

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

جنوری 2013

شعاع

PDFBOOKSFREE.PK

سالانہ مبارک



269	خالہ جیلانی	32	رضیہ جمیل
284	خالہ جیلانی	261	صباحہ
290	ادارہ	280	تبصیر نشاط
		265	شگفتہ جاہ
		287	امت الصور

چند 27 شمار 5
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیلہ فلورین حسن پر شنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ - (مقا ۲۰، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱) ریح ابن سوسانی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

نظمیں غزلیں

صیتہ علی آغا 260

78 ادارہ شعاع کے ساتھ

مکمل ناول

196 توبہ جہیں

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
 ریشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
 امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے ناول، یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

شعاع کا جنوری 2013ء کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
نئی امیدوں، نئی خواہشوں اور نئے خوابوں کے ساتھ ایک اور سال دستک دے رہا ہے۔
طلوع و غروب ہوتے روز و شب میں کوئی جدت نہ سہی تب بھی ہرگز رتے لٹے کے ساتھ تبدیلی کا عمل لازم
اور امید زندگی کے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ نئے سال کی آمد کے ساتھ ادا دوں، خواہشوں اور خوابوں کا
سلسلہ بھی چل نکلتا ہے۔

امن، انصاف اور خوشحالی کے خواب۔
ایک ایسی دنیا کے خواب جہاں طاقت کی نہیں انصاف کی مکرانی ہو۔

جہاں سب کو سزا ملے کر جینے کا حق حاصل ہو۔
ان خوابوں کی تعبیر کے لیے انسان صدیوں سے سرگرداں ہے۔ تمام پیغمبر، بادی انسانیت کی فلاح کے لیے ہی دنیا
میں بھیجے گئے۔ تمام فلسفی اسی کی جستجو اور کھوج میں غور و فکر کرتے رہے مگر خلاؤں کو تسخیر کرنے والا انسان دھرتی
پر رہنے کا سلیقہ نہ سیکھ سکا۔

گیا سال کسی حوالے سے بھی دنیا کے لیے کوئی خوش کن پیغام نہ دے سکا۔ آگ اور بارود کے شعلوں میں
جھلتی دھرتی اس سال بھی امن کے لیے ترستی رہی۔ گزشتہ دو دہائیوں سے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے
نبرد آزما وطن عزیز کے شہر دھماکوں سے لرزتے رہے۔ اور بے گناہ معصوم انسان اندھی گولیوں کا نشانہ بنتے رہے۔
آنے والے وقت کی بہتری کے لیے پوری خوش آمدی کے ساتھ دعا گو ہیں۔

قارئین کو نیا سال مبارک ہو۔
ہماری دعا ہے کہ نئے دلے سال میں آپ سب کو دلی خوشیاں نصیب ہوں اور یہ سال ہم سب کے لیے
امن برکت اور خوشحالی کا پیغام لے کر آئے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

، نغمہ ناز کا مکمل ناول۔ رابعی کی کہانی،
، ثوبہ جبین کا مکمل ناول۔ آشنا ہیں تیرے قدموں سے،
، نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے،
، سمیرا حمید کا ناولٹ۔ حیات ممکن ہے،
، سمیرا عثمان گل، مصباح علی، رمشہ خالد خان اور نسیم شریف کے افسانے،
، کیا کہو یا، کیا پایا۔ نئے سال کے حوالے سے قارئین سے سروے،
، دستک۔ معروف شخصیات سے گفتگو،
، خط آپ کے۔ آپ کے خط اودان کے جوابات،
، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
شعاع کا ہر شمارہ ترتیب دیتے ہوئے ہمارے پیش نظر آپ کی آراء ہوتی ہیں۔ اسی کی روشنی میں ہم ہرچہ
ترتیب دیتے ہیں۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

جو دل کی آنکھیں کھلیں ہم کو یہ ہوا معلوم
وہ راز جان گئے جو پہلے تھا معلوم

گناہ گار ازل ہوں سرشت میں ہے خطا
تجھے تو میرے خدا سب ہے مابرا معلوم

خدا کی ذات کو کیا سمجھے عقلِ انسانی
ابھی تو اپنی ہی ہستی کا راز نامعلوم

خدا کی ذات کے منکر رہے یہ بھول ہوئی
اجل کا وقت جو آیا تو ہو گیا معلوم

نہیں ہے تو ابھی رازِ حیات سے واقف
تجھے وجودِ عدم کا ہے کیا پتہ معلوم

جو حال پھول کا پوچھا کلی سے بلبل نے
لگی وہ کہنے مجھے کیا پتہ، خدا معلوم

تویر پھولے،

لازم ہے اس سے پہلے کہ نعت نبی لکھوں
جو کچھ لکھا ہے کچھ نہیں لکھا یہی لکھوں

پاسِ ادب میں جنش لب کی کہاں مجال
اور شوقِ مدح اس پر مصر ہے ابھی لکھوں

وہ کائناتِ علم ہیں، وہ علم کائنات
منجملہ صفات لکھوں تو یہی لکھوں

جو ان سے آشنا ہوا، حق آشنا ہوا
آگاہی نبی کو حشر آگاہی لکھوں

یارب عطا وہ ذہن رسا ہو کہ نعت میں
جو ماورائے فکر ہے وہ بھی کبھی لکھوں

اس جزو نورِ کل سے ہے تابندگی تمام!
میں کیوں نہ اس کے سائے کو بھی روشنی لکھوں

محسنے بھوپا پے،

موت کی یاد دہانی

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے پاس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گزرے جبکہ ہم اپنے چھپر کی مرمت کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ کیا ہے؟“

ہم نے کہا ”(یہ چھپر) کمزور ہو کر گرنے کے قریب ہو گیا تھا ہم اسے ٹھیک کر رہے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”میں تو معاملے (موت) کو اس سے بھی زیادہ قریب دیکھ رہا ہوں۔“

(اسے ابو داؤد اور ترمذی نے بخاری و مسلم کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل : خص سے مراد یا تو پھپر ہے یا وہ گھر ہے جو لکڑی اور کانوں سے بنا ہوتا ہے اور مٹی سے اسے لپ دیا جاتا ہے۔ وہ مٹی کی لپائی ہی میں مصروف ہوں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکان کی لپیا پوتی نہ کی جائے بلکہ مطلب موت کی یاد دہانی ہے تاکہ موت ہر وقت انسان کے سامنے رہے اور وہ کسی وقت بھی اس سے غفلت نہ برتے۔

فتنہ

حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے (یعنی ایسی چیز جس کے ذریعے سے اسے آزمایا جاتا ہے)۔ اور میری

امت کے لیے فتنہ (آزمائش) مال ہے۔“

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل : 1- فتنے کے معنی آزمائش کے ہیں۔ جس کو جس چیز سے آزمایا جائے وہ اس کے لیے فتنہ ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید میں اولاد اور مال کو بھی انسانوں کے لیے فتنہ کہا گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی نعمتیں ہیں، لیکن چونکہ ان نعمتوں کے ذریعے سے انسانوں کی آزمائش ہوتی ہے، اس لیے انہیں فتنے سے تعبیر فرمایا۔

2- اس حدیث میں امت محمدیہ کے لیے سخت تنبیہ ہے کہ وہ مال کی محبت میں اعتدال کو ملحوظ رکھے ورنہ وہ اس آزمائش میں ناکام ہو سکتی ہے اور یہ مال جو نعمت الہی ہے اس کے لیے عذاب شدید کا باعث بن سکتا ہے۔

ضروریات زندگی

حضرت ابو عمر اور بعض کے نزدیک ابو عبداللہ یا ابولیلیٰ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ابن آدم کے لیے ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز میں حق نہیں ہے ایک گھر جس میں اس کی رہائش ہو، کپڑا جس سے وہ اپنا ستر چھپالے، بغیر سالن کے (یا مولیٰ) روٹی اور پانی۔“

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔)

انسان کا مال

حضرت عبداللہ بن شخبہ (شین کے نیچے زیر اور

خاک کے نیچے بھی زیر اور تشدید) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ (الہکم التکاثر) تمہیں کثرت کی آرزو نے غفلت میں ڈال دیا۔“ تلاوت فرما رہے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”انسان کہتا ہے، میرا مال، میرا مال، حالانکہ اے انسان! تیرا مال تو صرف وہ ہے جو تو نے کھا کر ختم کر دیا، یا پہن کر بوسیدہ کر دیا، یا صدقہ کر کے آگے (آخرت کے لیے) چلا دیا۔“ (مسلم)

فائدہ

اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ انسان کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی پسندیدہ راہوں پر خرچ کرے کیونکہ یہ صدقہ کیا ہو مال ہی آخرت کے لیے ذخیرہ ہو گا جہاں اس کو اس کا اجر و ثواب ملے گا۔ باقی جو مال وہ اپنے کھانے پینے اور لباس وغیرہ پر خرچ کرے گا وہ سب اس دنیا ہی میں ختم اور بوسیدہ ہو جائے گا اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ اس کے کام نہیں آئے گا۔

فقر

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! میں یقیناً آپ سے محبت کرتا ہوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”دیکھ تو کیا کہہ رہا ہے!“

اس نے (پھر) کہا ”اللہ کی قسم! میں یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں۔“

تین مرتبہ اس نے اس طرح کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”اگر تو واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے تو فقر و غریب

کاملاً تیار کر اس لیے کہ فقر اس شخص کی طرف جو مجھ سے محبت کرتا ہے اتنی تیزی سے جاتا ہے کہ اتنا تیز سیلاب کا پانی بھی اپنے بہاؤ کے رخ پر نہیں جاتا۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔)

مال و جاہ کی حرص

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”دو بھوکے بھیڑیے، جنہیں بکریوں کے ریوڑ میں بھیجا جائے (بکریوں کو) اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا نقصان آدمی کے مال اور جاہ کی حرص اس کے دین کو پہنچاتی ہے۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل

مال و جاہ کی محبت کی یہ حشر سلمانیاں، جس کی نشاندہی اس حدیث میں کی گئی ہے، آج ہر طرف دیکھی جاسکتی ہیں حتیٰ کہ علماء اور مدعیان زید و تقویٰ بھی جب ان کے اندر ان چیزوں کی حرص آگئی تو وہ ان ہلاکتوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔

زہد

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک مرتبہ) ایک چٹائی پر سوئے جس سے آپ کے پہلو میں (چٹائی کے) نشان پڑ گئے۔ ہم نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر (اجازت دیں تو) ہم آپ کے لیے ایک نرم گدایتار کر دیں!“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مجھے دنیا سے کیا سروکار؟ میں تو دنیا میں اس سوار کی طرح ہوں جو کسی درخت کے نیچے سایہ حاصل کرنے کے لیے ٹھہرا، پھر چل پڑا اور اس درخت کو چھوڑ دیا۔“

(اسے تفسیر نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے) **فائدہ :** اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد کے علاوہ دنیا کی حقیقت ایک نمونہ کے ذریعے سے نہایت بلیغ انداز میں واضح کر دی گئی ہے۔ کاش لوگ اس حقیقت کو سمجھ کر دنیا کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کریں جو اس حدیث کا مفہوم ہے۔

فقر کی فوقیت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جنت میں فقرا“ مال داروں سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے۔“

(اسے تفسیر نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : فقرا سے مراد وہ فقرا ہیں جو ایمان میں کامل اور اعمال صالحہ کے پابند رہے ہوں گے نیز انہوں نے فقر پر صبر کر کے مانگنے سے اجتناب کیا ہو گا۔ یہ مال داروں سے پہلے جنت میں جائیں گے کیونکہ مال داروں کا حساب ہو گا کہ مال کس طرح کمایا اور کس طرح خرچ کیا، جبکہ فقرا سے یہ سوال نہیں ہو گا۔

جنت میں کثرت

حضرت ابن عباس اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”میں نے جنت میں جھانکا تو دیکھا کہ اس میں اکثر نادار لوگ ہیں، پھر جہنم میں جھانکا تو اس میں اکثریت عورتوں کی دیکھی۔“ (بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اور بخاری نے اسے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل :

1- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت اور دوزخ کا یہ مشاہدہ یا تو معراج کے موقع پر کرایا گیا یا کشف کے ذریعے سے، جیسے صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نماز کوف میں آپ کو کشف کے ذریعے سے جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا۔

2- فقرا کی اکثریت اس لیے جنت میں جائے گی کہ وہ ایمان و عمل صالح کی پابندی مال داروں کے مقابلے میں زیادہ کرتے ہیں، جبکہ مال داروں کی اکثریت مال کے گھمنڈ میں ایمان و عمل کے تقاضوں کو اہمیت نہیں دیتی۔ اور عورتوں کے زیادہ جنم میں جانے کی وجہ خود دوسری حدیث میں بیان کر دی گئی ہے کہ یہ آپس میں زیادہ لعین طعن اور خاوندوں کی ناشکری کرتی ہیں اس لیے عورتوں کو ان کو تابیوں کا ازالہ کرنا چاہیے۔

حساب کتاب

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو (میں نے دیکھا کہ) اس میں داخل ہونے والے زیادہ مساکین ہیں اور مال دار لوگوں کو (حساب کے لیے) روکا ہوا تھا، البتہ جہنمیوں کو جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔“ (بخاری و مسلم)

سچی بات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی وہ لبید (شاعر) کی بات ہے (اس نے کہا)۔“ سنو! اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے باطل (بے حقیقت) ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

اس سے معلوم ہوا کہ اچھے شعر پڑھنا، کہنا اور ان

سے استہلو جائز ہے۔ اس شعر میں کل من علیہا فان ○ والا مضمون بیان کیا گیا ہے جس سے آخرت کی زندگی کا وہام اور دنیا کی ناپائیداری کا اثبات ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہمیں آخرت کی طرف زیادہ توجہ رکھنی چاہیے۔

مسلمان کی مدد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جس نے کسی مومن سے دنیا کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی (بڑی) تکلیف دور فرما دے گا۔ جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی اللہ تعالیٰ اس پر دنیا و آخرت میں آسانی فرمائے گا۔ جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔“

جو ایسے راستے پر چلتا ہے جس میں وہ علم (دین)

تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمادیتا ہے۔ اور جو لوگ بھی اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے اور آپس میں اس کی تدریس (سیکھتے یا سکھاتے بحث و تکرار) کرتے ہیں تو ان پر (اللہ کی طرف سے) مسکنیت نازل ہوتی ہے، انہیں رحمت ڈھانپ لیتی ہے، فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان فرشتوں میں فرماتا ہے جو اس کے پاس ہوتے ہیں اور جسے اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھائے گا۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1- اس میں مذکورہ فوائد کے علاوہ اور بہت سی اہم باتیں بیان کی گئی ہیں مثلاً : تنگ دست پر آسانی کرنے کی فضیلت، علم شریعت حاصل کرنے کی سعی و

کاوش کی فضیلت، قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے درس و تدریس اور افہام و تفہیم کے لیے اجتماع کی ترغیب و فضیلت۔

2- گھروں میں ختم قرآن کی جو محفلیں منعقد کر کے ان سے فوت شدگان کی بخشش و مغفرت کی امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں، یہ الگ صورتیں ہیں جو ایک رسم و رواج سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یاد رہے! مسلمان کا کوئی کام خلاف سنت نہیں ہونا چاہیے۔

3- علاوہ ازیں اس حدیث میں نسبت پر اعتماد کرنے کے بجائے اعمال صالحہ اختیار کرنے کی ترغیب و تلقین کی گئی ہے۔ یہ حدیث ان لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے جو اعمال صالحہ اور اخلاق عالیہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور صرف خاندانی عزت و شرافت پر اترتے ہیں۔

سفارش

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”جس نے کوئی اچھی سفارش کی اس کے لیے بھی اس میں سے حصہ ہو گا۔“

فیصلہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ضرورت مند آتا تو آپ اپنے شرکائے مجلس کی طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے۔

”(اس کے لیے) سفارش کرو، تمہیں (بھی) اجر دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو پسند فرماتا ہے غیصلہ فرمادیتا ہے۔“

(بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے ”(اللہ) جو چاہتا ہے (فیصلہ فرمادیتا ہے)۔“

فوائد و مسائل :

1- اس میں جس سفارش کی ترغیب دی گئی ہے وہ حلال و مباح امور میں ہے۔ حرام کام یا اسقاط حد

(مقررہ شرعی سزا کی معافی) کے لیے سفارش کرنے کی اجازت نہیں ہے۔
2- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے منشاء الہی کے مطابق ہی کلام صادر ہوتا تھا۔

عورت کی مرضی

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بریرہ رضی اللہ عنہا اور اس کے خاوند کے قصے میں منقول ہے کہ اس (بریرہ) سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اگر تو اس (مغیث خاوند) سے رجوع کرے (تو اچھا ہے)۔“
اس نے کہا ”اے اللہ کے رسول! کیا آپ (رجوع کرنے کا) مجھے حکم فرماتے ہیں؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نہیں“ میں تو صرف سفارش کرتا ہوں۔“
اس نے کہا ”مجھے (مغیث کی) کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل :

1- حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی تھیں جو ایک غلام مغیث کے نکاح میں تھیں۔ انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آزاد کر دیا۔ آزادی کے بعد اسلام نے لونڈی کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے غلام خاوند کے نکاح میں رہنا پسند نہ کرے تو نکاح صحیح کرا سکتی ہے چنانچہ اس نے اپنا یہ حق استعمال کرتے ہوئے اپنے خاوند مغیث سے علیحدگی اختیار کر لی۔
2- مغیث کو بریرہ سے بڑی محبت تھی وہ اس کے پیچھے پیچھے پھرتا اور اس کی منت سماجت کرتا کہ لعلق زوجیت منقطع نہ کرے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا اور مغیث کی حالت زار کا علم ہوا تو آپ نے بریرہ سے سفارش کی کہ وہ اپنے خاوند سے رجوع کر کے اس سے تعلق زوجیت بحال کر لے۔ لیکن چونکہ یہ حکم شرعی نہیں تھا ایک مشورہ اور سفارش ہی تھی۔

اس لیے بریرہ نے اس مشورے کو اپنے لیے مفید تصور نہیں کیا اور اسے قبول کرنے سے معذرت کر لی۔
اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے شخصی حقوق اور شخصی آزادی کو تسلیم کیا ہے اور اس کا وہ پورا احترام کرتا ہے بشرطیکہ وہ دائرہ شریعت سے متجاوز نہ ہو۔ اس آزادی کو جو واکراہ سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔

لوگوں کے درمیان اصلاح

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
”ان کی اکثر سرگوشیوں (مشوروں) میں کوئی بھلائی نہیں مگر جو شخص صدقے یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے۔“
اور فرمایا ”صلح بہتر ہے۔“
اور فرمایا ”اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو۔“
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
”یقیناً“ مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں“
لہذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔“

صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”لوگوں کے ہر جوڑ پر صدقہ (واجب) ہے ہر اس دن میں جس میں سورج طلوع ہوتا ہے۔ تیرا دو آدمیوں کے درمیان عدل و انصاف (کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ) کرنا صدقہ ہے۔“
تیرا کسی آدمی کی اس کی سواری کے معاملے میں مدد کرنا کہ تو اسے اس پر سوار کرا دے یا اس کے اوپر اس کا سامان رکھو ادا ہے صدقہ ہے۔
اچھی بات کہنا صدقہ ہے۔
ہر وہ قدم جو تو نماز کے لیے اٹھائے صدقہ ہے۔
تیرا راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا صدقہ ہے۔“ (بخاری و مسلم)



ڈھلتا سورج ڈوب رہا ہے آؤ بیٹھ کر سوچیں
جانے والے سال میں ہم نے کیا کھویا کیا پایا؟
خاموشی سے گزرتے ماہ و سال عمر کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ یہ زندگی میں کبھی خوشی لے کر آتے ہیں اور کبھی دکھ کی پرچھائیاں۔ کبھی ہمارے سنہرے خواب تعبیراً کر زندگی میں قوس قزح کے رنگ بکھیر دیتے ہیں اور کبھی زندگی ایسے رخ بھی دکھاتی ہے کہ خواب کرچی کرچی ہو کر دکھ کے انمٹ نقوش ثبت کر جاتے ہیں۔

گزر گئے وہ رات دن، پچھڑ گئیں وہ ساعتیں
مگر یہ کیا کہ دل پر یہ جہاں ثبت ہو گئے

کوئی بھی موسم ٹھہرتا نہیں۔ زندگی اتنی تیز رفتار ہے اور وقت اتنی برق رفتاری سے گزر رہا ہے کہ کہیں رکنے اور کچھ دیکھنے سوچنے کی مہلت ملنا بھی محال ہے۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں رک کر سوچنا ہی پڑتا ہے کہ ہمیں جو زندگی دی گئی اس کا ہر لمحہ عمل و احتساب سے مشروط ہے۔

ایک اور نیا سال ہمارے سامنے ہے۔ گزرے سال کے حوالے سے ہم نے حسب روایت اپنی قارئین سے سروے کیا۔ سوال یہ ہے۔

گزرتے سال آپ کو کیا احساس دے جاتے ہیں؟ کیا سال آپ کو کیا دے گیا اور آپ نے کیا کھو دیا؟
(1) ذاتی حوالے سے

(2) اجتماعی حوالے سے۔
آئیے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

کیا کھویا کیا پایا

ادارہ

مسرت الطاف احمد... کراچی

مجھے حقیقتاً ”یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ گزرے ایک سال پر افسوس کیا جائے یا ناشیاں منانی جائیں۔ افسوس غم اور خوشی کی ملی جلی سی کیفیت دے کر اسی طرح ہر سال گزر جاتا ہے۔ اگر ذاتی حوالے سے دیکھا جائے تو۔۔۔

میری زندگی میں اس سال بہت تکلیف دہ واقعہ رونما ہوا۔ شاید آپ کو یہ میرا بچپنا لگے لیکن مجھے بہت چھوٹی چھوٹی باتیں تکلیف دیتی ہیں ہوا کچھ یوں کہ دسمبر کی ٹھنڈی اور خشک رات میں شبنم کی طرح

آنکھوں میں نمی لیے وہ مجھے چھت کے ایک کونے میں بیٹھی ملی۔ بہت ہی کیوٹ اور معصوم سی ملی کو جب بھیگتی آنکھوں سے اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرانی سموئے پتا نہیں کیوں بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ وہ بہت ہی چھوٹی اور نرم و نازک تھی۔ پہلے ہم نے اسے دودھ دینا شروع کیا۔ جب تھوڑی بڑی ہو گئی تو کبھی مچھلی، کبھی روٹی تو کبھی چاول دیتے رہے۔ جو کچھ ہمارے گھر میں پکتا اس میں اس کا حصہ ضرور ہوتا۔ وہ 2012ء کی اداس اور خاموش رات تھی۔ ملی ہماری محبت پیار کو ٹھکرا کر اسی رات



کوثر خالد... جڑانوالہ

1۔ گیا سال کیا لے گیا اور کیا دے گیا؟ ایک لمبی کہانی ہے۔ جنوری 2012ء نے مجھے ایم اے پاس ہونے کی خوش خبری دی۔ فروری میں ایم ایڈ بھی مکمل ہوا۔ اس کے بعد پتا چلا کہ بس تعلیم مکمل ہونا کافی نہیں بلکہ نگری سفارش بھی ضروری ہے نوکری کے لیے سو ہم مزید تعلیم کی طرف بھاگے اور ایم اے انگلش کرنے کی ٹھانی، ساتھ ایم فل بھی۔ مجھے بہت سے چروں کے پیچھے چھپے اصل چہرے بھی نظر آئے اور بہت سے اپنے بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ اس سال بھی دوستوں کو بہت مس کیا۔ خاص کرام رقیہ اور پروین کو (یہ ہمارا کالج گروپ تھا) البتہ ہمارے دل کا موسم بہت باغ و بہار رہا اور آج کل وہاں ہر طرف خاموشی ہے۔

2۔ اس سوال کے جواب میں تو بس چند اشعار ہی عرض کیے جاسکتے ہیں۔

سفر کی شب میں جھپٹتی فضا کی دہشت سے
مسافروں کی تھکن کس طرح لڑی ہوگی؟

کئی پھٹی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر محسن
مجھے یقین ہے کہ خود موت رو پڑی ہوگی
تمام اہل دل کے لبوں اور دل پہ یہ ایک ہی سوال
مچلتا ہے۔

ذاتی حوالے سے گیا سال ہمیں ایک پیاری سی بہو دے گیا۔ ہمارا رابطہ آپ سے یعنی شعاع سے بحال کر گیا۔ جن جن سے میری دوستی تھی اُسے اور مضبوط بنایا۔ خاندانی رجحانوں سے پنپنا سکھا گیا۔ کھویا کچھ نہیں۔ خدا کے فضل سے پایا ہی پایا ہے۔ کیونکہ دنیاوی لحاظ سے کچھ پانے کی تمنا ہی نہیں۔ صرف ہدایت کی خواہش ہو تو کھونے کا احساس ہو ہی نہیں سکتا۔

اجتماعی حوالے سے جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔ علم و دانش میں تو اضافہ ہوا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ابھی تک پاکستان ہمارے پاس معجزاتی طور پر موجود ہے۔ ظاہر ہے اگر عمل نہیں بھی تو ہماری دعائیں قبول ہوئیں۔ گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مظاہرے نے ثابت کر دیا کہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کم نہیں کیا جاسکتا۔

کھویا کیا ہے ابھی تک عافیہ کھوئی ہوئی ہیں۔
گزرتے سال ہمیں عبرت کا بڑا سامان دیتے ہیں
خدا کا کرم ہو تو نئے نئے الہام دیتے ہیں
ظل ہما... فیصل آباد

سب سے پہلے سب دوستوں کو نیا سال مبارک

ابدی غنیمت ہو گئی۔

کہنے کو تو یہ بہت ہی چھوٹی اور غیر اہم بات ہے کہ جہاں انسانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے وہاں ایک جانور کی کیا حیثیت لیکن پھر بھی میں یہ کہوں گی کہ ہمیں اس سے بہت محبت تھی اور محبت کے حوالے سے جتنا بھی لکھا جائے کم ہی ہوگا۔ کیونکہ محبت تو سمندر سے بھی گہری ہوتی ہے۔

بس آخر میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔

”میں نے اس کی جستجو میں کیا کھویا، کیا گنوا یا، کس کو بتاؤں کس کو اپنا یقین دوں کہ یہ ممکن نہیں ہے، کیونکہ میرا سب کچھ تو وہی تھا۔“

2۔ اجتماعی اور ملکی حوالے سے اگر بات کی جائے تو مئی 2012ء میں کراچی کے بہت ہی پس ماندہ علاقے لیاری میں آریشن کی وجہ سے جب بہت سے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو گھروں سے بے گھر کیا جا رہا تھا۔ ہمارے بھی بہت سے رشتہ دار ان ہی بے بس لوگوں میں شامل تھے۔

ایسے ہی ایک روز لیاری کے بہت سے رشتہ داروں کو ہمارے گھر آنا پڑا۔ ان کا ہمارے گھر آنا ایک طرف جہاں میرے لیے بہت سی خوشیوں کا سبب بنا وہیں دوسری طرف ان کی مشکلات، تکلیف اور مسائل سن کر دل خون کے آنسو روتا رہا۔ خوشی اس بات کی بھی کہ اپنے

رشتہ داروں کے ساتھ کچھ دن اکٹھے رہنے کا موقع ملا جو عموماً ”بست کم ملتا ہے کیونکہ آج کل بھگتی دوڑتی زندگی میں ہم اپنوں کے لیے وقت نہیں نکال پاتے۔ ان چار پانچ دنوں میں ہم نے بہت انجوائے کیا۔ ساتھ ساتھ موجودہ حالات کی وجہ سے اذیت میں بھی مبتلا رہے۔ آخر کیوں ہماری حکومت خاموش تماشائی کا رول بے کر رہی ہے۔ یہ حالات میں بھی ہم نے اس وقت کو اچھی یادوں کی طرح گزارا۔

ایک کمرے میں ہم سات، آٹھ لڑکیاں سوتیں رات دیر تک جاگتے بالکل شادی جیسا ماحول تھا۔ ان خوب صورت لمحوں نے ہمارے جذبات کو سمندر کی طرح پر جوش اور ہماری محبت کو ایک دوسرے کے لیے چٹان کی طرح اور بھی مضبوط کر دیا۔ یہ میری زندگی کے بہت ہی خوب صورت دن تھے مجنہیں میں کبھی بھی نہیں بھول سکتی۔ ان کے جانے کے بعد گھروں پر ان سا محسوس ہونے لگا۔

یادیں چاہے اچھی ہوں یا بری انسان کی زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے انسان بری یادوں کو بھول جانا چاہتا ہے اور اچھی یادوں کو بار بار یاد کرتا ہے اور ہر بار ان یادوں کا احساس بہت ہی خوب صورت ہوتا ہے۔



گیا۔ اچانک پیچھے سے آنے والی کسی تیز رفتار گاڑی نے اسے ہٹ کیا۔ جبکہ ڈکیتی کی وجہ سے موبائل بھی وہ اپنے ہمراہ نہیں لے جاتا تھا اور نہ ہی اس کے پاس اپنی ذاتی موٹر سائیکل تھی۔ وہ تو 3-A سے سفر کرتا تھا۔ اس نے ایمبولنس کے ڈرائیور کو اپنے گھر کا فون نمبر خود بتایا۔ فون پر انہوں نے کہا کہ ”آپ کے بیٹے کے پاؤں پر چوٹ لگی ہے، مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہ بائیں کر رہا ہے اور ٹھیک ہے۔“ سب لوگ اسپتال چلے گئے اور میں گھر پہ جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئی۔ اسے بچانے کے لیے دنیاوی سارے وسائل موجود تھے مگر محکم رہا نہ تھا۔ اس کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں۔

اس سال 11 نومبر کی رات نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ اگر اللہ نے مجھ میں دین کی اتنی سمجھ نہ دی ہوتی تو پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا۔ اللہ کی رضا میں راضی رہنے کا اجر و ثواب آخرت میں ملنے کی امید میں صبر کر رہی ہوں۔ وہ اللہ کی امانت تھا۔ اسے لوٹا دیا اور پھر میرے مالک نے معیذ کی شہادت کی گواہی ہر ہر جگہ سے مجھ تک پہنچائی۔ اس کا تازہ اور فریش خون لحد تک بہتا گیا جبکہ اس کے خون میں بہت خوشبو تھی۔ اس کا جسم روئی کے گالوں کی طرح نرم و ملائم تھا۔ اس کے چہرے پر اتنا نور اور روشنی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ مجھے اور کیا چاہیے اللہ نے مجھے شہید کی ماں کے رتبہ پر فائز کر دیا۔ میں تو اس

ایکسی ملٹنٹ کے ڈھائی گھنٹے تک معیذ زندہ رہا اور بالکل اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ کسی تکلیف کا اظہار تک نہیں کیا۔ کمر پر ایک زخم تھا۔ جس کی وجہ سے جسم کا سب خون بہہ گیا۔ مگر میرے بیٹے کے چہرے پر کسی اذیت کے آثار نہ تھے۔ اس نے مسلسل

آخری وقت کلمہ پڑھا اور اپنی جان مالک حقیقی کے سپرد کر دی۔ میرا بیٹا شہید ہے اور شہید کبھی مرتا نہیں۔ اس کی جان ایسے نکلی جیسے پھولوں سے خوشبو۔ اللہ ہمیں بھی اتنی آسانی کی موت نصیب کرے۔ (آمین) جنت میں اس کے درجات بلند کرے۔ (آمین) اور



میں اکثر سوچتا ہوں، رہزنوں کے جانشین آخر حقائق کیا چھپائیں گے، فسانے کیا تراشیں گے؟

1۔ گیا سال یعنی 2012ء مجھے ایک ایسا زخم دے گیا ہے جس سے تاحیات لہو رستا رہے گا۔ 11 نومبر 2012ء کی رات مجھ پر ایک ایسی

قیامت ٹوٹی، جس کی یاد مجھے زندگی بھر خون کے آنسو رلاتی رہے گی۔ معیذ اکرم اکیس سال کا جوان، معصوم، سادہ، شوخ و شرارتی، عام نوجوانوں سے بالکل منفرد جدا۔ بہت محنتی، نیک، فرماں بردار، KICT میں جاب کے ساتھ ساتھ کراچی یونیورسٹی سے B.A. فائنل کے ایگزام کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا ایڈمٹ کارڈ اس کے جانے کے ایک ہفتہ بعد ملا۔ پورٹ پر جاب کا بہت ٹف شیڈول ہوتا ہے۔ 11 نومبر اتوار کی صبح حسب معمول صبح آٹھ بجے ناشتا کر کے گھر سے روانہ ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج میں اسے آخری بار دیکھ رہی ہوں۔ میرا شہزادہ معیذ اکرم اپنی جاب پر گیا تو اپنے پیروں سے تھا، مگر واپس ایمبولنس میں آیا۔ 11 نومبر کو رات نو بجے جب میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی تو وہ تو نہ آیا، بلکہ بذریعہ فون اس کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع آگئی۔ گھر سے ایک اسٹاپ پہلے ماڑی پور روڈ پر دعا ہو مل کے قریب اپنے دوست کے ساتھ گاڑی سے اتر

غریبوں کی عدالت مجرموں کو جب بلائے گی خزانے لوٹنے والے بہانے کیا تراشیں گے؟ اور بس اتنا کہوں گی کہ دھرتی کے ستاروں کو نیا سال مبارک اس دیس کے پیاروں کو نیا سال مبارک

جو شدت آلام سے رو بھی نہیں سکتے ان درد کے ماروں کو نیا سال مبارک سانچے اتنے ہیں کہ آنکھیں لہو رو میں اور دل پھٹ جائیں مگر یہاں تو احساس ہی پتھر کے ہو گئے۔ کون روئے کون ماتم کرے؟ اجازت دیجیے۔ (اللہ حافظ!)

شمینہ اکرم... کراچی

شاید میں اتنی جلدی اس سروے میں شرکت کے قابل نہ ہوتی۔ اگر جو مجھے معیذ کی ایک بات یاد نہ آتی کہ ”می! آپ اپنے شعلہ ڈائجسٹ میں ہر ایک کے مارے میں لکھتی ہیں۔ اپنے بیٹے کے بارے میں بھی تو

سینرو، پھر 8 نومبر 2012ء بروز جمعرات میری شادی۔ آہ! سب سے بڑی خوشی۔ اپنے پیر شمس صاحب کے ہاتھوں رخصتی اور شاہ صاحب بڑے شاہ صاحب میرے معلم، استاد محترم کے ہاتھوں رخصتی اور اسپیشلی نکاح۔ عالم نہ پوچھے جب آنکھوں کے سامنے مانگی ہوئی دعا پوری ہو رہی ہو تو۔ یہ بس محسوس کیا جاتا ہے لفظوں میں ادائیکسی مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔

اللہ کی رحمت اور فضل ویسا ہی ملا۔ جس طرح میں نے گمان کیا ہوا تھا۔ ہر ایک تعلق سے زیادہ شوہر سے زیادہ سچا، مخلص، اچھا اور پیارا رشتہ کوئی نہیں مگر شرط یہ ہے کہ پہلے فریڈ ہو۔ دوستی لازوال، بندھن ہے۔ بے مثال ربط ہے اور صرف بنیاد و تکیا ہے۔ یہ تعلق تو صرف اور صرف بنیاد و اعتماد ہے۔ یگانگت ہے۔ اعتبار ہے۔ جس کو شک کے پانی سے بچا کر رکھنا پڑتا ہے۔ میں نے جیسا گمان کیا، مجھے اس سے بڑھ کر شوہر ملا اور پھر کریم اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو مجھ سے جیسا گمان کرتا ہے، میں اس کو ویسا ہی دیتا ہوں اور سچائی میں رب سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ اللہ رب العزت میری خوشیوں کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

2۔ کھونے کا احساس ہی اصل چیز ہے کہ ہم کچھ کھو کر کیا محسوس کرتے ہیں، اپنی پیاری بہن کا ساتھ چھن گیا۔ ناویہ پروین گھمن۔ اس کی شادی بھی میرے ساتھ ہی ہوئی۔ مولا کریم اسے اپنے گھر میں گرم ہوا بھی نہ دے۔ (آمین) سدا خوش رہے۔ (آمین)

3۔ گزرتے سال صرف یہی احساس دے جاتے ہیں کہ وقت کی رفتار تمام چیزوں سے زیادہ ہے۔

2۔ اجتماعی اور ملکی حالات کے حوالے سے۔ واصف علی واصف کا قول ہے کہ پاکستان ایک نور ہے اور نور اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس پاک وطن کو زوال نہیں کیونکہ نور کو زوال نہیں سیاست سے

بروردگار کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ میرے بیٹے کو شہادت ملی۔ (شکر ہے مالک) گزرتے سال کا تو پتا نہیں مگر 2012ء جاتے جاتے مجھے ایک احساس ضرور دے گیا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے انسان کو اپنی زندگی کا لمحہ بھر کا بھی بھروسہ نہیں۔ ہم دنیاوی زندگی کے جھیلوں میں مصروف ہو کر فکر آخرت کو بھلا دیتے ہیں۔ میرا بیٹا جاتے جاتے مجھے فکر

آخرت دے گیا ہے۔ ہمیں دنیا کا متاع و مال جمع کرنے کے بجائے آخرت کے لیے اچھے اعمال جمع کرنے چاہئیں۔ معیذ اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ گیا۔ اپنا کمپیوٹر، سی ڈیز، کیمرا، موبائل فونز، ڈھیروں پرفیومز جنہیں اپنی زندگی میں کسی کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتا تھا مگر اب وہ اس فکر سے آزاد ہے کہ اب ان چیزوں کو کون استعمال کرے گا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں دنیا بھر کی معلومات رکھتا تھا۔ ہر وقت نیوز دیکھنا یا پھر حالات حاضرہ کے پروگرامز جگہ جگہ اپنا نام ”معیذ استاد“ لکھنا بھی اس کا شوق تھا۔ دن میں کئی اخبار زیر مطالعہ رہتے۔ اس کے لیے میری سائنس نوجو کتاں ہیں اور دھڑکنیں بین کر رہی ہیں۔ اللہ اس پر اپنی رحمت نازل کرے۔ (آمین) اجتماعی اور ملکی حوالے سے گیا سال ہمیں بیروزگاری، بڑھتی منگائی کا عذاب، بد امنی، بے سکونی، عدم تحفظ، ٹارگٹ کلنگ، سی این جی اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ، نوجوانوں کے جنازے اور غیر یقینی صورت حال دے کر گیا ہے۔ ہر لمحے کچھ نہ ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ شہری ذہنی مریض بن گئے ہیں، کسی کا جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں۔

نوال افضل گھمن۔۔۔ گجرات

گیا سال آپ کو کیا دے گیا؟ اور آپ نے کیا کھو دیا؟ گزرتے سال آپ کو کیا احساس دے جاتے ہیں۔ 1۔ ذاتی حوالے سے۔ جی جناب! پہلی بات یہ ہے کہ گئے سال مجھے ستائیسویں روزے کو گاڑی ملی

خواتین اور روشنائی کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ



جنوری 2013 کے شمارہ کی ایک جھلک

جنوری 2013
کا شمارہ سال نو شائع ہو گیا ہے

✽ ”آنے والا ہے برف کا موسم“ سائرہ رضا ✽
راشدہ رفعت، قنبرہ رابعہ، افراح خان، ایلیا یقین اور ام شامہ کے افسانے،
کا مکمل ناول،

✽ ”تیرے میرے درمیان“ مہوش افتخار کے ناول کی ✽
ٹی وی فنکارہ ”نیلیم منیر“ سے ملاقات،
دوسری اور آخری قسط،

✽ ”زمین کے آنسو“ گہمت سیما کا ناول، ✽
کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

✽ ”ہم سے ہے زمانہ“ ثمرہ بخاری کا ناول، ✽
اور عدنان کے مشورے۔

خواتین ڈائجسٹ جنوری 2013 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

دلچسپی اتنی ہے کہ بس زیر و لبول کی۔ غریب عوام کل بھی مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کی چکی میں پس رہے تھے اور آج بھی پس رہے ہیں۔

عروج یوسف... کراچی

1۔ سال پہ سال اس طرح گزر رہے ہیں جیسے دن پہ دن۔ ایک زمانہ تھا جب سال گزرنے میں سال لگ جاتا تھا۔ مگر اب تو لمحوں کی بات لگتی ہے۔ نیا سال آیا۔ گیا۔

آپ کا سوال ہے کہ اس سال نے کیا دیا اور کیا لیا۔ تو بہت سے خوب صورت لمحے دیے اور بہت سی نعمتیں ملیں۔ آسیہ میری دو سالہ بیٹی کی ہر پیاری بات ہر کھانے کے وقت عطا کی گئی نعمتوں کی خوشی اور بہت سی چھوٹی بڑی خوشیاں اور دکھ۔ خدا نخواستہ ایسا کچھ نہیں ہوا، بس کچھ لمحے ہیں جن کا سوچ کر دل ٹھم سا جاتا ہے۔ شام کو جب تک یوسف گھر نہیں آجاتے، ایک ان دیکھا خوف دل کو ٹھھی میں جکڑے رکھتا ہے۔ جب کوئی بچہ بیمار ہوتا ہے۔ آسیہ کو ٹائفائیڈ ہو گیا تھا اور تشخیص نہیں ہو پاری تھی وہ دن یونس کو خسرہ ہو گیا تھا اور ڈاکٹر پہلے سمجھ ہی نہیں پارہے تھے۔

اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے خوف بھرے لمحے ہیں۔ (اور احساس تو صرف یہ ہی ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے کہ یا رب آنے والا سال خوشیاں ہی خوشیاں لے آئے۔) اور ابھی ایک ماہ پہلے ابو کا بائی پاس ہوا تھا۔ وہ چند دن چند برس بن کر گزرے۔ اللہ تعالیٰ میرے سب پیاروں کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین)

2۔ ملکی اور اجتماعی لحاظ سے تو میرے وہی جذبات ہیں جو پوری پاکستانی قوم کے ہیں۔ بے بسی، خوف، امید، دعا میں یوں لگتا ہے کہ ظلم کی تاریک رات ہے جو ہر طرف چھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کے لیے خوشیوں کا سورج طلوع فرمائے۔ (آمین)

بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جنہوں نے پوری قوم

کو برغمال بنالیا ہے۔ لوڈ شیڈنگ، مہنگائی، ہڑتائیں، فائرنگ، بم دھماکے، غیر یقینی حالات، غیر یقینی صورت حال، صرف اپنے رب کی ذات سے امید ہے کہ وہ ان فرعونوں سے نجات دے دے۔ انہیں تباہ و برباد کر دے۔ (آمین)

صومیہ نذیریہ۔ ہری پور، ہزارہ

1۔ ویسے تو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں لیکن دل سے پوچھوں تو گزرے سال نے غمگین یادوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ ذاتی زندگی کی بات کروں تو زندگی نے اپنا ایسا روپ دکھایا جو دل و دماغ کے کسی کونے میں نہ تھا۔ جون 2011ء میں فرسٹ ایر کے ایگزامز دینے

کے بعد سیکنڈ ایر کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ اچانک جسم پیرالائز ہونا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر سے رجوع کیا تو علم ہوا کہ ایسا نزل کوڈ میں ٹیو مر ہے۔ سرجری تجویز ہوئی اور اگست 2011ء میں اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب آپریشن ہوا۔ پہلے مکمل بیڈ ہسٹنٹ تھی پھر وہیل چیئر کی مدد لی اور پھر سہارے سے چلنا شروع کیا۔ اب الحمد للہ اپنے پیروں سے چلنا شروع کر دیا ہے۔ میری ریکوری میں جہاں اللہ کی مدد شامل ہے وہیں کامیاب سرجن، جدید علاج اور فیملی کی سپورٹ بھی شامل ہے۔ اپنی بسن کی بہت مشکور ہوں جس نے میری دیکھ بھال کے لیے اپنی بڑھائی چھوڑی۔ ان تمام لوگوں کے لیے دعا گو ہوں جنہوں نے میری بیماری میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

2012ء کے سورج کے طلوع ہوتے ہی دعا کی کہ یہ سال ہم سب کے لیے خوشیوں کا سال ہو، لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ 9 جنوری 2012ء کو ابو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ابو کے چلے جانے سے تو گویا زندگی ویران ہو کر رہ گئی۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ میرے والد محترم کی مغفرت فرمائے۔

2۔ ملکی حوالے سے کیا کہوں۔ کوئی اچھی خبر ہے نہیں، صرف مسائل کے انبار ہیں۔ نااہل سیاستدان، کرپشن

غیرت، بیروزگاری، دہشت گردی، قتل و غارت کیا نہیں ہے ہمارے ملک میں۔ یہ اللہ کا عذاب ہے جس نظریے کی بنیاد پر یہ ملک بناؤ، نظریہ تو کہیں گم ہو گیا ہے۔ ملکی حالات پہ کیا دل جلے جملے لکھوں کہ سب باخبر ہیں۔

گزرے سالوں میں پایا بھی بہت اور کھویا بھی بہت۔ دل ملے جلے احساسات سے دوچار ہے۔ کہنے کو کچھ زیادہ نہیں کہ ذہن الفاظ سے بالکل خالی ہے۔ تمام بڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ شکریہ

خدا کرے میری ارض پاک پہ اترے وہ فصل گل جسے کبھی اندیشہ زوال نہ ہو

یہاں جو پھول کھلے کھلا رہے برسوں یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

نوشین فاطمہ... کراچی

گزر اس سال مجھے کیا دے گیا اور میں نے کیا کھو دیا۔ اگر اس سوال کو میں ذاتی حوالے سے دیکھوں تو مجموعی طور پر اس سال میں نے نہ کچھ کھویا (الحمد للہ) نہ کچھ پایا۔ باقی نرمی گرمی، سرد گرم، خوشی و غم تو زندگی کے وہ رنگ ہیں جن کے بغیر زندگی مکمل نہیں۔ الحمد للہ اس پر آشوب دور میں یہ سال بخیریت گزر گیا۔ خصوصاً "بے درپے ڈاکوں کے بعد تو یہ بھی میرے لیے خوشی کا مقام ہے کہ اس سال پورا گھرانہ ڈیپٹی سے محفوظ رہا۔ یہ تو بات تھی ذاتی حوالے سے۔ جبکہ اگر اجتماعی حوالے سے بات کروں تو ملکی حالات ہماری انفرادی زندگیوں پر حاوی رہے۔ ہر دم ایک خوف کی کیفیت رہی۔ بالخصوص کراچی میں تو ہر دم جان جانے کا دھڑکار رہا۔

خوف، ہراس، بارود، موت کا خوف محسن

نہ پوچھ کتنی اذیتوں میں یہ سال گزرا جب تک گھر کے تمام افراد گھر بخیریت نہ پہنچ جائیں، جان سولی پر منگی رہتی ہے۔ باہر نکلنے پر ہر دم یہ

خوف دامن گیر رہتا ہے کہ نہ جانے کب کوئی دھماکا ہو جائے۔

بلدیہ ٹاؤن کے الٹا ساخانے نے تو حقیقتاً "دل دہلا دیا۔ اس قدر اذیت ناک موت کہ قیامت کی آگ کا منظر نگاہوں کے سامنے آگیا۔ انسانوں کی انتہائی بے بسی کے عالم میں اس قدر اذیت ناک حالات میں موت کہ رو نکلنے کھڑے ہو گئے۔ یونیورسٹی پر گستاخانہ فلم کے خلاف احتجاج کے دوران مشتعل عوام نے اپنی ہی قوم کے مسلمانوں کو لوٹ کر اور املاک کو نقصان پہنچا کر عالمی میڈیا کے سامنے اپنے وحشی ہونے پر مرثبت کر دی۔ اس کے علاوہ بھی اگر اجتماعی حوالے سے گزرے سال پر نظر دوڑاؤں تو کوئی خوش گوار یاد دل پر دستک نہیں دیتی۔

پاکستان وہ ملک ہے جہاں چاروں موسم رنگ بکھیرتے ہیں۔ نعمتوں کی ریل پیل ہے۔ قدرت کی تمام نعمتیں وافر مقدار میں موجود ہیں، لیکن ہم آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ملک کے امن کو تباہ کر رہے ہیں۔ کاش! ہم آنے والی نسلوں کو ایسا پاکستان دیں جو امن کا گوارہ ہو، جہاں غربت، بھوک و افلاس کی جگہ خوش حالی، بد امنی کی جگہ امن و سکون ہو، تعلیم و صحت کی بنیادی سہولیات سب کو میسر ہوں۔ نئی منزلیں کھونے کے لیے روشن راہیں قوم کے معماروں کے لیے کھلی ہوں۔

اللہ کرے نئے سال کا سورج آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو، معاشرے پر چھائی خوف و ہراس کی پرچھائیں چھٹ جائیں۔ (آمین)





ٹی وی فنکار اور میزبان

صنم بلوچ سے ملاقات

شہناز رشید

کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ صلاحیتوں سے مالا مال پیدا کرتا ہے۔ شوبز میں اگر دکھا جائے تو ہر شعبے میں نام پیدا کرنے والی شخصیات چند ہی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی اداکار ہے تو اداکار ہی ہے اور اگر کوئی ہوسٹ ہے تو پھر وہ ہوسٹ ہی ہے مگر صنم بلوچ میں اداکاری، ہوسٹنگ اور ماڈلنگ کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مارننگ شو کرنا ایک مشکل کام ہے مگر صنم بلوچ کئی سالوں سے یہ کام بھی بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ صنم کاروگرام موضوع کے اعتبار سے بالکل تازہ ہوتا ہے۔ کوئی اچھی خبر ہو یا کوئی بری صنم کاروگرام

بروقت ہوتا ہے۔
”کیسی ہو صنم؟“
”بس آپ کی دعاؤں سے اچھی ہوں۔“
”تمہارا مارننگ شو تو بہت کامیاب جا رہا ہے۔“
”کیا ریسپانس مل رہا ہے؟“
”شکریہ۔۔۔ جی بہت اچھا ریسپانس مل رہا ہے۔“
لوگوں کی حوصلہ افزائی سے ہی یہاں تک پہنچی ہوں۔
”کچھ عرصہ قبل تم کسی اور چینل سے جہی پروگرام کرتی تھیں۔ پھر چھوڑ دیا کہ صبح اٹھنا مشکل لگتا ہے۔ اب کیا صورت حال ہے؟“

”جی بالکل! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے اس لیے چھوڑا تھا کہ واقعی مجھے صبح اٹھنا مشکل لگتا تھا۔ مگر یہ لوگوں کی محبت ہے کہ ان کے اصرار پر دوبارہ آئی ہوں۔ اور اب تو کافی ٹائم ہو گیا ہے مجھے پروگرام کرتے ہوئے۔“

”اب آسانی سے اٹھ جاتی ہو۔“

(ہنستے ہوئے)۔ ”جی بالکل۔۔۔ اب عادت ہو گئی ہے اور ویسے بھی اسکول کلج کے زمانے میں بھی تو صبح اٹھتے ہی تھے لہذا عادت تو تھی مگر آرام پرستی نے اس عادت کو خراب کر دیا۔ اب سب کچھ سیٹ ہے۔ اب کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔“

”مارننگ شو اداکاری، ماڈلنگ۔۔۔ تھکن کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ یا خوش حالی ساری تھکن دور کر دیتی ہے؟“

”بات تو آپ کی درست ہے کہ خوش حالی تھکن دور کر دیتی ہے۔ مگر تھکن تو تھکن ہی ہوتی ہے۔ ہر جسم کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا بھی دل آرام کرنے کو چاہتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اپنی تھکن اتارنے کا وقت مل جاتا ہے؟“

”تم نے مارننگ شو اس لیے بھی چھوڑا تھا کہ اداکاری کے لیے ٹائم نکالنا مشکل ہو رہا تھا اور اب ٹائم مل جاتا ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔ ہر ایک چیز کو ہر کام کو مینج کرنا سیکھ لیا ہے۔ اب سب کاموں کے لیے ٹائم نکالنا آسان ہو گیا ہے۔“

”تو پھر کم کم کیوں نظر آتی ہو؟“

”اداکاری تو میرا جنون ہے اور آپ کو پتا ہی ہے کہ میں کم کام کرتی ہوں، مگر کوشش کرتی ہوں کہ اچھا کام کروں میں سال میں دو یا تین سیریلز کرتی ہوں، کیونکہ میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ کام کرنے سے ایک تو لوگ بھی بور ہو جاتے ہیں اور پھر کام کا معیار بھی گر جاتا ہے۔ اس لیے کم کام کرو، مگر اچھا کرو۔ میری اب یہی پالیسی ہے۔“



”کن لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے اچھا لگتا ہے؟ میرا مطلب انٹریکٹر اور پروڈیو سر سے ہے؟“
”میں سب کے ساتھ کام کرنے میں ایزی فیل کرتی ہوں۔ کیونکہ ٹی وی اب میرے لیے گھر جیسا ہو گیا ہے بالکل فیملی ماحول ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ کام کرنے کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، بس لیے کوئی بھی سیریل سائن کرنے سے پہلے اسٹوری اور اپنا رول دیکھتی ہوں اور پھر ٹیم دیکھتی ہوں۔ اگر سب کچھ پرفیکٹ ہوتا ہے تو پھر اوکے کرتی ہوں۔ جو کام دل کو پسند ہو وہی کرنا چاہیے۔ کیونکہ پھر اسی کا اچھا رزلٹ بھی آتا ہے۔“

”صرف اپنا رول دیکھتی ہو یا سب کا؟“

”سب کا دیکھتی ہوں۔ کیونکہ جب تک مجھے کہانی اور اس کے کرداروں سے واقفیت نہیں ہوگی میں پرفارم کیسے کر سکوں گی۔ کہانی پڑھ کر دوسروں کے کرداروں کو پڑھ کر اور پھر اپنے کردار کو پڑھ کر کام کرتی ہوں۔“

”کردار کا مشاہدہ کس طرح کرتی ہو؟“

”ایسا کردار جو ذرا عام زندگی سے ہٹ کر ہو اس کا



مشاہدہ تو ان ہی لوگوں کے درمیان تھوڑا وقت گزار کر کرتی ہوں، لیکن جو کردار روزمرہ زندگی سے ملتا جلتا ہو اسے کرنے میں کوئی دشواری یا پریشانی نہیں ہوتی۔ ”

”تمہارے کردار بہت ہی معصومانہ اور دکھی لڑکی کے ہوتے ہیں۔ کیوں؟“

(بے ساختہ ہنستے ہوئے)۔ ”شاید میری شکل بہت معصوم ہے۔ بس مجھے کردار ہی ایسے ملتے ہیں اور مجھے خود بھی سنجیدہ اور دکھی رول کرنا اچھا لگتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس میں پرفارمنس کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ اور سچی بات ہے کہ میں بہت حساس دل کی مالک ہوں۔ اسی لیے سنجیدہ کرداروں کو پرفارم کرنے میں مجھے مشکل پیش نہیں آتی۔“

”لوگ کہتے ہیں کہ تم رونے کی اداکاری بالکل نیچل کرتی ہو؟“

”ہاں نا۔۔۔ نیچل ہی تو کرتی ہوں۔ میں کب کچھ آنکھوں میں ڈال کر روتی ہوں۔ مجھے تو سچ سچ رونا آ جاتا ہے کیونکہ میں اپنے کرداروں کو بہت گہرائی کے ساتھ آبرو کرتی ہوں۔“

”تمہیں کبھی چالاک، بہت ہی زیادہ فیشن ایبل لڑکی کا رول ملا؟“

”نہیں! ایسا رول ابھی تک تو نہیں ملا۔“

چالاک لڑکی کا کردار تو شاید کر لوں، لیکن اگر زیادہ فیشن ایبل لڑکی کا رول ملا تو شاید نہ کروں، کیونکہ میں اس فیلڈ میں ضرور ہوں۔ لیکن ہماری تربیت اس قسم کی نہیں ہے کہ ہم آپے سے باہر ہو جائیں۔ میں بھی اس فینلی سے تعلق رکھتی ہوں، جہاں شرم و حیا کی تربیت میری ماں نے دی ہے۔ میرے بھی بہن بھائی ہیں، بزرگ ہیں۔ سب کوئی وی دیکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی روایات کا بہت خیال رکھتی ہوں۔“

”ان لڑکیوں کے بارے میں کیا کہو گی جو اس قسم کے رول کرتی ہیں؟“

”میں کچھ بھی کہنا نہیں چاہوں گی، کیونکہ سب کی اپنی اپنی سوچ اور تربیت ہوتی ہے۔ جو جیسا کام کر رہا ہے اسے کرنے دیں۔ میرے خیال میں سب اپنے اپنے انداز میں بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔“

”ڈراموں میں فنکار کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے؟“

”جی بالکل ہوتا ہے۔۔۔ میں سنجیدہ طبیعت کی مالک ہوں تو سنجیدہ رول زیادہ بہتر طریقے سے کر لیتی ہوں۔ اگر بہت زیادہ شوخ و چنچل ہوتی تو رول بھی ویسے ہی کر رہی ہوتی، تو کہیں نہ کہیں تو عکس ہوتا ہی ہے انسان کی شخصیت کا۔“

”اور ڈراموں میں حقیقت کا رنگ ہوتا ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔ ڈراموں کی کہانیاں ہمارے ارد گرد کی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔ کیا آپ کو ان میں حقیقت کا رنگ نظر نہیں آتا؟ جو کچھ اس دنیا میں اس معاشرے میں ہو رہا ہے وہی ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے۔ رائٹر حضرات بھی تو اس معاشرے کا حصہ ہیں۔ وہ وہی کچھ لکھیں گے جو دیکھیں گے۔ ہاں یہ جنوں پریوں کی کہانیاں ہوتی ہیں جو حقیقت سے دور ہوتی ہیں۔“

”ڈراموں میں بہت زیادہ فینٹسی دکھائی جاتی ہے۔“

”نہیں! میں نہیں سمجھتی۔۔۔ آج کل تو کہانیاں اس معاشرے کی ہوتی ہیں جس میں ہم اور آپ

رہتے ہیں۔ جو ماحول آج کل کا ہے وہی دکھایا جا رہا ہے۔“

”آج کل کیا کیا انڈر پروڈکشن ہے؟“

”یہ مت پوچھیں۔۔۔ کیونکہ انڈر پروڈکشن کافی کام ہے، مگر کچھ بتا نہیں ہوتا کہ کون سا پروجیکٹ کب مکمل ہو جائے۔ اور کب آن ایر ہو جائے۔“

”اب تک کیے گئے ڈراموں میں کون سا بہت پسند ہے؟“

”مجھے تو اپنے سارے ہی ڈرامے بہت پسند ہیں۔ لیکن ”دام“ اور ”کیمسٹری“ کا تو جواب نہیں۔ دونوں

میں ہی میرے کردار بہت اچھے اور پاور فل تھے اور ناظرین نے بھی مجھے بہت پسند کیا۔“

”مارننگ شو میں دیکھتی ہوں، تم ہر جگہ آزادی سے چلی جاتی ہو۔ کوئی پریشانی یا ڈر نہیں لگتا کیا؟“

”ڈر یا پریشانی کیسی؟ یہ سب ہمارے ہی تو ہیں۔ ہم انسان ہیں تو یہ بھی انسان ہیں۔ یہ ہمیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہماری عزت کرتے ہیں۔ کیا یہ ہمارے لیے کم خوشی کی بات ہے۔ اور پھر میں اکیلی نہیں ہوتی پوری ٹیم ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔“

”کبھی کوئی مسئلہ ہوا؟“

”نہیں! اللہ کا شکر ہے، کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل تو ہوتے ہی رہتے ہیں جن کی ہم پرواہ نہیں کرتے۔“

”پہچان کبھی مسئلہ بنی؟“

”نہیں! کبھی نہیں۔۔۔ اور پہچان سب کے نصیب میں ہوتی کہاں ہے۔ میں تو اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ اللہ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھے دولت اور شہرت سے نوازا ہے۔“

”ایسی شہرت کے بارے میں کبھی سوچا تھا؟“

”نہیں جی! کبھی نہیں سوچا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تو شو بزم میں بھی آنے کا نہیں سوچا تھا۔ میں اپنی شہرت کو بہت انجوائے کر رہی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ شو بزم میں کیوں نہیں آنا چاہ رہی تھیں؟“

برطانیہ میں مقیم سات شہری مجموعوں کے خالق بھتیوں کے خوش نوا شاعر



سعود انجم

کے شاعر، ناول، مدح گیتوں کا تالار، مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

سعود انجم کی گیت نگاری میں ایک بڑا نام ہیں، انہوں نے گیت کے کینوس کو بڑی وسعت اور کشادگی عطا کی ہے، انہوں نے سرنگیت کے سوتوں سے گیت کی نئی دنیا میں تخلیق کی ہیں۔ افتخار عارف

گیتوں کی قدیمی روایت میں پوش نظر گیتوں کے دل کی دھڑکن اور معاشرتی شعور کا نرم و نازک اسلوب، سہجی راہی کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فخر حسین

بذریعہ ذاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

Idara-e-Adab London

63 - Hamilton Avenue Surbiton, Surrey, KT67PW. U.K.

Phone: 0044-0208-397-0974



تھا۔ اس دُراے کے بعد ہی بس میں تھی اور بے شمار آفرز۔ ہاں! جب ”کالک“ کیا تو اس وقت پڑھ رہی تھی اور پھر جیسے ہی پڑھائی ختم ہوئی بس پھر میں تھی اور یہ فیلڈ تھی۔“

”اچھا۔۔۔ واہ۔۔۔ فیلڈ سے ہٹ کر کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔“

”آپ پوچھیں گی تو بتاؤں گی۔ (تقمیم)۔۔۔ میں چودہ جولائی کو نواب شاہ شہر میں پیدا ہوئی۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں اور میں پانچویں نمبر پر ہوں۔ میں اور میری بہن ہی اس فیلڈ میں ہیں۔ باقی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”ہر وقت کام کام۔۔۔ پر سٹل لائف کے بارے میں کچھ سوچا؟“

”نہیں! یہ سوچنا والدین کا کام ہے اور جب وقت آئے گا تو سب کام خود بخود آسان ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے پتا چل جائے کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے، لیکن پھر سوچتی ہوں کہ اگر کچھ اچھا نہ لکھا ہوا ہو تو پھر باقی کی زندگی پتا نہیں کیسے گزرے گی۔“

”لوگ سوال تو کرتے ہوں گے؟“

”ہاں! کیوں نہیں کرتے۔ مگر فیوچر کس نے دیکھا ہے۔ اور میں بھی ایک لڑکی ہوں۔ یقیناً ”دو چار سال بعد میرا بھی ایک گھر ہوگا“ شوہر ہوگا“ سمجھتے ہوں گے۔ سسرال ہوگا“ پھر اس لائف کا بھی ایک علیحدہ ہی مزا ہو گا۔“

”ہر وقت بناؤ سنگھار سبنا سنو رٹا کیسا لگتا ہے؟“

”میں فطرتاً بہت سادہ طبیعت کی مالک ہوں۔ یہ بناؤ سنگھار میری مجبوری ہے۔ اس فیلڈ میں کیرے کے آگے مجھے میک اپ میں رہنا پڑتا ہے کیونکہ یہ کیرے کی ڈیمانڈ ہے۔ عام زندگی میں اگر آپ مجھے دیکھیں تو میں آپ کو سادہ ہی نظر آؤں گی۔“

”یوں تو ہر فیلڈ میں برائیاں ہوتی ہیں لیکن لوگ

اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیا شوہر کی برائیاں بھی نظر انداز کر دینے والی ہوتی ہیں؟“

”اگر انسان چاہے تو فیلڈ کیا اپنے گھر والوں کی عزت و اقارب کی دوستوں کی سب کی برائیاں اور خامیاں نظر انداز کر سکتا ہے۔ شوہر میں سب کچھ ٹھیک ہے، مگر یہاں لوگوں میں منافقت بہت ہے۔ آپ کے آگے کچھ ہوں گے اور آپ کی غیر موجودگی میں کچھ یہاں جب تک آپ ”ان“ ہیں سب آپ کے ہیں۔ جہاں غائب ہوئے تو ”آنکھ او کھل نہاڑاؤ جھل“ والی بات ہو جاتی ہے۔“

”لوگ تعریف کرتے ہیں یا تنقید۔۔۔“

”سچ بتاؤں۔۔۔ بہت تعریف کرتے ہیں۔ کبھی تنقید نہیں سنی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے کام پر تنقید بھی ہو تاکہ میں اور بہتر سے بہتر کر سکوں، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ لوگ ملتے ہیں تو نہ صرف میرے کام کی تعریف کرتے ہیں بلکہ بے ساختہ کہتے ہیں ”آپ تو اسکرین پر بہت بڑی نظر آتی ہیں۔ دیکھنے میں تو بہت چھوٹی ہیں۔“

”گھر میں ہوتی ہو تو سب سے زیادہ کس کو ٹائم دیتی ہو؟“

”اپنی امی کو۔۔۔ کیونکہ امی کے پاس بیٹھنے کا بہت کم وقت ملتا ہے۔ اس لیے جب بھی گھر میں ہوتی ہوں۔ امی کے ساتھ گپیں مارتی ہوں اور امی کے ہاتھ کا پکا ہوا ہی کھاتی ہوں، بلکہ فرمائش کر کے پکواتی ہوں۔“

”فصل خیرج ہو؟“

”بہت زیادہ اور اس بات پر امی سے ہمیشہ ڈانٹ پڑتی ہے کہ تم فصلوں چیزوں پر زیادہ پیسہ خرچ کرتی ہو۔ مگر کیا کروں جو چیزیں آجاتی ہیں اسے خریدے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”وہ صنم بلوچ جو کسی زمانے میں گھر میں رہتی تھی اور طالبہ تھی اور اب کی صنم بلوچ جو ایک پہچان رکھتی ہے اس میں اور پہلے والی میں کیا فرق ہے؟“

”فرق تو کافی ہے۔ پہلے کوئی جانتا نہیں تھا مجھے۔۔۔

اب سب جانتے ہیں۔ پہلے میں اتنی بولڈ نہیں تھی۔ اب میں کافی بولڈ ہو گئی ہوں۔ پہلے امی کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتی تھی۔ اب ان کی ہر بات کو گہرے سے باندھ لیتی ہوں۔ پہلے تھوڑی ضدی طبیعت کی تھی اب نہیں ہوں۔ پہلے دل چاہتا تھا کہ میں اگر کسی سے ناراض ہوں تو وہ مجھے منائے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ تو کسی بھی فیلڈ میں رہ کر انسان وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ سیکھتا ہے اور میں تو جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں سیکھ ہی رہی ہوں۔“

”اور پہلے غصہ زیادہ آتا ہو گا۔ اب کام آتا ہے۔“

(تقمیم)۔۔۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟ واقعی ایسا ہی ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ آج بھی کوئی جھوٹ بولے اور غلط بیانی سے کام لے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ غصہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ غصہ ابھی بھی آتا ہے، مگر جائز باتوں پر۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے صنم بلوچ سے اجازت چاہی۔



خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

ح

نادرہ خاتون

قیمت۔۔۔ 550/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔



خط بھجوانے کے لیے پتہ:
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@shuaaonline.com
shuaaonline@yahoo.com

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں

آپ سب کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمارے پیارے وطن کو اور امت مسلمہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وطن عزیز کا برا چاہنے والوں کو ان کے ارادوں میں ناکام کر دے۔ آمین۔

پہلا خط کوٹ مٹھن سے رمضہ خالد خان کا ہے ہماری مصطفین میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔ لکھتی ہیں۔

کراچی کے حالات کے بارے میں پل پل ٹی وی پر جو خبریں نشر ہوتی ہیں انہیں سن سن کر دل خون کے آنسو پڑتا ہے، روشنیوں کے شہر میں یہ کیسا اندھیر چھا ہے نہ قتل ہونے والے کو خبر کہ وہ کس کے ہاتھوں کس جرم کی سزا پا رہا ہے اور نہ قاتل کو پتا وہ کسے اور کیوں مار رہا ہے۔ یہ آثار قیامت نہیں تو اور کیا ہے ویسے تو پورے ملک میں ہی قہر پرا ہے اور ہم عوام بے بس ہیں مگر کیا واقعی؟

ادھر ہمارے ہاں موسم ان دنوں بہت اچھا ہے، بستر کب کے کھلے آنگن سے برآمدے اور اب کمروں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ پنکھا چلانے کی نوبت شاذ ہی آتی ہے۔ چونکہ جوائنٹ فیمیلی سسٹم ہے مگر پورشن سب کے الگ ہیں، رات کو فرصت سے تین چار گز زمل بیٹھتی ہیں بات سیاست سے چلتی ہے اور پھر در در تک جاتی ہے رات گئے جب ہر طرف خاموشی بکھری ہوتی ہے، ہلکی ہلکی خنکی اور اس میں گھبراہٹ کا رانی کا امک، خصوصاً چاندنی راتوں

میں جب جامن کے پتوں سے پھسل پھسل کر چاندنی سارے آنگن میں چٹکی ہوتی ہے، ایسے میں تنہا چائے کا کپ لے کر ستون سے ٹیک لگائے ماحول کے فسون کو اپنے اندر اتارنا، میں بتائیں سکتی، کتنا لطف دیتا ہے مگر یہ مزے بھی بس چند ہفتوں کے ہیں اس کے بعد رات گئے صحن میں دھند کا راج ہو گا۔

ایسے میں موٹی رضائی میں گھس کر کتابیں پڑھنا اور کافی کے سپ لینا مگر یہ کافی بنانے کے لیے پچن تک جانا بڑا جان جوٹھوں کا کام ہوتا ہے، وجہ سردی نہیں میری ازلی آنکسی، بھئی اب گرم بستر چھوڑ کر کون جائے۔ ہاں جب سردیوں میں لائٹ جاتی ہے اور بیٹر کے راؤ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں ایسے میں امی انگلیٹھی میں کوئلے دھکالاتی ہیں تب سب کمرے کے بیچ انگلیٹھی کے گرد گھیر ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں، دیکھتے کوئلوں کا عکس چروں کو گھنار کیے دیتا ہے۔ عبداللہ موبائل پر اچھا سا سونگ لگا دیتا ہے پھر ٹھک ٹھک کر آواز سے مونگ پھلیاں کھلتی ہیں گرم گرم چائے ساتھ میں کبھی گاجر اور کبھی چنے کی دال کا کھوپرے والا حلوہ ماحول کا لطف دوبالا کر دیتا ہے، ان سب کی ملی جلی منک حواسوں پر سوار ہونے لگتی ہے۔ دل کرتا ہے زندگی کو ان ہی خوشگوار پلوں میں قید کر لوں مگر۔۔۔ یہ زندگی ہے۔

بس مونگ پھلی کے چھلکے سے کسی ایک پر ذروں حملہ کرنے کی دیر ہوتی ہے اور جنگ عظیم موسم شروع۔ ہاتھ میں عموماً کتاب ہوتی ہے، ساتھ ساتھ نظریں نی دی پر بھی بھٹکتی رہتی ہیں، لکھنے کا موڈ ہو تو ذرا قلم بھی چل جاتا ہے، ایسے میں میرا چائے کا پھر سے موڈ بنے تو اسٹیل

کے برتن میں سارے اجزا ڈال کر انگلیٹھی پر رکھ دیتی ہوں، بجتے بجتے چائے آخر بن ہی جاتی ہے، مل شکر کی کھانے کو دل چاہے تب بھی نور ابلم، چینی، پانی اور تل کوئلوں پر اور کتاب کے کچھ صفحے پلٹنے کے بعد گرم گرم تل شکر کی تیار۔ بھئی، میری سرد راتیں تو ایسے ہی گزرتی ہیں، اس بار بھی ایسے گزارنے کا ارادہ ہے، آج کل وزن کم کرنے پہ کوشاں ہوں آخر کو سردیوں میں حلوے کھا کھا کر موٹا جو ہونا ہے اس لیے بہتر ہے ابھی سے کچھ کم کر لوں، آگے منظور خدا، ایسے کیا کراچی میں بھی ایسی سردیاں ہوتی ہیں؟ سرد راتوں میں اکثر جب رات گئے اپنے کمرے میں سوئے جاتی ہوں تو ٹھنڈا بستر جب تک وندو کی حرارت سے گرم نہیں ہوتا تب تک شہر کے کھلے میدان میں خیمہ زن خانہ بدوشوں کا ناکافی ساز و سامان کے ساتھ کھلے آسمان تلے کپڑے کی چار دیواری اور خیمہ میں موسم کی شدت کا مقابلہ کرنے کا احساس ستاتا ہے، پھر جوں جوں بستر گرم ہوتا ہے غینہ آکر ہر احساس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

پاری رمضہ! نادیدہ کا یقین غلط نہیں تھا اگر ہمارے پاس آپ کا فون نمبر ہوتا تو ضرور پوچھتے کہ آپ کیوں نہیں لکھ رہیں۔ ”حوا“ اس ماہ شامل اشاعت ہے کراچی کے بارے میں کیا کہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ احساس زیاں بھی جاتا رہا۔ کراچی کے باسی ان حالات کو قبول کر چکے ہیں۔ عادی ہو گئے ہیں یا بے حس کہ کہیں سے بھی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ کراچی میں ایسی نہ دے۔ سردی ہوتی ہی نہیں ہے۔ اگر

کوئٹہ میں برف باری ہو جائے تو ایک دو دن کے لیے سردی کی لہر آجاتی ہے۔ ورنہ۔۔۔

کراچی کو غریب پرور شہر ہی لیے تو کہا جاتا ہے جگیوں میں فٹ پاتھ پر راتیں آسانی سے گزر جاتی ہیں۔

مصباح مسکان رؤف اور امینہ رؤف نے جہلم سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

سب سے پہلے جس کمائی نے لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے داؤن اینڈ اوٹی ”جنت کے پتے“ ہم ہر قسط پڑھنے کے بعد قلم اٹھاتے اور پھر رکھ دیتے کہ تبصرہ آخر کے لیے رکھنا ہے مگر اس قسط نے قلم اٹھانے اور لکھنے پر مجبور کر دیا کیونکہ اس بار کا انکشاف تو بہت ہی چونکا دینے والا تھا کہ میرا احمد + ڈولی +

باشا = جہان۔ قسم سے ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ”ستارہ شام“ بھی اچھی جا رہی ہے۔ باقی سب کی طرح ہمیں بھی یہی لگے ہے کہ ستارہ شام کے صفحات بہت کم ہوتے ہیں پورا ماہ انتظار کر کے پانچ منٹ میں قسط ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہی انتظار۔ انتظار اور انتظار۔ شعاع کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہر نئے لکھنے والے کو موقع ملتا ہے۔ ہر بار فہرست میں نئے نام دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مسکان اور امینہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں، آپ شعاع کے ہر سلسلے میں شرکت کر سکتی ہیں۔ شعاع کے صفحات حاضر ہیں۔ شرط صرف ایک ہے اچھا اور نیا انتخاب بھجوائیں۔

عاتکہ یا سمین نے منڈی بہاؤ الدین سے لکھا ہے خط لکھنے کے بارے میں سوچ تو نمبر احمد کا ناول (جنت کے پتے) پڑھ کر آئی لیکن سوچ کی تکمیل فاترہ جی نے کروائی واہ شان دار۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے دلچسپ کمائی کہیں نہیں پڑھی۔

پاری عاتکہ! آپ کا یقین غلط ثابت ہوا اور ہم نے آپ کا خط ردی میں نہیں ڈالا۔ فاترہ اور نمبر تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ لیکن صرف دو کمائیوں پر تبصرہ۔۔۔؟ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

اقصی بتول۔ نیالاہور سے لکھتی ہیں

رسالہ ہاتھ میں آتے ہی سرورق پر نظر دوڑائی۔ کیا کمال انداز اور رنگوں کے امتزاج سے موسم کا احساس دلایا جا رہا تھا۔ پھر دوڑ لگائی نمبر جی کی طرف۔ نمبر کے ناول کا تجزیہ کرنا

کچھ مشکل ہے کہ شاید اس کا حق ادا نہ ہو سکے۔ بہت سارے رنگوں سے مل کر نیا یہ ناول ہمیں بے حد پسند ہے۔ میں نے اس ناول سے بہت کچھ سیکھا ہے شکریہ۔ پھر عالیہ جی کی طرف رخ موڑا۔ دیوار شب کو پڑھتے ہوئے عجیب سی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور وہ پمفلٹ کا خراب ہو جانا ٹیبل جیسے مکروہ لوگوں کے منہ پر قدرت کی طرف سے طمانچہ تو پڑنا ہی تھا اور مجھے سو فیصد یقین ہے، ربیعہ اور خیام کی شادی ہی ہوگی۔ افسانوں میں نمبروں رہا ڈی والی جونی ساہہ رضا بہت اچھی جگہ بنا رہی ہیں ”ایک راستہ ہے

زندگی روایتی گھریلو جھگڑوں پر مشتمل تھی مگر اچھی تھی۔ توازن ہر چیز کے لیے ضروری ہوتا ہے ”اک نئی سنڈریلا“ بہت اچھا اختتام رہا۔ آغاز بھی اچھا رہا اور انجام بھی۔ فائزہ جی کو مبارکباد ”چوکھٹ کے پار“ سبق آموز تحریر تھی۔ ایک بھیا تک غلطی کے بعد مہر نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ درآید درست آید ”تجھ یہ دل ہارا“ مزے کی تھی مگر کیا ہی اچھا ہو جو ایسے اتفاقات کبھی حقیقت میں بھی ہو جایا کریں۔ ”ستارہ شام“ سلور فائر سے بڑھ رہا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بھی قیاس قبل از وقت ہے جنت بیگم کی تلملہا بہت مزہ دے گئی۔ اس بار کا بہترین ناول ”نوٹ نوٹ“ تھا۔ عنیزہ سید کی تحریر ہو اور بہترین نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عنیزہ سید کی تحریروں سے ان کی شخصیت جھلکتی ہے بے حد سنجیدگی ہوئی، سب سے سنجیدہ اور درد دل رکھنے والی انسان ہیں۔ لفظوں کا چناؤ اس قدر عمدہ ہوتا ہے کہ قاری کرداروں کا ہر احساس خود پہ محسوس کرتا ہے۔ نظم اور غزل میں صابرو سیم اور ام شامہ نمبر لے گئیں۔ سحرش یوسف کی شاعری کا انتخاب بے حد پسند آیا۔ یہ بتادیں۔ کیا نمبر احمد شادی شدہ ہیں؟

پیاری انصی! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ عالیہ بخاری کے ناول کے بارے میں آپ کا قیاس کس حد تک درست ہے۔ یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ قارئین کی اکثریت کی یہ خواہش ہے کہ ربیعہ کی شادی خیام سے ہی ہو۔ راشدہ رفعت کی کہانی جیسے اتفاقات حقیقی زندگی میں عام طور پر تو نہیں ہوتے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

نمرہ احمد شادی شدہ ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ نئی زندگی کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

فوزیہ منظور نے کہروڑ پکا سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں سلسلے وار ناولز میں سب سے پہلے ”جنت کے پتے“ دس ماہ پہلے جب میں نے اس ناول کا نام پڑھا تھا بے اختیار سیدھی ہو کے بیٹھی تھی۔ نام ہی اتنا چونکا دے والا تھا۔ ہنسی قسط سے اب تک میں اس ناول کے سحر سے نکل ہی نہیں پا رہی ہوں یقین کرو نمرہ! میری زندگی کے بہت سے معاملات بہت سے الجھاؤ جو واقعی جالے کی طرح میرے

دماغ سے چپکے ہوئے تھے۔ ایک دم صاف ہوئے۔ بہت سا ایمان بڑھا۔ اس ذات پر یقین بے تحاشا بڑھتا ہوا اور اس رب سے تعلق کی ذور اور مضبوط ہوئی اور آپ کے لیے تمہ دل سے دعائیں نکلیں۔ الفاظ میں طاقت اور اثر تب آتا ہے جب انسان خود باعمل ہو آپ کے شرعی پردہ کرنے کے بارے میں جان کر بہت فخر ہوا۔

اس کے بعد آمنہ ریاض کا ناول ”ستارہ شام“ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ کہانی اب نیا رخ لے رہی ہے۔ آپ کو بیٹی کی دھیر ساری مبارکباد قبول ہو۔ اس کے بعد فائزہ افتخار کا ناول ”سنڈریلا“ اتنی شاندار کہانی اتنا ہی شاندار اختتام رہا۔ عالیہ بخاری کے ناول میں کردار چاہے ”ثانی ستارہ کا ہو یا سالار کا“ چاہے جو یا ہو یا اسلام صاحب ”یہ سب کردار اتنے وسیع النظر اتنے اعلا طرف ہیں ان سب کو بڑھتے ہوئے میرے ذہن میں صرف یہ بات آتی ہے کہ ایسے کردار ایسے ہی تخلیق نہیں ہو جاتے جب تک ان کرداروں کو تخلیق کرنے والا خود اتنا اعلا طرف اور باوقار نہ ہو۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔

عنیزہ سید کا ”نوٹ“ پڑھا۔ عنیزہ سید اور نمرہ دلوں ہی ہر مرتبہ اتنے مختلف انداز میں سامنے آتی ہیں کہ اندازہ کرنا مشکل ہو جائے کہ کچھ لکھنا زیادہ پر اثر تھا یا اب والا۔ آپ کا مطالعہ اتنا وسیع ہے مجھے لگتا ہے آپ کا قلم لفظ منتخب کرنے کے لیے نہیں رکنا ہو گا بلکہ یہ سوچ کر رکنا ہو گا کہ ”اس خیال کو لکھوں یا نہ لکھوں پتا نہیں قارئین سمجھ بھی پائیں گی یا نہیں“ سائرہ رضا کو پڑھا ”ان کا ہر افسانہ ہی اپنے اندر اتنے معنی“ اتنی گہرائی لیے ہوتا ہے کہ دل بے اختیار اثر لیتا ہے۔

”شہزادی عباس“ عباس کا ناول تو ایک دم ڈرا گیا۔ کہانی میں منظر کشی اور الفاظ کا چناؤ سب شاندار تھا۔ فرح طاہر کی سبق آموز کہانی پڑھ کر ظاہری سی بات

ہے اچھا لگا، راشدہ رفعت کا ناول ”تجھ یہ دل ہارا“ پڑھ کر سچ سچ دل ہارا تھا۔ اتنی مزاحیہ کہانی تھی یقین کریں نجانے کتنے عرصے بعد میں کھل کر ہنسی ہوں۔

پیاری فوزیہ! تفصیلی تبصرہ اچھا لگا، آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرنی رہیں گی۔

رابعہ تبسم نے گگو منڈی سے لکھا ہے

دسمبر کا شعلع ملا تو چھلانگ لگا کر پہنچے۔ سیدھا ”جنت کے پتے“ ناول تک ایسا شاہکار ناول مدتوں بھلایا نہیں جا سکتا۔ مجموعی طور پر دسمبر کا پورا شمارہ ہی بہترین تھا۔ ”دیوار شب“ اور ”ستارہ شام“ بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ سنڈریلا کا اختتام اچھا لگا۔ لیکن زینی کا کیا بنا فائزہ جی؟ نوٹ نوٹ اپنے نام کی طرح منفرد اور اچھا ناول تھا۔ چوکھٹ کے پار شہزادی عباس کی بہترین کاوش تھی۔ افسانے سارے ہی پسند آئے۔

پیاری رابعہ! شعلع کی بزم میں خوش آمدید۔ فائزہ کے ناول میں زینی کا کچھ نہیں بنانا خالی ہاتھ واپس لوٹ گیا زینی کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔

شعلع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد اور دوسری مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

روزینہ حسین شاہ پشاور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

پیشے کے لحاظ سے ایک ہو میو پیٹھک ڈاکٹر ہوں، خواتین اور شعلع کی قاری کب سے ہوں یاد نہیں ہے۔ اللہ نے تیسری بار حج کی سعادت نصیب فرمائی ہے۔ اس کا کرم ہے۔ حج سے آکر دل نے سب سے پہلے جس چیز کی طلب کی۔ وہ شعلع اور خواتین تھے۔

شمارہ ماہ دسمبر ”باتوں سے خوشبو آئے“ قوم عاد کا عذاب پیرا گراف نمبر 3 لائن نمبر 12 حضرت ہود علیہ السلام کی جگہ پر عاد علیہ السلام پر نازل ہوا ہے۔ عاد تو وہ قوم ہے جس پر اللہ نے عذاب نازل کیا تھا اور ہم اس کے ساتھ علیہ السلام لکھ رہے ہیں گو کہ یہ جان بوجھ کر نہیں ہے مگر احتیاط برتیں۔ ”جنت کے پتے“ بہت خوب صورت تحریر ہے اللہ تعالیٰ نمرہ احمد کو جزا دے۔

پیاری روزینہ! بہت شکریہ! آپ نے غلطی کی نشان دہی

کی۔ ”سوا“ ہود کی جگہ عاد لکھا گیا ہے اس کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے اور قارئین معافی کے خواست گار ہیں۔ قوم عاد کے کھنڈرات کہاں واقع ہیں۔ اس کی تفصیل تاریخ کے سلسلے میں دیں گے۔

شبانہ عابد نے بھاول پور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

آپ کا ڈائجسٹ میں تب سے پڑھ رہی ہوں جب میں نے لفظوں سے نیا نیا رشتہ جوڑا تھا اور آج میں ماشاء اللہ سے بی اے کر رہی ہوں حالانکہ میرا پورا خاندان میرے پڑھنے کے خلاف ہے وہ سمجھتے ہیں ڈائجسٹ پڑھنا وقت کا ضیاع ہے اور کچھ نہیں مگر میں سمجھتی ہوں۔ آج مجھے یہ جو شعور اور آگہی ملی ہے وہ شعلع، خواتین، کرن سے ہی ہے۔ اس ماہ کا ناول خوب صورت تھا۔ خاص طور پر ناول کا ڈریس اور ریڈ لپ اسٹک۔ پہلی شعلع پڑھی جو واقعی پہلی شعلع ہوتی ہے۔

”جنت کے پتے“ واہ جی پوچھیں تو میرے پاس وہ لفظ ہی نہیں جس سے میں تعریف کروں سلسلے وار ناولز دونوں ٹھیک جا رہے ہیں ”اک نئی سنڈریلا“ کا اختتام اچھا لگا۔ اتنا اچھا ناول دیکھنے پر فائزہ آپی کو مبارکباد۔ افسانوں میں ’اڈی والی جونی‘ اور ’بد دعا پسند آئے‘ ایک ہی راستہ ”اور سوچ کا در بھی ٹھیک تھے پلیز آپی عمیرہ احمد اور فرحت اشتیاق سے کہیں کہ وہ بھی اب شعلع کے لیے لکھیں۔

پیاری شانہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے والد آپ کی خاندانی روایت کے برعکس آپ کو تعلیم دلا رہے ہیں اور انہوں نے ڈائجسٹ پڑھنے پر نہ صرف یہ کہ کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ ہر ماہ خود لا کر دیتے ہیں۔

میمونہ اختر ولد محمد اسلم نے سکندر آباد (ضلع میانوالی) سے لکھا ہے

دسمبر 2012ء کا شعلع ہمیشہ ہر ماہ کی طرح بیسٹ تھا ”سنڈریلا“ فائزہ افتخار کا ناول بہت اچھا تھا۔ آمنہ ریاض سے بھی کہیں کہ وہ اپنے ناول کو اختتام پذیر کریں اور باقی سارے ناول اور ناولٹ اچھے تھے میں میٹرک کی طالب علم ہوں اور ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں میرے لیے سب سے دعا کرنے کو ضرور کہیے گا۔

پیاری میمونہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اتنے عرصہ سے شعلع کی قارئین میں شامل ہیں اور اب خود خرید کر پڑھتی ہیں۔ آپ کا پہلا خط ہمیں موصول نہیں ہوا ورنہ جواب ضرور دیتے۔ شعلع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

قارئین تک آپ کی دعا کی درخواست پہنچا رہے ہیں اور ہم بھی آپ کی کامیابی کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔

ارم کمال نے فیصل آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں سب سے پہلے نئے سال کی بہت بہت مبارکباد خدا کرے نیا سال ہم سب کے لیے ذاتی اور اجتماعی حوالے سے بہت بابرکت ثابت ہو (آمین) شادی سے پہلے بھی ارم ٹائیڈ کے نام سے مستقل سلسلوں میں شرکت کرتی تھی اور اب شادی کے کافی سال بعد دوبارہ قلم سے ناثہ جوڑا ہے۔

ٹائٹل بہت خوب صورت رنگوں سے مزین تھا۔ سب سے پہلے پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں۔ بندھن میں فضا عابد سے ملاقات نے مزادویلا کر دیا ”دیوار شب“ عالیہ بخاری کی لازوال اور اثر انگیز تحریر ہے میرے دل کی ساری دعائیں جو یا کے ساتھ ہیں۔ اس کے علاوہ ”اڈی والی جوتی“ اور ”بد دعا“ پراثر تحریریں تھیں۔ راشدہ رفعت کا ناولٹ ”مجھے دل ہمارا“ اسے دن تحریر تھی۔ لیکن ذرا ہٹ کر تھی ایسا اکثر ہوتا نہیں ہے دونوں کا ایک مزاج کا ملتا عنیزہ سید کا ناول ”ٹوٹ ٹوٹ ٹوٹ“ بہت زبردست مگر الجھی ہوئی تحریر تھی۔ کئی باتیں غور طلب تھیں میں نے ایسا پرندہ نہیں دیکھا نہ سنا۔ یہ کہاں پایا جاتا ہے۔ ”چوکھٹ کے پار“ بے حد سبق آموز تحریر تھی ”اک راستہ ہے زندگی“ میں الجھے اور میٹرھے راستوں پر چلتے چلتے نادیدہ نے بالا خر صبح راستہ ڈھونڈ ہی لیا۔

پیاری ارم! عنیزہ سید نے جس علاقہ کا کہانی میں ذکر کیا ہے وہ پرندہ اسی علاقے میں پایا جاتا ہو گا لیکن کہانی میں کسی مخصوص پرندے کی اہمیت واضح کرنا مقصد نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ انسان کس طرح اپنے حالات کے تحت یا کسی ذہنی کیفیت کے زیر اثر یا بے جان چیز سے توہمات وابستہ کر لیتا ہے۔ کہانی کا مقصد یہ تھا کہ ایک لڑکی جو بیوہ ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے فطری جذبات و احساسات سے بھی محروم ہو گئی ہے۔ اسے نئی زندگی شروع کرنے کا حق دینا چاہیے۔

نٹو محمد خان سے عائشہ نے لکھا ہے

آج سمجھ نہیں میں آ رہا کہ کیا لکھوں۔ ان دو مہینوں

کے درمیان ہم پر قیامت گزر گئی۔ میری بہن ندا جس کی شادی کو صرف 9 مہینے ہی ہوئے تھے۔ اس کے شوہر اچانک دماغ کی نس پھٹ جانے سے انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 26 سال تھی۔

ان کے انتقال کے صرف 13 دن بعد اس کی بیٹی زینب پیدا ہوئی۔ باجی ہم پر تو قیامت ہی گزر گئی۔ میری بہن ندا ہر وقت اپنے شوہر کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔ پیاری عائشہ! آپ کی بہن پر جو سانحہ گزرا، وہ واقعی بہت آئناک ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بہن کے لیے زندگی میں آسانیاں پیدا کرے اور وہ بچی جو پیدائش سے پہلے یتیم ہو گئی اس کے نصیب میں ڈھیر ساری خوشیاں ہوں۔

کھوسکی سے صبار لٹو نے لکھا ہے

سب سے پہلے ”پہلی شعاع“ بڑھی جو واقعی شعاع ہے چھوٹی بات پر گہری بات اور پراثر۔ ”جنت کے پتے“ بہت زبردست ناول ہے۔ لیکن اس ماہ قسط پڑھ کر تو شاگ لگ گیا کہ احمد پاشا ڈولی سب کچھ ایک جہاں ہی ہے۔ عالیہ جی اب جلدی سے معاذ کو جو یا سے اور خیام کو اپنے والد سے ملوادیں۔ ”ستارہ شام“ میں کبھی کبھی ماوی کا کردار عجیب سا لگتا ہے اور کبھی بہت پاور فل۔ خیر کہانی بہترین ہے۔ فائزہ جی نے بھی دل خوش کر دیا۔ معصوم شرارتی اور خواہشوں میں ڈوبی میثا کا کردار بہت پسند آیا۔ اس ماہ کے شمارے میں ”ٹوٹ ٹوٹ بہت پسند آیا۔ افسانوں میں ”اڈی والی جوتی“ نمبر لے گیا۔ باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔ یہ ہماری پرانی رائیٹرز ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔ عمیرہ احمد رخصانہ نگار، مریم عزیز، ماہا ملک، راحت جبین، سعدیہ رئیس، پلیز واپس آجائیں۔ اور اس ماہ عقیفہ خیام کا خط بھی بڑا پسند آیا ”رحمانیہ منزل“ محبتوں سے لبریز۔

پیاری صبا! ہم بھی اپنی رائیٹرز کے شدت سے منتظر ہیں۔ آپ کا پیغام ان تک پہنچا رہے ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

جویریہ تبسم لکھتی ہیں

”جنت کے پتے“ بہت اچھی کہانی ہے۔ ”بد دعا“ افسانہ بھی اچھا تھا۔ میثا کو فائزہ نے ٹھیک ٹھکانے پر لگایا۔ میں نے پچھلے مہینے ایک افسانہ ”دنیاوی ابلیس“ بھیجا تھا۔

پیاری جویریہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانی کے لیے معذرت سنی الحال آپ صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔

ربیعہ ابرار نے لکھا ہے۔

اس خط کے توسط میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہ رہی ہوں کہ UMS کے بجائے کیا ہم اپنی تحریر کو برسرے بھیج سکتے ہیں اور قسط دار کہانی کے لیے ایک ایک کر کے قسط بھیج جائے یا تمام اقساط یک مشت۔ ویسے میں نے رسالے میں کبھی ”اشاعت سے معذرت“ والا صفحہ بھی نہیں دیکھا تو کیا مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جانا چاہیے کہ آپ کو بھیجی گئی ہر تحریر رسالے میں جگہ پالیتی ہے بصورت دیگر ہمیں بتائیے چلے گا کہ ہماری تحریر مسترد کردی گئی یا اپنی باری کا انتظار کر رہی ہے۔

ربیعہ کہانی بھوانے کا طریق کار ہم متعدد بار بتا چکے ہیں۔ بڑی حیرانی ہوتی ہے جب یہ سوال بار بار دہرایا جاتا ہے۔ کہانی آپ کو برسرے بھی بھیجوا سکتی ہیں۔ طریق کار یہ ہے لفافے میں کہانی ڈالیں اور اس پر ایڈریس لکھیں۔

خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔ اور پوسٹ کریں۔

پوری کہانی مکمل کر کے بھجوائیں۔ قسطیں نہیں، اشاعت سے معذرت والا صفحہ پرچہ میں اس لیے شامل نہیں کرتے کہ اگر کسی کی کہانی ناقابل اشاعت ٹہرے تو اسے اپنے دوست احباب کے سامنے خفت نہ اٹھانی پڑے۔

کہانی کے بارے میں آپ فون کر کے بتا کر سکتی ہیں۔ نمبر یہ ہے 32721666 یہ کراچی کا نمبر ہے۔ اگر کسی دوسرے شہر سے فون کر رہی ہیں تو کوڈ 021 لگائیں۔

اقرا، عروج، سعدیہ، عائشہ، منال اور خدیجہ نے فتح پور ضلع لیہ سے لکھا ہے۔

ماڈل اتنی پیاری لگ رہی تھی معصوم سی۔ زیور سے پاک واہ۔ نمبرہ احمد کا ناول زبردست ہے بھئی۔ ہائے سنڈریلا ختم بھی ہو گئی۔ اتنی جلدی فائزہ جی۔ اتنی جلدی میثا کی معصوم باتیں ختم کریں۔ ”ستارہ شام“ ٹھیک ہی تھا۔ دیوار شب میں اب مزا آ رہا ہے۔ ٹوٹ

نوٹ اتنا خاص نہیں لگا۔ ”مجھے پر دل ہمارا“ راشدہ رفعت کا عجیب سا ناولٹ تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہو جائے وہ بھی

شادی کے معاملے میں اور آپ خاموش رہیں حد ہے بھئی پاگل پن کی۔ کینز نبوی سے بھی کچھ لکھوا میں۔ خوبصورت بننے میں ورزش اور یوگا کا طریقہ تفصیل سے بتادیں۔ ڈائجسٹ میں تھوڑا بہت چھینچ کر س پلیز۔ سالوں سے ایک ہی جیسا دیکھ دیکھ کر اب بور ہو گئے۔ ہر ماہ ایک جیسا لگتا ہے۔

باتوں سے خوشبو آئے اور دوسرے سلسلوں میں کس طرح شامل ہوتے ہیں۔ یہ بھی بتادیں۔

ندا یا سر اور یا سر نواز کا دونوں میاں بیوی کا انٹرویو شامل کریں پلیز۔ شاین رشید آپ سے میری سب سے بڑی فرمائش۔

آپ لوگوں کی یہ بات بہت عجیب لگی کہ ڈائجسٹ آپ کو ہر ماہ ایک جیسا لگتا ہے جبکہ ہر ماہ مختلف مصنفین کی نئی اور دلچسپ تحریریں شامل ہوتی ہیں۔

انٹرویو کی فرمائش شاین تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کے سلسلوں میں شامل ہونے کے لیے جس طرح آپ نے خط لکھا ہے۔ آپ علیحدہ کاغذ پر اپنا انتخاب لکھ کر خط کے ساتھ ہی لفافے ڈال دیتیں اس کے لیے علیحدہ لفافے کی ضرورت نہیں ہے۔

سونیا ربانی نے قاضیاں محلہ بالا سے لکھا ہے۔

اس بار نہ دسمبر میں اپنا پن، اداسی، ویرانی اور سنسنائی محسوس ہوئی اور نہ اب جنوری کی آمد ہے تو لگ رہا ہے کہ نیا سال آ رہا ہے ایک سے دن ہیں ایک سی رات ایک سے حالات کچھ بھی بدل نہیں رہا مگر دعا ہے کہ

سال نو میں اک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو سارے دل، سارے درتچے دھو جائے شعاع جج میرے لیے شعاع ہے اب دیکھتے ہیں کہ جو تربیت شعاع نے میری کی ہے آگے چل کر کتنا میرے کام آتی ہے ممکن ہے اس آئین، ان رشتوں اور اپنوں کے ساتھ شعاع سے بھی ساتھ چھوٹ جائے مگر میرے فیورٹ ناول؟ مجھے سب کا اینڈ پڑھنا ہے، خیر دیکھتے ہیں مگر میں نے شعاع کا شکریہ ادا کرنا ہے اسکول کے بعد فارغ وقت میرا

کتابوں اور ڈائجسٹ کے نام رہا جن میں پہلے شعاع پھر خواتین اور آخر میں کرن شامل ہوا اور کوئی شک نہیں کہ اچھے برے میں فرق خود کو زمانے سے بچا رکھنے کا طریقہ اور دلوں میں جگہ بنانے کا فن۔ ان ڈائجسٹ سے ہی حاصل ہوا امی کے بعد میری تربیت میں ان ہی رسالوں کا ہاتھ ہے سو شکریہ میرے عزیز ڈائجسٹ۔

پیاری سونیا! ایک نئی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے دل میں خدشات تو ہوتے ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد اور والدین کی دعائیں ساتھ ہوں تو زندگی کا یہ موڑ خوشیاں لے کر آتا ہے۔ آپ پورے اعتماد اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ زندگی کے نئے سفر کا آغاز کریں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

انعام اعجاز اپنے گاؤں جھاکے ضلع شیخوپورہ کا تعارف کر رہی ہیں۔

اس ماہ میں آپ کو اپنے گاؤں کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ میرا گاؤں جھاکے ایک بہت ہی بڑا گاؤں ہے۔ اس میں آج کے دور کی تمام سولتیں موجود ہیں سوائے اسپتال کے، لیکن ہمارے گاؤں کی ایک بات جو مجھے اچھی نہیں لگتی وہ ہے۔ گاؤں کے مردوں کا عورتوں پر اعتماد نہ کرنا۔ یہاں گاؤں میں لڑکیوں کو پڑھنے کی اجازت نہیں، میں آپ کو اپنے ”ورک ولا“ کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ ہمارا یہ ”ورک ولا“ میرے دادا ابا کے ابا نے بنوایا تھا۔ اس وقت سے اب تک ہمارے ولا میں بہت سی تبدیلیاں بھی ہوئی، لیکن رشتوں میں محبت نسل در نسل ویسے ہی رہی، بلکہ بڑھتی گئی۔ ہمارے ”ورک ولا“ کی ایک بات جو مجھے بے حد پسند ہے کہ ان لوگوں (میرے دادا ان کے بعد تیا اور ابو اور چاچو) نے اپنے خاندان کی پرانی روایات کو آج تک سینے سے لگا کر رکھا ہے اور میرے تیا اور ابو لڑکیوں کو پڑھانے کے حق میں ہیں۔ میرے ابو نے مجھے بھی اتنی کام گویا ہے۔ میری بڑی بہن نے بھی اتنی کام کیا ہے، میرے ابو ہمیں آگے بھی پڑھانا چاہتے تھے لیکن میرے چاچو اور میری پھوپھیوں نے سخت مخالفت کی۔ جس کی وجہ سے میں آگے نہیں پڑھ سکی۔ پہلے تو انہیں میرے شعاع اور خواتین پڑھنے پر بھی اعتراض تھا۔ انعام! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی

ہوئی، لیکن یہ افسوس ناک بات ہے کہ آپ کے گاؤں کے لوگ لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف ہیں، اب اتنی تبدیلی تو آئی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر ان کے خیالات بھی بدل جائیں۔ آپ نے انٹرنیٹ کر لیا ہے۔ اب آگے پرائیویٹ بھی تعلیم جاری رکھ سکتی ہیں۔

نایاب سعید ڈی آئی خان شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

ٹائٹل بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے آتے ہیں ”جنت کے پتے“ کی طرف۔ ”نمرہ جی! آپ نے یہ کیا کر دیا۔ عبد الرحمن پاشا کو جہان کے روپ میں دیکھ کر بالکل اچھا نہیں لگا۔ ہمیں تو وہی جہان پسند تھا۔ باقی حیا کا کافینڈس بہت اچھا لگا۔ فائزہ جی! آپ نے بھی اک نئی سنڈریلا کا اینڈ اچھا نہیں کیا۔ شروع میں تو کہانی بہت اچھی رہی۔ اینڈ پڑھ کر مزا نہیں آیا۔ اس کے بعد ”نمرہ جی کا“ ”ستارہ شام“ پڑھ کر ہمیشہ کی طرح اچھا لگا۔ باقی تمام ناول اور افسانے بھی اچھے تھے۔

پیاری نایاب! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچانی جاری ہے۔ آسیہ قادری نے کونٹینٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت پسند آیا۔ خاص طور پر پیچھے کا منظر۔ سب سے پہلے دوڑ لگائی فائزہ افتخار کے ناول ”اک نئی سنڈریلا“ کی طرف واہ جی! بہت خوب صورت اینڈ کے ساتھ آپ نے ہمارے دل جیت لیے۔ عنیزہ سید کا ناول کچھ خاص دل کو نہیں بھایا۔ ”چوکھٹ کے پار“ ناول بہت پسند آیا۔ بہت سبق آموز کہانی تھی۔ ”تجھ پہ دل ہارا“ بس سو سو تھا۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت پسند آئے۔ غرض ہمیشہ کی طرح پورا شمارہ ہی بہت زبردست تھا۔

پیاری آسیہ! آپ ہماری مجبوری کو جانتیں تو کبھی بھی ناراض نہ ہوتیں۔ محدود صفحات میں سارے خط شامل کرنا ممکن نہیں۔ اسی لیے کچھ خط شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات کا یقین رکھیں کہ آپ کی رائے ہم تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ ہم تمام خط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

نیلیم شہزادی نے کوٹ مومن سے لکھا ہے۔

السلام علیکم! اس امید کے ساتھ خط لکھ رہی ہوں کہ شامل ہوگا۔

ہے فرض قاتل ان پہ میرا جان چھڑکنا پر وہ میری کچھ حوصلہ افزائی تو کر جائے کسی ایک کو بہترین کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ نمرہ

احمد اور تمام کی تمام مصنفین حیات کی رمز آفرینی سمجھاتی ہیں۔ یہ سب ہماری اتالیق ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر گھر جا کر ہمارے کہوں کہ خدارا اپنی بیٹیوں کو رسالے پڑھنے سے نہ روکیں۔ خاص طور پر آپ کے رسالے۔ یہ تو لڑکوں کو بھی پڑھنے چاہئیں۔

پیاری نیلیم! ہم اپنی تمام قارئین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مجبوری کی بات دوسری ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔

اے آر راحیلہ منظر نے جھمروٹی سے لکھا ہے۔

پیاری باقی! مجھے لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ لکھنا میرا جنون ہے۔ باقی! مجھے شاعری سے بے حد لگاؤ ہے۔ تھوڑا بہت لکھ بھی لیتی ہوں۔ باقی! کیا میں اپنی اسٹوری شعاع کے لیے بھیج سکتی ہوں۔

راحیلہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ نے جو کہانی لکھی ہے بھجوا دیں۔ اگر قابل اشاعت ہوئی تو شعاع میں ضرور جگہ دیں گے۔ کہانی صفحے کے ایک جانب اور لائن چھوڑ کر لکھیں۔

فوزیہ بی بی نے تونسہ شریف سے لکھا ہے۔

آپ کے تمام سلسلے بہت اچھے جارہے ہیں۔ تمام رائٹرز بہت ہی زبردست لکھتی ہیں، لیکن میری موسٹ فیورٹ رائٹر صرف عمیرہ احمد ہی ہیں، ہر دفعہ ایک نیا اور دل کو چھو لینے والا انداز ہوتا ہے۔

پیاری فوزیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

آمنہ اعوان نے گاؤں شمنلہ سے لکھا ہے۔

سب سے پہلے آمنہ جی کا ”ستارہ شام“ پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ مجھے نمرہ احمد کا ”جنت کے پتے“ پسند ہیں۔ شعاع ڈائجسٹ کے سب ہی ناول اور ناولٹ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ دسمبر کا اختتام ہے اور میری رب سے دعا ہے کہ آنے والا سال پاکستانیوں کے لیے بہت بہت ساری خوشیاں لے کر آئے۔ (آمین)

آمنہ! آپ کی نانی اماں درست کہتی ہیں حسن واقعی سادگی میں ہی ہے۔ اب دیکھ لیں، آپ کا سادہ سا خط شامل اشاعت ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رابعہ اور ایمان نے فاروق آباد سے لکھا ہے۔

غل ہا فیصل آباد سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

سب سے پہلے ایک نئی سنڈریلا کی جانب بڑھے اچھا اختتام رہا۔ عالیہ جی پلیر جویا کے ساتھ کوئی نا انصافی نہ ہو۔ سائرہ رضا کا افسانہ بہت زبردست رہا انسان واقعی دل کا رئیس ہونا چاہیے۔ مگر افسوس ہوا کہ سانولی کا رشتہ ایسے لوگوں سے جڑا۔ ”بد دعا“ بہت ہلا دینے بلکہ ہلا دینے والی تحریر تھی۔ راشدہ رفعت کا ہلکا پھلکا سا ناولٹ بھی اچھا لگا۔ ہماری پیاری سی دوست فرح طاہر کا افسانہ زبردست رہا۔ عنیزہ سید تو ہمیشہ اچھا بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ولی امام کا کردار بہت اچھا لگا۔ ”چوکھٹ کے پار“ بہت سبق آموز تحریر تھی۔ سعدیہ ملک سسرالی رشتوں کے داؤ بیج سمجھا رہی تھیں۔ ”ستارہ شام“ کافی ٹرن رہا کہانی میں آگے دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔ ”جنت کے پتے“ بہت زبردست تحریر ام تمامہ کی نظم بہت زبردست تھی۔ ہاں ٹائٹل بھی بہت زبردست تھا۔

غل ہا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر رائے کا اظہار کرتی رہیں گی



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور دارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے ہر چوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادا رہے محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی نقل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دل دار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لیتا ہے جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڑے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ لیتی آراکی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔ ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاحی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور راوی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

قسط: ۵۸



”ابا اور معاذ پچھلے گارڈن میں ہوں گے پھر اگر کمرے میں نہیں ملتے تو وہیں ہوتے ہیں صبح کے وقت۔“ اس نے بولتے ہوئے مڑ کر چائے کا کپ اٹھایا۔ ”میں آپ تینوں کے لیے وہیں چائے لے آتی ہوں۔“

”میرے آنے سے آپ کا کام بڑھ گیا۔“
دروازے کی طرف جاتی ربیعہ نے چونک کر خیام کی طرف دیکھا۔ اتنے عرصے میں وہ جتنی بار بھی یہاں آیا محض چند لفظوں سے زیادہ وہ کبھی بھی اس کے منہ سے اور کچھ نہیں سن پائی تھی۔ سو پھر آج یہ کیسی بات برائے بات؟

”کیا ہوا؟“ ربیعہ کی حیرت کو نوٹ کر کے وہ شرمندہ سا ہوا۔
”کچھ نہیں، اصل میں آپ بولتے نہیں ہیں نا، اس لیے عجیب سا لگا۔“ اس بار ربیعہ کو فوراً اپنی بات کے بے تکلف پن نے شرمندہ کیا اور وہ خیام کی مسکراہٹ کو دیکھنے کے لیے وہاں رک بھی نہیں سکی۔
خیام بے ساختہ ہنستا ہی چلا گیا۔

دروازے پر پڑا وہ ابھی تک بل رہا تھا۔
سر کو ہلکے سے جھٹکتے ہوئے اس نے خود بھی باہر جانے کے لیے قدم بڑھایا تھا کہ سامنے الماری میں لگے قد آدم آئینہ میں دکھائی دیتے عکس نے اسے ٹھٹھکنے پر مجبور کیا تھا۔

چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ابھی بھی نمایاں تھی اور ایسے میں وہ خود اپنے آپ کو بے حد اجنبی سا لگا۔
معاذ کے ہمراہ گزرتے زندگی کے اس دور میں جب ہلکی سی مسکراہٹ اس کے حصے میں آنے لگی تھی۔ تب بھی وہ اس طرح پورے دل کے ساتھ ہنسنے کی ہمت تو کیا خواہش بھی کبھی نہیں کر پایا تھا۔ مگر اس وقت اک عمر کی بد نصیبی کا رونا جیسے کچھ لمحوں کے لیے پس پشت چلا گیا تھا۔

وہ ربیعہ کی بات کو یاد کر کے ایک بار پھر سے مسکرایا۔ مگر اس بار افسردگی غائب تھی۔
”کوئی تک بھی تھی بھلا؟“ اس نے خود کو سختی کے ساتھ سرزنش کی اور تیزی سے باہر نکل آیا۔
عافیت اسی میں تھی کہ خود سے بھی نگاہ بچا کر چلا جائے۔ برآمدے کی سیڑھیوں سے اتر کر پچھلے گارڈن تک جاتے ہوئے اس نے خود کو مربوط رکھنا چاہا تھا۔

”او بیٹا خیام!“ ابا موسیٰ پھولوں سے لدی کیاری کے ساتھ ہی بید کی کرسی پر بیٹھے تھے اور معاذ ان کے قریب دیوار کے ساتھ بنی منڈیر پر۔
اسے آتا دیکھ کر دونوں ہی جس محبت سے مسکرائے تھے۔ وہ خیام کو پچھلی رات کے اپنے رویہ پر شرمندہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

”السلام علیکم!“
”وعلیکم السلام! جیتے رہو، بیٹھو۔“ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ ابا نے قریب پڑی دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا، لیکن وہ معاذ کے قریب منڈیر پر ہی بیٹھا۔
معاذ نے دھیرے سے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔

”نیند تو ٹھیک آئی؟“
”جی!“
”رات تمہیں بخار تھا۔ ابھی ناشتے کے بعد میرے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں چلنا۔“ معاذ کا ہاتھ ابھی تک اس کے کندھے پر تھا۔
”میں ٹھیک ہوں معاذ بھائی!“ وہ اطمینان دلانا چاہ رہا تھا، لیکن یہاں کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

معاذ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم ڈاکٹر کو دکھاؤ گے تو مجھے بھی تسلی ہو جائے گی۔ رات میں کتنی دیر پٹیاں رکھیں، تب کہیں جا کر تمہارا بخار اتر اٹھا۔“ وہ دونوں ہی فکر مند تھے۔ خیام کی نگاہ جھکی تھی۔
”آئی ایم سوری!“

معاذ ہلکے سے ہنس پڑا۔ ”کس بات کی معذرت۔ کیا بخار ہو جانے کی؟“
”نہیں! بلکہ۔“ اس نے سر اٹھا کر کچھ کہنا چاہا تھا۔ تب ہی وہ ایک بار پھر آتی دکھائی دی۔
”لو بھی! چائے بھی آگئی۔“ ابا ربیعہ کو آتا دیکھ کر خوش دلی سے بولے۔
”السلام علیکم ابا!“

”وعلیکم السلام بیٹا! خوش رہو، ہمیشہ۔“
معاذ اور ابا ربیعہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک سے محسوسات سے گزرے۔
”بس فقط تھوڑا عرصہ اور۔“

چائے کے خوشبو اور بھاپ اڑاتے کپ ان تینوں کو دیتے ہوئے ربیعہ نے ان کی خاموشی کو دل پر محسوس کیا تھا۔

وہ سب ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ کوئی بار کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اب آج کل تو جیسے یہ حساسیت عروق پر پہنچ رہی تھی اور سب ہی ایک دوسرے کو تکلیف سے بچانے میں ہمیشہ کی طرح سرگرداں۔

”ربیعہ بیٹا! خیام سے ملیں؟ رات ہم اسے ساتھ لے آئے تھے۔“ ابا نے پتا نہیں اسے نارمل کرنا چاہا تھا یا خود کو۔

ربیعہ مسکرا دی۔ ”ہم ابھی ملے تھے ابا! کچھ دیر پہلے۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ یہ آئے ہوئے ہیں۔“
”تمہاری سسرال کے استقبال کی تیاری ہم دونوں ہی مل کر کر سکیں گے نا۔ ابا نے تو ایک لمبی لسٹ تیار کر کے دے دی ہے کاموں کی۔ جلدی سے ناستا بناؤ۔ تاکہ ہم نکلیں گھر سے۔ اب تو مینے بھر کے لیے آرام کا لفظ ہی ہماری زندگی سے نکلتا دکھائی دے رہا ہے خیام!“
معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے خود پر مصنوعی تھکن سی طاری کی۔ ربیعہ نے حسب توقع فوراً ہی برا ماتا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے کچھ کرنے کی۔ ابا! انہیں تو کوئی کام سپرد مت کیجئے گا۔ ساری زندگی احسان جتلتے رہیں گے مجھ پر اور میں ابھی صاف کہہ رہی ہوں کہ۔۔۔“

خیام نے بے ساختہ ہی ایک نگاہ ربیعہ پر ڈالی تھی۔ جنجھلائی ہوئی تیز تیز بولتی ہوئی۔
”غصہ نہیں کرتے بیٹا! عادت پتا تو ہے بھائی کی۔“ ابا نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ”سب سے زیادہ محبت کرتا ہے تم سے۔“
”کوئی نہیں کرتے۔“

”ربیعہ ربیعہ۔۔۔“ کھڑکی میں سے امی آوازیں دے رہی تھیں۔
وہ بات ادھوری چھوڑ کر واپس اندر چلی گئی۔
خیام نے ابا اور معاذ دونوں کی مسکراہٹ کو چند لمحوں میں پھینکی پڑتی محسوس کی۔
”کل سے ان شاء اللہ تمہارے نئے اسکول کی باقاعدہ کلاس شروع ہو جائیں گی۔ ایڈمیشن ابھی کچھ دن اور چلیں گے یا پھر اب بند کرو گے؟“

ابا نے شاید جان بوجھ کر موضوع بدلا تھا۔

خیام خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سننے گیا۔

معاذ کے پاس کبھی بھی آئیڈیاز کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی بہت کچھ کی گنجائش تھی۔ مگر وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھا۔

گزشتہ شام سے اب تک بہت کچھ تھا جو تیزی سے گزرتا ہوا تھا اور زندگی میں پھیلا ہوا الجھاؤ اور بھی گہرا۔

خالی خالی نگاہوں سے ابا اور معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے خیام کو ان کی باتوں کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا حالانکہ اس نے پورا دھیان لگا کر ان کی باتوں میں دلچسپی لینا چاہی تھی مگر نہیں۔

اور وہ لوگ آخر کیوں نہیں اس سے کل شام کے بارے میں پوچھتے۔ اس کی غیر موجودگی اس کی خستہ حالی کسی پر بھی کوئی ایک سوال کیوں نہیں اٹھایا گیا اب تک۔

کوئی تو پوچھے اس سے۔

کسی حوالے سے سہی۔

دل سے اٹھتی آواز میں اور بھی شدت تھی۔

خیام نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

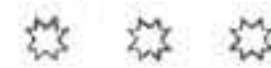
”ابا! میں آپ لوگوں کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

ابا اور معاذ دونوں ہی نے بیک وقت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں ابا۔۔۔ سب کچھ۔“

اس نے بڑی تیزی سے بات کو دہرایا جیسے ابھی نہ کہا تو شاید پھر کبھی نہ کہہ سکے گا۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو حیرت انگیز طور پر بے حد پر سکون محسوس کیا تھا۔



”خیام وہاں ہے سالار! اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔“ صبح ناشتے پر ایک بار پھر اسے یاد آیا۔ کل سے اتنی حیران تھی کہ حد نہیں۔ سالار ہنس پڑا۔

”ضرور ہو گا۔ میں نے کب کہا ہے کہ وہ نہیں تھا۔ بس مجھے دکھائی نہیں دیا۔۔۔“

”دیکھا۔۔۔ آپ پھر مذاق اڑانے لگے۔“ وہ تھوڑی سی ناراض ہوئی۔ ”کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ میں یوں ہی وہم کا شکار ہو رہی ہوں۔ یا میرا اب بھی دماغ اتنا خراب ہے کہ۔۔۔“ بات ادھوری چھوڑ کر اس نے بے زاری سے سر جھٹک کر کسی امکان کو رد کیا۔

سالار کو اس بار پہلے سے بھی زیادہ ہنسی آئی تھی، لیکن اس کی مزید ناراضی کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔

”میں اپنی پیاری پیاری بیوی کے لیے کچھ بھی ایسا ویسا سوچ کر بے ادبی کا مرتکب کسے ہو سکتا ہوں؟“

گیتی کو اب بھی مذاق اڑانے کا سا شبہ ہوا تھا۔ لیکن سالار کی محبت لہجوں میں گھسنے ٹپکنے پر مجبور رکھتی تھی۔

بڑے ہی غیر محسوس انداز میں وہ ذات کی تبدیلی کے عمل سے گزری تھی۔ اب تو سوچ کر بھی کوفت ہوتی تھی کہ وہ خیام کے جانے کے بعد مایوسی اور دکھ کے کسی عالم سے گزری تھی۔

”اللہ کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے، مگر انسان نہیں سمجھ سکتا فوری طور پر۔“ گیتی نے کھوئے کھوئے سے انداز میں شاید خود سے کہا تھا۔

”یہ عادت تم میں بالکل نانی ستارہ والی ہے۔ وہ بھی اسی طرح لمحہ نہیں لگاتیں بات کہیں سے کہیں شروع کرنے

میں۔ انسان بس سراپکڑنے میں ہی لگا رہتا ہے ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے۔“

گیتی ہلکے سے مسکرا دی۔ ”کچھ غلط تو نہیں کہتا میں نے۔۔۔ خیام کا جانا ہمارے خاندان کے لیے بہت بڑی ٹریجڈی تھا اور اس کے لیے بھی آسان تو نہیں رہا ہو گا، مگر اب اتنے سال گزر جانے کے بعد سب کچھ بڑی حد تک نارمل ہو گیا۔“

”خیر! اب اگر وہ معاذ کے پاس آ گیا ہے تو یقیناً اللہ کا کرم ہے اس پر۔۔۔ وہ تدریج بہتری کی طرف بڑھے گا اور کیا پتا بڑھ بھی چکا ہو۔ مجھے اس خبر سے واقعی بڑا اطمینان ہوا ہے۔“ آئیٹ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس نے گیتی کی پلیٹ میں رکھا۔

”کیا ہمیں نانی کو بتادینا چاہیے؟“ انہیں تسلی ہو جائے گی۔ مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ پہلے فیروزہ خالہ اور اب خیام۔۔۔ وہ اب کتنی تو نہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔“

بیٹے ہوئے اس سارے قصے میں آج بھی نانی ستارہ کا غم تازہ تھا۔ یہ بات طے شدہ تھی۔

سالار نے ہلکے سے انہماک میں سر ہلایا۔

”لیکن پھر بھی۔۔۔ پھر بھی انہیں اس طرح براہ راست بتادینا خود ان کے لیے اچھا نہیں ہو گا گیتی! پہلے کم از کم خیام کا تو پتا ہو کہ وہ ان سے ملنا بھی چاہتا ہے یا۔۔۔“

”میں ملنے کے لیے نہیں کہہ رہی، لیکن بس انہیں پتا چل جائے کہ وہ زندہ ہے۔ یہی بہت بڑی خبر ہو گی ان کے لیے۔“

”ابھی نہیں کچھ دن اور رک جاؤ۔ وہ جب یہاں تک آ گیا ہے تو پھر اسے خود کو آزما لینے دو۔۔۔ مت بھولو کہ اس کے پیچھے معاذ اور اس کے والد ہیں۔“

گیتی نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر تب ہی اس کی نگاہ باہر سے آتے ہوئے نبیل پر پڑی تھی۔

”مت دیکھو اس کی طرف، میں ہوں نا تمہارا بچہ۔“ سالار نے دھیمی آواز میں اسے ٹوکا۔

گیتی نے ذرا سا رخ موڑ کر سالار کی طرف دیکھا۔

”خدا یا!“ وہ ہلکے سے بریدیا۔ ”زرد رہا ہے تمہارا رنگ۔ گیتی! تم ٹھیک تو ہونا! وہ جا چکا ہے۔“

گیتی کی نگاہ نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا تھا۔

نبیل بنا کسی سے اچھے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گیا تھا۔

وہ واقعی الجھا ہوا تھا یا پھر سالار کی موجودگی نے اسے باز رکھا تھا بظاہر ایسا ہی لگا تھا۔ لیکن صرف گیتی نے اس ایک نظر کی وارننگ کو وصول کیا تھا۔

”ویسے حیرت کی بات ہے کہ یہ شخص اتنا مطمئن ہے۔ یا تو اس کے اعصاب بہت مضبوط ہیں یا پھر یہ ضرورت سے زیادہ پراغتماد ہے۔“

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر لیا ہو۔“ گیتی کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نبیل کے خلاف جرم ثابت ہو چکا ہے اور اس کی سزا وہی رہے گا۔ اگر وہ خدا نہ کرے کسی بھی وجہ سے بچ نہ نکلتا ہے تو بھی میں اسے معاف نہیں کروں گا۔“ سالار ایک دم بے حد سنجیدہ ہو گیا۔

گیتی کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

”تم فکر مت کرو ایسا کچھ نہیں ہونے والا جو پریشان کن ہو۔ اگر اسے سزا نہیں ملنی ہوتی تو اس وقت زرتاج بیگم کے ساتھ یو کے جانے سے روکا نہیں جاتا۔ شک کا اظہار تو ہے نا اس پر۔۔۔“

سالار نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی دینا چاہی، مگر اندر ہی اندر ایک گہرا سہم روز بہ روز مزید گھٹنا

ہوتا جا رہا تھا۔

پتا نہیں کیا ہوتا تھا؟

گیتی نے مضبوطی سے سالار کا ہاتھ پکڑ لیا۔



گھر کا آخری سامان بھی نیچے کھڑے ٹرک میں لوڈ کر دیا گیا تھا۔ خالی درودیوار کے بیچ اب کچھ بھی نہیں تھا۔ عجیب سی ویرانی اترنا شروع ہو گئی تھی۔

جویا نے ایک خاموش سی نگاہ اپنے کمرے پر ڈالی اور روزانہ بند کر کے باہر نکل آئی۔
”جلدی کرو جویا! سب لوگ ٹیکسی میں بیٹھے ہیں۔ تم کر کیا رہی ہو آخر!“ میٹرھیوں کیپاس کھڑے سلمان نے جھنجھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں گھر کی چابی تھی جو اسے ابھی نیچے مالک مکان کے سپرد کرنا تھی۔
”سامان کا وہاں اتروانا اور پھر اوپر چڑھوانا میری تو زندگی عذاب بنی ہوئی ہے۔ سارے کام کرنے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں۔ باقی سب کے پیش ہیں اس گھر میں۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا اس کیپاس سے گزرتا ہوا نیچے گیا تھا۔
جویا خاموشی سے ٹیکسی میں آ بیٹھی۔

زویا، شاکرہ امی اور وہ۔ آگے اظہار صاحب تھے۔ سلمان کو بایک پر جانا تھا۔

سڑکیں، بازار، گلیاں۔ تیزی سے پیچھے جاتے گئے۔

راستے بھر کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

وہ جب وہاں پہنچے تو سامان اتارا جا رہا تھا۔

”آپ لوگوں کو آج آپاگل کے ہاں چلے جانا چاہیے تھا۔ سامان پھیلا پڑا ہے سارے میں یہاں تو۔“ سلمان انہیں دیکھ کر قریب آیا تھا۔ ”انہیں کب سے فون ملا رہا ہوں۔ مگر اٹھا ہی نہیں رہی ہیں۔“ اس کی جھنجھلاہٹ بڑھ رہی تھی۔

”مت کریں فون۔ وہ کام کے موقعوں پر ایسے ہی غائب ہو جاتی ہیں۔“ زویا کا لہجہ سخت تھا۔ سلمان اور اظہار صاحب دونوں ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”اور سامان کی فکر مت کریں۔ پہلے بھی تو آخر شفٹنگ کے بعد کا سارا کام میں نے اور جویا نے ہی کیا تھا۔ آؤ جویا۔ آئیں امی!“ اس نے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

اظہار صاحب اور سلمان دونوں ہی نے کچھ جھینپ کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔ وہ تینوں اوپر جا چکی تھیں۔

ایک تھکا دینے والے طویل دن کے بعد آنے والی صبح کو سویرے ہی آپاگل موجود تھیں۔

”مجھے پتا تھا کہ یہاں سب کے سب آرام طلب ہیں۔ سو رہے ہوں گے اور میں اتنی دور سے ان کی محبت میں دوڑی چلی آئی ہوں۔“

انہوں نے یہ جملہ اتنی بار دہرایا تھا جب تک ان کو یقین نہ ہو گیا کہ وہ سب سن چکے ہیں۔ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں ابھی تک بند تھا۔ سوائے سلمان کے کسی نے بھی اب تک اسے کھولنے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ مگر وہ ابھی موڈ میں نہیں آئی تھیں۔

”صبح کا ایک کپ چائے پی کر گھر سے نکلی ہوں۔ یہاں ابھی تک بھی ناشتے کے آثار نہیں ہیں۔ کرتے کیا ہو تم لوگ۔ اور یہ جویا۔ جویا کہاں ہے؟“ انہوں نے پہلی بار جویا کی غیر موجودگی کو نوٹ کیا۔

”وہ سو رہی ہے رات گئے تک گھر سمیٹا ہے۔ اسے ابھی مت اٹھانا۔“ شاکرہ امی کے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔

”میں تو خود کہتی ہوں کہ اب اس سے زیادہ کام مت کروائیں۔ آج تو مایوں بیٹھنا ہے اسے۔ چند دن کا آرام تو ہر لڑکی کا حق بنتا ہے۔“ آپاگل نے ایک مصلحت بھری حمایت کی۔

”سلمان! یہاں نیچے حلقہ پوری ملتی ہے۔ سب کے لیے لے آؤ۔ ناشتے سے تو فارغ ہوں کم از کم۔“
”تمہیں اتنی بھوک لگ رہی تھی تو ناشتا کر کے لکھنا تھا۔ یا پھر بنا کر ہی لے آئیں سب کے لیے۔ ایک تو اتنی جلدی آکر سب کی خیند خراب کی اوپر سے آتے ہی حکم۔“

سلمان بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔

آپاگل نے اس کے جانے کے بعد بڑے اہتمام سے ساتھ لایا ہوا سوٹ کیس کھولا۔

پیلے رنگ کا خوب صورت سوٹ، چوڑیاں، مہندی، آئین، چاندی کے زیورات۔

ایک کے بعد ایک کتنی ہی چیزیں نکل رہی تھیں۔

”بڑے ہی شوق اور ارمانوں کے ساتھ شادی کر رہے ہیں فرید بھائی۔ حالانکہ ان کی بہنیں تو جلی جا رہی ہیں یہ سب دیکھ کر۔“ لاکھوں روپے کی جائیداد جو ہاتھ سے نکل رہی ہے، مگر وہ کسی کی بھی پروا نہیں کر رہے۔ سب کچھ میرے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ اب ظاہر ہے میں تو اپنی بہن کے لیے سب کچھ اچھے سے اچھا۔“

”یہ کڑے بھی فرید الدین نے آپ کو دیے ہیں آپاگل؟“

زویا کے سوال نے ان کی روانی سے چلتی زبان کو بریک لگایا تھا۔

ان پر نگاہ جمائے وہ جواب کی منتظر تھی اور شاید اس نے ان کڑوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔
”ہاں۔ ہاں نا! اپنی خوشی سے دیے ہیں۔ میں نے مانگے تھوڑی تھے۔“ کچھ سٹپٹا کر انہوں نے غیر ارادی طور پر اپنی قمیص کی آستین کو نیچے کھینچ کر ان چمکتے ہوئے کڑوں کو شاید چھپانا چاہا۔

”بہت منع کیا۔ ہاتھ تک جوڑ لیے کہ اب جو بھی کرنا ہے جویا کے لیے کریں، لیکن وہ کہنے لگے کہ بہنوں کا بڑا حق ہوتا ہے۔“

”تو اپنی بہنوں کو بھی انہوں نے ایسے ہی کڑے دیے؟ ڈھائی تین لاکھ سے کیا کم ہوں گے۔ واقعی بہت بڑا دل ہے۔“

آپاگل نے پہلی بار اپنی نمائش پسندی کی عادت پر دل میں افسوس کیا۔

”بھلا کیا ضرورت تھی پسینہ کر آنے کی۔ جویا کی شادی کے بعد بھی پہنے جاسکتے تھے۔“

”انہوں نے رشتہ طے کروانے پر بھی ایسا ہی کچھ دیا تھا۔ کیا وہ کروڑ پتی آدمی ہیں؟ حالانکہ لگتے تو نہیں ہیں۔“
زویا کے لہجے کی کڑواہٹ اتنی بڑھی تھی کہ چھلک رہی تھی اور آنکھوں میں بڑی گہری بے مروتی۔

آپاگل کو عجیب سے احساس نے گھیرا۔

آنے والے دنوں میں زویا کی حیثیت مضبوط تر ہو رہی تھی۔ چند ماہ میں اس کا ہاؤس جاب شروع ہو رہا تھا اور وہ یقیناً جویا نہیں تھی۔

”آپ کو ذرا بھی شرم نہیں آئی، اپنی سگی بہن کی قیمت لیتے ہوئے آپاگل! آپ کی عادتوں کو آج تک آپ کی فطرت کا حصہ سمجھ کر میں نے اور جویا دونوں ہی نے نظر انداز کیا ہمیشہ۔ آپ کی لالچ آپ کی تنگدلی۔“
ان کی خاموشی سے وہ بالکل صحیح نتیجہ نکال چکی تھی۔

”مجھے نہیں پتا تمہارا ان باتوں سے کیا مطلب ہے زویا! لیکن بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تم بالکل کھو چکی ہو۔ تم لوگوں کا ساتھ دیتے دیتے میں نے اپنے گھر کو بھلا دیا۔ اس تنگ، خستہ حال، ڈھائی کمروں والے گھر سے لا کر یہاں اس اتنے بڑے اپارٹمنٹ میں لا کر بٹھا دیا۔ وہ بھی فری میں۔ مگر بجائے احسان ماننے کے التا ذلیل کر رہے ہو تم۔“

لوگ مجھے۔ جو یا کی شادی ہو جائے پھر بات کروں گی تم سے میں۔ فی الحال تو مجھے صرف اس کی فکر ہے۔ بے چاری میری مظلوم بہن۔ بس کر رہ گئی غریب۔

شاہدہ امی نے خالی خالی نگاہوں سے زویا اور پھر آپاگل کو دیکھا۔

”کاش! آپ نے واقعی جو یا کی فکر کی ہوتی۔ کاش! اسی فرید الدین سے آپ نے بنا کسی لالچ، کسی غرض کے جو یا کا رشتہ کرنا چاہا ہوتا۔ صرف اس کی بھلائی سوچی ہوئی تو شاید اس کی بد قسمتی کا دکھ کچھ ہلکا ہوتا۔ مگر آپ نے تو اسے بچ دیا۔ اپنی سگی بہن کو بچ دیا۔ خدا کرے کہ آپ وہ دن بھی دیکھیں جب آپ کی ایک بیٹی دوسری کے ساتھ یہی سلوک کرے۔“

آپاگل نے بے ساختہ پہلو بدلا تھا۔

کچھ تھا زویا کے لہجے میں جو کمرے میں پر ہول سناٹا چھایا تھا۔

”میں نے کتنا چاہا کہ وہ آپ کے فیصلے سے بغاوت کر دے۔ یہ اس کا حق ہے۔ مگر وہ نہ مانی۔ ایک نہیں سنی اس نے میری۔ وہ حق استعمال نہیں کیا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر لڑکی اور ہر عورت کو دیا ہے۔ کیونکہ وہ تو بہت پہلے خود کو قربان کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی آپاگل! اس وقت سے جب آپ لوگوں نے معاذ بھائی کو اس کی زندگی سے نکالا تھا۔ زندگی اس کے لیے ختم ہو گئی تھی۔ مگر یہاں کسی کو خوف خدا ہے آج بھی۔“

زویا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آنسوؤں کو روکنے کی مزید کوشش اب لا حاصل تھی اور آپاگل کے سامنے وہ کبھی بھی رونا نہیں چاہتی تھی۔

”دیکھا آپ نے کیسے الزامات لگا رہی تھی۔ جیسے میں ڈر رہی تو جاؤں گی اس سے۔“

زویا کے جانے کے بعد ایک پھکی سی مسکراہٹ وہ چہرے پر لانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

”یہ اچھے آثار نہیں ہیں امی! ایک معاذ کے قصے نے ہی سارے خاندان میں عزت و کوڑی کی کروی ہے ہماری۔ یہ زویا تو اور بھی آگے نکل رہی ہے۔ غلطی کی جو اسے کو ایجوکیشن میں۔ ہم نے پڑھنے دیا۔ جلد ہی اس کا بندوبست نہ کیا تو۔“

وہ بولے گئیں جب تک سلمان گرم گرم پوری چھو لے اور جلوہ لے کر نہیں لوٹا۔

آج پلیٹیں ڈونگے نکال کر لانے کی زحمت انہوں نے خود اٹھائی تھی۔ کسی کو بھی آواز نہیں دی۔

”شکر ہے خدا کا ہمارا تول اور دامن دونوں ہی صاف ہیں۔“ جس کمرے میں زویا تھی اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے بطور خاص اونچی آواز میں کہا۔ مگر جواب میں خاموشی ہی چھائی رہی۔

شاید زویا کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

شاید کسی کے بھی پاس کچھ نہیں تھا سوائے آپاگل کے۔

حیرت انگیز طور پر آج انہوں نے سلمان یا انظہار صاحب کے سامنے زویا کی کسی شکایت کو نہیں دہرایا تھا۔

جو یا سارا دن کمرے سے نہیں نکلی۔ فرید الدین کی بہنوں کو عصر کے بعد آنا تھا۔ صرف بٹھانے کا انتظام کرنا تھا۔ کھانا پینا فرید الدین کی طرف سے ہی آنا تھا۔ لیکن یہ بات اس کی بہنوں سے پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔

آپاگل کی بیٹیاں آگئی تھیں۔ آج کے دن کے حساب سے ان کی تیاریاں مکمل تھیں۔

”جو یا۔! آپاگل نے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے آواز دی۔

وہ سامنے بند پر بیٹھی قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔ ان کی آواز پر بھی اس کا تسلسل نہیں ٹوٹا تھا۔

زویا انہیں دیکھتے ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ آپاگل نے احتراماً کچھ لمحے کی خاموشی اختیار کی۔

یہ دیکھ کر ہر حال سکون بھی ملا تھا کہ وہ خاصی نارمل ہے۔ چہرے پر رونے دھونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔

ان کی جائزہ لیتی نگاہ جو یا پر جمی تھی۔

زرد رنگت والے چہرے پر صرف آنکھیں ہی نمایاں تھیں اور اس کے گلابی ہونٹ اب سفید پڑ چکے تھے۔

فرید الدین کے ہاں سے آئی ہوئی چوڑیاں اور کپڑے اس پر بے حد ڈھیلے پڑنے لگے تھے اور فرید الدین کی بہنوں کو اس سخت بیمار نظر آتی دلہن پر اعتراض کرنے کا کھلا موقع مل جاتا تھا اور خود فرید الدین بھی اس طرف اشارہ کر چکا تھا پہلے ہی۔

آپاگل کو گھبراہٹ نے گھیرا۔ پچھلی بار جب فرید الدین کی بہنیں آئی تھیں۔ تب تک جو یا پھر بھی کسی حد تک بہتر نظر آتی تھی، لیکن اب تو صرف اس کا سایہ سا تھا۔

”اور جو خدا نہ کرے کہ۔“ انہیں اس بچے کی پوچاری والی فکر نے گھیرا جو اپنا مال خراب ہونے کے ڈر سے جلد سے جلد فروخت کرنے کی فکر میں گھرتا ہے۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”نہاؤ ہو کر کپڑے بدل لو جو یا۔! اور چہرے پر کچھ لگالینا فاؤنڈیشن وغیرہ۔ وہ لوگ اب آتے ہی ہوں گے اور ہاں! اپنے لیے دعا ضرور کرنا۔“

پتا نہیں اس نے ان کا ہدایت نامہ سنا بھی یا نہیں۔

آپاگل کو جو یا کے بے تاثر چہرے سے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح تلاوت کیے گئی۔

آپاگل دروازہ بند کر کے واپس جا چکی تھیں۔

جو یا کی آنکھ سے آنسو گر کر چہرے پر پھیلتا چلا گیا۔

”میں پھر کہتی ہوں جو یا! مت ہونے دو یہ سب۔ اور کچھ نہ سہی اپنی زندگی میں امید تو رہنے دو۔ خود کو اس طرح ختم مت کرو۔“

جب وہ پیلا جوڑا پہن کر آپاگل کے حسب حکم فاؤنڈیشن کی بوتل کھول رہی تھی، زویا کمرے میں واپس آئی تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ جو یا سے ناراض تھی۔ اس شادی سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر لینے کے بعد وہ اس سے زیادہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔

”میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے سامنے۔ نہیں کہہ۔ ابھی بھی وقت ہے جو یا۔ میں معاذ بھائی کے ہاں جانے کا نام بھی نہیں لوں گی ساری زندگی۔ لیکن ہم کہیں اور رہ سکتے ہیں۔ دوستوں یا کسی رشتے دار کے گھر۔ بعد میں ہاسٹل چلے جائیں گے۔ میرا فاسٹل ایریا ہے جو یا! میں سنبھال لوں گی سب کچھ پلیز۔ پلیز۔“

وہ اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ بری طرح رو رہی تھی۔

”خود پر نہ سہی مجھ پر رحم کرو جو یا! میں بہت بہت پیار کرتی ہوں تم سے۔ میرا دل بند ہو جائے گا یہ سب دیکھ کر۔“

جو یا نے فاؤنڈیشن کی بوتل واپس رکھ کر محبت سے زویا کے چہرے کو چھوا۔

”مت رو زوی! سنبھالو خود کو۔ اس طرح مت کرو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“ زویا نے غصے سے اس کے ہاتھ کو جھٹکا۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ نہیں ہوتی ہے تمہیں کوئی تکلیف۔ بے رحم ہو چکی ہو تم جو یا! تمہیں کسی پر ترس نہیں آتا۔ خود پر بھی نہیں۔“

”خود پر رحم کھانے کے لیے اب بچا ہی کیا ہے زویا! چار سال پہلے سب کچھ ختم ہوا۔“ اس نے فاؤنڈیشن کی تھوڑی سی مقدار ہتھیلی پر نکال کر چہرے پر ملنا شروع کی۔

”اب کم از کم کچھ لوگوں کا تو بھلا ہو رہا ہے۔ امی، ابو، سلمان بھائی آرام سے زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کبھی بھی۔“

”میں سنبھال سکتی ہوں ان سب کو۔ پڑھائی ختم ہو گئی ہے میری تقریباً۔“ آنکھوں کو خشک کرتی زویا آخری لمحے تک بھی پر امید تھی۔

”نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ تم ایسا سوچنا بھی مت، تم اپنی پوری زندگی خود جینا زویا! پورے دل، پوری خوشی کے ساتھ۔ کسی سمجھوتے، کسی قربانی پر خود کو ضائع مت ہونے دینا۔ سنا تم نے۔“ جویا کی آواز تدریج پتلی ہوئی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

”میں تمہارے لیے بہت ساری دعائیں کرتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اللہ ضرور سنے گا۔“ بات ختم کر کے اس نے جھک کر زویا کی پیشانی پر بیاں کیا۔

زویا کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

تب ہی وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑی۔ زویا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شیشے میں دکھائی دیتے اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ ہنسے ہی چلی جا رہی تھی۔

”دیکھو تو ذرا فاؤنڈیشن لگانے سے چہرے کی رنگت کیسی عجیب سی ہو گئی ہے۔ اس سے تو پہلے ہی بہتر تھی۔ کم از کم اصلی تو تھی۔ میں منہ دھو کر آتی ہوں۔“

وہ نارمل سے انداز میں کہتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ لیکن اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ میں کچھ غیر معمولی پن جھلکا تھا۔ زویا فکر مند سی وہیں بیٹھی رہی۔ جویا نے پتا نہیں کتنے منٹ تک منہ پر پانی ڈالا تھا اور جب وہ واپس آئی تو مہمانوں کی آمد کا شور اٹھ چکا تھا۔

”وہ لوگ آگئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں جب میں کہوں تو جویا کو رسم کے لیے لے آنا۔“ آپا گل نے دروازہ کھول کر اتنی سی بات تیزی سے کہی اور مڑنے لگی تھیں تب ہی کچھ اور یاد آیا۔

”یہ سارے کپڑے گیلے کر لیے ہیں تم نے جویا! کچھ تو ہوش کیا کرو اور وہ فاؤنڈیشن چوڑیاں۔“

”امی۔۔۔ امی!“ باہر سے ان کی بیٹیاں آواز دے رہی تھیں۔

”ساری ذمہ داریاں میری بچیوں پر آگئی ہیں۔“ پہلی بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے زویا کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر جس تیزی سے آئی تھیں اس سے زیادہ تیزی سے واپس چلی گئیں۔

”یہ اور ان کی بچیاں۔“ زویا نے منہ بنا کر سر کو بے زاری سے جھٹکا۔

”کچھ اور پہن لو۔ میں تمہارے کپڑے دوبارہ استری کر دیتی ہوں۔“

”نہیں! ٹھیک ہیں۔ ابھی سوکھ جائیں گے۔ اتنے بھی گیلے نہیں ہیں۔“

”اور یہ چوڑیاں۔“ زویا نے ڈبا اس کے آگے کیا۔ اس میں سنہری، ہری اور پیلی چوڑیوں کے خوب صورت سیٹ جگمگا رہے تھے۔

کوئی وقت تھا کہ اس طرح کی چیزوں پر اس کی اور زویا کی ایک چھوٹی سی بحث تو ہو ہی جاتی تھی۔ جویا نے دل کڑا کر کے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر۔۔۔

”یہ نہیں پہنوں گی میں زویا! رکھ دو ادھر۔“

”کیوں، ابھی تو صرف فرید الدین کی بھیجی ہوئی چوڑیاں ہیں۔ وہ ہی پہنی نہیں جا رہیں تم سے۔ آگے کی زندگی

کیسے کئے گی جویا؟“
اس بار زویا کے لمبے میں سختی نہیں، رحم تھا۔ جویا نے کوئی جواب نہیں دیا۔
آپاگل کی بیٹیاں جویا کو لینے آئی تھیں۔ میک اپ، زرق برق لباس، مہندی، جیولری اور چروں پر آپاگل والی
لے سی۔

”چلیں جویا خالہ!“ ان میں سے ایک نے اس کے سر پر دوپٹا ڈالا اور تیزی سے ہاتھ پکڑ کر کھڑا بھی کر لیا۔
”ایک منٹ“ آپ کی شکل کیسی ہو رہی ہے۔“ دوسری نے تنقیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے روکا اور
قریب بڑی اس فاونڈیشن کو جسے ابھی جویا نے دھو کر صاف کیا تھا۔ جھٹ پٹ پھر سے اس کے چہرے پر مل دیا۔ جویا
”نہیں نہیں“ کرتی رہ گئی۔
وہ دونوں اسے تقریباً دھکیلتی ہوئی دروازے تک لائی تھیں اور باہر آکر ہی ان کی نگاہ چوڑیوں سے خالی ہاتھوں
پر پڑی تھیں۔
لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ کچھ بچیاں ڈھول کو بلا وجہ یوں ہی بجاری تھیں اور فرید الدین کی وہ بہنیں جن کے
بارے میں آپاگل کی رائے بے حد بری تھی اس وقت خاصی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔
آپاگل نے آگے بڑھ کر جویا کے بازو تھامے اور اپنے قریب صوفے پر بٹھادیا۔ جویا کی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو آنے
والی کئی عورتوں نے نوٹ کیا تھا۔
”ٹڑکی شاید بیمار ہے۔“

شبہ کی تصدیق ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔
جویا کی فاونڈیشن ملی زور رنگت بہت ہی عجیب سا تاثر دے رہی تھی اور اس کی مخصوص کشش جواب تک
جیسے تیسے اس کا ساتھ دے رہی تھی اب گم ہو چکی تھی۔ اس کی نظریں اس طرح جھکی تھیں جیسے اب کبھی بھی
نگاہ اٹھا کر زمانے کو نہ دیکھنے کا تہیہ کر چکی ہے۔
فرید الدین کی بہنوں کی ناپسندیدگی ظاہر ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔
”جب ہم رشتہ طے کرنے آئے تھے تب تو خاصی اچھی تھیں۔“ ان ہی سے کسی نے اپنی ایک اور شتہ دار
عورت سے کہا۔ ”اب تو دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔“
دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے ہوئے کھڑی زویا کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔
اس کی نیکول، صابر اور خوب صورت بہن کس طرح لوگوں کی نگاہوں میں تماشائی تھی۔
”رسم شروع کیجئے“ آپاگل اس وقت بڑی متانت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ بات کو بگڑنے نہ دینا ہی ان کی کامیابی
تھی۔

فرید الدین کی سب سے بڑی بہن ہچکچاتے ہوئے اٹھ کر جویا کے قریب آکر بیٹھی تھی۔ آپاگل کو اٹھ کر برابر
والے صوفے پر جانا پڑا۔ خاموش بیٹھی شاگرہ امی، جویا کے اور بھی قریب ہوئیں۔
”دو چار چوڑیاں تو ہاتھ میں ڈال دیتیں جویا کے۔ ہم لائے بھی تھے اور اب خالی ہاتھ کتنے برے لگ رہے
ہیں۔“ جویا کا ہاتھ تھام کر رسم کرنے سے پہلے انہوں نے آپاگل کو خانا ضروری سمجھا تھا۔
تیل، آبلہ، مٹھائی، سامنے رکھی میز پر سب ہی کچھ خوب صورتی کے ساتھ رکھا تھا۔
سامنے بیٹھی سب ہی خواتین میں رسم دیکھنے کی دلچسپی ایک دم ہی بڑھ چکی تھی۔
تب ہی ایک بڑی عجیب سی بات ہوئی۔
فرید الدین کی بہن کا ابلہ لگانے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔

سہ پہر ڈھل کر شام میں بدل رہی تھی جب خیام کی بازار سے واپسی ہوئی تھی۔ چھوٹی موٹی کئی چیزوں کے ساتھ
ہست سے پھول بھی تھے جو اسے خاصی دور سے جا کر لانے پڑے تھے۔
چند بڑے بڑے شاہزادہ اپنی بانٹیک پر سے اٹھا کر گھر کی داخلی سیڑھیوں پر آکر کھڑا ہوا تھا۔ سامنے اندر کوئی دکھائی
نہیں دے رہا تھا۔ وہ انہیں نہیں رکھ دے یا پھر اندر چلا جائے سیدھا۔ اس کی بے تکلفی ابا کے کمرے اور اسٹڈی
تک تھی۔ اندر جاتے ہوئے وہ ہمیشہ اطلاع دے کر ہی گیا تھا۔ تب ہی دادی کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے وہ
سیڑھیوں پر کھڑا دکھائی دے گیا۔

”ارے خیام بیٹا!“ وہ وہیں سے پکاریں۔
”اندر جا کر کیوں نہیں رکھ دیتے یہ سامان؟ ادھر مال میں یا پھر کچن میں۔۔۔“
”جی!“ اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ مگر اندر جانے کے بجائے وہیں برآمدے میں کھڑا رہا۔
”معاذ بھائی! معاذ بھائی!“

ربیعہ اس کی آواز پر ہی کمرے سے نکل کر آئی تھی۔
”بھائی گھر پر نہیں ہیں۔ کہیں گئے ہوئے ہیں۔“
ربیعہ کی آواز سنی تھی اور وہ کافی خاموش خاموش سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک قدرتی سی افسردگی تھی جو آج
اسے گھیرے لے رہی تھی۔
خیام نے دانستہ نگاہ چرائی۔

”یہ سامان۔۔۔ جگہ بتادیں میں خود رکھ دوں گا۔“
”اچھا! پھر کچن میں لے آئیں۔۔۔ اور یہ پھول ادھر مال میں۔۔۔“
”تم آگئے۔“ کچن میں کام کرتی شائستہ امی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔
”جی آئی! یہ لسٹ چیک کر لیں۔“
”تم نے دیکھ لی کافی ہے۔ چائے پیو گے؟“
اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ ربیعہ کی طرف مڑ چکی تھیں۔

”ربیعہ! خیام کے لیے چائے بناؤ۔ تھکا ہوا آیا ہے۔ تم رک گئے تو بہت آسانی رہی مجھے۔ بے حد شکریہ بیٹا! کہ
تم نے اتنا ساتھ دیا، ورنہ معاذ سے تو ایک کام کو اتنی بار کہنا پڑتا ہے کہ بے کار میں ہی غصہ آنے لگتا ہے۔ بی بی پہلے
ہی بڑھا رہا ہے میرا، لیکن اسے خیال نہیں ہے۔“
وہ خیام سے بے حد خوش تھیں اور اس کا اظہار بار بار ہوتا تھا۔ ربیعہ کو یاد نہیں آتا تھا کہ وہ اتنے خوش گوار
انداز میں اور کس سے بات کرتی ہیں۔

”تم مال میں بیٹھو ربیعہ وہیں چائے لے آتی ہے۔ بس یہ تھوڑا سا کام اور پنڈالوں، مغرب کے بعد وہ لوگ
آجائیں گے۔ بس دعا کرو سب کچھ خیریت سے ہو جائے۔“
”جی!“ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

ہال میں پھول میز پر رکھے تھے۔
 آج ربیعہ کی سسرال والے پہنچ رہے تھے اور سارا اہتمام ان ہی خوش نصیبوں کے لیے تھا۔
 خیام نے ایک تھکی تھکی سی سانس لی۔
 قسمت کا گورکھ دھندا۔

کاش! اگر بہت پہلے وہ ابا اور معاذ کو اپنی ساری حقیقت بتانے کی ہمت کر لیتا تو سارے کا سارا بوجھ زائل ہو جاتا تھا۔

تب شاید وہ زیادہ بہتر فیصلے کر سکتا تھا۔
 ”تب شاید ربیعہ کے لیے بھی۔۔۔“
 دل سے اٹھتی آواز میں آج بار بار شدت سی محسوس ہوئی تھی۔
 اس نے گھبرا کر نفی میں سر ہلایا۔
 ”محسنوں کی بیٹی۔“

”اور محسن بھی کون؟ جنہوں نے نئی زندگی دی۔ تلخی اور تاریکی کی انتہائی گہرائی سے نکال کر روشن راستے پر قدم رکھنا سکھایا۔ زندگی سے جڑے سب سے تکلیف دہ احساس سے چھٹکارا دلادیا۔“ خیام کی براؤن آنکھوں میں نمی سی اتری۔

ابا کے سامنے اپنے خاندان کی حقیقت بتاتے ہوئے بہت کچھ غیر متوقع ہوا تھا۔
 وہ سب جو خود خیام کے خیال میں انہیں اور معاذ بھائی کو بری طرح چونکا سکتا تھا ایک معمول کا قصہ بنے تھے۔
 ”ہمیشہ یاد رکھنا کہ یہ سب زندگی کا حصہ ہیں، مکمل زندگی نہیں اور حقیقت میں خود زندگی سے بڑھ کر کچھ بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔“ ابا نے کہا تھا۔ ”تم خود کو کس بات کی سزا دے رہے ہو بیٹا! کس پر اپنا غصہ اتار رہے ہو؟ وہ مظلوم ماں، جو اب اس دنیا سے بھی جا چکی اپنی ساری حسرتوں کو لے کر۔ اس پر۔ یا پھر اپنی نانی کے اس خاندان پر جو حالات کا شکار ہو کر نہ جانے کیسے اب تک اپنی گزر بسر کرتا آیا ہے۔ وہ جنہوں نے تمہارے لاڈ پیار میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، لیکن اپنی کسی بھی پریشانی کا بوجھ تم پر نہیں ڈالا۔
 خیام! تم نے انہیں چھوڑ کر اچھا نہیں کیا بیٹا! زندگی کو آزمانے کے لیے نکلنا مردوں کا شیوہ ہے۔ لیکن تعلق توڑنا ہرگز نہیں۔“

انہوں نے جو کچھ کہا، خیام کے دل میں لفظ بہ لفظ اترتا تھا۔
 ”وہ محلے، وہ سیٹ اپ، آسمان سے نہیں اترے تھے خیام۔ انسانوں کی تخلیق ہیں۔ نفرت کرنی ہے تو ان مظلوم عورتوں سے نہیں، بلکہ باہر کی دنیا کے نام نہاد شریفوں سے کرو۔“
 وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہ رہے تھے۔ تب ہی معاذ نے بے تکی سی مداخلت کی تھی۔
 ”باہر کی دنیا کے لوگوں کی بھی اپنی بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں خیام۔ ہر شخص خود اپنی ذات کا اسیر ہے۔ ہر ایک کے لیے رعایت رکھنا سیکھ لو۔ با طرف ہونا سب سے ضروری ہے۔“
 خیام کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ معاذ نے کس کی طرف سے صفائی دی تھی۔ لیکن اس سارے قصے کو دل بھر کر دہرائینے کے بعد جب وہ ابا کے گلے لگا تھا تو دل بردت سے لگا داغ اندامت دھل چکا تھا۔
 پچھلے گارڈن میں گزشتہ صبح اس نے پہلی بار سکون بھر اسانس لیا تھا۔
 یہ گھر اور اس کے لوگ سحر انگیز تھے۔
 ”آپ کی چائے۔“ ربیعہ اس کے قریب چائے کا کپ رکھ رہی تھی۔

”شکریہ۔“

”کس بات کا؟“

”آپ کی چائے کا۔“

وہ افسردگی سے مسکرائی۔

کوشش کے باوجود وہ خود کو اس کی طرف دیکھنے سے باز نہیں رکھ پایا تھا۔

وہی تھی جسے دیکھ کر گیتی یاد آتی تھی۔

اور وہی تھی جو گیتی کو بھلانے کا سبب بھی بنی تھی۔

سادہ پرکشش سا وجود جس کے تصور سے بھی وہ اپنائیت کے گہرے احساس کے ساتھ بندھا تھا اور کچھ عرصے

بعد وہ اسے صرف تصور میں دیکھا کرے گا۔

”بہت مبارک ہو آپ کو ربیعہ! اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔“

اس بار ربیعہ نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ خیام نے نوٹ کیا وہ خوش نہیں تھی۔ کم از کم ویسے بھی

ایسے موقعوں پر لڑکیاں ہوتی ہیں۔

”آپ تو یہاں ہوں گے۔ ابابا اور معاذ کا بہت خیال رکھیے گا۔ مجھے ان کی بہت فکر ہے۔ وہ بہت سادہ دل لوگ

ہیں۔ معاذ کو تو خود سے کھانا کھانا بھی یاد نہیں رہتا اور ابابا۔۔۔ وہ تو۔۔۔“ کسی ہمدرد کو پا کر وہ رو دینے کو تھی۔

خیام نے ایک گہرا سانس لیا۔

کیسی خوب صورت اور پیاری سی وجہ تھی ربیعہ کی افسردگی کی۔ خود اس کی اپنی طرح۔

اور یہ پہلی ذمہ داری جو وہ اسے سونپ رہی تھی خود اس کی بھی تو تھی۔

”ارے! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ بلکہ ابابا اور معاذ بھائی کے لیے تو آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ بڑی خوش دلی سے مسکرایا۔ لیکن ربیعہ بہت سنجیدہ تھی۔

”آپ کو نہیں پتا بھائی خوش نہیں ہیں۔ بہت دن پہلے وہ اپنی ہر خوشی سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ ہر راستہ بند

کر چکے ہیں خود پر۔ بہت۔ بہت تنہا۔ بہت دکھی۔۔۔“ خیام نے مضطرب سا ہو کر ربیعہ کی طرف دیکھا۔

سو وہ بات وہ ڈر جو اسے معاذ کی طرف سے فکر مند کرتا تھا سچ تھا۔

”میں معاذ بھائی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں ربیعہ! آپ دیکھیں گی کہ وہ کتنی خوش و خرم زندگی۔۔۔“ برابر

والے کمرے سے داوی ربیعہ کو آواز دے رہی تھیں۔

”جی آئی وادی!“ آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے ربیعہ نے اونچی آواز میں ان کی پکار کا

جواب دیا اور جاتے جاتے مڑ کر خیام کی طرف دیکھا۔

”کاش! آپ ایسا کر سکیں۔ کاش! وہ آپ کو ایسا کرنے دیں۔۔۔ یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہو گا خیام!“ بات

مکمل کر کے وہ کمرے سے نکل گئی۔

”خیام۔۔۔“ اس نے زیر لب اپنا نام دہرایا۔

آج سے۔۔۔ پہلے کبھی اسے اپنا نام اتنا اچھا نہیں لگا اور نہ ہی اپنا آپ اتنا معتبر۔

دل خوشی اور دکھ کے ملے جلے احساس سے بوجھل ہوا تھا۔ کیا تھا جو معاذ بھائی جیسے بے حد پیارے انسان کی

زندگی کا تکلیف دہ باب تھا۔ وہ اسے پڑھنا چاہتا تھا۔

”بیٹا دنیا بھی چائے کا کپ ہے۔“ وہ تیز قدموں سے اسٹڈی کی طرف جاتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھا۔

مہمان وقت سے پہلے ہی آگئے تھے۔ تھوڑے سے لوگ تھے۔ لڑکے کے والدین اور شاید بھائی بہن ایک

بزرگ رشتے دار، لیکن لڑکا خود نہیں تھا۔ خیام کو ابابا اور معاذ کے اصرار پر ان سے ملنا بھی پڑا اور ساتھ میں بیٹھنا

بھی۔ سو وہ ایک زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لیے ان سب کے درمیان بیٹھا رہا۔

”میرا بھتیجا ہے۔ آج کل یہاں میرے پاس آیا ہوا ہے۔“ ابابا کسی کو اس کے بارے میں بتا رہے تھے۔

خیام کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ کوشش کے باوجود بھی وہ خود کو جذباتی ہونے سے نہیں روک پایا تھا۔

لڑکے کے ساتھ نہ آنے کے بارے میں کوئی وجہ بتائی جا رہی تھی۔ خیام بڑی خاموشی سے بڑے ہال سے نکلا

تھا۔ کسی کی بھی توجہ اس پر نہیں تھی، لیکن ابابا کی نگاہ نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

وہ حد درجہ اداس تھا اور اس بار اداسی کی وجہ بھی کچھ اور۔ یہ بات طے شدہ تھی۔

ایک گہری سانس لے کر وہ پھر سے مہمانوں کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

شام ڈھل کر رات میں بدلنے لگی تھی۔ وہ چپ چاپ اسٹڈی کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔

خود کو مربوط کر کے وہ جلد ہی واپس اندر جانا چاہتا تھا، تاکہ اس کی غیر حاضری کا نوٹس نہ لیا جاسکے۔ تب ہی کسی

نے گیٹ پر گلی بیل کو بجایا تھا۔

خیام تیزی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف گیا تھا۔

”وعلیکم السلام علیکم!“ سامنے کھڑی پریشان حال بزرگ خاتون کو دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ بالکل اکیلی

تھیں۔

”وعلیکم السلام بیٹا! مجھے اسلام بھائی سے ملنا ہے یا پھر معاف۔“

”گھر پر اس وقت مہمان ہیں اور۔۔۔“ خیام نے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس کی تھی۔

”میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے بیٹا! میں بہت مشکل سے آئی ہوں۔ گھر بھی بھول گئی تھی۔ تم انہیں کہو کہ

شاگرہ آئی ہے۔ وہ ضرور مل لیں گے مجھ سے۔“ ان کے انداز میں بے بسی تھی۔

خیام نے بنا کچھ کہے ان کو آنے کا راستہ دیا۔

وہ گیٹ سے اندر آئیں اور پھر سیڑھیوں سے کچھ دور ہی رک گئیں۔

”میں یہیں بات کر لوں گی۔ تم بلا لاؤ بس۔“ خیام تیز قدموں سے چلتا ہوا برآمدے کی سیڑھیوں پر آیا۔ تب

ہی شائستہ اندر سے نکل کر آئی تھیں۔

”گیٹ پر کون تھا خیام؟“

”آنٹی! کوئی خاتون ملنے آئی ہیں۔ معاذ بھائی یا ابابا۔۔۔“

”تم کہہ دو کہ وہ مصروف ہیں۔ پھر کسی وقت آجائیں۔“ وہ واپس اندر مڑنے لگیں۔

”میں نے کہا تھا، لیکن وہ کہہ رہی ہیں کہ بہت ضروری بات کرنی ہے ان کا نام شاگرہ ہے۔“

شائستہ امی کا قدم وہی تھا تھا۔

خیام نے بہت حیرت سے انہیں تیز قدموں سے اس طرف جاتے دیکھا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم یہاں آئیں شاگرہ! میرے بچے میرے گھر آنے پر دل بھر کر کچڑا چھالنے کے بعد

بھی۔ انسان میں کم از کم اتنی شرم تو ہونی چاہیے کہ وہ پھر سامنا کرنے سے بھی گریز کرے۔“

خیام جب وہاں پہنچا تو اس نے انہیں بے حد غصے میں کہتے سنا تھا۔ وہ چند قدم پیچھے رکھا تھا۔

دوسری خاتون کی آواز دھیمی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔
 ”ایک کپڑے سی کر گزارہ کرنے والی عورت کا بیٹا۔ آوارہ، نا اہل، جس کی ہنسی اڑانے کا کوئی موقع نہیں جانے

دیا تم نے اور تمہارے خاندان نے شاکرہ! عروج پر تھی تمہاری فرعونیت۔ کس حقارت سے تم نے ہماری شرافت اور بے بسی کو دکھا ہمیشہ۔“ شائستہ کی آواز میں نمی آ رہی تھی۔ لیکن وہ خود کو ہرگز، ہرگز بھی کمزور نہیں پڑنے دینا چاہتی تھیں۔

خیام نے دل پر بھاری بوجھ سا محسوس کیا تھا۔
 زندگی سے جڑے دکھ اور بے بسی کی کہانیاں، صرف نانی ستارہ کے محلے تک ہی کب محدود تھیں۔
 ”میں ہاتھ جوڑتی ہوں شائستہ! بہت سزا پائی ہم نے۔ معاف کرو خدا کے لیے۔ مدد کرو میری۔ بہت امید لے کر آئی ہوں۔“ اس بار ان کی آواز واضح تھی۔
 ”معافی اور امید دونوں ہی اللہ سے مانگے۔ ہم کم ظرف لوگ بھلا کسی کو کیا دے سکتے ہیں۔“ وہ مزید کچھ سنے بغیر واپس مڑیں۔ ”خیام بیٹا! گیٹ بند کر لینا۔“ وہ اس کے قریب سے کہتی ہوئی واپس سیڑھیوں کی طرف برہہ گئیں۔
 ”شائستہ۔ شائستہ۔“ وہ بے قراری سے پکار رہی تھیں۔
 ”میری بچی مرجائے گی، جو یا مرجائے گی۔“

خیام نے انہیں کہتے سنا۔
 برآمدے کی سیڑھیاں خالی تھیں۔ شائستہ اندر جا چکی تھیں۔ وہ خاتون بری طرح رو رہی تھیں۔
 گیٹ پر وہی رکشہ والا آکر کھڑا ہوا تھا۔ جو انہیں لایا تھا۔
 ”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اماں کو واپس بھی چھوڑنا ہے۔ کرایہ بڑھتا جا رہا ہے۔“
 ”کتنا کرایہ؟“ خیام نے اسے مطلوبہ کرایہ دے دیا تو وہ مطمئن ہو کر دوبارہ رکشہ میں جا بیٹھا۔
 شاکرہ ابھی تک رو رہی تھیں۔
 ”میری جو یا۔ مرجائے گی۔“

اس ادھورے بھید بھرے قصہ کافی الوقت ایک وہی گواہ تھا۔
 اس نے انہیں گیٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر سخت بے چینی سی محسوس کی تھی۔
 معاذ کی قسمت مند دروازے کا قفل اسی نام سے کھلنا تھا۔
 ”جو یا۔“

اسے پورا یقین ہوا۔
 ”سنیں!“ وہ بہت تیزی سے ان کے پیچھے آیا۔
 اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔
 یہ وقت نکل جاتا تو شاید وہ خود کو پھر کبھی بھی معاف نہ کرتا۔

(اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



”صوفیہ کل پاکستان آرہی ہیں۔“

ناشتے کی میز پر وہ بہت پر جوش ہو کر میاں جی کو بتانے لگیں۔ میاں جی نے خفیف سا ہو کر اخبار کو جھٹکا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو اور تیزی سے اخبار کی سطروں پر نظریں گھمانے لگے۔

”تمام چینلز والے خوب کورج دے رہے ہیں۔ لگتا ہے بہت ہی انتظار کروایا ہے انہوں نے۔“

وہ چائے میں چینی ملا کر میاں کو تھماتے ہوئے پھر گویا ہو میں مگر وہ ناگواری کا مسلسل تاثر لیے آنکھیں سکیڑتے اخبار کا صفحہ پلٹنے لگے۔ جیسے کوئی خاص خبر کی تلاش ہو یا پھر بیگم کی کسی بات کا جواب نہ دینا چاہتے ہوں۔ حالانکہ چہرہ اضطراب کی ترجمانی کر رہا تھا لیکن بیگم صاحبہ مسلسل ”صوفیہ صوفیہ“ کی گردان کر رہی تھیں۔

کبھی ملک سے گئے ان کے سالوں کا حساب لگاتیں، تو کبھی فرمائش کرنے لگتیں انہیں اپنے گھر بلانے کی مگر بریگیڈیر مودت کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے سرسری انداز میں اخبار ایک طرف میز پر رکھا اور چائے کی پیالی اٹھا کر چسکیاں بھرنے لگے۔ گرم چائے ہونٹ تو جھلسا ہی رہی تھی مگر اس وقت ان کا دل بھی سلگ رہا تھا۔

”ویسے مودت! وہ اپنے پرانے محلے تو ضرور جائیں گی۔ پرانی جگہوں پر انسان کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔“ بیگم نے انجانے میں یادوں کا ایک اور ہنسا مارا۔

”لگتا ہے آج چائے میں چینی نہیں ملائی۔“ وہ

کپ نیچے رکھتے ہوئے بولے۔ وہ شاید موضوع بدلنا چاہتے تھے۔

بیگم صاحبہ چائے میں دوبارہ چینی ملانے لگیں۔ ساتھ ساتھ میاں سے فرمائش جاری تھی۔

”کل رات ہی ان سے ملنے ہو کل چلیں گے، آخر پرانے مراسم ہیں۔“ ساتھ ساتھ ارادہ بھی ظاہر کرنے لگیں، وہ اپنی خوشی میں میاں کے چہرے پر پھیلی ناگواری محسوس ہی نہیں کر رہی تھیں۔ بس

اپنے ملنے ملانے والوں پر رعب جمانے کے لیے انہیں گھر بلوانا چاہتی تھیں اور ساتھ تصویریں بنوا کر یادگار بنانا چاہتی تھیں۔ یہ جانے بغیر کہ شریک سفر کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

”میری کیپ پکڑ دو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اپنے احساسات چھپا کر انہوں نے سپاٹ انداز میں کہا۔

بیگم صاحبہ قریب رکھی کیپ پکڑاتے ہوئے ساتھ آن کھڑی ہوئیں۔

”میں اتنی دیر سے کیا باتیں کر رہی ہوں، لگتا ہے کچھ سنا ہی نہیں۔“ وہ بگڑ کر غصے میں بولیں۔ وہ میاں کے خالی خالی چہرے کو بالکل نظر انداز کیے ہوئے تھیں۔

”ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں۔“ وہ اب بھی انجان بنے اپنی کیپ درست کرتے ہوئے بولے۔

”کل صوفیہ پاکستان آرہی ہیں۔ انہوں نے غصے سے گھورتے ہوئے اپنی بات دوہرائی۔

”روزانہ بہت سے پاکستانی بھارت سے آتے جاتے

ہیں۔ ظاہر ہے یہ ان کا ملک ہے۔ انہیں آنا چاہیے۔ اس میں ایسی کیا بات ہے۔“ وہ شان بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولے۔ ان کے لمبے میں روکھا اور آگاہی واضح تھی۔

بیگم صاحبہ کے لیے حیرت کا جھٹکا تھا۔ وہ ان کی اسٹڈی میں صوفیہ کی لکھی کتابیں دیکھ چکی تھی۔ بلکہ

شوہر کی پسند مرادیں ہوئے خود بھی صوفیہ کی شاعری پڑھنے لگی تھیں اور اب تو وہ گھر کے ہر فرد کی پسندیدہ شاعرہ تھیں۔

”جناب! میں اس صوفیہ کی بات کر رہی ہوں جو آپ کے پرانے محلے میں رہتی تھیں۔ جن کی آپ سے بہت دوستی تھی۔ وہی جو چھت پر آپ سے باتیں کرنے آتی تھیں۔ جب پرہائی سے آپ لوگ آگیا جاتے تھے تو وہ آپ کو شعر سناتی تھیں۔ خود ہی تو آپ نے بتایا تھا۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔“ وہ بوکھلا گئے۔ ”مجھے کیوں سنانے لگی شعر۔“ وہ اپنی چوری پکڑی جانے پر کچھ غصے میں بولے۔

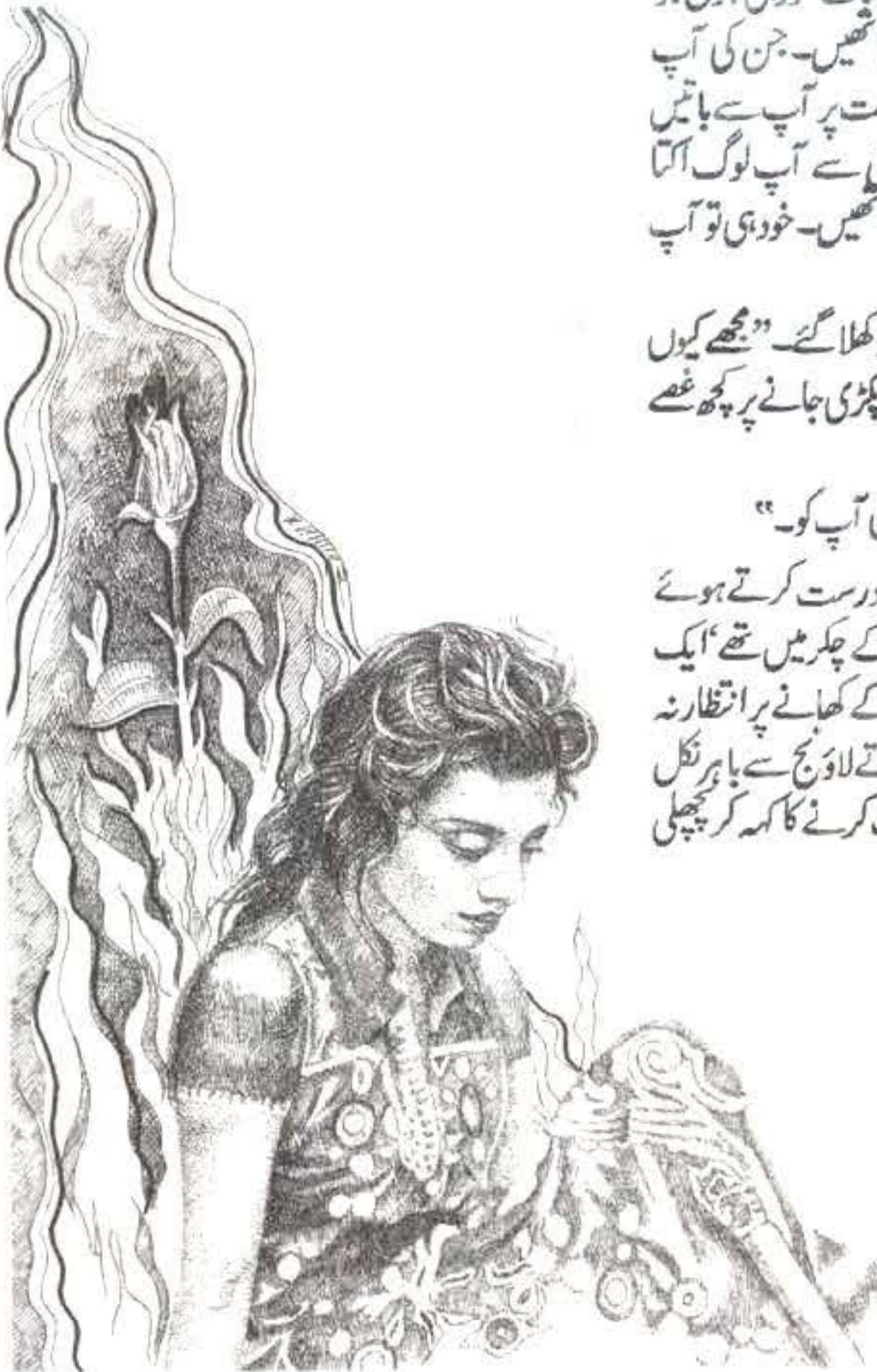
”ارے بھئی یاد دل رہی ہوں آپ کو۔“

وہ اپنے میاں کی شرٹ کا کالر درست کرتے ہوئے بولیں۔ لیکن وہ تو جان چھڑانے کے چکر میں تھے ایک دم ان کے ہاتھ ہٹائے اور وہ پھر کے کھانے پر انتظار نہ کرنے کا کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتے لاؤنج سے باہر نکل گئے۔ ڈرائیور سے گاڑی اشارت کرنے کا کہہ کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

چڑھتے دن کا ایک اپنا ہی سحر ہوتا ہے۔ گاڑی فرالے بھرتی ہوئی تیزی سے سرمئی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ بریگیڈیر مودت ہونٹوں کو سختی سے جمائے پشت پر سر نکائے ماضی میں جھانک رہے تھے۔ ان کے ماضی کو ان کی اپنی بیوی نے جھاڑا تھا۔ جس پر برسوں کی گرد جمی تھی۔



صوفیہ اور مودت ایک ہی متوسط محلے کے رہائشی



تھے صوفیہ والدین کی اکلوتی بیٹی تھی مگر مودت کی دو بہنیں اور ایک بھائی درمیانے درجہ کا خوشحال گھرانہ تھا۔ بچوں کی وجہ سے گھر میں ہر وقت رونق پیرا رہتی۔ صوفیہ بھی اپنا وقت گزارنے ان کے گھر آ جاتی۔ روم سے گہری دوستی بھی تھی۔ جہاں مودت اردو کے الفاظ و معانی صوفیہ سے سمجھتا وہاں اس کی ریاضی مودت پر انحصار کرتی تھی۔

وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ کب سانسوں کی ضرورت محسوس ہونے لگا پتا ہی نہ چلا۔ صوفیہ میں شعر کہنے کی صلاحیت تھی۔ وہ ہر موقع کو جملے میں ڈھال سکتی تھی۔ اس کے لفظوں میں محبت کا لمس تھا۔ وہ جلد ہی باقاعدہ شاعری کرنے لگی۔ اس کا کالج میں پہلا دن تھا جب اس نے ایک غزل لکھ کر مودت کو دی جو اس نے فوراً "ایک مقامی رسالے میں شائع کروادی۔ فرمائش پر وہ زیادہ لکھنے لگی۔ مودت کاکول اکیڈمی چلا گیا۔ صوفیہ کے لفظوں میں محبت کے ساتھ انتظار کی باس پھیلنے لگی۔

مودت کے بڑے بھائی نے پی سی ایس کا امتحان اعلا نمبرز سے پاس کیا اور سیشن کورٹ میں جج لگ گئے بڑی بہن لیکچرار تھی۔ کسٹم آفیسر سے شادی کے بعد باہر چلی گئی۔ چھوٹی بہن جو صوفیہ اور مودت میں محبتی پل کا کام کرتی تھی اب ڈگریاں اکٹھی کرنے لگی۔ وہ دن صوفیہ کے لیے بڑا ہی دلکش تھا جب مودت لیٹننٹ بنا اپنے گھر آیا۔ وہ پہلے سے زیادہ وجہ و دلکش لگ رہا تھا۔ صوفیہ بھی مودت کے گھر اعزازی تقریب میں بھرپور طریقے سے شامل ہوئی۔ موقع کی مناسبت سے چند دعائیہ اشعار بھی اسے لکھ دیے۔ اب جب بھی وہ چھٹی پر گھر آتا تو دونوں کی بے قرار ملاقات ضرور ہوتی۔

آج بھی لیٹننٹ مودت چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا اور شام کے وقت اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا فضا میں آزاد اڑتے پرندے دیکھ رہا تھا۔ دیوار پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اپنی چھت پر آنے کی دعوت دے دی۔

آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ صوفیہ ہوانہ صرف مست بادلوں کو بکھیر رہی تھی بلکہ درختوں سے جھڑے بے جان سوکھے تھے بھی چھت پر پھینک رہی تھی۔ صوفیہ چھوٹی سی مشترکہ دیوار پھلانگ کر اس کے قریب چلی آئی۔ وہ کتنی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔

مودت کے نہ صرف لفظوں سے محبت کی خوشبو آ رہی تھی بلکہ آنکھوں میں موتی سے چمک رہے تھے جنہیں صوفیہ بڑے خیر مقدم سے اپنے دل میں رو رہی تھی۔ مست بادل کے گہرے ٹکڑے سے بھی ننھی بوندیں گرنے لگیں۔ مودت صوفیہ کا ہاتھ کھینچ کر کونے میں بنی چھوٹی سی برساتی کے نیچے لے آیا۔ صوفیہ کے ہاتھ بہت گرم تھے اس کے ہاتھوں کی گرمی مودت کو آج بھی یاد تھی۔

مودت اس کی آنکھوں میں بہت سے دیپ جلا کر بہت سے وعدے لے کر اسے انتظار سونپ گیا۔ اس کی پوسٹنگ سیاحین ہو رہی تھی۔ اس لیے دونوں طرف خدشے برابر تھے۔ دعاؤں پر زور ہوا اور بیس میں جاتے ہی اسے پتا چلا اس کی پوسٹنگ فی الحال منسوخ ہو گئی۔

وہ اس منسوخی کو صوفیہ کی دعا سمجھ رہا تھا مگر یہ معجزہ حل ہو گیا۔ یہ مہربانی اس کی کمپنی کے میجر جنرل کی ہے۔ جنرل صاحب کی نظر التفات اس کی پرکشش جاذب نظر شخصیت پر کیا پڑی۔ رنگ بھی تیزی سے بدلے۔ مراعات گے کیا ہی کہنے۔

مودت برٹ کو شک گزرا۔ وہ ایمر جنسی میں چھٹی لے کر گھر آ گیا اور شادی کا شور مچا دیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ اس سے شادی کرو گے؟" یہ بھائی جان تھے جو ہر بات پر اڑیل گھوڑے کی طرح ٹانگیں اٹھا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ "حیثیت ہی کیا ہے اس کی تمہارے سامنے؟ گھٹا قسم کے شعر کہتی ہے۔ اس سے شادی کر کے ہمارے خاندان پر دھبہ لگانا ہے کیا؟" وہ غصے میں لال سیلے

ہو رہے تھے۔ "تم نے افسانہ پڑھا ہے اس کا؟" وہ غصے میں پھنکارے۔

"افسانہ کم محبت نامہ زیادہ ہے۔" اس نے چند ماہ پہلے ہی افسانہ نگاری بھی شروع کی تھی۔ بھائی صاحب اسی کا ذکر کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک افسانہ نگاری "شاعری گھٹیا ترین فعل تھا۔ جج ہونے کے ناتے فرد جرم عائد کر رہے تھے۔

"بھائی جان! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ کھوکھلی ہوئی اپنی سانسوں میں مضبوطی پیدا کر کے بولا۔ "محبت کرنا ہوں اس سے۔"

"یہ محبت و حبت کچھ نہیں ہوتی۔ سب بکواس ہے۔" وہ تیوری چڑھا کر بولے۔ "ویسے بھی وہ عباسی ہیں اور ہم بٹ۔ کیسے میل کھا سکتے ہیں۔" ان کے تہجے میں فیصلے کی مضبوطی تھی۔

مودت کا رنگ اتر گیا۔ بھائی جان نے اسے ڈھیلا پڑنا دیکھ کر موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھایا اور اسے بہت پیار سے اپنے قریب بٹھالیا اور پیار سے پچکارتے ہوئے معاشرے کی اونچ نیچ سمجھانے لگے۔

"لوگ کیا کہیں گے بڑی بہو اعلا وکیل اور چھوٹی سیکنڈ ڈویژن لی اے پاس شاعرہ افسانہ نگار؟" ان کے تہجے میں واضح حقارت کے نشتر تھے۔

متوسط طبقے کا یہ ایک بڑا المیہ ہے، یہ لوگ احساسات و جذبات سے زیادہ ڈگریوں کو معتبر جانتے ہیں۔ صوفیہ بھی اسی نظریے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ بھائی جان نے میجر جنرل کی طرف سے آئے پروپوزل کا ذکر کیا۔ مزید ترقی کے چانسز دکھائے جو مابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے۔

"تم اپنی بہترین زندگی کے بارے میں سوچو۔ ویسے بھی ہم یہ محلہ چھوڑنے والے ہیں۔ کیا یہاں کی گھٹیا یادیں لے کر جانی ہیں؟" وہ ساٹ لہجے میں بولے۔

مودت نے آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس ہوا میں بکھیری، اسے ہونٹ مضبوطی سے بند کیے اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر آیا تھا۔ اس نے کئی دن کمرے میں قید گزارے۔ وہ سرخ آنکھوں سے گزرتا ایک ایک لمحہ سوچ رہا تھا۔ انکار کی اس میں ہمت نہ تھی۔ الفاظ سب ہو چکے تھے۔ اس کے کانوں میں بھائی کے الفاظ کی گونج تھی۔

"لوگ ایک رومانٹک شاعرہ کے ساتھ آرمی آفیسر کو شاید کسی اور ہی رنگ میں دیکھیں۔" آرام کرسی پر جھولتے ہوئے وہ ایک تخت پر رک گیا۔

ادھر صوفیہ پریشان تھی۔ مودت کو آئے ہفتے ہونے والا ہے مگر چھت پر گھر کے باہر کہیں نظریوں نہیں آتا۔ اس نے بہانے بہانے سے کتنے چکر لگائے مگر بے سود۔

ایک چڑھتی دوپہر میں وہ گیلے کپڑے پھیلانے کے لیے چھت پر آئی۔ وہ جھٹک جھٹک کر کپڑے تار پر ڈال رہی تھی۔ کپڑوں سے چھتیں ننھی بوندیں بھی اسے فرحت کا احساس دلانے سے عاری نہیں کیونکہ اس کی سوچوں کا مرکز دیوار پار تھا۔ اس نے عادتاً "دیوار کے ساتھ چوکی رکھ کر دو سری طرف جھانکا۔

سامنے ہی ستم گر گہری سوچ میں ڈوبا کھڑا تھا۔ اس نے تیزی سے دیوار پھلانگی اور قریب چلی آئی۔ خوشی سے اس کا چہرہ تھمتانے لگا۔

"کہاں تھے تم؟" وہ بے قراری سے بولی۔ "کیپٹن کا بیج سجا کر مغرور تو نہیں ہو گئے؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ سورج کی طرف پشت کیے کھڑا تھا اور وہ ہاتھ سے آنکھوں پر باڑھائے سورج کے سامنے کھڑی اس کی گہری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ بھنویں اچکا کر بولی۔ "تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" اس کا لہجہ ساٹ تھا۔

"ایسی کیا ضروری بات ہے۔ کسی لفظ کا مطلب تو نہیں پوچھنا۔ سوہان روح شادی مرگ۔" وہ اس کی بات کو مذاق میں لے گئی۔ "یاد ہے تمہیں شادی مرگ کا تم نے جو جملہ بتایا تھا شادی میں ہونے والی ہوالی

فائرنگ سے بچہ ہلاک ہو گیا تو اہل خانہ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”میں سنجیدہ ہوں۔“ وہ گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں بھی اب تشویش در آئی تھی۔ وہ بہت دیر تک لفظ بتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں دکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر کچھ شرمندگی پریشانی کے آثار تھے مگر اس کے الفاظ بہت سیات تھے۔

”صوفیہ! محبت کچی عمر کا ایک جذباتی لمحہ ہوتا ہے مگر کیریز زندگی کی روشن حقیقت۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔ ”جذباتی لمحوں پر کیریز قربان نہیں کیے جاسکتے۔“

وہ بول رہا تھا۔ صوفیہ اس کے چہرے کے بدلنے رنگ دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ کی باڑیچے گر چکی تھی۔ وہ اس کے لفظوں کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی۔ مگر حیران تھی یہ اتنے افسانوی لفظ کیسے بول گیا۔ سورج کی براہ راست کرنیں اس کی آنکھوں میں جاری تھیں۔ اسے کسی تپش کا احساس نہیں رہا تھا کیونکہ اس کی روح سورج نہیں کوئی اور جھلسا رہا تھا۔ وہ ساکن نظروں سے مسلسل اسے تک رہی تھی۔

”تم خاموش کیوں ہو؟“ وہ اسے مسلسل خاموش دیکھ کر دہل گیا۔

”کوئی لقب تو دو بے وفا خود غرض، قلربی۔ کوئی بد دعا ہی دے دو مگر خدا کے لیے خاموش مت رہو۔“

وہ اس کی طرف سے شدید رد عمل کا منتظر تھا۔ مگر وہ اس کی سوچوں کے برعکس خشک نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

وہ خود بھی اپنے اس رد عمل پر حیران تھی۔ اس نے تو یہی سنا تھا شاعر ہو یا مصنف معاشرے کا احساس ترین فرد ہوتا ہے۔ فوراً ”دلبرداشتہ ہو کر کمی میں گھلنے لگتا ہے۔ لیکن یہ راز تو آج فاش ہوا تھا۔ لکھاری تو بہت

مضبوط اعصاب کا مالک ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے حساس ترین موڑ پر بھی ضبط پر کماں دسٹر کر رکھتا ہے۔ وہ بھی اپنے مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا اس کے دل کی دھڑکن رک جائے کیونکہ وہ اس سے شدید محبت کرتی تھی مگر وہ خاموش نظروں سے اسے جا چتی رہی۔ دھوپ کی تیز شعاعوں میں اس کے چہرے کا بھورا رواں کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

”محبت میں طعنہ زنی یا بد دعا میں نہیں ہوتیں۔“ وہ کافی دیر بعد اس کی شرمسار نظروں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم خوش رہو۔ تمہیں بہت عروج ملے۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ سوکھی آنکھوں اور سپاٹ انداز کے ساتھ تیزی سے دیوار پھلانگ گئی۔ محبت میں اس نے ذات، رشتے، عہدے نہیں دیکھے تھے۔ بس خود ہی جگہ بنتی چلی گئی اب وہ اس جگہ کو سیٹ کر بڑے حوصلے سے اس کی زندگی سے چلی گئی۔ مبادا اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔

یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ سووت شکستہ قدموں سے واپس بیٹ چلا گیا۔ ہفتے بعد ہی پتا چلا صوفیہ اپنی ماں کے ساتھ بھارت چلی گئی ہے۔ جہاں اس کے ماموں رہتے تھے۔ صوفیہ کے والد کے انتقال کے بعد سے وہ انہیں اپنے پاس بلانے پر اصرار کر رہے تھے مگر صوفیہ مسلسل ایک سال سے اپنی ماں کو ٹالتی آئی تھی۔

”پی! یہ ہمارا ملک ہے۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔“ مگر اب ایسا کیا ہوا تھا جو وہ خاموشی سے اپنا ملک بھی چھوڑ گئی۔

کیپٹن صاحب کی شادی جنرل کی بیٹی سے ہو گئی۔ دل کے آئینے پر برسوں کی دھول پڑی گئی۔ مگر ایک کتاب کا رشتہ باقی تھا۔

صوفیہ تیزی سے شاعری کی دنیا میں مشہور ہوئی۔ ہر سال اس کی کوئی نہ کوئی کتاب افسانے یا شاعری کی زبان میں آنے لگی۔ اس کی ہر کتاب کا انتساب ”جیبی کے نام“ ہوتا۔ اس کی شاعری میں بے وفائی کی

بالکل بساندہ تھی بلکہ محبت، امن، خواہش، مگر صبر کا ہی پیغام ہوتا اس لیے وہ نہ صرف بھارت بلکہ پاکستان میں یکساں مقبول ہوئی۔

گاڑی ٹائر کی چرچراہٹ کے ساتھ ایک جھٹکے سے رکی۔ بریگیڈیر صاحب کی سوچوں کا ارتکاڑ ٹوٹا۔ وہ لمبے ڈگ بھٹے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کتنی ہی بار ذہن کو جھٹکا مگر ایک کے بعد ایک سوچ تھی۔ انہوں نے اپنی کیپ اتار کر سامنے میز پر رکھی اور خود کرسی کی پشت سے سر نکال کر جھٹ کو گھورنے لگے۔

”آخر یہ اٹھارہ سال بعد اب کیوں آرہی ہے؟“



صوفیہ حکومت پاکستان کی طرف سے منعقد کیے گئے بین الاقوامی مشاعرے میں مہمان خصوصی تھیں پاکستانی ہونے کی بنا پر انہیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا اور تقریب کے پاس مہینہ پہلے فوجی افسران کو بھی بھجوائے گئے۔ یہاں تو وہ طبیعت خرابی کا بہانہ تراش سکتے تھے کیونکہ ان میں صوفیہ کا سامنا کرنے کی سکت نہ پہلے تھی نہ اب مگر بیگم کا مسلسل عشائیہ پر اصرار۔ وہ گو گو کیفیت میں کرسی پر جھول رہے تھے۔

دو تین دن اسی گم صمم کیفیت میں گزرے۔ بالآخر وہ دن آن پہنچا جس دن تقریب تھی۔ بریگیڈیر صاحب طبیعت سازی کا بہانہ کیے گھر میں براجمان تھے۔ لاؤنج میں بیگم اور بچے آواز اوپچی کیے اسکرین کے سامنے بیٹھے مشاعرے کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ بریگیڈیر صاحب بھی بظاہر فیملی کا ساتھ دینے کے لیے شرمندہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مائیک کے سامنے بیٹھا شخص صوفیہ کے اعزاز میں مسلسل رطب اللسان تھا۔ ساتھ ساتھ بیگم صاحبہ بھی تمام ریکارڈ توڑنے پر بریگیڈیر صاحب کو طعنوں سے نواز رہی تھیں۔ بظاہر وسیع سوچ کے مالک بریگیڈیر صاحب جوان ہوتے بچوں سے ماضی کی جھلک چھپانے کے لیے کھسیانی ہنسی ہنستے رہے۔

”یار! ہم لوگوں کے پاس کہاں ٹائم ہوتا ہے اس قسم کی تقریبات کے لیے۔ تم اسے گھر بلا کر کیا کر رہیں۔ یہ لوگ میڈیا پر ہی اچھے لگتے ہیں۔“

نہ جانے کس دل سے بولے تھے۔ ان کی آواز کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”بیجیے! آپ کے میجر صاحب تو اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے جھوم رہے ہیں۔“ بیگم کی نظر انہی کی کمپنی کے میجر صاحب پر پڑی تو تڑپ کر بولیں۔

”خود نہیں جانتا تھا نہ جانتے کم از کم ہمیں ہی جانے دیتے۔“ انہیں شدید غصہ تھا۔

”ہو نہ۔“ بیٹے نے بھی نخوت سے گردن گھمائی۔ جیسے ہی صوفیہ نے اپنی تازہ غزل شروع کی۔ بیٹی نے شدت جذبات سے فلائنگ کس پلازا اسکرین پر اچھالنی شروع کر دی۔

ایک تو اسکرین پر رات کے منظر میں برقی قہقہوں کا سحر و سرا لاؤنج میں بیٹھے اپنے خاندان کا یہ عالم، بریگیڈیر صاحب کے لیے سخت تکلیف کا باعث تھا۔ اپنوں سے اپنا ہی درو چھپانا کتنا مشکل ہوتا ہے اس کا اندازہ بریگیڈیر صاحب کو اچھی طرح ہو رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے وہ پروگرام ختم ہوا۔



بریگیڈیر صاحب نے چھٹیاں لے رکھی تھیں۔ ڈیوٹی پر جانے کا دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ آج شام بھی لان میں بیٹھے دل ہی دل میں دنوں کا حساب لگا رہے تھے۔

”کل اتوار ہے، صبح اس کی فلائٹ ہے۔“ انہیں پورا شیڈول یاد تھا۔ ان کی نظر سامنے لان میں لگے نیٹ پر تھی۔ جس کی دونوں جانب بیٹا بیٹی اوپن ٹینس کھیل رہے تھے۔ بیگم بچوں کے قریب ہی کھڑی جج کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ کوچنگ بھی کر رہی تھیں۔

”سر! کوئی خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ جدید

طرز سے بنی بید کی کرسی پر بیٹھے بریگیڈیر صاحب کو گارڈ کی آواز نے چونکا دیا۔

”ہوں۔۔۔ کون۔“ کہتے ہی ان کی نگاہ براؤن آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوتے نسوانی حسن پر پڑی۔ وہ گہرے گلابی رنگ کی ساڑھی میں لپٹی ایک وقار کے ساتھ برہہ رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں اپنے پسندیدہ رنگ میں ملبوس اپنی ہی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم۔ السلام۔“ ان کے لہجے میں یو کھلاہٹ تھی۔ ”ایم۔۔۔ سوری۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ آج بھی ان کی یو کھلاہٹ ان کے لفظوں کی چغلی کھا رہے تھے۔

وہ خاموش سوکھی نگاہوں سے آج بھی صرف انہیں دیکھے گئیں۔ اتنے میں بیگم صاحبہ اور بچوں کی نظر پڑی۔ کھیل چھوڑ کر بھاگتے ہوئے قریب آئے۔

”آ۔۔۔ آپ۔۔۔ یہاں۔۔۔ آپ ہمارے گھر۔“ بیگم کی زبان اور الفاظ دونوں ہی خوشی میں بے قابو ہو رہے تھے۔ وہ کبھی اندر لاؤنج میں لے جانے کا کہتیں۔ کبھی حیران ہوتیں۔ ”ہمارا گھر کیسے ملا۔“ پھر ان کی یادداشت پر حیران ہوتیں۔ کوئی اتنے عرصے بعد بھی ہمایوں کو یاد رکھتا ہے۔

ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ کیسے خوشی کا اظہار کریں۔ وہ انہیں بتانا چاہتی تھیں کہ اس گھر کے مالک سے لے کر نوکر تک ان کے فین ہیں۔ وہ ان کی شاعری کی افسانوں کی دل کھول کر تعریف کر رہی تھیں۔ صوفیہ کو موقع دیے بغیر۔

بریگیڈیر صاحب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ صوفیہ کے لیے یہ قابل برداشت نہ تھا۔ وہ ہمت کرتی ہوئی وہاں رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ”بس آپ کی نوازش ہے“ آپ مجھ ناچیز کو یاد رکھتے ہیں۔“

بیگم بتانے لگیں بریگیڈیر صاحب کی اسٹڈی میں ان کی ہر کتاب موجود ہے۔ پھر اصرار کر کے پوچھنے لگیں۔ آپ کی ہر کتاب کا انتساب کس اجنبی کے نام

ہوتا ہے۔

”ہے ایک اجنبی۔“ وہ سامنے طنزیہ نظریں اٹھاتے ہوئے بولی۔

بریگیڈیر صاحب سامنے رکھی دوسری کرسی پر نکلے بوٹ کی نوک سے گھاس مسل رہے تھے۔ بیگم صاحبہ بٹلر کو چائے پانی کی ہدایات دینے کے لیے تیزی سے اندر کی طرف بڑھیں۔ بیٹے کو اپنا ہینڈی۔ کم یا دیا کہ کچھ یادگار ویڈیو بنالی جائے اور بیٹی کو آٹو گراف لینے تھے۔ سب اپنی اپنی چیزوں کے لیے ادھر ادھر بھاگے لیکن صوفیہ بہت تجلّت میں تھیں۔ وہ جانے کے لیے پرتو لے لگیں۔

”دراصل میں یہاں ایک خوش فہمی میں آگئی تھی۔ جس شخص سے میں ملنا چاہ رہی ہوں، آیا میں اسے یاد بھی ہوں کہ نہیں۔ کافی مراسم رہے تھے میرے اور اس کے درمیان۔“ وہ آج بھی تپتے اعصاب کو کنٹرول کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں بول رہی تھیں۔ بریگیڈیر صاحب کا دل کن پٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ چہرہ شرمندگی سے سرخ ہونے لگا تھا۔

”سب کچھ بھول کر جینا اتنا آسان نہیں ہوتا مگر مجبوری اور بزدلی میں بڑی بھوک ہوتی ہے صوفیہ! سب کچھ نکل کر بڑھتی رہتی ہے۔“ وہ شکستہ قدموں سے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہے تھے معلوم ہوتا تھا آواز گہرے گنوں میں سے آرہی ہے مگر صوفیہ ایک جانناز دلیر سپاہی جو ان کا محبوب بھی تھا ہارا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ تو صرف اپنی دعاؤں کی تاثیر دیکھنے آئی تھیں کہ کیا انہیں عروج ملا۔ وہاں عروج تو تھا خوشی بھی، مگر خالی لہجے میں سابقہ ملاقات والا کھوکھلا پن تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔ جاتے جاتے آخری بات کہی۔

”اللہ تمہیں مضبوطی دے مودت!“

وہ آج بھی اسے دعا ہی دے رہی تھیں۔



حیاتِ محکومہ

”آذر لندن آ رہا ہے۔ شام چار بجے تک وہ پہنچ جائے گا اسٹیشن۔“ ثانیہ نے اسے صبح ہی فون پر بتایا تھا۔

”آفس کے کام سے وہ دو دن سے برطانیہ میں تھا۔ اسکاٹ لینڈ سے اسے آج لندن آنا ہے۔“ ثانیہ نے تفصیل بتائی۔ ثانیہ کا وہ فون اس کے لیے کسی مجزے کے رونما ہونے کی خبر سے بڑھ کر تھا۔

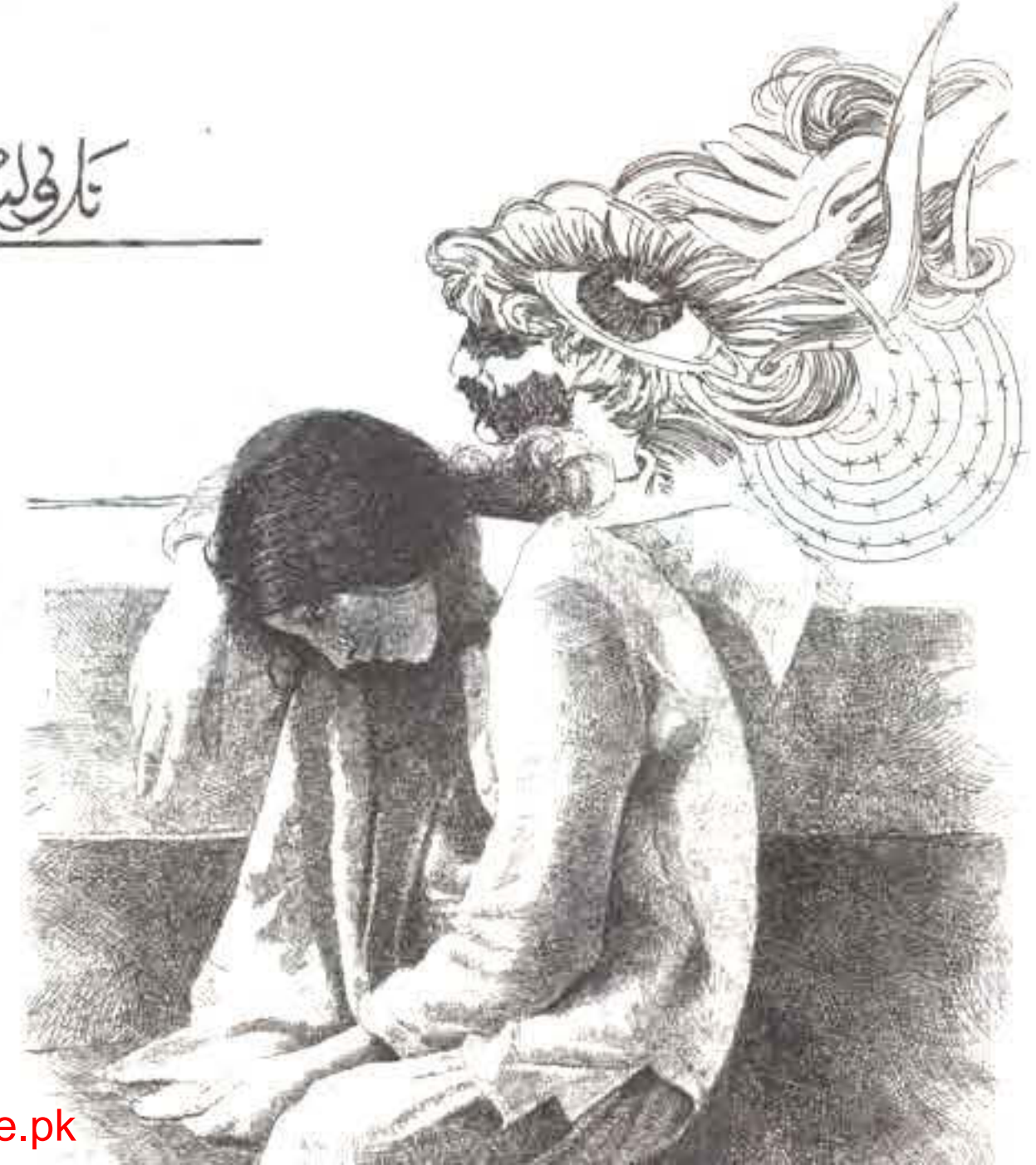
”آپ سے ملنے نہیں آ رہا آنٹی! اپنے کسی کام سے آ رہا ہے۔ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ آپ اسے دور سے دیکھ لیجئے گا۔ اگر اسے معلوم ہوا کہ میں نے آپ کو

اس کے آنے کا بتایا ہے تو وہ بہت ہنگامہ کرے گا، پلیز آنٹی!“

اور فریال نے ثانیہ سے وعدہ کیا کہ وہ آذر کو صرف دیکھے گی، ملے گی نہیں لیکن یہ وہ اس وقت بھی جانتی تھی کہ وہ جھوٹا وعدہ کر رہی ہے۔ وہ آذر کو دیکھے گی نہیں وہ اس سے لیٹ جائے گی۔ اسے پہنچ لے گی اور پھر بے تحاشا پیار کرے گی۔ وہ آذر کو دیکھ کر اس سے دور کیسے رہ سکتی ہے۔

وہ سات سال بعد اس سے ملنے والی تھی، دیکھنے والی تھی۔ جب وہ گھر چھوڑ کر گیا تھا، اس وقت وہ اٹھارہ

نارولیٹ



سال کا تھا۔ فریال کے لیے چھوٹا سا بچہ تھا۔ اب وہ خود ایک بچی کا باپ بن چکا تھا۔

اتنا لمبا عرصہ۔ اتنے بہت سارے دن۔ اتنی لمبی لمبی راتیں اس نے آذر کو یاد کرتے کرتے پکارتے اس کے لیے روتے ہوئے گزار دی تھیں۔ ثانیہ کا فون سننے ہی وہ فوراً لندن ریلوے اسٹیشن آگئی۔ اپنے گھر کو لاک بھی نہیں کیا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ خوشی کے مارے اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بس سے آنے کے بجائے وہ ٹیکسی سے آئی۔ وہ ایک ایسے چھوٹے بچے کی طرح لگ رہی تھی جو غبارے ہاتھ میں پکڑے اپنے والدین کے ساتھ پہلی بار آؤں کریم کھانے جا رہا ہو۔

اسٹیشن کی بھیڑ میں وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر اسے یاد آیا کہ آذر کو چار بجے تک اتنا ہے اور ابھی صرف گیارہ بجے ہیں۔ اس نے ثانیہ کو فون کیا۔

”کیا وہ لندن کے لیے نکل چکا ہے۔“ وہ ایک بار پھر سے تصدیق چاہتی تھی کہ وہ لندن آ رہا ہے۔

”ابھی وہ اسکاٹ لینڈ میں ہے آنٹی! آپ کو بتایا تھا نا کہ وہ۔ آپ کہاں ہیں؟“ ثانیہ اچانک چونک کر بولی۔

”میں اسٹیشن۔“

”آپ گیارہ بجے ہی اسٹیشن آگئیں؟ میں نے غلطی کی آپ کو بتا کر۔“ ثانیہ کو افسوس ہوا۔ یہ افسوس اسے تب نہ ہوتا اگر وہ فریال کی جگہ پر ہوتی۔

”پلیز آنٹی! گھر جائیے۔ اتنا وقت ہے۔ ابھی آپ یہاں کیا کریں گی؟“

”میں بہت خوش ہوں، تم میری فکر نہ کرو۔“ اسے خدشہ تھا کہ وہ چار بجے سے پہلے بھی آسکتا ہے، وہ اپنا ارادہ بدل سکتا ہے، سو جلدی آنے میں کیا حرج ہے۔ وہ اسٹیشن کے بیرونی دروازے کے پاس آگئی۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے وہ ہر آنے جانے والے کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ اسٹیشن کے اندر اسے نہیں ڈھونڈ سکے گی مگر یہاں آذر اس سے بچ کر نہیں گزر سکے گا۔ وہ قریب

ہی ایک جگہ بیٹھ گئی اور ٹکنکی لگا کر ہر ایک کو دیکھنے لگی ابھی اس کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا، مگر کون جانے وہ ابھی جائے۔

وہ گزرنے والوں کی شکل کی طرف دیکھتی اور پہچاننے سے پہلے ہی مسکرانے لگتی۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اس کے بیک جھپکنے کے دوران ہی کہیں آذر اس سے بچ کر نہ نکل جائے۔ وہ ایک لمحے بھی نظریں ادھر ادھر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

گیارہ سے بارہ اور بارہ سے ایک بچ گیا۔ وہ اسی ایک جگہ پر نظریں جمائے بھی کھڑی ہوئی۔ کبھی بیٹھ جاتی وہ خوش تھی مگر اسے چین و قرار نہیں تھا۔

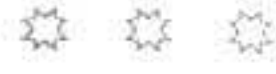
دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا، لیکن اسے بھوک پیاس محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کاؤنٹر تک جائے اور اسکاٹ لینڈ سے آنے والی ٹرین کا پوچھے، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اسے ”ٹرین لیٹ ہے یا ٹرین سرے سے آئی نہیں رہی“ جیسی منحوس خبریں سننے کو ملیں، جبکہ ایسی خبروں کا کوئی امکان نہیں تھا، لیکن اس کے نزدیک کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ وہم کو دل میں جگہ دینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ دل میں جگہ بنا رہے تھے۔

اس کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ آذر اس سے ملنے نہیں آ رہا۔ وہ وہاں ایسے انتظار کر رہی تھی جیسے آذر نے اسے فون کر کے وہاں آنے کے لیے کہا ہو۔

تکلیف اور خوشی نے اس کے چہرے پر شکنوں کو نمایاں کر دیا تھا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وہ آذر سے ملنے جا رہی تھی۔

اس کی اپنی ماں سے نفرت اتنی بڑھ گئی کہ وہ اسے سزا دینے کے لیے گھر ہی چھوڑ گیا۔ اچھی سزا تھی جو فریال نے خوب کائی۔ وہ ایک کرپٹ عورت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ خاص کر ایسی عورت کے ساتھ جس کی وجہ سے اس کا باپ اسے بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔ وہ ایک بری عورت تھی۔ وہ بار بار اسے کہہ

دیا تھا کہ وہ بری عورت ہے اور وہ اس عورت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔



”تم نے کشتیوں والے کام بھی شروع کر دیے۔“ وہ کچن میں کھڑی رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ آذر سامنے ہی بیٹھانی وی دیکھ رہا تھا، جب وہ بیگ ہاتھ میں لیے اس کے سامنے کھڑا ہو کر چلانے لگا۔

”ویدہ دلیری تو دیکھو۔ بے شرم ویسے ہی دلیر ہو جاتا ہے۔“

”جیسے تم ہو۔“ وہ بدستور اپنا کام کرتے ہوئے پلٹے بغیر بولی۔

”مجھے بے شرم کہا۔“ بیگ پھینک کر اس نے اس کی گردن پکڑ لی۔

”تمہیں تمہاری اصلیت بتا رہی ہوں۔“ اس سے اپنی گردن آزاد کروا کر وہ کچن سے باہر نکلے۔ آذر سما ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

”آذر! تم کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ آذر کے پاس آکر بولی۔ وہ جانتی تھی کہ اب یہ تماشا رات گئے تک لگا رہے گا۔

”بیٹھا رہنے دو اسے یہاں۔ اسے جانے دو سب کچھ۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ماں باہر کیا کیا کرتی ہے۔“

”آذر! آؤ میرے ساتھ۔“ آذر کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے کمرے میں لے آئی اور دروازہ بند کر دیا۔

”اس کی ماں سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرتی ہے باہر۔ یہ بتاؤں اسے یا یہ کہ اس کا باپ سولہ منٹ کام کر کے کما کر نہیں لاسکتا۔ اسے کھانا تو دور کی بات ہے۔“ وہ واپس آکر کچن میں کام کرنے لگی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے رسید اس کی آنکھوں کے سامنے لا کر لہرائی، جیسے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ رسید تو بیگ میں مل گئی۔ انگوٹھی کہاں ہے ہیرے کی؟

اسے عادت تھی اس کا بیگ اس کی الماری حتیٰ کہ کچن میں بنے دروازے تک چیک کرنے کی۔ جب وہ بالکل

خالی جیب ہو جاتا تو وہ گھر کی ہر چیز سوچتا پھرتا حتیٰ کہ گلدان اور لانڈری مشین بھی۔

”کس یار نے لے کر دی ہے یہ۔“

”تمہیں یقیناً یار کی فکر تو نہیں ہوگی۔ فکر تو تمہیں انگوٹھی کی ہے نا؟“ وہ برتن دھونے لگی۔

اس بات نے اسے اور طیش دلایا۔ اس نے اس کی کمر پر زور سے ایک لات ماری۔ انتہائی غصے میں وہ یہی کرتا تھا۔

”بنا حرام۔ کس نے لے کر دی ہے؟“ اس نے ایک سانس میں چار پانچ گالیاں بوے دیں۔

کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے وہ زمین پر ادھ موٹی ہو رہی تھی۔

”گھوگی کی تھی۔ آج وہ میرے ساتھ خریداری کرنے گئی تھی۔ اس کے پاس سامان بہت تھا۔ میں نے اسے بیگ میں رکھ لی۔“

”تو انگوٹھی اس نے نکال لی اور رسید تجھے پکڑا گئی؟“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

احلام حیات میں



فاخرہ جبین

قیمت - 400 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 32735021 فون نمبر: 37، اردو بازار، کراچی

الو کا پٹھا سمجھ رکھا ہے نا مجھے؟ اپنے باپ کی طرح جو تیری کمائی کھاتا ہے۔

”جانتے ہوئے وہ انگوٹھی لے گئی۔ رسید رہ گئی میرے بیک میں۔ گوگی سے فون کر کے پوچھ لو۔“ وہ جانتی تھی کہ ایک لات مارنے کے بعد وہ اب اسے سارے گھر میں گھسیٹے گا۔

مجھے یہ کہانی مت سنا۔ صرف اتنا بتا کہ یہ کس نے لے کر دی؟ تیرا کیا خیال ہے میں جانتا نہیں کہ وہ کمپنی کا ڈرائیور اور تو دونوں کیا کیا کرتے پھرتے ہو۔“

”وہ میرا بھائی بنا ہوا ہے۔ کچھ شرم کرو۔“

”تم جیسی عورتیں بھائی ہی بناتی ہیں۔ بہت بھائی بنا رکھے ہوں گے اور بھی۔ کمپنی میں بھی۔“

”جیسے تم نے اپنی کئی بہنیں بنا رکھی ہیں۔“

”ہاں! بنا رکھی ہیں۔“ وہ مارنے کے لیے اس کی طرف لپکا۔

”میرے پاس نہ آنا۔ میں پولیس کو فون کر دوں گی۔“

”پولیس۔ کر پولیس کو فون۔ لے کر۔“ کھڑا کھڑا وہ اسے اپنی ٹانگوں سے مارنے لگا۔ ”آج تو کہی لے اپنا شوق پورا۔ جا۔ جا کر۔“

جب وہ اسے مارتے مارتے تھک گیا تو رسید اٹھا کر آذر کے کمرے میں آگیا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

آذر پہلے ہی باہر کی آوازوں سے سہا بیٹھا تھا۔

”یہ دیکھو آذر!“ نادر نے آذر کو گود میں بٹھایا۔ اس کا ماتھا چوم اور رسید اس کے ہاتھ میں دی۔ ”تمہاری ماں نے اتنے بہت سارے پیسوں کی خریداری کی ہے۔ بہت مہنگی مہنگی چیزیں لی ہیں۔ یہ سب اسے اس کے دوست نے لے کر دی ہیں۔ تمہاری ماں اور وہ دوست آپس میں بہت خوش رہتے ہیں۔ تمہاری ماں نہ میرا خیال رکھتی ہے اور نہ ہی تمہارا۔ آج میں نے پوچھا کہ وہ آدمی کون تھا تو لڑنے لگی۔ ہمارا مذہب عورت کو ایسی آزادی نہیں دیتا۔ ایسی عورت کو بدکردار کہتے ہیں میں سمجھتا ہوں تو مجھ سے لڑتی ہے۔“

سات سالہ آذر سر اٹھا کر حیرت سے اپنے باپ کی

باتیں سن رہا تھا۔

”دروازہ کھولو نادر! خدا کے لیے بچے پر رحم کرو۔“ فریال دھڑا دھڑا دروازہ پینے لگی۔ ”وہ نفسیاتی مریض بن جائے گا۔ اپنے بچے پر تو رحم کرو نادر!“

”اسے تمہارے کروتوت بتا رہا ہوں۔“ نادر نے چلا کر کہا۔

وہ مسلسل دروازہ پیٹے جا رہی تھی جب تک کہ اس نے دروازہ کھول نہ دیا۔

”کیوں۔۔۔ تم نہیں چاہتیں اسے سب معلوم ہو۔۔۔“

فریال اس کی بات سنے بغیر آذر کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے آئی اور دروازہ لاک کر لیا۔ آذر اس سب ڈرامے کے دوران خاموش ہی تھا۔ وہ ہر بار خاموش ہی رہتا تھا۔

”پاپا مذاق کر رہے تھے آذر! تمہارے ساتھ۔ تم جانتے ہو نا، کبھی کبھی انہیں غصہ آ جاتا ہے۔“ وہ آذر کا سر سہلانے لگی۔

ایک عرصے سے آذر کی معمولی کارکردگی پر اسے بار بار اسکول بلایا جا رہا تھا۔ آذر دن بدن صفی ہوتا جا رہا تھا۔ اسکول کے ہی ڈاکٹر نے آذر کے لیے نفسیاتی ڈاکٹر تجویز کیا تھا۔ ایک ماہ سے فریال، آذر کو ڈاکٹر کے پاس لے کر بھی جا رہی تھی۔ لیکن وہ ٹھیک کیسے ہونا۔

ٹھیک ہونے کے لیے اس کے ماں اور باپ دونوں کا ٹھیک ہونا ضروری تھا اور ایسا ناممکن تھا۔ شروع سے ہی وہ کم گو تھا، لیکن گزرتے وقت نے اسے خاموش تر بنا دیا۔ لندن میں آذر، فریال کا کل اٹھائے تھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا۔

دس سال پہلے فریال جب بیاہ کر لندن آئی تھی تو اتنی اذیت ناک زندگی کے بارے میں اسے گمان تک نہیں تھا۔ وہ سرکاری اسکول سے آٹھ جماعتیں پاس تھی۔ نادر اس کا دوسرا بڑا کارشتہ دار تھا۔ چند سالوں سے وہ لندن میں ہی مقیم تھا۔ نادر نے ہی فریال سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تھا، کیوں؟ وہ نہیں جانتی تھی۔

شادی کے فوراً بعد ہی وہ نادر کے ساتھ لندن

آئی۔ لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ خود وہ بھی کرتی تھی۔ وہ گھر میں سب سے بڑی تھی اور کڑھائی سلائی کا کام کر کے گھر کے لیے ایک معمولی سا سہارا بنی ہوئی تھی۔ اس کے چار چھوٹے بہن بھائی سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے اور باپ پوسٹ آفس میں چوکیدار تھا۔ وہ بے حد غریب نہیں تھے۔ صرف اتنے کہ وہ تین وقت کا کھانا ہی سہولت سے کھا سکتے تھے بس۔

وہ لندن جا رہی تھی یہ ان کے گھرانے کے لیے قارون کے خزانے جیسی بات تھی۔ وہ خزانہ نادر اور لندن تھے۔ لندن ایک ایسی جگہ جہاں جانے کا اس کی ساتویں نسل بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

لندن میں نادر اسے ایک کمرے کے ڈربے نما گھر میں لے آیا۔ دو دن بعد ہی وہ اسے دو اؤں کی ایک کمپنی میں لے گیا۔ نادر نے اسے ڈبل ڈیوٹی ورکرز میں لگوا دیا تھا۔ اسے اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا۔ محنت کرنے پر اسے اعتراض نہیں تھا۔ اپنے چھوٹے سے شہر میں بھی وہ محنت ہی کرتی تھی۔

نادر اس سے اس کی ساری تنخواہ لیتا تھا۔ نادر چند گنی چنی چیزیں کھانے پکانے کے لیے لے آتا۔ وہ لندن میں پاکستان سے زیادہ غریب کا سامنا کر رہی تھی۔

نادر کا کہنا تھا کہ وہ اس قرض کو ادا کر رہا ہے جو اسے لندن لانے کے لیے اس نے لیا تھا اور وہ بہت زیادہ تھا جس کے لیے وہ بھی دن رات کام کر رہا تھا۔ وہ چھوٹے شہر کی ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرتی تھی۔ اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی تھی اور لندن آکر رہنے میں ہی بہت خوش تھی۔

”انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش۔ بہت لوگ تم جیسی بیویاں امپورٹ کرتے ہیں وہاں سے۔“

یہ گوگی تھی۔ کمپنی میں اس کے ساتھ کام کرتی تھی اس کی کچھ جھجک ختم ہوئی اور اس نے بولنا اور دوسروں کو سننا شروع کیا تو اسے بہت سی نئی باتوں کی سوجھ بوجھ آنے لگی۔ جوئی صرف اس کے لیے تھیں۔ اس کی بہت سی پاکستانی اور انڈین عورتوں سے

گوگی نے ہی کرائے پر گھر لے کر دیا۔ کچھ اپنے جمع شدہ پیسے اور کچھ اس نے گوگی سے ادھار لیے اور وہ دو کمروں کے فلیٹ میں کرائے دار بن کر رہنے لگی۔

صاف ستھرا گھر اس کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی لایا۔ اسے اچھا لگتا تھا اس گھر میں رہنا۔ حیرت انگیز

دوستی ہو گئی تھی۔ گوگی سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ کھانے کے دورانے میں گوگی ہی ان سب کو یکچروٹی۔

”ایک یہ ہے نرملا۔ دس سال سے یہاں کام کر رہی ہے۔ آج تک میں نے اسے ڈھنگ کی ساڑھی میں نہیں دیکھا اور یہ پاکستان کی لڑکی نرملا سے بھی آگے ہے۔ اس نے لندن آکر آس کریم تک خرید کر نہیں کھائی۔“

فریال اس کی سچائی پر افسوس ہو گئی۔ یہ گوگی ہی تھی جو اسے گلے بگاڑے سمجھاتی رہتی تھی کہ وہ نادر کو اپنا شوہر سمجھے۔ اسے اپنا آقا نہ بنائے۔ اسے سارے پیسے نہ دیا کرے کچھ اپنے پاس بھی رکھا کرے۔

پہلی بار مار بھی اسے اسی بات پر پڑی تھی؛ جب اس نے نادر کو آدھے پیسے دیے تھے اس نے اس کی مار کھائی، مگر پیسے آدھے ہی دیے۔ پہلی بار مشکل لگا مگر اس نے کر لیا۔ وہ اپنے گھر پیسے بھیجنا چاہتی تھی۔ اس کا باپ بیمار تھا۔

”مگر وہ کماتی تھی تو اس کی کمائی پر صرف اسی کا حق تھا۔“ یہ گوگی کا کہنا تھا جسے وہ جلدی ہی سمجھ گئی، ٹھیک دو سال بعد۔ ہر بار نادر اسے پیسوں کے لیے مارتا۔ خود وہ پتا نہیں کیا کرتا تھا۔ کبھی دنوں کے لیے غائب رہتا تھا اور کبھی ہفتوں کے لیے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس سے پوچھے کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

وہ اس کی مار کھا لیتی تھی مگر پھر بھی اس کی مار اور غصے سے ڈرتی تھی۔ تھوڑا بہت بھی وہ اپنی دوستوں کے کہنے پر بول لیتی تھی۔ تین سال بعد جب آذر آنے والا تھا تو گوگی کے مشورے پر ہی فریال نے گھر بدل لیا۔

”ہمت ہے تمہاری۔۔۔ تم اس غسل خانے جتنے گھر میں رہتی ہو۔“

گوگی نے ہی کرائے پر گھر لے کر دیا۔ کچھ اپنے جمع شدہ پیسے اور کچھ اس نے گوگی سے ادھار لیے اور وہ دو کمروں کے فلیٹ میں کرائے دار بن کر رہنے لگی۔

صاف ستھرا گھر اس کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی لایا۔ اسے اچھا لگتا تھا اس گھر میں رہنا۔ حیرت انگیز

طور پر نادری نے اس کے گھر بدلنے پر کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔ کرتا بھی کیوں گھر کا کرایہ بھی اے دیتا تھا اور اخراجات تو وہ پہلے ہی خود سے اٹھاتی تھی۔ جب نادری پورے پیسے لے لیتا تھا تب بھی گنی چنی چیزیں ہی پکانے کے لیے لاتا تھا۔

”تم جیسی پاگل عورتیں ہی مردوں کو شیر بناتی ہیں۔“ گوگی اسے کافی عرصے سے سمجھا رہی تھی کہ وہ نادری کو پیسے دیتا بند کر دے۔ گھر کا کرایہ روز مرہ کے اخراجات، آذر کی ضروریات، اس کی اپنی صحت، مگر وہ کیسے یہ سب کرتی۔ وہ بار بار اسے یہی دھمکی دیتا تھا کہ وہ اسے پاکستان واپس بھیج دے گا۔ وہ پاکستان جانے سے ڈرتی تھی۔ یہاں تو وہ پھر بھی اچھا خاصا کمائی تھی گھر بھی پیسے بھیج دیتی تھی۔ وہاں وہ کیا کما سکتی تھی۔ وہی دو ڈھائی ہزار مہینے کے۔

نادری اس کے گھر میں چھپا کر رکھے پیسے بھی نکال کر لے جاتا تھا۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ وہ اکیلی گھر چلاتی ہے، بچے کو سنبھالتی ہے۔

ایک دن پاکستان سے اس کے گھر والوں کا فون آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ نادری کی پاکستان میں موجودگی کی اثراتی اڑتی خبر ان تک پہنچی ہے۔ نادری مہینے سے غائب تھا۔ وہ اسے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانے کا بتا کر گیا تھا۔

”اڑتی اثراتی خبر سچ بھی ہو سکتی ہے۔“ گوگی کو اثراتی اثراتی خبر پر یقین تھا۔

”لیکن وہ پاکستان جائے گا کیوں؟“ فریال کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تمہاری طرح کی ایک اور لینے۔“ گوگی سنجیدہ تھی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

اس نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا کہ نادری یہیں ہے۔ وہ انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”اپنے گھر والوں سے کہو! وہاں پتا کریں۔ وہ وہیں ہے۔ مجھے یقین ہے۔“

”ابا بیمار رہتے ہیں۔ میں انہیں پریشان کرنا نہیں

چاہتی۔“

”پھر خود نکٹ کٹاؤ اور جاؤ۔“ گوگی کو غصہ آ گیا۔ وہ اتنی سمجھ دار ہمت والی ہوتی تو ابھی تک نادری کی بیوی نہ ہوتی۔

جب نادری آیا تو اس نے اس سے پوچھا۔

”پاگل تو نہیں تمہارے گھر والے۔ مجھے کیا ضرورت تھی پاکستان جانے کی؟“

”اس کا پاسپورٹ دیکھنا تھا۔ دیکھا؟“ گوگی پوچھ رہی تھی۔

”وہ تو اسی کے پاس ہوتا ہے۔ میں کیسے دیکھتی؟“

”پھر جا کر اپنا ڈربا چیک کر۔“ گوگی نے نہ صرف مشورہ دیا بلکہ اسے ساتھ لے کر بھی گئی۔

اس دُربے میں واقعی ایک اور مرغی موجود تھی، انتہائی سادہ اور سہمی ہوئی۔ دو دن پہلے ہی وہ وہاں آئی تھی۔

”نادری کون ہے تمہارا؟“ گوگی نے ہی ساری پڑتال کی۔

”شوہر۔“

”آں۔ اچھا۔ ہمارا مت بتانا۔ ہم یہاں پہلے کرائے دار تھے۔ اس لیے نادری کو جانتے ہیں۔“ گوگی نے بچی کے گالوں پر چٹکی بھری۔ وہ بچی ہی تھی جو اکیلی وہاں بڑی تھی۔

”کہنا تھا تمہیں۔ دیکھ لی اس کی نئی بیوی۔ نئی فریال۔“

”تم پاکستان سے ایک اور بیوی لائے ہو؟“ دونوں بعد جب وہ گھر آیا تو فریال نے اس کے بیٹھنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اس کی بات پر وہ کافی دیر تک خاموش ہی رہا۔

”بیوی نہیں ہے میری۔ میرے دوست کی رشتہ دار ہے۔ اسے یہاں کام کرنا تھا۔ پیر میرج کرنا پڑی اس کے ویزے کے لیے۔ غریب ہے، بہن بھائیوں کی واحد کفیل ہے۔ میں نے تو مدد کی ہے اس کی۔“ وہ

اسے اور تین چار باتیں سن کر سونے چلا گیا۔

”پاگل! اس لڑکی کی شکل یاد کر۔ وہ تجھے لگتی ہے برطانیہ آکر کام کرنے والی وہ تو شاید کبھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلی ہوگی کبھی۔“

گوگی نے اسے سمجھایا بہت مثالیں دیں مگر اس میں شاید سچ کو قبول کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ خود کو بھی دھوکا دے رہی تھی۔ اس نے نادری کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

”جس عورت کے ساتھ دھوکا ہوتا ہے۔ اس دھوکے میں آدمی وہ خود شریک ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنا دماغ استعمال نہیں کرتے۔ وہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔ عذاب صرف برے لوگوں کو ہی نہیں ملنا چاہیے۔ انہیں بھی ملنا چاہیے جو برے لوگوں کو شہہ دیتے ہیں۔“ گوگی کو بے تحاشا غصہ تھا فریال پر۔

کچھ دنوں تک نادری باقاعدگی سے گھر آتا رہا۔ گھر کا ماحول بھی ٹھیک ہی رہا۔ ایسے دنوں میں آذر بہت خوش ہوتا تھا۔ جب نادری زیادہ سے زیادہ وقت گھر میں گزارتا تھا۔

چند دنوں بعد اس کی پرانی ڈگر لوٹ آئی۔ فریال اس کی زندگی میں ایک ملازمہ سے برہم کر نہیں تھی۔ ایک بار مارنے کے بعد اس کا ہاتھ کھل گیا تھا۔ وہ بات بات پر اسے بلا وجہ مارتا تھا تاکہ وہ اس کے سامنے خوف زدہ ہی رہے۔

آذر بڑا ہو رہا تھا اور فریال نہیں چاہتی تھی کہ اس کے سامنے کوئی لڑائی ہو۔ وہ اس کا واحد اثاثہ تھا۔ اسے اس کی تعلیم کے لیے اس ملک میں رہنا تھا۔ وہ اپنے بچے کو غربت میں واپس لے جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ڈبل ڈبل کام کرتی تھی۔ ہفتے کے پانچ دن دواؤں کی کمپنی میں اور ہفتہ اتوار ایک گودام میں، جہاں اس کا کام صفائی کرنا تھا۔ گھر میں اس کے بھائی، بہن بڑے ہو رہے تھے۔ ان کے لیے اسے الگ سے محنت کرنا پڑتی تھی۔ ان کا مستقبل بھی فریال کے ہاتھوں میں ہی تھا۔

نادری کی بدترین عادت یہ تھی کہ وہ اس کے پاس کوئی

پیسہ نہیں رہنے دیتا تھا۔ وہ گھر آتا ہی کھانے اور پیسے لینے کے لیے تھا اور ہر بار مار، خاص کر آذر کے سامنے مایہ نچنے کے لیے اسے نادری کو پیسے دینے ہی پڑتے تھے۔ وہ نادری کے لیے کسی نہ کسی طرح پیسے بچا کر رکھتی۔

”میں اخبار کا نمائندہ تمہارے گھر بھیجتی ہوں۔ تم اسے اپنی کمائی سناؤ۔“ گوگی ہر بار اسے اکساتی مگر وہ چھوٹے شہر کی چھوٹی عورت بڑی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

”نہیں! نادری مجھے طلاق دے دے گا۔“

”جب خود کو اور اپنے بچے کو تم پال رہی ہو تو طلاق ہو جانے سے کیا فرق پڑے گا؟“

”میں اکیلا ہونے سے رہنے سے ڈرتی ہوں۔“

اکیلے رہنے سے ڈرتی ہو؟ اکیلے مار کھاتے نہیں ڈرتیں؟ اس کے جوتے اپنے منہ پر کھاتی ہو اور اس کے منہ میں اپنی کمائی ڈالتی ہو۔ جو جوتی کالے اسے پھینک دیتے ہیں۔“

”نادری جوتی نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہا، نادری تو تمہارے پاؤں کی جوتی بھی نہیں ہے۔ میرے پہلے شوہر نے جب اپنے جوتے کی نوک میرے منہ میں گھسائی تو میں نے اسے اپنے لیے آخری بار سمجھ لیا۔ اسی رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جوتوں کو اپنے پیروں میں رکھوں گی۔ اپنے سر پر نہیں پڑنے دوں گی۔ جو ڈرتے ہیں وہ زندگی نہیں گزارتے فریال! وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے بنائی گئی دونخ میں خود کو جلاتے ہیں۔ یاد رکھنا فریال! ظلم کا ہر باب ہم خود اپنے لیے لکھتے ہیں۔“

فریال صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”میرا دوسرا شوہر انسان ہے۔ میں نے اپنی زندگی سے اس جانور کو نکال دیا۔ اب میں خوش ہوں اس دنیا میں برے بھی ملتے ہیں اور اچھے بھی۔“

”میں آذر سے اس کا باب نہیں چھین سکتی۔ تم جانتی ہو بروکن فیملیز کے بچے کیسے ہوتے ہیں۔“

”بروکن فیملیز کے بچے جیسے بھی ہوتے ہیں وہ

انسان ہی رہتے ہیں۔ نادر کے زیر سایہ تو آذر انسان بھی نہیں رہے گا۔ خود پر رحم کرو۔ آذر بڑا ہو کر جان جائے گا کہ تمہارے لیے طلاق کتنی ضروری تھی۔ پاکستانی ان بڑھ بیویوں والی سوچ کو آگ لگا دو۔ طلاق لے لو۔“

لیکن آذر کا مکمل خاندان کا خواب ٹوٹ جائے گا۔

وہ ”we are family“ میری بہت شوق سے دیکھتا ہے گوگی۔

”تم بچھتاؤ گی فریال! امید اچھے کی کی جاتی ہے۔ نادر سے کسی اچھے کی امید مت رکھنا۔ اچھے وقت پر طلاق لے لو۔ آذر ابھی چھوٹا ہے۔“

”آذر ابھی چھوٹا ہے اسی لیے تو۔۔۔ نادر کے گھر آتے ہی وہ اس کا سایہ بن جاتا ہے۔ نادر بہت پیار کرتا ہے آذر سے۔“

”ان دونوں کا یہ پیار تمہیں لے ڈوبے گا۔ اسے تمہارا دن رات کا کام کرنا یاد نہیں رہے گا۔ ہفتے بعد ملنے والا باپ کا پیار یاد رہے گا“ آذر تمہارے ہاتھ سے کھائے نوالے بھول جائے گا۔“

”وہ بے شک باپ سے پیار کرے۔ مجھے تو بس اپنا بیٹا ایک کامیاب انسان چاہیے۔“

”ایک وقت میں تمہیں صرف آذر کا پیار ہی چاہیے ہو گا۔ یاد رکھنا! اس وقت آذر کا پیار ہی سب کچھ ہو گا۔“



وہ خیالوں میں اتنی گم نہیں تھی کہ بھول جاتی کہ وہ وہاں کیوں آئی ہے۔ ایک بار پھر اس نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔ چار بجنے میں چند منٹ تھے۔ خوشی خوشی وہ ہر گزرنے والے کو دیکھتی رہی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وہ مسکرا رہی تھی۔ آج اس کا بیٹا آ رہا تھا۔ فریال نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آذر سے بالکل چھوٹے بچوں کی طرح لپٹ جائے گی تو وہ کیا کر لے گا کچھ نہیں اور وہ لیٹی ہی رہے گی۔

پانچ منٹ۔ دس منٹ۔۔۔ فریال نے قریب سے

گزرتی ایک عورت سے اسکاٹ لینڈ سے آنے والی ٹرین کا پوچھا۔ وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ تصدیق ہو چکی تھی ٹرین آچکی تھی۔ آذر بھی بس باہر آئے ہی والا تھا۔ وہ اور جاق و چوند ہو کر دیکھنے لگی۔

وہ آنے ہی والا ہے۔ بس تھوڑی دیر میں وہ میرے سامنے کھڑا ہو گا۔



جب آذر ذرا اور بڑا ہوا تب اسے معلوم ہوا کہ نادر اور اس کے درمیان ہونے والی تکراروں اور لڑائیوں کا اس نے کتنا گہرا اثر لیا تھا۔ آئے دن اس کے رویے کی شکایت اسکول سے آنے لگیں۔ وہ نادر کی طرح ہی بد تمیز اور اکھڑا ہوا جا رہا تھا۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ آذر کے اچھے گریڈ کے بجائے اسے اس طرح کی رپورٹس ملیں۔

اب اس نے اور زیادہ کوشش کرنی شروع کر دی کہ نادر سے اس کا سامنا ہی نہ ہو، لیکن چھوٹا سا گھر تھا اور نادر اپنی عادت سے مجبور تھا۔ وہ کوئی بھی ملاقات لڑے بغیر نہیں گزارتا تھا۔ زیادہ لڑائی اس کے نشے میں ہونے کی وجہ سے ہوتی تھی۔ اس کے آتے ہی فریال اسے کھانا کھلا کر جیسے تیسے جمع کیے گئے پیسے پکڑا دیتی۔ اس سے وہ یہ سمجھنے لگا کہ شاید فریال زیادہ ہی کمانے لگی ہے۔ وہ اس سے اور زیادہ پیسے مانگنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ نادر کے سامنے سب تدبیریں الٹی ہی ہوتی تھیں۔ آذر سے وہ نادر کے خلاف کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کرتی تھی۔ آذر یہی جانتا تھا کہ وہ دوسرے شہر جاب کرتا تھا اور چھٹی ملنے پر ہفتوں بعد ہی گھر آتا ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے اسکول جانے والے بچے کے ذہن پر اور کتنا بوجھ لادتی وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کا باپ نشہ منی ہے، جو اکیلے ہی اپنی بیوی کی حلال کی ساری کمائی لے اڑتا ہے۔

”تم اپنے گھر پیسے بھجواتی ہو؟“

”نہیں۔! اس نے صاف جھوٹ بولا۔

”میرے ساتھ ہیرا پھیری نہ کرو فریال!“ اس نے

دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ”میرے پاس ثبوت ہے۔ اپنے منہ سے خود اگل دو، ورنہ جلتے چولے پر رکھ دوں گا۔“

”ایک دو بار۔“ وہ انکی۔ ”میں ضرورت تھی تو۔۔۔“

”ضرورت کی کچھ لگتی۔ تو ان کی ماں ہے۔؟ جانتی ہے میرے کتنے پیسے لگے ہیں مجھے یہاں لانے میں؟ کتنے عیش سے رہ رہی ہے تو یہاں۔ شوہر کو ایک روپیہ نہیں دیتا اور اپنے بھوکے بچے، بمن بھائیوں پر بہت ترس آتا ہے۔“

آذر کے سامنے وہ ایسے ہی بڑے بڑے جھوٹ بولتا تھا۔ وہ جانتا تھا آذر فریال کی کمزوری ہے اور وہ اتنا گھاگ تھا کہ آذر پر قطرہ قطرہ زہر نیکار رہا تھا۔

”مجھ سے تو کہتی تھی کہ آذر کے کمپیوٹر کے لیے پیسے جمع کر رہی ہوں۔ تو تو ان کے لیے نان نفقے کا انتظام کر رہی تھی۔“ نادر نے ایک اور جھوٹ گھڑا۔

”آذر! ادھر آؤ۔“ آذر بھاگ کر اپنے پیپا کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

”تمہاری ماما نے سارے پیسے اپنے بمن بھائیوں کو پاکستان بھجوا دیے ہیں جو میں نے اسے تمہارے لیے دیے تھے۔“

”آذر کو کیوں پریشان کر رہے ہو نادر۔ آذر! اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”یہ یس رہے گا۔ سب سنے گا۔“

”خدا کے لیے نادر! اپنے بیٹے پر رحم کرو۔ اب نہیں بھیجوں گی پیسے وہاں۔ آذر بیٹا! جاؤ جا کر کھیلو۔“

”یاد رکھنا فریال! میرے ساتھ کوئی جالا کی نہ کرنا۔“ آذر کے جاتے ہی نادر نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔ ”بیٹا چھین کر تمہیں پاکستان چلتا کروں گا۔“

”نادر کو بتانا تھا یہ لندن ہے۔ پاکستان نہیں جہاں وہ بیٹا چھین لے گا۔ زبان تو تمہارے پاس ہے نہیں۔ عقل کب آئے گی؟ ایک شخص کو شوہر بننے کے تم پیسے بھی دے رہی ہو۔ اس سے مار بھی کھا رہی ہو اور ڈرتی بھی اسی سے ہو۔“

”کیا کروں پھر۔ ذرا میں ادھر ادھر ہوتی ہوں تو آذر سے پتا نہیں کیا کیا کرتا رہتا ہے۔ کچھ دن پہلے اسے کہہ رہا تھا، ”اپنی ماما پر نظر رکھا کرو۔“

”واہ۔۔۔ ایک بچے سے کہہ رہا تھا۔ داد دیتی ہوں نادر کو۔ ابھی بھی عقل پکڑ لو۔ سانپ ہے نادر۔ تمہارے بچے کو زہر پلا رہا ہے۔“

”پھر کیا کروں؟“ وہ اور الجھی۔

”چلتا کرو۔ آذر کا دماغ خراب کر دے گا۔ نامعلوم اور کیا کیا کرتا ہے اسے۔ اپنے ہاتھوں آذر کو دوسرا نادر مت بناؤ۔“

”کیسے چلتا کروں۔“ وہ بے بسی سے گوگی کو دیکھنے لگی۔ طلاق کے نام سے ہی اس کی روح فنا ہوتی تھی۔ ان ہی دنوں وہ کمزوری اور نقاہت سے گودام کے اسٹور میں کام کرتے ہوئے چکر اکر گر گئی۔ ڈاکٹر سے چیک اپ کے بعد اسے گودام کے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ ایک بنگالی ڈرائیور تھا اور اس کے ساتھ فریال کی اچھی دعا، سلام تھی۔ ”موتا“ چائے کے لیے وہ اسے گھر کے اندر لے آئی۔ چائے پی کر وہ جا ہی رہا تھا کہ نادر آ گیا۔ اس نے بنگالی کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی اس بات پر نادر ضرور لڑے گا۔ لیکن وہ لڑا نہیں بلکہ اس کی گردن دیوچ لی اور اسے زمین پر پٹخ دیا۔ اپنے بھاری جوتوں سے اسے مارنے لگا۔ وہ نشے میں تھا اور اس کی سرخ آنکھیں باہر آنے کو تھیں۔ وہ اسے گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔

”مجھے شک تھا۔ ذلت دکھا دی نا! ایسے ہی تو اتنی زبان نہیں چلتی، بہت سوں کی شہہ ملی ہوئی ہے نا، بہت سہارے۔ بہت پیسے بہت عیش۔“

اس نے اپنے بھاری جوتے سے اس کا منہ مسلا۔ وہ اس کے ہونٹوں اور گالوں پر اپنے جوتے کے تلوے رگڑ رہا تھا۔ فریال کے دانتوں اور ہونٹوں سے خون نکلنے لگا۔

”دیکھ آذر! اپنی ماں کے کرتوت۔ آج اپنے یار کو گھر لے آئی۔ اسی لیے یہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیتی

لے آئی۔ اسی لیے یہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیتی

لے آئی۔ اسی لیے یہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیتی

لے آئی۔ اسی لیے یہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیتی

لے آئی۔ اسی لیے یہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیتی

مجھے منہ نہیں لگاتی۔“ غصے اور توہین کے احساس سے فریال کا منہ سرخ ہو گیا۔ اس نے بمشکل اٹھ کر ہر وہ چیز اس پر پھینکنی شروع کر دی جو اس کے ہاتھ آئی۔ اس سے پہلے وہ صرف خود کو بچاتی تھی۔ آج پہلی بار اس نے مدافعت کی کوشش کی۔

”مجھے ہاتھ لگا کر دکھانا اور! اب تو۔“

پندرہ منٹ کے اندر اندر پولیس نادور کو لے گئی۔ ”بھاگ جا آؤ۔ اس عورت کے شر سے نجات حاصل کر لے۔“ پولیس کے آنے کے باوجود وہ زخمی کتے کی طرح بھونک رہا تھا۔

”یہ تیرے ساتھ بھی یہی کرے گی جو میرے ساتھ کیا۔“

آذر ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ فریال نے اسے اندر کمرے میں لے جانے کی کوشش کی، مگر وہ اپنی جگہ سے کس سے مس نہیں ہوا۔

وہ آخری منظر تھا جو آذر نے دیکھا اور وہ آخری مار تھی جو فریال نے اس دن کھائی۔ گوگی کی مدد سے اس نے طلاق بھی لے لی۔

اس کا خیال تھا کہ نادور اسے تنگ کرے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ویسے بھی کورٹ کے آرڈر کی وجہ سے اسے فریال سے ایک ہزار گزر دور ہی رہنا تھا۔ فریال نے اپنے گھر والوں کو سب کچھ بتا دیا۔ صرف ایک آذر تھا جو سب کچھ نہیں جانتا تھا۔ آذر تو وہ جانتا تھا جو اس کے پیالے سے بتایا کرتے تھے۔

”تمہاری ماما کام کرنے نہیں جاتی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے جاتی ہے۔“

آخری بات جو اسے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ماما اپنا دوست گھر لے آئی تھیں جس پر پیالہ ناراض ہو گئے اور ماما نے پولیس کو بلوا لیا۔

آذر نادور کو یاد کر کے بہت روتا تھا۔ روتی وہ بھی تھی اس سے اپنے بیٹے کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ پھر آذر اپنے خول میں بند ہوتا چلا گیا۔ بہت ضرورت کے وقت ہی وہ فریال سے بات کرتا۔ وہ بہت بد مزاج اور چڑچڑا ہوا گیا۔

میں چاہتی ہوں نادور آذر سے ملنے آجایا کرے۔ لیکن میرے پاس نادور کا کوئی آتا ہی نہیں ہے۔ کیسے رابطہ کروں اس سے؟

”اتنا ہی پیار ہوتا ہے آذر سے تو خود آکر ملتا۔“

”آذر بہت ادا اس رہتا ہے نادور کے لیے۔ بہت روتا ہے۔“

آج کا رونا کل کے رونے سے اچھا ہے۔

”آذر کو یہ کیسے سمجھاؤں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”مجھ سے تو بات ہی نہیں کرتا۔“

”بچہ ہے، سمجھ جائے گا۔“ گوگی نے تسلی دی۔

گزرے وقت نے آذر کی ناپسندیدگی کو اس پر ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے چھوٹے بڑے سارے کام خود ہی کرتا تھا۔ اپنے لیے کھانا خود بناتا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ وہ اس سے کچھ نہیں کہتا تھا، مگر اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی تھیں۔

”تمہارے ماموں آرہے ہیں آذر!“ اس دن وہ بہت خوش تھی۔ پہلے تو اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہیں، پھر کمرے کی طرف جاتے جاتے رک کر پلٹا۔ ”پاپا ٹھیک کہتے تھے جو عورت اپنے خاندان کو پالتی ہے وہ اپنی اولاد کو ڈستی ہے۔“

آذر کی اس بات نے اسے سن سا کر دیا۔ اسے اپنے باپ کی کئی باتیں یاد تھیں۔

آہستہ آہستہ آذر نے ضرورت کے لیے اس سے پیسے لینے بھی بند کر دیے تھے۔ وہ جو کچھ اس کے لیے خرید کر لاتی وہ ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

”مجھے لگتا ہے وہ نادور سے ملتا ہے باہر کیس۔“

”شاید۔ اس کا یہ رویہ بلا وجہ نہیں۔“ فریال بہت پریشان تھی۔

”لیکن نادور کا تو کچھ آتا ہی نہیں کہ کہاں ہے۔“

”ہو سکتا ہے آذر نے اسے ڈھونڈ نکالا ہو۔“ فریال

یہ سن کر گہری تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

”آذر! تم اپنے پیالے سے ملے کبھی؟“ فریال نے پیار سے ہی پوچھا تھا۔

”مل لیتا۔ اگر آپ نے ملنے کے لائق چھوڑا ہوتا۔“ آذر نے نفرت سے کہا۔ ”آپ کی وجہ سے ان کی اتنی بدنامی ہوئی کہ انہوں نے یہ شہر ہی چھوڑ دیا۔ آپ نے انہیں جیل بھیج دیا۔ وہ شاید پتا کرتا رہا تھا نادور کا۔“

”وہ مجھے مار دیتا۔ تب تم خوش ہوتے؟“ اس نے

دھکے سے آذر کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے بھی بہت بار حنا چکا تھا آذر کا جیل جانا۔

”بری عورتوں کو مار ہی دینا چاہیے۔“ آذر نے اتنی

سفاکی سے کہا کہ وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔

”میں تمہاری ماں ہوں آذر! ایسا غلط کیا ہے میں نے

آج تک؟“

”کیا غلط کیا تھا پیالے۔ آپ کو روکتے ہی تھے نا۔

دن رات آپ باہر رہتی تھیں، اپنے دوستوں کے

ساتھ۔“

”اب تم اتنے بھی بچے نہیں ہو کہ یہ جان نہ سکو کہ

تمہاری ماں دوست رکھنے کی شوقین نہیں ہے۔“

”اور وہ جو صدیقی آتا ہے؟“

”انکل کہو انہیں۔ بھائی ہے وہ میرا۔ ہر برے

وقت میں مدد کی ہے اس نے میری۔“

”ہو نمس۔ بھائی۔ بچہ نہیں ہوں میں۔“

آذر کے اس رویے سے وہ اتنی دل برداشتہ ہوئی کہ

اس کے دل میں درد رہنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے اپنا خیال

رکھنے کو کہا۔ گوگی نے آذر کو بہت سمجھایا۔ ماضی کی

بہت سی باتیں بتائیں، لیکن جیسے وہ سننا نہیں چاہتا تھا۔

اس پر کسی بھی بات کا اثر نہیں ہوا تھا۔

اٹھارہ سال کا ہوتے ہی اس نے گھر چھوڑ دیا۔ شاید

گھر چھوڑنے کے جن انتظامات میں وہ لگا ہوا تھا، وہ

ہو چکے تھے اپنے لیے کسی اور جگہ انتظام کر چکنے کے

بعد اس نے گھر چھوڑ دیا۔ فریال کے نام اس نے ایک

چپٹ تک لکھنا گوارا نہیں کی۔

چند دن پہلے جب وہ گھر آیا تو نادور کی طرح ہی اس

نے چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنی شروع کر دیں۔

”آج پیالہ کو دکھا میں نے۔“ وہ تنفر سے فریال کو

جانکریا۔ ”پی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بہت خوش نظر رہے تھے۔ انہیں خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔ ان کی ”سری بیوی پہلی بیوی فریال جیسی جو نہیں ہے۔“

اس دن اسے معلوم ہوا کہ کوئی بھی فریال جیسا

نہیں۔ سب نادور جیسے ہی تھے۔

اور پھر آذر چلا گیا۔ اور دوبارہ اس سے کبھی نہیں

فریال نے اپنا ہر ذریعہ استعمال کر لیا، مگر وہ نہیں ملا۔

شام ہونے لگی تھی۔ چار کب کے بج چکے تھے۔

اسکاٹ لینڈ سے ٹرین بہت پہلے آپہنچی تھی۔ مگر آذر

نہیں آیا تھا۔ آذر بھینٹ میں کہیں بھی نہیں تھا۔ خود کو

سنجھاتی وہ لوگوں کے رش میں چلنے لگی۔ کاؤنٹر پر آکر

اس نے ٹرین کا پوچھا، پھر آذر کا نام بتایا۔

”کیا اس نے میرے لیے کوئی پیغام چھوڑا ہے۔“

کاؤنٹر میں فریال کی شکل دیکھنے لگا۔ ٹرینیں آجاری

تھیں، مگر آذر نہیں آیا۔ اس نے ٹائیڈ کو فون کیا۔

”آئی! آذر لندن میں ہی ہے۔ وہ آپ کو نہیں ملا؟

کچھ دیر پہلے ہی اس نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ

لندن پہنچ چکا ہے۔ وہ نظر نہیں آیا آپ کو؟“

”نہیں۔“ فریال نے اپنی ہچکی دبا کر کہا۔

”میں آذر کو فون کرتی ہوں، پھر آپ کو بتاتی

ہوں۔“

فریال نے بمشکل چند منٹ انتظار کیا، پھر فون کیا۔

فون مصروف تھا۔ پانچ منٹ بعد، سیات منٹ، دس

پندرہ۔ وہ مسلسل فون کیے جا رہی تھی۔

”آئی! وہ لندن ہی میں ہے۔ میرے اصرار پر بھی

مجھے کچھ نہیں بتایا کہ کہاں ہے۔ بہت جلدی میں

تھا۔“

”مجھے تو اسٹیشن پر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ کیسے

یہاں آگیا؟“

”وہ جہاز سے۔“

”تم نے تو کہا تھا وہ ٹرین سے آ رہا ہے؟“ انہیں دکھ

سے زیادہ مایوسی ہوئی۔ وہ ایر پورٹ پر اس کا انتظار

کر لیتی۔

”یقین کیجئے! آذر نے مجھے یہی بتایا تھا۔ شاید کسی مسئلہ کی وجہ سے اسے جہاز سے اتار دیا ہو۔“

اس نے بے دلی سے فون کو کوٹ کی جیب میں رکھا اور بے دم سی ایک طرف چلنے لگی۔ کس طرف اسے نہیں معلوم تھا۔ معلوم کر کے کرنا بھی کیا تھا۔ لندن سینٹرل اسٹیشن کی بھیڑ میں وہ تنہا ہی ہو گئی۔

کیسا لگتا ہے منزل کے بغیر سفر کرنا۔ سفر بھی دکھ اور تکلیف سے بھرا۔ اس نے بھی وہی سفر کیا تھا۔

”تم نہیں آئے نا آذر!“ چلتے چلتے وہ بدبوڑھے لگی۔ ایک عرصہ ہوا وہ خود سے اور آذر سے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگی تھی۔

”تم سے ایک بار ملنے کے لیے میں جہنم کی آگ میں کود سکتی ہوں، لیکن تم تو نادر ہی بن گئے۔ میرا بیٹا نادر کا بیٹا بن گیا۔ آذر میرا بیٹا۔“

وہ رونے لگی۔ آنسو اس کے لائنگ کوٹ کے کار میں جذب ہونے لگے۔

”تم تو ملے نہیں، کاش! آج مجھے موت مل جائے۔ اگر تم کسی کونے سے لیک کر میری طرف نہ آؤ تو موت آجائے۔“ وہ اسٹیشن کی حدود سے باہر اب سڑک پر تھی۔ گھر جانے کے لیے اسے بس میں چالیس منٹ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ وہ پیدل ہی سمت کا تعین کیے بغیر چلنے لگی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کمزوری اور نقاہت سے زیادہ اسے صدمے نے نڈھال کر دیا تھا۔ اس کا پچیس سالہ بیٹا اس ماں سے ملنا نہیں چاہتا تھا جس نے اٹھائیس سال اپنے پیاروں سے دور صرف اس کے لیے یہاں اکیلے گزار دیے تھے۔ کیسا لگتا ہے۔ اٹھائیس سال کی ریاضت اور دکھ کے بعد ناکام ہونا۔ ساری محنت، محبت اور ایمان داری کے بعد ناکام ہونا۔ وہ مین روڈ پر بنی ان دکانوں کے آگے سے گزر رہی تھی جن میں لوگ خوشی خوشی چیزیں خرید رہے تھے۔ کاش لوہ بھی آذر کہیں سے خرید سکتی۔

لندن شہر جگمگا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بھی۔ قریب سے گزرنے والے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ

پچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ نومبر کی سرد راتوں کے گرم آنسو۔

☆ ☆ ☆

”میری ٹیسٹ رپورٹ پر سائن آپ نے کیے ہیں؟“ آذر اس وقت نویں جماعت کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ کچن میں کام کر رہی تھی جب وہ دروازہ نور سے بند کر کے اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ خود سے تو وہ اپنی ڈائری رپورٹس ٹولس دکھانا نہیں تھا اسے۔ وہ خود ہی بیگ چیک کرتی رہتی تھی۔

”ہاں۔“

”کیا میں نے آپ سے کہا تھا سائن کرنے کے لیے؟“

”تمہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہاں میرے ہی سائن ہونے تھے۔“

”یہاں میرے ڈیڈ کے سائن ہونے تھے۔“

”سائن میں ہی کرتی رہی ہوں۔“

”آپ تو بہت کچھ کرتی رہی ہیں۔ تب میں بچہ تھا، اب نہیں۔“

”کیا کرتی رہی ہوں میں۔؟“ آذر نے اپنی رپورٹ پھاڑ کر پھینک دی۔

”میری کسی چیز کو ہاتھ مت لگایا کریں۔“

”تمہیں معلوم ہے آذر! تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو۔؟ اپنی ماں کے ساتھ۔“

”آپ کو معلوم ہے آپ نے کیا کیا، میرے اور ڈیڈ کے ساتھ؟“

”کیا کیا۔۔۔ تاؤ مجھے۔“

”آپ نے ہر وہ کام کیا جس سے ڈیڈ نے آپ کو منع کیا۔“

”اس نے کبھی مجھے پیسے کما کر گھر چلانے اور تمہیں پالنے سے تو منع نہیں کیا۔“

”پیسے آپ اپنے گھروالوں کے لیے کما تے تھیں۔ جن عورتوں کے دل اپنے گھروں میں نہیں لگتے وہ ساری دنیا کو اپنا لے رہی ہیں۔“

”اکیلے ہی زندگی گزار رہی ہوں۔ کون ہے جسے اپنا لے؟“

”مجھ سے اپنی ذاتیات کی تفصیل مت پوچھے۔ میں گناہ گار عورت کے گناہوں پر بات کرنا نہیں چاہتا۔“

”جس عورت نے مردوں کی طرح حلال رزق کمایا۔ اپنے بیٹے کے لیے اکیلے زندگی گزار دی۔ وہ گناہ گار ہے؟“

”آپ کو شوق تھا سنگل ہونے کا۔ آذر رہنے کا۔“

”آذر رہنے کا نہیں، مار پیٹ سے بچنے کا شوق تھا۔“

”برے کاموں سے کوئی آپ کو روکے بھی نا۔ آذر کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔“

”گوگی ٹھیک کہتی تھی۔ نادر تمہارے اندر زہر بھر رہا ہے۔“

”دنیا آپ سے ٹھیک کہتی ہے۔ آپ کو ٹھیک نہیں کہتی۔“ آذر نے زہر میں بجھا طنز کیا۔ وہ طنز کرتا تھا اور طنز بھری نظروں سے اسے دیکھتا بھی رہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

”تم اسے لے کر پاکستان چلی جاؤ۔ گوگی نے مشورہ دیا۔“

”کس کے پاس۔۔۔ اپنے ماموں، نانا، نانی سے وہ ملے بغیر ہی اتنی نفرت کرتا ہے۔ اسے بس نادر چاہیے۔“

”تو بھیج دو اسے نادر کے پاس۔ چار دن رہے گا اس کے پاس تو سب سمجھ جائے گا۔“

نادر کہیں ملتا تو وہ کچھ کرتی۔ بیوی کے نام پر وہ ماں بنی اور ماں کے نام پر گناہ گار۔

”آذر مجھے نادر کی نظروں سے دیکھتا ہے گوگی! تنفر اور حقارت سے۔ مجھ جیسی ماں سے پوچھو، اولاد کی نفرت کا دکھ۔ پہلے باپ مارتا تھا۔ اب بیٹا لفظوں کی مار مارتا ہے۔ گوگی کے سامنے وہ کھل کر رونے لگی۔

”یہ سب تمہاری کمزوریوں کا نتیجہ ہے فریال! عورت میں اتنی ہمت تو ہونی چاہیے کہ وہ بڑی بات کو

سنوار سکے۔ آخر تم کب اپنے ڈر اور خوف سے نجات حاصل کرو گی؟“

”ساری عمر ڈرتی رہی ہوں سب سے۔ پہلے اپنے باپ سے، پھر شوہر سے، پھر طلاق سے۔ اب آذر سے، اس کی نفرت سے، اس کی حقارت سے۔“

”جہاں ڈرنا سیکھا ہے، کچھ اور بھی سیکھ لو۔ تمہیں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ تم خود ہارتی ہو۔“

چلتے چلتے جب وہ تھک گئی تو ایک پارک میں آکر بیٹھ گئی۔ پارک میں اکا دکا لوگ ہی تھے نومبر کی سردی میں لوگ اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ ایسے گھر جہاں بچوں کا پیار ہوتا ہے اور ماں باپ کا احترام۔

☆ ☆ ☆

آذر سولہ سال کا ہوا تو فریال سے چھوٹا بھائی نعمان لندن پڑھنے اور کام کرنے کے لیے آیا۔ وہ اسٹوڈنٹ ویزے پر آیا تھا۔ نعمان ایرپورٹ سے فریال کے گھر ہی آیا تھا۔ فریال نعمان کے آنے پر بہت خوش تھی۔ ایک طویل مدت کے بعد وہ کسی سے ملنے والی تھی۔ کسی اپنے سے۔ لیکن آذر کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ کھیلنے کے بعد باہر سے آیا تو اتنی نفرت سے نعمان کی طرف دیکھا کہ وہ اٹھ کر اسے پیار بھی نہیں کر سکا۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے اپنے کمرے کی چیزیں پھینکنی شروع کر دیں۔ نعمان سب سمجھ گیا۔ فریال گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”یہ مغرب ہے۔ یہاں کے بچے۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”وجہ مشرق مغرب نہیں ہے آپ!“ وہ بھی اتنا ہی کہہ سکا۔

نعمان فریال کے ساتھ ہی رہنے آیا تھا اور فریال بھی اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتی تھی مگر۔ وہ ایسا کیسے کرتی۔

”یہ شخص دوبارہ اس گھر میں نہیں آئے گا۔“ نعمان کے جاتے ہی آذر چلانے لگا۔

”وہ تمہارے ماموں ہیں۔“ اس نے تحمل سے کہا۔

”وہ صرف آپ کا بھائی ہے۔“ اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

نعمان، آذر کی موجودگی میں پھر نہیں آیا۔ ویسے بھی وہ رات دن کام کرتا تھا۔ اسے اپنی دو بہنوں کی شادی کرنی تھی وہ اتنا مضبوط ہونا چاہتا تھا کہ پھر اس کی کسی بہن کو تادرنہ مل سکے۔

گزرتے وقت نے فریال کے لیے کچھ نہیں بدلا۔ خوشی کا کوئی لمحہ اسے نصیب نہیں ہوا۔ جاتے ہوئے آذر اپنے کمرے میں لگی تادرنہ کی تصویر لے کر گیا بس۔

تین دن اسپتال میں رہ کر گوگی اسے اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ اس کے ہر ملنے جلنے والے نے آذر کو ڈھونڈنا چاہا، مگر وہ نہیں ملا۔

اپنے فارغ وقت میں نعمان بھی یہی کام کرتا تھا۔ سارالندن، سارابرطانیہ کھنگال ڈالا، مگر آذر نہیں ملا۔ فریال کی بگڑتی جسمانی اور ذہنی حالت کی وجہ سے نعمان فریال کے ساتھ رہنے لگا۔

”ایک بار آذر کو لے آؤ۔ اس سے کہو، مجھ سے نفرت ہی رکھے، مگر میرے سامنے رہے۔ اس کی ماں اس کے بغیر مر جائے گی۔“

وہ ہر وقت تڑپتی رہتی۔ ہر ایک کے سامنے روتی رہتی۔ نعمان چاہتا تھا کہ وہ پاکستان چلی جائے، مگر وہ نہیں جاتی تھی۔

”میں خالی ہاتھ رہ گئی۔ تادرنہ سب لے گیا۔“ تادرنہ نام کا ”حیوان“ اس کا سب کچھ کھا گیا۔

اگر گوگی اور نعمان نہ ہوتے تو شاید وہ خود کشی کر لیتی۔ اس نے جب چھوڑ دی۔ سارا وقت وہ آذر کو ہی نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتی رہتی نہ جانے کہاں کہاں کن کن لوگوں سے ملتی۔ پھر وہ ایک سیاہ فام گروپ سے ملی جو آذر کو تلاش کرنے کے لیے تیار تھا، مگر وہ اتنے زیادہ میسے مانگ رہے تھے کہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں رکھے تھوڑے سے پیسوں سمیت گھر کی ہر چیز بک جاتی تو بھی وہ رقم ادا نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے دوبارہ ڈبل جاب شروع کر دی۔ ہفتہ اتوار دوسری جاب۔ اس نے ایک ایک پاؤنڈ بچانا شروع کر دیا۔ انتہائی ضرورت کے علاوہ پیسہ خرچ کرنا بند کر دیا۔ ڈاکٹر کے تجویز کردہ سیرپس۔ فوڈ سپلیمنٹ، کبھی کبھار کے لیے جانے والے کپڑے، جوتے، وہ صرف تین وقت کے ساتھ کھانے پر آگئی۔

ایک عرصہ لگا فریال کو ایڈوانس کی رقم جمع کرنے میں گوگی سے بھی ادھار لیا۔ نعمان سے بھی پیسے لیے گھر کا کچھ سامان بیچ کر حاصل شدہ رقم شامل کی۔ ایڈوانس لینے کے تین ماہ بعد فریال کو آذر کے بارے میں معلومات ملنے لگیں۔

لندن سے وہ سیدھا فرانس گیا تھا۔ فرانس کی یونیورسٹی سے دو سالہ ڈگری لینے کے بعد اس نے وہیں کسی کمپنی میں ڈیڑھ سال تک جاب کی۔ پھر وہ سویڈن چلا گیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد وہ وہاں سے بھی چلا گیا۔ کہاں چلا گیا، وہ معلوم کر رہے تھے اور ظاہر ہے یہ معلومات حاصل کر کے ”اب وہ کہاں ہے“ کی معلومات فریال کو مکمل رقم کی ادائیگی کے بعد ہی ملنی تھی۔

نعمان اور گوگی کا خیال تھا کہ وہ اپنی رقم ضائع کر رہی ہے، ان لوگوں کو دے کر وہ لوگ اسے الوداع رہے ہیں۔

”بننے دو مجھے الوساں بن گئی ہوں۔ اب دیکھنا! کیا کیا نہیں بنتی۔“

اس کی صحت دن بدن گرتی ہی جا رہی تھی۔ اسے اتنا زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ نعمان نہیں چاہتا تھا کہ وہ جاب کرے، مگر وہ مانتی ہی نہیں تھی۔

”آئی! آپ نے اپنا آپ برباد کر لیا ہے۔ بس کرویں اب۔“

”آذر کے ملنے تک مجھے اور کر لینے دو۔ میں اس سے ملے بغیر نہیں مروں گی۔ وہ میری جمع پونجی ہے۔ ایسے کیسے اسے میں دنیا میں بانٹ دوں۔“

جب فریال نے مکمل ادائیگی کر دی تو چند ہفتوں میں ہی انہوں نے بھی مکمل معلومات دے دیں۔

وہ جرمنی میں تھا، اپنی بیوی ثانیہ اور ایک آٹھ ماہ کی

بچی نمل کے ساتھ وہاں وہ ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ اسے فون نمبر اور گھر کا ایڈریس دونوں دیے گئے۔ فون نمبر اور ایڈریس ملتے ہی وہ اپنا دل اتھام کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آذر مل چکا ہے۔

چھ سال اور چند ماہ بعد آذر اسے مل چکا تھا۔ اس نے پہلے فون کیا۔ یہ گھر کا نمبر تھا۔

”تمہاری ماں۔!“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”میری کوئی ماں نہیں۔“ اتنے سالوں بعد بھی آذر نہیں بولا تھا۔

آذر فون بند کر چکا تھا۔ ساری رات اگلا سارا دن وہ فون پر فون کرتی رہی، مگر اس نے پھر فون نہیں اٹھایا۔

فریال کے پاس مزید ایک پاؤنڈ نہیں تھا کہ وہ جرمنی جاسکتی۔ وہ سب سے ادھار لے چکی تھی، نعمان، فریال کو اذکار نہیں کرتا تھا، مگر اس نے اپنا سب کچھ ارسہ، نمبر کی شادیوں پر لگا دیا تھا۔ چند ماہ پہلے اس نے ساوگی سے برطانیہ کی ہی ایک پاکستانی نژاد لڑکی کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ وہ فریال کے سامنے والے فلیٹ میں رہتا تھا جو کچھ تھا فریال کے سامنے ہی تھا۔ اس نے فریال سے کچھ چھپا کر الگ نہیں رکھا تھا۔ وہ نعمان کے سامنے رونے لگی۔

”کسی بھی طرح مجھے جرمنی بھیج دو، اپنے گھر سے دھکے دے کر نکال تو نہیں دے گا۔ پھر تو اسے مجھ سے ملنا ہی پڑے گا۔“ فریال نے ٹھوس دلیل دی۔

نعمان نے اپنا سب کچھ نکال کر اپنی بہن کے سامنے رکھ دیا۔ اپنی گھڑی، لیب ٹاپ، اپنی بیوی کے گولڈ کے ایررنگز، جو جو کچھ بک سکتا تھا سب۔

نعمان اس کے جرمنی جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران وہ مسلسل اس کے گھر فون کرتی رہی۔ اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا جاتا۔ ایک دن ثانیہ فون اٹھالیا۔

”آذر نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔ وہ سختی سے مجھے منع کرتا ہے آپ سے متعلق کوئی بھی بات کرنے سے۔“ وہ نرمی اور تحمل سے فریال سے مخاطب تھی۔

فریال نے رورو کر ثانیہ کو اپنی زندگی کے واقعات

سنائے۔ اس نے یقین کیا یا نہیں، مگر وہ خاموشی سے سختی رہی۔

”آپ کی وجہ سے وہ یہ گھر شفٹ کر رہا ہے آئی۔!“

”کب۔۔؟“ فریال کو لگا، آذر ایک بار پھر سے گم ہونے جا رہا ہے۔

”آج کل میں۔۔“

”میں جرمنی آرہی ہوں ثانیہ۔!“

”بھی مت آئیں آئی۔ میں کوشش کرتی ہوں آذر کو منانے کی اور سمجھانے کی۔ اس وقت تک تھوڑا انتظار کر لیں۔“

”کتنا انتظار اور ثانیہ۔!“ وہ رونے لگی۔ ”کر سکتی تو کر لیتی۔“

”وہ میری کوئی بات نہیں سنتا آئی۔ آپ یہاں آئیں تو مایوس ہوں گی۔ دیکھی بھی۔“

دیکھی تو وہ اور ہو ہی گئی تھی۔ آذر گھر شفٹ کر چکا تھا۔ ثانیہ کو اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ فریال سے بات نہیں کرے گی، پھر بھی کبھی کبھار ثانیہ چپکے سے فریال کو فون کر لیتی تھی۔

اور آج تین ماہ بعد اس نے ہی فون کر کے آذر کے لندن آنے کا بتایا تھا۔ جرمنی سے دو دن پہلے وہ اسکاٹ لینڈ آیا تھا۔ آج اسے لندن آنا تھا۔

وہ لندن آیا، مگر اس سے نہیں ملا۔

شام رات میں ڈھل چکی تھی۔ وہ پارک میں ایک ہی انداز سے بت بنی بیٹھی تھی۔ وہ اپنی سرخ آنکھوں کو رگڑتی ہوئی اٹھی اور پارک سے باہر آگئی۔ وہ ڈمگاری تھی۔ اس کا دکھ اور تکلیف آج بے حد بڑھ چکی تھی۔ اتنی کہ اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چلتے وہ ایک دم سے سڑک پر گر گئی۔ اس پاس چلنے والے لپک کر اس کے قریب آئے، دیکھوں کے عجیب انداز ہوتے ہیں۔ وہ آپ کو تھس تھس کر دیتے ہیں۔



آذر کو آفس کے کام سے اسکاٹ لینڈ بھیجا گیا تھا۔

برطانیہ سے باہر کر بھی اس نے ہمیشہ نادر کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے کچھ خبریں ملیں کہ وہ پاکستان جا چکا ہے۔ اس نے وہاں بھی معلوم کروانا چاہا مگر ناکام رہا۔ اسے نادر کی دوسری بیوی کے بارے میں کچھ معلومات ملی تھیں کہ وہ لندن میں ہی ہے۔ اس نے قیاس لگایا کہ اگر وہ لندن میں ہیں تو نادر بھی ہوگا۔

لندن آکر اسے کچھ وقت لگا گھر ڈھونڈنے میں مگر اسے مل ہی گیا۔ وہ ایک بڑا اور شاندار گھر تھا۔ اس کے ڈیڈ کا گھر نادر کا گھر اس کا گھر جس کے لیے وہ روتا رہا تھا۔ جس کا اس نے پانچوں کی طرح انتظار کیا تھا۔ گھبرائے ہوئے انداز میں اس نے تیل بجائی۔

خوب صورت اور اسماٹ سی عورت دروازے پر آئی۔ اس نے صرف مسکرا کر سوالیہ شکل بنائی۔ یہ وہی عورت تھی جسے آذر نے نادر کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں دیکھا تھا۔ جب تک وہ بھاگ کر فرسٹ فلور سے گراؤنڈ فلور تک آیا۔ وہ اس کی نظروں سے گم ہو چکے تھے۔ اسے پھر کبھی نادر نظر نہیں آیا۔

”میں آذر ہوں۔“ آذر گھبرایا۔ ”پاپا ہیں؟“ اسے یقین تھا پاپا کی یہ بیوی اسے ضرور جانتی ہوں گی۔ ”کون پاپا؟“ وہ ابھی بھی مسکرا رہی تھی۔ ”نادر جمال۔“ آذر بھی مسکرایا۔ خاتون کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”وہ یہاں کیوں ہوگا؟“ اس بار وہ مسکرائی نہیں مگر جواب تحمل سے ہی دیا۔

”آپ ان کی بیوی۔“ آذر تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ ”تھی۔ ایک عرصہ ہوا ہماری طلاق ہو گئی۔“ آذر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ طلاق پر افسوس کرے یا نادر کا پوچھے۔

”اور ڈیڈ؟“ ”اندر آجاؤ۔“ وہ اسے اندر لے آئی۔ گزرتے ہوئے آذر نے لاؤنج میں دو کم سن لڑکا لڑکی کو فلم دیکھتے دیکھا۔

”تم اس کے کون سے بیٹے ہو؟“ سوال تھا یا

اقرار۔ آذر سمجھا نہیں۔

”کون سے۔؟“ وہ حیران ہوا۔

”ہاں! کس بیوی کے کون سے بیٹے؟“

”پہلی بیوی کا پہلا بیٹا! میں ان کا ایک ہی بیٹا ہوں۔“

آپ کے بچوں کے علاوہ۔“

”تمہیں یقین ہے کہ تم اس کے اکلوتے بیٹے ہو۔“

میری ایک بیٹی کے علاوہ۔“

”جی۔“ آذر نے ساتھ سر بھی ہلایا۔

”اور تمہیں یقین ہے کہ تم اس کی پہلی بیوی سے ہو؟“ آذر کو غصہ آگیا۔

”میں فریال کا بیٹا ہوں۔ وہ ان کی پہلی بیوی تھیں اور آپ دوسری۔“

”میں اس کی آٹھویں بیوی تھی آذر۔“ وہ تحمل سے بولی۔

اس طرح کے صدمے سے آذر پہلی بار دوچار ہوا تھا۔ اسے سامنے بیٹھی عورت کی عقل پر گمان ہوا۔

”اب بتاؤ اپنی بدمذہب کا نمبر؟“

آذر ایسے خاموش ہو گیا تھا جیسے نہ کچھ بولے گا نہ پوچھے گا۔

سوال اتنی تکلیف دیتے ہیں۔ جواب اتنا غضب ڈھاتے ہیں۔

”میں نے ایک دوبار نام سنا تھا فریال کا۔ شاید وہ تیسری بیوی تھی نادر کی۔“ وہ خود سے بتانے لگی۔

”وہ کہاں ہیں؟ کس بیوی کے گھر؟“ آذر کو یہی سوال مناسب لگا۔

”گھر؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”وہ حکومت کے گھر میں۔ جیل میں ہے۔ اتنا بڑا صدمہ۔ آذر کا سر گھوم گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔“

وہ دبانستہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ آذر کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی جذباتی حالت ٹھیک نہیں۔

کچھ دیر بعد وہ کافی لے کر آئی۔

”جب میں نے اس کے ساتھ شادی کی تھی اس وقت میں بھی اس کی پہلی بیوی ہی تھی۔ پہلی سے شاید نادر کا مطلب تھا پہلی برطانوی شہری خاتون۔ باقی سب

پاکستانی تھیں۔ اس وقت میرا ایک پانچ سال کا بیٹا تھا۔ دو سال پہلے ہی میں بیوہ ہوئی تھی۔ مجھے وہ اچھا لگا تھا۔ وہ روزانہ میرے ریسٹورنٹ آتا تھا۔ میرا اپنا گھر تھا۔ ریسٹورنٹ تھا۔ مجھے صرف ایک شوہر ہی چاہیے تھا۔ لیکن اسے صرف ایک بیوی نہیں چاہیے تھی۔ اسے بیویوں کی مشین چاہیے تھی۔ نہ جانے کیسے میں اس کے جال میں آگئی۔ اتنا عیاش اور بے غیرت انسان میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ ریسٹورنٹ کے اکاؤنٹ میں ہیر پھیر کرتا تھا۔ پوچھا تو مجھ پر ہاتھ اٹھالیا۔ اصلیت سامنے آنے لگی تھی اس کی۔ میں نے مزید معلومات کروائیں تو مجھے اس کے ایک اور گھر کا پتا چلا جہاں وہ اپنی ساتویں بیوی کو بیاہ کر لایا تھا اور جسے وہ جانوروں کی طرح مارتا تھا۔ تنزیلہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی اور سمجھ دار بھی۔ ہم دونوں کو زیادہ وقت نہیں لگا نادر کی اصلیت کا پتا لگانے میں۔

وہ پاکستان سے لڑکیاں بیوی بنا کر لاتا تھا۔ یہاں ان سے رات دن کام کرواتا تھا اور ان کے سارے پیسے اپنے پاس رکھتا تھا۔ لڑکیاں کم پڑھی لکھی ہوتی تھیں جنہیں ٹھیک سے اپنا پاسپورٹ بھی پڑھنا نہیں آتا تھا۔ پولیس کے پکڑنے سے پہلے ہی نادر بیرون ملک بھاگ گیا۔ اپنی بیویوں کو ماں تو وہ بننے ہی نہیں دیتا تھا پھر بھی وہ چار بچوں کا باپ بن گیا۔ ان میں سے ایک میری بیٹی بھی ہے۔

اس دوران فریال کا نام سننے میں بھی آیا تھا مگر فریال سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

”فریال۔!“ آذر کے دل و دماغ میں یہ نام گونجنے لگا۔

”اس پر شادی کے نام پر لڑکیوں کو ایکسپورٹ کرنے کا ہی الزام نہیں وہ ڈرگ سپلائر بھی تھا۔ خدا نے صرف شکل ہی اچھی دی تھی ورنہ کوئی اس پر تھوکتا بھی پسند نہ کرے۔“

آذر نے پسند کیا تھا اسے چاہنا۔ اور اپنی ماں کو دھتکارنا۔ اتنے سال وہ فریال نامی عورت سے نفرت کرتا رہا۔

”کچھ عرصہ پہلے مجھے خبر ملی کہ وہ امریکا کی کسی جیل میں ڈرگ کے کسی کیس میں عرصے سے قید کاٹ رہا ہے۔ کیس کوئی بھی ہو سزا وہ ظلم کی بھگت رہا ہے۔ اپنے گناہوں کی۔“

”اور فریال نے کس جرم کی سزا بھگتی؟“ اس کا دماغ الٹ پلٹ ہونے لگا۔

”میں چند ماہ پہلے ہی لندن شفٹ ہوئی ہوں بیٹی کی یونیورسٹی کی وجہ سے۔ ورنہ اس شہر سے میری بہت سچ یادیں وابستہ ہیں۔ خاص کر وہ پہلی مار جو میں نے نادر کے ہاتھوں کھائی۔“

”صرف ایک بار مار۔“ آذر نے سوچا۔ اور یہ سب کچھ اس نے بہت دیر سے سوچا۔

”کس کے لیے کھائی مار۔ جبکہ میں اس کی ایک پائی کی بھی محتاج نہیں تھی۔ اس کے جوتے کھانے کے لیے پیدا نہیں ہوئی تھی میں۔ میں تمہارے لیے اس کی مار بھی کھا لیتی آذر! اگر وہ تمہارا ذہنی سکون نہ چھین رہا ہوتا تو۔ میں کھاتی رہتی وہ مار بھی۔“

آذر کو فریال کی بات یاد آئی۔ آذر نے نم آنکھوں سے سامنے بیٹھی خاتون کو دیکھا۔ وہ ابھی بھی خوب صورت اور بر سکون نظر آرہی تھی۔ مگر اس کی ماں وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو چکی تھی۔

”ہائے۔ ہائے!“ وہ سات سال کا تھا جب فریال

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے آسیہ سلیم قریشی کے 3 دلکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ جھپٹی سی دیوانی سی	600/- روپے
آرزو نکھر آئی	500/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، راولپنڈی۔ فون نمبر: 32735021



کسی کی بات

”بھابھی! چرا گھر پر ہے؟“ حرا نے حنا کی آواز سنی تو چونک اٹھی۔

”الٹی خیر! یہ آج الٹی گنگا کیسے نکلی۔ حنا میرے بارے میں پوچھے اور وہ بھی میرے گھر آگے؟“ بھابھی حرا حیرت کے سمندر میں غوطہ لگا رہی تھی کہ حنا اس کے کمرے میں آن ٹپکی۔ اس کی اڑی اڑی رنگت اور چہرے پر بارہ بختے دیکھ کر حرا کے حواس بھی جواب دینے کی تیاری کرنے لگے۔

”کیس ہمارا رزلٹ تو نہیں آگیا۔ مگر پیر دیے ہوئے ابھی صرف دو ہی مہینے تو گزرے ہیں۔ اپنی جلدی رزلٹ کیسے آسکتا ہے۔“ اس نے ایک ہی لمحے میں اتنی لمبی چوڑی سوچ بچار کی اور اس سے پہلے کہ اس کی سوچ کا یہ سلسلہ مزید دراز ہوتا، حنا بول پڑی۔ ”حرا! مجھے تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔“

”مدد اور وہ بھی میری۔؟“ حرا کے لہجے میں بجا طور پر تمام جہاں کی حیرت سمٹ آئی۔ ”ہاں۔۔۔ تمہاری مدد کی۔ تمہیں پتا ہے امی نے میری شادی کی ڈیٹ فکس کر دی ہے اور اگلے ماہ کی چار تاریخ کو میری شادی ہے۔“

”لعنت ہو۔“ حرا جھلائی۔ ”سارے سین کا ستیاناس کر دیا۔ تالاق! شادی ہے تو اس میں اتنا روتا ہوا چہرہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ غضب خدا کا میں بھی ہمارا رزلٹ آگیا۔ صاف صاف نہیں کہہ سکتیں کہ پار لڑ چلنا ہے، نئے نئے کپڑے خریدے نہیں۔“

”اگرے بھاڑ میں گیلیاں لرا اور جنم میں گئے پیر۔۔۔“

”اب کون سا حساب کتاب لینے کے لیے فون کیا ہے تم نے؟“ نعمان کی کرخت آواز اسے سنائی دی۔ ”آئی سی یو میں ہے وہ۔“

فریال کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ آئی سی یو میں تھی نعمان نے ایک شکایتی نظر اس پر ڈالی اور تباہات کیے ایک طرف ہو گیا۔ آذر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زمین میں زندہ ہی گڑ جائے۔ اس نے کتنے رشتوں کو زندہ گاڑ دیا تھا۔ گوگی آنٹی، ان کے شوہر جیسی کہ ان کے بچے تک اسپتال میں تھے۔ وہ سب اس کی ماں کے لیے پریشان اور فکر مند تھے۔ اتنے سارے لوگ اس کی ماں سے پیار کرتے تھے۔ ایک وہ ہی نہیں کر سکا۔

اولاد کے نام پر تنہا زندگی کیسے گزاری جاتی ہے اس ہجر کی تصویر بنی فریال اکھڑی اکھڑی سانس لے رہی تھی۔

آذر نے جرمی فون کر کے ثانی اور نمل کو آنے کے لیے کہہ دیا۔

دو دن بعد جب فریال نے ہوش میں آکر دیکھنا شروع کیا تو اسے آذر اپنا ہاتھ چومتا نظر آیا۔ وہ بار بار اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں اور ہونٹوں کے ساتھ لگا رہا تھا۔

”ماما! وہ محبت سے پکار رہا تھا۔“ اس نے سوچا تھا کہ وہ آذر سے لپٹ جائے گی مگر آذر اس سے لپٹ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کا ہاتھ چومے گی اور آذر اس کا ہاتھ چوم رہا تھا۔ سوچ کی تعبیر الٹ ہوئی، مگر بہت خوب ہوئی۔

لوگ کہتے ہیں، مائیں معاف کر رہی دیتی ہیں۔ انہیں معاف کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں جو وہ اپنی اولاد سے کرتی ہیں۔ ماں وہ سختی ہے جس پر اولاد کچھ بھی لکھ سکتی ہے مگر ماں صرف ”محبت“ لکھتی ہے۔

نادر کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد اس کے ساتھ سوتے ہوئے کراہ رہی تھی۔ ”ہائے نی ماں۔!“ وہ بڑبڑاتی رہتی۔ ساری رات کراہتی رہتی۔

کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ لاؤنج میں چلتی فلم کی چنگھاڑنی آوازیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔

”آذر! آنٹی کا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔“ ثانیہ کی آواز۔ ”صرف ایک بار مل لو ان سے۔“ ”جس دن تمہاری اصل نادر سے ملاقات ہوگی، اس دن تم دیواروں سے لپٹ لپٹ کر روؤ گے۔“ گوگی کی آواز۔

”دکاش! تم ایک بار اپنی ماں کو ماں کی نظر سے دیکھ لو۔ اپنی ماں کو گالی دے دو آذر! ان نظروں سے مت دیکھو۔“ فریال کی آواز۔ مگر اس نے دیکھا۔

آگے عذاب ہے، اس صورت میں اگر اسے دیر سے جانا جائے۔

وہ بمشکل خود کو قابو میں رکھ کر کھڑا ہوا۔ ”امریکن جیل میں فون کر کے میں نے معلوم کیا تھا نادر کا۔ چاہو تو تم بھی۔“ اس کے کھڑے ہوتے ہی وہ فوراً بولی۔

آذر نے ایک زخمی سی نظر اس پر ڈالی اور وہ خاموش ہو گئی۔

ان کے گھر سے نکل کر وہ بمشکل کچھ دور تک چل سکا۔

سڑک روشن، لیکن سنسان تھی اور وہ کھل کر رو سکتا تھا۔ دیواریں نہیں تھیں جن سے وہ لپٹتا ہاں بچھتا اور ضرور تھا۔

”ثانیہ! کچھ دیر بعد اس نے ثانیہ کو فون کیا۔ ”ماں کا نمبر ہے تمہارے پاس؟ مجھے سینڈ کرو۔“ کچھ دیر بعد وہ کچھ اور کرنے کے قابل ہو سکا۔

فریال کے فون پر نمل جا رہی تھی۔ ”ماما! کال ریسیو ہوتے ہی وہ بولنے لگا۔“

صیبت سر پر آن پڑی ہے اور تمہیں کپڑوں کی سوچی ہے۔
”کیسی مصیبت صاف صاف کہو۔“ حرا کے لہجے میں تشویش در آئی تو حنا کو سخت مینشن کے باوجود ہنسی آگئی۔

”بدھو ہو تم تو۔ دیکھو میری امی نے شادی کی تاریخ اتنی قریب کی رکھ دی ہے اور تم تو جانتی ہو شادی کے گھر میں کتنا کام پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اب امی بے چاری اکیلی کیا کرے گی۔ انہوں نے تو روز روز بازار کے چکر لگانا شروع کر دیے ہیں اور تم تو جانتی ہو کہ مجھے تو کھانا پکانے کی الف ب بھی نہیں معلوم اب چونکہ تم اس فن میں طاق ہو تو سوچا کیوں نہ تم سے کھانے بنانا سیکھ لوں۔“

حرامنہ پھاڑے حنا کی یہ نان اسٹاپ تقریر سن رہی تھی کہ حنا نے اچانک بولتے بولتے حرا کے گال پر ایک چپت رسید کی اور حرا کا منہ آپوں بند ہو گیا۔
”من بھی رہی ہو یا میں یونہی بگو اس کیے جا رہی ہوں؟“

حرا نے فوراً ”عالمانہ انداز میں سر کو اثبات میں ہلایا۔ حالانکہ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ کہہ دے کہ ”ہی بی! آپ نے سچ کہا آپ واقعی بکو اس فرما رہی ہیں۔“ مگر بے چاری کہہ نہ سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں ابھی انٹر کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں اور حرا کو گریجویشن کرنے تک حنا کی مدد کی ضرورت تھی۔
”تم کیا پکانا سیکھنا چاہتی ہو۔“ حرا نے لہجے کو مدبرانہ بنانے کی کوشش کی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اسے خود بھی کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔

”سب کچھ سیکھو وہ سب کچھ جو تم کالج میں ہمارے لیے پکا پکا کر لاتی تھیں، پڑا، بریانی، منشی کباب، گاجر کا حلوا۔“

حنا نے چٹارے لے کر فرمائشیں گنوائیں تو حرا کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ یہ تو سچ تھا کہ اس نے اپنے گھر کی بنائی ہوئی بہت ساری چیزیں اپنے

دوستوں کو کھلائی تھیں اور ڈیٹیں یہ باری تھیں کہ وہ سب چیزیں خود اس نے بنائی ہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ سب کچھ اس کی بھابھی نے بنایا ہوتا تھا۔ اسے تو یہ تک نہیں معلوم تھا کہ گاجر کے حلوے میں گاجر کے علاوہ اور کیا ڈالا جاتا ہے۔

”اتنی ساری چیزیں سیکھ کے کیا کرو گی؟ اور ویسے بھی نئی دلہن سے کون پکواتا ہے۔“ حرا نے بات ٹالنے کی کوشش کی مگر حنا تو گویا آج تیرہ کر کے آئی تھی، جھٹ سے بولی۔

”آج کل کی نئی دلہن کتنے دن غمی رہتی ہے۔ ہفتہ بھر بعد ہی اس بے چاری کو باورچی خانے میں جھونک دیا جاتا ہے اور تمہیں کیا پتا۔ امی نے میرے سسرال والوں کے سامنے میری کیسی کیسی تعریفیں کی ہیں اب اگر انہیں یہ پتا چلے گا مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا تو ذرا سوچو امی کی ان سب لوگوں کے سامنے کیسی سبکی ہوگی۔“

اور حرا نے فوراً ”سوچنا شروع کر دیا“ تو یہ سارا قصور شیخی بگھارنے کا ہے۔ اگر حنا کی امی اس کے سسرال والوں کے سامنے جھوٹی تعریفیں کر کے اپنی بیٹی کے نمبر نہ بڑھاتیں اور نہ میں بھابھی کی پکائی ہوئی چیزوں کو اپنے نام سے منسوب کرتی تو یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

”یہ سارا قصور تمہاری امی کا ہے۔ انہیں کیا ضرورت تھی تمہارے بارے میں جھوٹ بولنے کی؟“ حرا نے فوراً ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

”چھا اب سچ کی فضیلت اور جھوٹ کی مصیبت پر فلسفہ نہ بگھارنے بیٹھ جانا۔“ حنا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

”تمہیں نہیں معلوم آج کل لڑکیوں کی شادی کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ ماں باپ کو نجانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ میری امی نے تو محض ایک، چھوٹا سا جھوٹ بولا ہے۔ بس! تم مجھے یہ بتاؤ کہ سب سے پہلے تم مجھے کیا پکانا سکھاؤ گی۔“

حنا کی یہ بات سن کر حرا سوچ میں پڑ گئی۔ ایک لمحے کو

اسے خیال آیا کہ پہلے وہ خود بھابھی سے بنانا سیکھے اور پھر حنا کو سکھائے مگر اس سارے مسئلے میں قیامت یہ تھی کہ صبح ہی اس کی بھابھی سے ہلکی سی جھڑپ ہو گئی تھی اور دونوں کی بات چیت فی الحال منقطع تھی۔ اگر بندش کا یہ سلسلہ حرا کی جانب سے ہوتا تو وہ انا وغیرہ پر تین حرف بھیج کر بھابھی سے دوستی کر لیتی مگر مسئلے کا درد ناگ پہلو یہ تھا کہ اس دفعہ بات چیت بھابھی نے بند کی تھی اور حرا کی خودداری اور اتانی الحال کافی بلند تھی۔ حرا نے یہ ساری باتیں سوچیں مگر حنا پر ظاہر یہ کیا جیسے کھانے کے متعلق سوچ رہی ہو۔

”ایسا کرتی ہوں، تمہیں سب سے پہلے آسان سی چیز بنانا سکھاتی ہوں۔ ایسا کرو، فناٹ ایک ایسی انڈا لے کر آؤ۔ میں تمہیں سب سے پہلے انڈا ابلانا سکھاتی ہوں۔“

”مگر ہمارے گھر تو فارمی انڈے آتے ہیں۔“ حنا منمنائی۔

”فارمی؟“ حرا نے ناک بھوں چڑھائی۔ ”پلو وہی لے آؤ مگر دو لے کر آنا۔“

حرا کی یہ بات سن کر وہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی اور حرا نے ایک دیکھی پانی سے بھر کر چولہے پر رکھ دی۔

”اب میں ایسی بھی تالاق نہیں ہوں۔ انڈا تو ابل ہی لوں گی۔“ اس نے بار بار بھابھی کو انڈا ابلتے دیکھا تھا۔ اگرچہ سرسری نگاہوں سے دیکھا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ وہ یہ کام آسانی سے کر لے گی۔

حنا کا گھر پڑوس میں ہی تھا وہ فوراً ”دو انڈوں سمیت کسی جن کی طرح حاضر ہو گئی۔ اور حرا نے دونوں انڈے احتیاط سے دیکھی میں ڈال دیے اور چولہے کی آگ دھیمی کر دی۔ دس منٹ گزرے۔ بیس منٹ گزرے مگر پانی تو گویا وقت کی طرح ٹھہر گیا تھا۔ ابلنا تو درکنار اس میں فی الوقت کسی بھی طرح کے بلبلے بھی بننا شروع نہیں ہوئے تھے۔ حنا پر جوش نگاہوں سے اور حرا تشویش کی نگاہوں سے پانی کو دیکھ رہی تھی۔

”آخر یہ ابلنا کیوں شروع نہیں ہو رہی؟“ حرا جواب دینے کا سوچ ہی رہی تھی کہ

بھابھی کی یکن میں آمد ہوئی اور دونوں کا انہماک ٹوٹ گیا۔

”بھئی آج تیز کرو۔ یوں موم بیٹوں میں پکاؤ گی تو پکا چکیں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولیں تو حرا نے خاموشی سے چولہے کی آگ برہادی مگر سچ تو یہ ہے کہ بھابھی کے انداز نے اس کے وجود کو بھی وہ کا دیا تھا۔

پانی تھوڑی ہی دیر میں ابلنے لگا اب چونکہ حرا نے دیکھی لبالب بھر رکھی تھی، لہذا وہ ابل ابل کر نیچے گرنے لگا تو حرا گھبرا اٹھی۔

بھابھی جب انڈے اباتی ہیں تو پانی یوں تو نہیں گرتا۔ یہ کیا ہوا۔

پانی کی چھن چھن کرتی آواز نے اسے مزید بدحواس کیا اور اس نے گھبرا کر چولہا بند کر دیا۔ چولہے کا بیٹن گرم پانی کرنے کے باعث خود بھی گرم ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے چھونے کے باعث اس کے ہاتھ پر ایک ننھا سا پھپھولا بن گیا۔ یہ دیکھ کر حنا گھبرا گئی۔

”اچھا حرا! میں پھر آؤں گی شاید امی بازار سے آگئی ہیں۔“ وہ تو یہ کہہ کر چلتی بنی اور حرا پھونکیں مار مار کر ہاتھ کی جلن کم کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔



دو دن بعد حرا اس کے گھر گئی تو اس نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی نوٹس مانگنے اس کے گھر جاتی تو بے زاری اس کے چہرے پر صاف لکھی نظر آتی تھی۔
”آج تم مجھے کیا بنانا سکھاؤ گی؟“ حنا نے بڑی امید سے پوچھا۔

”آج میں تمہیں لیموں کا شربت بنانا سکھاؤں گی اس دن تو بھابھی نے آکر سارا کام بگاڑ دیا تھا۔ اب ہم باقی کی کوئنگ تمہارے گھر پر کریں گے ٹھیک۔“

حنا نے حرا کی بات سن کر سر ہلایا اور حرا کی ہدایتیں شروع ہو گئیں۔

”ایسا کرو ایک جگ پانی لو۔ اب اس میں چار کپ چینی اور دو کھانے کے چمچے نمک ملا دو۔ اب اس میں

چار لیموں نچوڑو۔ اب برف بھی ملا دو۔ گڈ! شربت تیار ہو گیا ہے۔“

حرا نے ہدایات کے مطابق من و عن حنا کو کام کرتے دیکھا تو خوش ہو کر بولی۔

”لاؤ! اب ایک گلاس شربت مجھے بھی دو۔“

مگر پہلا گھونٹ لیتے ہی اس کے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔

حنا کے چہرے کے زاویے بھی بگڑ کر رہ گئے تھے مگر حرا کے ڈر کے مارے اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حرا نے سارا بوجھ اسی پر ڈال دیا۔

”تم نے افضل میں پہلی دفعہ بنایا ہے نا اس لیے بناتے بناتے آئے جائے گا۔“

اگلے روز حنا پھر حرا کے کچن میں موجود تھی۔

”آج ہم ایک بنائیں گے۔“

”بنانا آتا ہے؟“ حنا نے مشتبہ لہجے میں پوچھا۔

”آج ہم اس میں سے پڑھ کر بنائیں گے۔“ حرا نے اس کے سامنے کک بک لہرائی۔

”اور ویسے بھی آدمی غلطیوں ہی سے تو سیکھتا ہے۔ تجربے ہی اسے عقل مند بناتے ہیں۔ ہر چیز خود بخود تھوڑا ہی آجاتی ہے۔ ایک دفعہ غلطی ہو گئی تو تم کیا سمجھتی ہو ہمیشہ غلطی ہوگی۔ چلو شاباش یہ سارا سامان منگوالو۔“

حرا نے ترکیب کے مطابق فہرست اس کے سامنے رکھی تو حنا نے بادل نخواستہ سارا سامان منگوا لیا، حرا نے احتیاط سے پڑھ پڑھ کر ہر چیز اس کے وزن اور ناپ تول کے مطابق لی اور میدہ تیار کر کے سانچے میں ڈال کر حنا کو تھمایا۔

”لو اسے اوون میں رکھ دو۔“ حنا متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی تو حرا جھلا اٹھی۔

”یہ ہونقوں کی طرح لے کر کیوں کھڑی ہو جاؤ۔ اوون میں رکھو۔“

”لیکن تمہارے کچن میں اوون کہاں ہے مجھے

تو نظر نہیں آ رہا۔“ حنا نے بے بسی سے اپنی مشکل بیان کی تو حرا کو یاد آیا کہ اس کے گھر میں تو اوون ہے ہی نہیں۔“

”اوہ! ہمارے گھر میں تو اوون ہی نہیں۔“ اب حنا کی شکل دیکھنے والی تھی۔

”نالا تق! اوون نہیں تھا تو کیک بنانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”تو مجھے کیا پتا تھا کہ کیک اوون میں بنتا ہے۔“

”کیوں تم نے ترکیب نہیں پڑھی تھی؟“

”تو وہ تو میں اسٹیپ بائی اسٹیپ پڑھ رہی تھی اب سب سے آخر میں لکھا ہے کہ اسے اوون میں رکھو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”تمہارا قصور یہ ہے کہ پہلے تمہیں پوری ترکیب پڑھنی چاہیے تھی۔ میرے اتنے سارے پیسے ضائع کر دئیے۔“ حنا غصے سے بولی اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی اور حرا افسوس سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔“ وہ بدبڑائی۔ ایک ہفتے بعد حرا نے پھر حنا کو بلا بھیجا۔ اس کا خیال تھا کہ حنا کا غصہ اب تک ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔

”آج لیموں کا اچار بنائیں؟“ حنا جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”سچ! آج کوئی غلطی نہیں کریں گے۔ میں نے پہلے سے پوری ترکیب پڑھ لی ہے۔“ حرا نے پھر کک بک اس کے سامنے لہرائی۔

”حرا! تم کتنی بار کہہ چکی ہو کہ آدمی غلطی سے سیکھتا ہے۔ میں بھی غلطی کر رہی تھی مگر اب سمجھ گئی ہوں کہ تمہاری دوستی جی کا جنجال ہے۔ میں نے سب کچھ امی سے سیکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گئی اور دروازے تک پہنچ کر گویا اسے کچھ یاد آیا تو پلٹ کر حرا سے بولی۔

”تم چاہو تو تم بھی آ سکتی ہو۔“

حرا پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ کچھ بول ہی نہ سکی صرف سر ہلا کے رہ گئی۔

نعیمہ ناز سلطان

رانی کی کہانی

”افسار کم بخت۔“

ابو اور بھائی کے منہ سے بیک وقت محکمہ بجلی کی شان میں گستاخانہ کلمات نکلے، ڈھائی گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کے بعد بجلی آئے ہوئے ابھی بمشکل دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے اور محترمہ پھر غائب ہو گئیں۔

انی نے ایک آہ بھری اور سلائی مشین ایک طرف کھسکا دی، اگرچہ مشین چلنے کے لیے بجلی کی محتاج نہیں تھی۔ وہ ہاتھ کی مشین تھی مگر سلائی کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور بمشکل ساٹھ گز لمبائی اور چالیس گز چوڑائی کے اس گھر میں

تدرتی روشنی اور ہوا کا گزر بہت کم کم ہی تھا، ہاں ایک صورت تھی کہ ان کا مسئلہ حل ہو جائے کہ اگر وہ بالائی منزل کے اس کمرے کی واحد کھڑکی پر پرامونا سا رہہ دیتیں جو اس پر لگا ہوا تھا تو کچھلی سڑک کی جانب کھلنے والی اس کھڑکی کے ذریعے دھوپ، روشنی اور ہوا کا گزر ٹھیک ٹھاک ممکن تھا مگر یہ ناممکن تھا کہ شوہر اور بڑے بیٹے کی موجودگی میں وہ اس پردے کو سرکالنے کی جرأت کر سکتیں۔

دونوں باپ بیٹوں کو یہ بات سخت ناپسند تھی کیونکہ سڑک پار میدان میں بیٹوں بیچ تین رہائشی عمارتیں بنی ہوئی تھیں دو میں سے ایک اسکول تھا۔ باپ بیٹے کی

مکمل تاول



ایک منطق تھی کہ اگر ان عمارتوں کی بالائی منزلوں پر کوئی کھڑا ہو کر ادھر دیکھے تو اندرونی منظر صاف نظر آئے گا اور ویسے بھی ان کے خیال میں کھڑکیوں میں لڑکیوں کو کھڑے ہونے کی عادت نہیں ہونی چاہیے۔

”بڑی آوارگی ہے یہ عادت۔“ ابو اکثر و بیشتر بیٹیوں اور بیوی کو یاد دہانی کرواتے رہتے تھے۔

”جب ان بلند نگز میں کھڑا کوئی بھی فرد ہمیں واضح نظر نہیں آتا تو ہم یہاں کھڑے یا بیٹھے کسی کو کیسے نظر آئیں گے۔“ تانیہ بہنوں کے درمیان بیٹھی اعتراض کرتی۔

”ہو سکتا ہے ابو اور بھائی کا خیال ہو کہ ان کی حسین و جمیل بیٹیوں کو گھور گھور کر کوئی نظر نہ لگاوے۔“

فردا انتہائی کڑوا منہ بنا کر اپنے جی کی بھڑاس نکالتی اس کا میوڈ ویسے تو تقریباً ”ہر وقت ہی خراب رہتا تھا مگر دن میں دوبار اس وقت تو ضرور ہی خراب ہوتا تھا جب خوب اچھی طرح صابن سے رگڑ رگڑ کر منہ دھونے کے بعد رنگ گورا کرنے کی ایک کریم لگا کر آئینہ اس امید سے دیکھتی کہ شاید آج کچھ فرق پڑا ہو مگر یہ آئینے بھی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ اس کی رنگت کی سیاہی اور عام سے نقوش بغیر کسی تبدیلی کے دکھا دیتے اس کی تنخیاں کچھ اور بڑھ جائیں ہر گزرتا دن اندر کی کڑواہٹ میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔

”کیا پتا کوئی دور بین لگا کر یہاں کا یا ہمارا نظارہ کر لے۔“ سائرہ دور کی کوڑی لے کر آتی۔

”ایک بار دور بین لگا کر نظارہ کر لیا تو آئندہ دیکھنا تو درکنار وہاں کوئی کھڑا بھی نہیں ہو گا کالی پیلی، سڑی بسی شکلوں سے کسے دچکپی ہوگی۔“ فردا کا لہجہ نیم ہو جاتا اور باقی بہنوں میں سے اس کی باتوں کو کوئی ہنسی میں اڑا دیتا اور کوئی خاموشی کا زہر چپ چاپ اپنے اندر اتار لیتا۔

”اتنا ہی پردے اور چار دیواری کا خیال ہے تو کھڑکی بند کیوں نہیں کروا دیتے۔“

عمیرہ جلے دل کے پھولے پھوڑتی، گھر بھر میں

سب سے زیادہ اسے ہی گرمی ستاتی تھی۔

”کھڑکی کیوں بند کروائیں گے۔ رات کو خود سو رہے ہیں اس کمرے میں، ہمیں ہوا کی ضرورت نہیں مگر انہیں تو ہے؟“ مائرہ کو اور بہنوں کے مقابلے میں باپ اور بڑے بھائی سے زیادہ پر خاش تھی۔ وہ پڑھائی میں اچھی تھی۔ آگے پڑھنے کا شوق تھا۔ کچھ نئے کام عزم تھا مگر میٹرک بہت اچھے نمبروں سے کلیئر کر کے بعد اس نے کالج میں داخلے کے لیے کہا تو ابو نے صاف منع کر دیا۔ کچھ ماہ پہلے محلے کی ایک لڑکی جو کالج میں سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی اس کو اور اس کے اس فعل پر لعنت ملاامت کرنے کے ساتھ کالج اور اس کے ماحول کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

”ہزاروں لڑکیاں پڑھتی ہیں کالج میں، ایک کی غلط حرکت سے ساری لڑکیاں خراب اور پورا کالج بدنام۔“ مائرہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ مگر خیر بقول فردا اگر عظمیٰ کسی کے ساتھ گھر سے نہ بھی بھاگتی، تمہارا کالج میں ایڈمیشن بھر بھی خوش فہمی ہی تھا۔ ہمارے گھر میں اس خواب کی تعبیر کسی نے پائی ہے؟ ابو کسی اور بات کو جواز بنا کر انکار کر دیتے۔

”کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے گھر والے دنیا سے الگ ہی کوئی زندگی جیتے ہیں اور ہمیں بھی ان ہی سانچوں میں فٹ کر رکھا ہے۔“ رابعہ ان سب میں سب سے زیادہ حساس تھی سو جتنی بہت زیادہ تھی اور بولتی کم۔

اس کے اندر کی لڑکی نے اپنے ماحول کے جس اور گھٹن سے سمجھوتا نہیں کیا تھا وی اور ڈانچہ سٹون کی کہانیوں میں جو خوب صورت لوگوں کی دنیا وہ دیکھتی پڑھتی اور سنتی تھی اس کے تصورات اور خواب آنکھوں میں جتنے لگے تھے اگرچہ یہ خواب کوئی بہت اونکھے اور یہ خواہشات لامحدود نہیں تھیں مگر عمیرہ کہنا تو یہی تھا کہ جب ایک پنجرے سے نکل کر دوسرے پنجرے میں جانا ہے تو بلاوجہ آزادی اور خوش

گمانوں کے خواب دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

”اگر میری آنکھوں سے میرے خواب چھن جائیں تو میں تو مری جاؤں۔“ رابعہ دہل کر سوچتی۔

”اللہ جانے اب یہ منحوس ماری کب آئے گی۔“ ابو بیدار ہوتے ہوئے اٹھنے لگے۔

”دو چار گھنٹے سے پہلے کیا آئے گی۔“ بھائی بھی مایوسی سے بولتا ہوا جب سے موبائل نکالنے لگا، اچھا خاصا اپنی پسندیدہ مودی دیکھ رہا تھا کیبل پر کم بخت بجلی کے کھیلنے سے سارا میوڈ غارت کر کے رکھ دیا۔

”چل اچھا فرحان! ذرا یہ پردہ تو ہٹا دے کھڑکی کا۔“ کچھ تو ہوا آئے گی۔“ ابو اور فرحان کی موجودگی میں کھڑکی پر سے پردہ ہٹانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا اس لیے کہ پھر اس کمرے میں صرف وہی دونوں یا زیادہ سے زیادہ اہی ہوتی تھیں۔ لڑکیاں سب دوسرے کمرے میں پائی جاتی تھیں۔

فرحان نے اٹھ کر موٹا اور بھاری سا پردہ ہٹا دیا، پورا کمرہ روشنی اور ہوا سے بھر گیا۔ اس رخ سے بڑی اچھی ہوا آتی تھی۔ وہ تنگ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے فرحان نے جیب سے گنگا نکالا۔ کھول کر منہ میں رکھا اور بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا ہوا ہلکا ہلکا چل دیا اہی نے موقع غنیمت جان کر سلامتی مشین دوبارہ کھسکا لی۔ رابعہ کی قمیص میں تھوڑا سا کام رہ گیا تھا۔



آج اتوار تھا، فرحان کی تو خیر فیکٹری کی چھٹی تھی اور شوہر کا کام تو ہفتے کے ساتوں دن کا تھا، وہ ہر گز کاٹھیلہ لگاتے تھے۔ چالیس سال ہو گئے تھے یہ کام کرتے ہوئے۔ جب یہ کام شروع کیا تھا تو اس وقت بن کباب کے نام سے جتنے تھے پھر یہ بن کباب ”پرگر“ کے روپ اور نام میں ڈھل گیا آمدنی ٹھیک ٹھاک تھی پھر وہ مختصر بھی تھے سولڑکوں کے بڑے ہونے اور روزگار سے لگنے تک بخوبی گھر کی گاڑی گھسیٹے رہے یکے بعد دیگرے دس بچوں کی پیدائش میں سات لڑکیاں ہونے پر بھی

دونوں میاں بیوی اتنا نہیں گھبرائے اور بوکھلائے جتنا پچھلے چند سالوں میں منگائی کے ہاتھوں عاجز آ گئے تھے۔

فرحان فیکٹری میں لگا تو انہوں نے کچھ سکون کا سانس لیا، چار مہینے کا سہارا تو مزید ہوا فرحان نے تو خیر انہیں اتنا مایوس نہیں کیا مگر اس سے چھوٹے عدنان کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔

چھٹی ساتویں جماعت تک تو وہ ٹھیک رہا پھر اس کے بعد بتدریج اس کے مزاج میں گرمی اور تیزی آتی چلی گئی، محلے سے اسکول کے بچوں کے ساتھ روز کا لڑائی جھگڑا، مار کشتائی، کالم گلوچ، آئے دن کی شکایتیں۔ کئی بار انہوں نے تنگ آکر بے تحاشا سے پیٹا، مگر مار کھا کھا کر وہ اور ڈھیٹ ہو گیا، اسکول سے خیر اس نے خود ہی قطع تعلق کر لیا تھا، محلے اور علاقے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا پھرتا، جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا

اور بھی سرکش اور بدتمیز۔ بری صحبت رنگ لائی، ایک روز موبائل چھینتے ہوئے پکڑا گیا، باپ کو تھانے بلایا گیا۔ پولیس نے رہائی کے بدلے کچھ نذرانہ مانگا تھا۔

”اس کو جیل میں ڈال دو، اچھا ہے عقل ٹھکانے آجائے گی۔“ باپ نے ٹکڑا توڑ جواب دیا اور گھر واپس آ گیا۔

پولیس والوں نے چھ ماہ کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ وہاں محفل تو کیا ٹھکانے آتی اور دماغ کیا ٹھیک ہوتا اور نئے گر اور ہتھکنڈے سیکھ لیے جواب تک باہر کی دنیا میں بھی نہیں سیکھے تھے۔ مستزاد یہ کہ جس پینے کی لت بھی لگالی، سگریٹ پہلے بھی پیتا تھا مگر خالی، جیل آیا تو بھری ہوئی سگریٹ کے مزے بھی سیکھ لیے۔ جیل سے چھوٹ کر آیا اور یہ نئی سوغات ساتھ لایا۔ باپ کو پتا چلا تو پہلے اپنا سر پیٹ کر پھر بیٹے کو پیٹ کر رہ گیا۔

ماں سوائے آنسو بہانے اور۔ پریشان ہونے کے اور کیا کرتی، بیٹے کی عادت بد چھڑانے کی تک وہ دو میں لگی، کسی نے ایک اسپتال کا بتایا جہاں نشے کے عادی افراد کا علاج کیا جاتا تھا، ماں نے پیار محبت سے سمجھایا،

مگر وہ کسی طور وہاں جانے پر راضی نہ ہوا پھر ماں نے روایتی حربہ استعمال کیا اور اپنا دھڑا بیٹے کے قدموں میں ڈال دیا، بیٹا اک دم بوکھلا گیا۔

”کیا کر رہی ہو امی!“ شرمندہ چہرہ لیے اس نے دوپٹا اٹھا کر ماں کے سر پر ڈالا۔

”تیری بھلائی اور بہتری چاہتی ہوں بیٹے! کون ماں چاہے گی کہ اس کا بیٹا ہر پینے کی عادت ڈال لے۔“

باپ کا گرجنا برسا اور مار پیٹ تو ایک طرف رہ گئی ماں کی منت سماجت، رنگ لے آئی۔ وہ نشہ چھوڑنے اور اپنا علاج کروانے پر راضی ہو گیا۔

اسپتال میں خلاف توقع اس نے بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، ڈاکٹروں سے تعاون ہر دوا، ریزیم اور بدایت پر عمل، ماں خوش ہو گئی، باپ کچھ مطمئن اور باقی گھروالوں نے سکون کا سانس لیا، وہ صحت یاب ہو کر گھر آیا تو اس کا پلٹ کی وجہ بھی ماں کو بتادی۔

اسپتال میں ایک لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے نشہ منی باپ کے علاج کے لیے وہاں موجود تھی، دن بھر وہیں رہتی۔ شام ڈھلے گھر چلی جاتی، بھائی ایک ہی تھا، شادی شدہ بیوی بچوں میں مکن سالوں سے بھولے بیٹھا تھا کہ اس کی چار بہنیں اور ایک نشہ باز باپ بھی ہے، سوا ب بیٹے کی ذمہ داریاں بھی بیٹیاں سنبھال رہی تھیں۔ تین بہنیں کسی فیکٹری میں نوکری کرتی تھیں یہ سب سے چھوٹی بھی مدیحہ گھر اور باپ کو سنبھالتی تھی، بمشکل اٹھارہ سال کی ہوئی تھی۔

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں نہیں تھیں مگر خود کو سنوارنے اور خوب صورت دکھائی دینے کے فن میں طاق تھی، اسپتال میں باپ کے برابر والے بیڈ پر لیٹے عدنان میں اپنے پسندیدہ ہیرو کی بے پناہ شباهت دیکھی تو وہیں دل دے بیٹھی، نظریں ملیں، دل ملے پھر ایک دوسرے کے موبائل نمبروں کا تبادلہ بھی ہو گیا۔ محبت کی قسمیں کھاتے ہوئے اس نئے نشے میں چور عدنان نے اس کی فرمائش پر دل و جان سے عہد بھی کیا اور وعدہ بھی کہ تمام بری حرکتیں چھوڑ کر ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزارے گا۔

”ہماری منتفی کرد ماں! میں اس کے بغیر نہیں سکتا۔“ گھر آ کر ماں سے سب سے پہلی فرمائش اس نے یہی کی۔

”کوئی کام دھندا تو کر بیٹے! میں تیری منتفی بھی کروں گی اور دھوم دھام سے شادی بھی۔ تو فکر مت کر۔“ ماں نے چکارا وہ تو یہ دیکھ دیکھ کر ہی نہال ہو رہی تھی کہ صبح کا بھولا شام ڈھلے گھر لوٹ رہا تھا۔

باپ اگلے روز سو کر اٹھا۔ اپنے معمول کے مطابق ٹھیلانگانے کی تیاری کرے تو حیران رہ گیا، ٹھیلانگ چکا تھا اور بالکل تیار تھا اور عدنان بھی۔

”ابے کیا کر رہا ہے یہ؟ کہاں لے جا رہا ہے اسے“

”ابو! تم گھر پر آرام کرو، آج ٹھیلان میں لے جا رہا ہوں۔“ زندگی میں شاید پہلی بار عدنان نے اتنے تمیزدار لہجے میں انہیں مخاطب کیا تھا، وہ حیران پریشان کھڑے کے کھڑے رہ گئے، عدنان ٹھیلان لے کر چل دیا۔

”کوئی مجھے بتائے گا یہ معاملہ کیا ہے؟“ انہوں نے مشکوک نظروں سے بیوی کو گھورا جو ان کے لیے چائے نکال رہی تھیں۔

”ناشتا کر لو پہلے، پھر آرام سے بتا دوں گی۔“ انہوں نے شوہر سے نظریں چرا لیں، ابھی ایک نئے طوفان سامنا کرنا تھا انہیں۔

”لے کر لیا ناشتا، اب بتا، کیا بات ہے؟“ انہوں نے دو چار گھونٹوں میں چائے کا پیالہ خالی کر کے بیوی کے آگے رکھا۔ لڑکیاں ارد گرد اپنے اپنے کاموں میں یوں مشغول تھیں جیسے نہ ان کے پاس آنکھیں ہوں نہ کان، انجان بے نیاز۔

ماں نے تھوک نکل کر خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش کی، پھر اپنی دانست میں مناسب اور مختصر لفظوں میں عدنان کا معاملہ یوں بیان کیا کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

”ہوں، لونڈیا کا معاملہ ہے۔ جب ہی تو میں کہوں، شیطان سے فرشتہ کیسے بن گیا۔“ خلاف توقع ان کا رد عمل ایسا گھن گھرج والا نہیں تھا، جس میں کسی

طوفان کے آثار پائے جاتے ہوں۔

”سائے کو گھر میں بیٹھی بہنیں نظر نہیں آرہیں جو عشق و عاشقی کے چکر میں پڑ گیا، اوپر سے منتفی کی فرمائش کھل کو گئے گا کہ ابھی شادی کر دو، کہاں رکھے گا اسے، اپنے سر پہ؟ کھلائے گا کیا، خاک دھول؟“ وہ بیوی سے سوال کر رہے تھے جن کا جواب شاید بیٹے کے پاس بھی نہ تھا۔

”اب جو ہو گیا وہ ہو گیا، آگے کی بتاؤ کیا کرنا ہے۔“ بیوی نے شوہر نامدار کا مزاج کچھ بہتر پایا تو آگے بات کرنے کی جرأت کی۔

”میں کیا بتاؤں عورت! تو خود دیکھ لے، پانچ پہاڑ ابھی سامنے کھڑے ہیں! نہیں کون سرکائے گا؟“ چھوٹے کی شادی کرے گی تو بڑا کیا چپ بیٹھ جائے گا وہ شور نہیں مچائے گا کہ میری بھی کرو۔“ غصہ کرتے ہوئے دور کی گوی لائے۔

”اس کی بھی کر دیں گے۔“ وہ سادگی سے بولیں۔

”واہ واہ بھی واہ، دونوں بیٹیوں کی شادی کر دے اور ہاتھ پاؤں کٹوالے اپنے۔ وہ کالے سروالیاں آئیں گی اور ان دونوں کو لے کر چلتی بنیں گی تو بیٹھی اپنا سر پیٹتی رہتا، شادی کرنے کے لیے یہ مخلوق تجھے نظر نہیں آ رہی؟“ انہوں نے بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی کو یوں گھورا جیسے ابھی کچا چبا جائیں گے۔

”یہ تو نصیب کے کھیل ہیں، کوئی مناسب رشتہ ہو تو ان کی بھی کر دیں گے۔ دو لڑکیوں کی بھی آخر شادی کی ہے، انہیں بھی کوئی بٹھا کر تھوڑی رکھیں گے۔“ امی نے رساں سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”رشتہ تو رشتہ ہوتا ہے، مناسب، غیر مناسب کیا ہے، ایک ایک کر کے جلدی جلدی جان چھڑا اپنی۔ بتا نہیں کون سے شہزادوں کے سنے دیکھ رہی ہے اپنی لڑکیوں کے لیے۔“ عدنان کا معاملہ ایک طرف رکھ کر وہ نئے قفسے میں الجھ گئے۔

”ایسے کیسے کسی کے ہاتھ پکڑاؤں، کوئی رشتہ ہو تو کول۔“ امی نے ناشتے کے برتن سمیٹ کر ایک

حرف رکھے اور دھوتا شروع کر دیے۔ مختصر سا کچن تھا جو بقول لڑکیوں کے راستے میں بنا ہوا تھا، یہاں باپ کی نکاسی کا انتظام نہیں تھا۔ نل کے نیچے خالی بالٹی رکھ کر برتن دھوتی جاتیں، بالٹی بھر جاتی تو کوئی بھی لڑکی یا لڑکا اسے نیچے ہاتھ روم میں ڈال آتا۔

”شمسہ بوانے جو رشتہ بتایا تھا۔ اس پر بھی تو نے کوئی توجہ نہیں دی۔“ انہوں نے اپنی نفیشت کا دائرہ اور وسیع کیا۔ اس رشتے کی بات بیوی نے تو انہیں نہیں بتائی تھی، کل رات شمسہ بوا سے اتفاقاً ٹکراؤ ہو گیا تو وہی بات نکال بیٹھی تھیں۔

”کچھ خدا کا خوف کرو، وہ دو بچوں کا باپ، پینتیس چالیس سال عمر بتا رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے، زیادہ کا ہی ہو، فروا کے لیے کہہ رہی تھیں، تو وہ مشکل سے انیسویں سال میں لگی ہے، ایسے کیسے آنکھیں بند کر کے بیاہ دوں۔“

”رنگ دیکھا ہے اس کا، یہ رشتہ آگیا غنیمت ہے

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



میگ عبدالقادر مہوں

شروت نذیر

قیمت - 225 روپے

منگوانے کا پتہ:

کتبہ و عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

اور کون ارمان لیے بیٹھا ہے شزاو کے؟ انہوں نے طنز کے تیر چلائے۔ کمرے میں دستک کرتی فروا کے چہرے کی سیاہی اور گہری ہو گئی جب سگا باپ ہی ایسے باتیں کرے تو غیروں سے کیا امید کریں، اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔

”کالی ہے تو کیا اسے ایسے ہی کنویں میں دھکا دے دیں؟“

وہ کسی معاملے میں تینوں کے آگے نہیں بولتی تھیں مگر بس بیٹیوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں وہ شوہر کے آگے ڈٹ جاتی تھیں۔

”گھر میں سجا کے رکھے گی مہارانیوں کو تیری میری آنکھیں بند ہو گئیں تو دل جائیں گی۔ کون دیکھے گا انہیں، کون فکر کرے گا، جتنی جلدی ہو سکے اپنے سامنے انہیں گھریار کا کر دیں تو اچھا ہے، اس جھوپڑے میں کہاں تو اچھے رشتوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جو اللہ بھیجے، اسی کے سنگ رخصت کر دے۔“ ان کی باتیں شاید معقول تھیں، امی چپ ہو گئیں۔

”مجھے تو ان لڑکیوں کی فکر کھائے جا رہی تھی، یہ کمینہ بد ذات بھی بیچ میں کود پڑا۔ اللہ جانے کس کے گھر کا گند خانہ سمیٹ کر لائے گا، وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بیٹے کو مغلظات سے نوازنے لگے۔

”یہ کیا کم ہے کہ نشہ چھوڑ دیا۔ یار دوستوں میں اب نہیں بیٹھتا، کام دھندے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اب اس کے اچھے مستقبل کے لیے تھوڑی بہت قربانی ہمیں بھی دینی پڑی گی۔“ امی دبے لفظوں میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

”ہاں، یہ خوب کہی تو نے، قربانی ہمیں اس درخت کے لیے اور پھل کوئی اور آکر کھائے، ان کا لہجہ پھر طنز پر ہو گیا۔“ اپنے لاڈلے سے بول دینا، دھندا کرنا ہے تو اپنے ٹھیلے کا انتظام کر لے، میرے جیسے جمائے کام پہ کیوں ہاتھ صاف کر رہا ہے میں گھر بیٹھ کر کیا اس کی شادی کی تیاریاں کروں گا؟ اپنی روزی روٹی نہ کماؤں؟ انہوں نے اٹھتے ہوئے بیوی کو تنبیہ کی۔

”اچھا میں کہہ دوں گی۔“ انہوں نے ایک سانس لی۔ خدا خیر کرے، ان کا مہتابھرا دل اندھیلوں بھرا ہوا تھا۔



مختصر سے کمرے میں دو الماریوں اور ایک سیڑھی کے بعد بس اتنی جگہ بچتی تھی کہ وہ پانچوں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھے بیٹھے اس میں سما جائیں۔ عموہ اور ثانیہ کڑھائی کے فریم ہاتھوں میں لیے اپنے جینز کی چادر کی کاڑھنے میں مگن تھیں، میٹرک کر کے ان کی مصروفیات اور مشاغل بس یہی تھے۔ گھر کے کام، امی اور سلائی کڑھائی بنائی۔ اس فن میں لڑکیوں کو طاق کر ان کی برادری اور خاندان میں بہت ضروری سمجھا جاتا تھا، جب تک لڑکی کے جینز میں اس کے اپنے ہنر کا لہجہ نہ ہو، اس گھرانے کو ایویس ہی سمجھا جاتا تھا۔

خاندان اور برادری میں لڑکوں والے بہت سے گھرانے ایسے تھے جہاں ان کی لڑکیوں کی کھپت ہو جاتی تھی۔ لہذا امی نے لڑکیوں کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جو ان گھرانوں کی عورتوں کے لیے مناسب ہو۔ تقریباً سب کے خیالات ہی کچھ معاملات میں یکساں تھے اور رسم و رواج کے معاملے میں سب ایک کے فقیر، میٹرک کے بعد حصول تعلیم کو غیر ضروری اور فضول سمجھا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو آگے چل کر گھر سے ہوتا ہے، بچے پالنے ہوتے ہیں۔ گھر داری کا طریقہ سلیقہ آنا چاہیے، سلائی کڑھائی بنائی، کھانا پکانا، سب میں طاق ہونا چاہیے۔ زیادہ پڑھ لکھ کر تو لڑکی کسی کام کی نہیں رہتیں، یہی سوچ تھی جس سے خاندان، برادری کی لڑکیوں پر عمومی طور پر تعلیم سے دروازے بند کر رکھے تھے۔ جونکمی تھیں وہ مشکل سے آٹھ دس جماعتیں پڑھ کر جان چھوٹنے پر خدا کا شکر ادا کرتیں، گھر بیٹھے اپنے جینز بناتیں اور اسے استعمال کرنے کے سنہری پنہ دیکھتیں جنہیں پڑھنے شوق تھا وہ اپنا دل مار کر گھر بیٹھ جاتیں اور قربانیوں کی طرح یہ قربانی بھی صنف نازک کے حصے میں ہی آتی۔

باقی رہے لڑکے تو انہیں بھی گھر کے معاشی حالات اور خوفناک منگائی کے سبب پڑھائی میں زیادہ وقت ضائع کرنے کے بجائے چھوٹی عمروں میں ہی کسی نہ کسی ہنر کو سکھانے، ٹھادے، کچھ بڑے ہوتے تو گھر کی گاڑی گھسنے میں انہیں بھی باپ بھائی کے ساتھ جوت دیا جاتا، سب کے سب کو لوہے کے تیل کی مانند ایک دائرے میں سفر کر رہے تھے، جہاں سے چلتے وہیں پہنچ جاتے۔

”یہ ابو فروا کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟“ رابعہ نے دھیمی آواز میں ماں سے سوال کیا جو ٹانگیں پھیلائے گاؤں کے سے ٹیک لگائے بیٹھی جانے لگا سوچ رہی تھیں۔

”وہ جو شمسہ بوانے رشتہ بتایا تھا، امی کی بات کر رہے تھے، تمہارے باپ سے جانے کیا تعریفیں کی ہیں بوانے؟“ امی نے پیشانی کو ہاتھ کی پھٹی سے مسلا، اتنے مسائل تھے کہ صرف ایک ہی سوچتے بیٹھتیں تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔

”اتنا ہی اچھا رشتہ ہے تو بوا اپنی نواسیوں میں سے کسی ایک کا کیوں نہیں کروا دیتیں، وہ کون سی سفید آنے کی بوریاں ہیں۔ کالی بھی نہیں، وہ نظر نہیں آئیں بوا کو؟“ رابعہ کا دل حساس تھا پھر بہن سے محبت بھی تھی، جلے دل کے پھپھولے ماں کے سامنے پھوڑنے لگی۔ صبح ابو کے باہر جانے کے بعد فروا کا بلک بلک کر رونا اسے تڑپا گیا تھا۔

”ایسی باتیں کہہ دو تو لڑائی ہے اور برے بھلے جیسے بھی رشتے تو بتائی دیتی ہیں۔ لوگوں کو گھر تک لے آتی ہیں وہ بھی بغیر کسی غرض اور لالچ کے آخر سمیرا اور حمیرا کا رشتہ بھی تو وہی لائی تھیں، اللہ کا شکر ہے، دونوں اپنے اپنے گھر سمیٹ کر بیٹھی ہیں۔“ امی نے اسے سمجھایا۔

”پتا نہیں اللہ نے ہمیں ایسے گھروں میں ایسی شکلوں اور ایسے نصیبوں کے ساتھ کیوں پیدا کیا ہے؟ سانس بھی لو تو گھٹ گھٹ کر۔ خواب بھی دیکھو تو ڈر کر نہ زندگی میں نہ گھروں میں کوئی ایسا روزن بھی تو

نہیں کہ باہر سے ایک ننھی کرن ہی اندر آ سکے۔“ رابعہ جو کچھ سوچتی اسے اپنی ڈائری میں لکھ لیتی، دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ طریقہ اس نے ان ڈائجسٹوں اور کہانیوں سے سیکھا تھا جنہیں وہ بہت شوق سے پڑھتی تھی، جانے کچھ کہانیوں کا اثر تھا یا حساس طبیعت کہ باقیوں سے کچھ الگ مزاج تھا اس کا جو کچھ کہانیوں میں پڑھتی، فلموں، ڈراموں میں دیکھتی، اسے اپنے گھر زندگی اور حالات میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی، مایوس ہوتی تو ڈائری اور قلم لے کر بیٹھ جاتی۔ اس وقت بھی وہ لکھنے بیٹھ گئی کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

”محبت، ایثار، ہمدردی، قربانی، کتنے خوب صورت جذبوں اور احساسات کو گوندھ کر کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ خوب صورت لوگ، حسین مناظر، اعلیٰ انسانی جذبے، عمدہ خیالات، اچھی اچھی باتیں، ان سب کا گزر فقط کہانیوں میں ہی کیوں ہوتا ہے ہماری زندگی میں کیوں نہیں؟

ہماری زندگیاں، محرومیوں سے عبارت ہیں۔ بہترین طور طریقے، ادب، آداب اور اخلاقیات کا گزر ہمارے ہاں کم ہی ہے۔ خوب صورتی انسانوں کی ہو یا رویوں کی ڈھونڈنے سے بھی مشکل سے ملتی ہے اور محبت؟ یہ تو شاید وہ نایاب جہ ہے جسے ہم اپنا آپ مول دے کر بھی حاصل نہیں کر سکتے، ہر رشتہ کسی نہ کسی ضرورت سے بندھا ہے، ہم ایسے کیوں ہیں؟ ایسے ماحول میں کیوں ہیں؟ اللہ نے ہمارے لیے ایسا ماحول، ایسے لوگ اور ایسا گھرانہ کیوں پسند کیا؟ ہم جیسے لوگوں کی کہانی کون لکھے گا؟ جو خود تو کچڑ میں پڑے ہوئے ہیں مگر چاند کو دیکھ کر اسے پانے کی تمنا کر بیٹھتے ہیں، ہمارا نوحہ کون لکھے گا کہ ہم اپنی ہی سانسوں کے قیدی ہیں، انہیں چھوڑ کر جائیں تو کہاں جائیں؟ کیا کریں؟“

لکھتے لکھتے وہ رک گئی۔ ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔ قلم ڈائری کے درمیان ہی رکھ کر ڈائری بند کر دی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

ٹانگیں فروا کے اوپر رکھ دی گئیں۔ وہ بھٹا کر اٹھ بیٹھی۔

”ٹھیک سے نہیں لیٹا جاتا تم سے؟“ اپنی ٹانگیں اپنے پاس ہی رکھا کرو۔“ اس نے فروا کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”کیا مصیبت ہے؟“ فروا آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی۔ ”یہاں کروٹ لینے کی جگہ نہیں ہے اور تم سوتے میں لوٹ لگاتی رہتی ہو۔“

ثانیہ نے اسے غصے سے گھورا ایک تو گرمی سے ویسے ہی برا حال تھا۔ اوپر سے چھوٹے سے کمرے میں چھ نفوس برابر ایسے لیٹے تھے کہ کروٹ بھی بہت احتیاط سے لینی پڑتی تھی بازو پورا پھیلاتے تو برابر والے کے منہ پر پڑتا، چھت کا پنکھا ہوا تقسیم کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا، مگر جس اور کھٹن کی فضا میں وہ بھی کیا کرنا۔ یہی غنیمت تھا کہ بجلی موجود تھی اور وہ چل رہا تھا۔

عدنان دوسرے روز بھی باپ کا ٹھیل لے گیا تھا۔ حالانکہ ماں نے باپ کی وارننگ اس تک پہنچادی تھی، تو اس نے ہفتہ دس دن کا کہا تھا کہ وہ اپنے ٹھیلے کا بندوبست کرے گا ”جب تک تو یہی لے جاتا ہوں“ وہ ماں سے بولا تھا، باپ نے سنا مگر جانے کیا سوچ کر خاموش رہے۔ اس دن خلاف توقع عدنان جلدی گھرا گیا تھا۔

”اتنی جلدی کیسے آگیا؟“ باپ نے حیران ہو کر سوال کیا۔

”مال ختم ہو گیا تھا اس لیے آگیا۔“ ”ابے، مال بیچ کر آیا ہے یا بانٹ کر؟“ انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

”بیچ کر آیا ہوں۔ گر لڑکالج کے باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ یوں ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔“ واش میسن میں ہاتھ منہ دھو کر اب وہ آئینہ دیکھتے ہوئے اپنے بال سنوار رہا تھا۔ ”وہاں تو پولیس والے کھڑا نہیں ہونے دیتے، تو کیسے کھڑا ہو گیا؟“

”انہوں نے ہی کھڑا کیا تھا، جس تھانے دار نے جیل میں ڈالا تھا۔ وہ گشت پر تھا، میں نے جا کر سلام کر

لیا اور کہا کہ صاحب، یہاں کھڑے ہونے کی اجازت دے دیں، پتا نہیں کس موڈ میں تھا۔ ہنسنے لگا پھر ”تمہیں سدھرا ہوا دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے دوبارہ تو جیل نہیں آؤ گے۔“

”میں نے کہا کہ صاحب! دوبارہ جیل جانا ہوتا، ٹھیل لگا کر دھوپ میں کیوں پھرتا؟ کتنے لگا کہ ”جل جا کر کھڑا ہو جا“ کوئی پوچھے تو میرا نام لے کر کہہ دے، میں نے کھڑا کیا ہے، مگر سو روپے چائے کے لیے لیے۔“ عدنان نے تفصیل سے بات بتائی۔

”نصیب ہے تیرا جو سو روپے پہ معاملہ پٹ گیا اور تو۔۔۔ خیر آج کتنے کا دھندا ہوا؟“ عدنان روز کی آمد کر ان ہی کے ہاتھ پر رکھ رہا تھا وہ خوش تو بہت ہوئے مگر انہوں نے اس خوشی کو ظاہر نہیں کیا کہ آسمان پر چڑھ جائے گا۔ بولے گا کہ آج ہی نکاح کرا کے رکھ کر والو۔ انہوں نے دل میں سوچا۔

دو ہفتے بعد عدنان نے اپنا ٹھیل سیٹ کر لیا تو وہ اپنے دھندے سے لگ گئے۔ عدنان کو کام کرنا بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ اس نے اپنی شادی رٹ لگائی۔ ادھر باپ کو اس رشتے کی فکر ہو رہی تھی شمسہ بوانے فروا کے لیے بتایا تھا۔ بیوی منع کر رہی تھیں اور وہ خود ابھی عدنان کی شادی سے انکاری تھے گھر میں تقریباً ”روزانہ ہی لڑائی جھگڑا ہو رہا تھا“ مگر عدنان کے معاملے میں جیت باپ کی ہوئی، انہوں نے شمسہ بوا کے توسط سے ان لوگوں کو گھبرا لیا، فروا کا رویا ہوا اور سوچی ہوئی سرخ آنکھیں نظر انداز ہو گئیں۔ جب ایک جیتی جاگتی لڑکی نظر انداز ہو رہی تھی تو ان کے جذبات و احساسات کی پروا کون کرتا۔ یہ سب پیٹ بھرنے کی باتیں تھیں۔

فروا سے شادی کے امیدوار کی عمر تقریباً ”اڑیسہ سال تھی۔ ایک بیٹا نو سال کا اور دوسرا چھ سال کا تھا۔ موصوف کی ماں اور تین بہنیں لڑکی دیکھنے آئی تھیں مستقبل کے دو لہما کی ماں کی بس ایک کمزوری تھی ہونے والی ہو کم عمر ہو۔ شکل و صورت چاہے جیسی، ان کے خیال میں کم عمر ہو میں جلدی اور آسانی سے

قابو میں آجاتی ہیں۔ اسی لیے فروا کی جی بھر کے کالی رنگت نظر انداز کر کے انہوں نے اس رشتے کی ہابی بھلی۔

”پہلی اس سے بڑی ثانیہ اور رابعہ ہیں۔ انہیں چھوڑ کر ایسے لیے کروں فروا کی وہ بھی دوہا جو ہے۔“ ای جتا اور جیسا احتجاج کر سکتی تھیں۔ شوہر کے آگے گر رہی تھیں۔ عدنان اپنے ہی چکروں میں لگا رہا تھا وہ چاہ رہا تھا کہ فروا کی بارات کے دن اس کا رسمہ بھی نہٹ جائے، بڑا فرحان جان بوجھ کے خاموش تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک ایک کر کے کم از کم دو، تین، پہاڑ کھسکیں تو شاید اس کی باری آجائے۔

تین ماہ بعد اس کی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔ فروا کے سرال والے آئے۔ مٹھالی کھلا کر ہاتھ پہ شنگن کے کچھ نوٹ رکھے اور رشتہ پکا ہو گیا۔ شادی کے انتظامات ابو اور فرحان کے ذمے تھے، دونوں نے کیٹیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ جینز کا کچھ سامان امی تھوڑا تھوڑا کر کے لاتی رہتی تھیں، شادی بہر حال ٹھیک ٹھاک ہو جاتی۔



”یہ گنے کا رس ہے۔ سب کو دے دے گلاسوں میں ڈال کر۔“ ابورات گئے ٹھیل لے کر آئے تو واپسی پر بڑے بڑے دو شاہر مارے کو پکڑائے، ان کا معمول تھا رات جب بھی گھر آتے، اکثر ہی کچھ نہ کچھ لے آتے، کبھی پھل، کبھی چاٹ، سمسو سے گول پکے، رنگ برنگے شربت، جس دن بکری ذرا زیادہ ہوتی اس دن مٹھالی نمکو، روسٹ یا تنکے جیسے آٹنم بھی آجاتے ایک روز رابعہ کو عادت کے مطابق بیٹھے بٹھائے خفقان ہو رہا تھا۔

”اگر ہمارے گھر کی آبادی کچھ کم ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا، کچھ تو بہتری آتی، تین، چار بچے بھی کافی ہوتے ہیں ایک فیملی بنانے کے لیے۔“ وہ اپنی بہنوں سے مخاطب تھی۔ ”ہم جتنے بھی ہیں۔ اور ہمارے ابو جیسے بھی ہیں کم

از کم کھانے پینے کی تو کوئی تنگی نہیں ہے نا، ہم یہ فلمی ڈائلاگ نہیں مار سکتے کہ۔“

”کھلا نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟“ سارہ نے جواب دیتے ہوئے بڑی مہارت سے نقل اتاری، سب کی سب کھلکھلا اٹھیں۔

”اللہ بیٹیوں کے نصیب سے بہت دیتا ہے۔“ انی نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”عزت، محرومیاں اور تلخیاں بھی تو ہمارے ہی نصیب سے آتی ہیں شاید۔“ فروا نے نہایت کڑوا منہ بنا کر سوچا مگر اپنی سوچ زبان تک نہ لائی، اسے بھی چپ رہنے اور اندر ہی اندر کھٹنے کی عادت تھی۔

جب سے شادی کی تیاریاں شروع ہوئی تھیں، فروا کے ہونٹوں پہ تو جیسے چپ کی مہر لگ گئی تھی۔ ماں اسے دیکھ دیکھ کر پریشان تھی۔ رابعہ کا دل کبھی دال جاتا۔

”خدا انخواستہ کچھ کر کرانہ لے۔“ وہ فروا کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کے اندر ابلتے آتش فشاں کے بارے میں اندازے لگانے کی کوشش کرتی رہتی۔ مگر وہ تو خیر کیا کچھ کرتی، اس سے پہلے عدنان نے دھماکہ کر دیا۔ فروا کی بارات میں ٹھیک دو ہفتے باقی تھے، جمعے کے روز وہ آدھے دن میں ہی گھر واپس آگیا تھا۔ اپنا ٹھیل اور اس کی چیزیں ٹھکانے لگائیں اور نہادھو کر اپنا عید کانا کرنا شلوار پہن کر باہر نکل گیا۔

”اس وقت نئے کپڑے پہن کر کس کی بارات میں جا رہے ہیں بھائی؟“ مارنہ نے یونہی زور سے کہا۔

”اپنی۔“ بھائی کی طرف سے با آواز بلند جواب ملا۔ ”ہمیں نہیں بلایا اپنی بارات میں؟“ عمیوہ نے جوڑے کی پکنگ کرتے ہوئے اس میں آل پن گھسیڑی۔

”چھوڑو، تم لوگ کیا کرو گی جاکر، میں یہیں لے آؤں گا تمہاری بھابھی کو، تم لوگوں کے کپڑوں، جوتوں اور زیور کا خرچ بچا دیا میں نے۔“ عدنان بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ قہقہہ لگا کر عمیوہ کی بات کا جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

شام ڈھلے اس کی واپسی ہوئی تو رنگ برنگی کڑھائی

نگوں اور موتوں سے آراستہ سیاہ برقعے میں ملبوس ایک اور ذی نفس اس کے ہمراہ تھا ماں اور بہنیں سب کی سب حیرانی سے دیکھ رہی تھیں کہ یہ اپنے ساتھ کسے اور کیوں لایا ہے۔ ابو اور فرحان کی وابستگی میں ابھی کافی دیر تھی۔

”یہ میری امی ہیں، جا انہیں سلام کر۔ ان کی دعائیں لے۔ جھک مت یہ تیرا اپنا گھر ہے، برقع اتار، آرام سے بیٹھ۔“ عدنان برابر میں بت بنی کھڑی لڑکی سے مخاطب ہوا جو چہرے کا نقاب ہٹا کر ایک نظر گھر اور گھر والوں پہ ڈال کر پھر سے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ بیوی پارلر کا خوب صورت میک اپ تھ اور بندیا چہرے پہ سچے نظر آ رہے تھے۔ سب کا ماتھا ٹھٹک گیا۔

”امی ایہ مدد ہے میری بیوی، ہم نے آج ہی نکاح کیا ہے۔ اب دو ہفتے بعد فروا کی بارات والے دن ہمارا ولیمہ کرونا۔“ عدنان یوں بول رہا تھا جیسے ماں سے پراٹھا یا چائے بنانے کی فرمائش کر رہا ہو۔ ماں کے ساتھ ساتھ بہنیں بھی چیخ پڑیں۔

”یہ کیا کیا بیٹا تو نے۔“ ماں نے اپنے کانپتے دل پہ ہاتھ رکھا۔ ”تو جانتا نہیں ہے کیا اپنے باپ کو جان سے مار ڈالے گا۔ تجھے اوپر سے فروا کی شادی سر پہ کھڑی ہے نا ہنجر، کچھ تو سوچا ہوتا، لوگ کیا کہیں گے۔“ امی رو ہنسی ہو گئیں۔

”کچھ نہیں ہو گا امی! سب ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر مت کرو اور لوگوں کا کیا ہے، دو چار دن میں سب بھول بھال جائیں گے۔“ عدنان لاپرواہی سے پان چباتے ہوئے ہوا بولا پھر برابر میں استواء بت کو کہنی مار کر مخاطب ہوا۔

”تجھ سے کہا کہ امی کے پاس جا کر بیٹھ، انہیں سلام کر، سنتی نہیں ہے کیا۔“

”جی اچھا۔“ وہ بڑی فرماں برداری سے سیدھی چلتی ہوئی امی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”السلام علیکم جی!“ نظریں جھکا کر وہ اپنے مہندی، نیل پالش اور انگوٹھیوں سے سجے ہاتھوں کو گھور رہی

تھی۔

”آ۔۔ ہائے عدنان! یہ تو نے کیا کیا۔“ امی نے نئی نویلی بہو کی جانب متوجہ ہوئے بغیر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”امی! سلام کا جواب تو دے دو، اس کے سر پہ ہاتھ رکھو، اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ کر تمہاری خدمت کے لیے آئی ہے۔ اپنے دل میں کیا سوچے گی۔“ عدنان بھی ماں کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”ارے کم بخت، میری خدمت کے لیے یہ اتنی جانیں کافی ہیں، تجھ سے کس نے کہا تھا یہ کارنامہ دکھانے کو، میں نے کہا تو تھا تجھ سے کہ سال کے اندر اندر تیری شادی کروں گی۔ صبر نہیں ہوا تجھ سے۔ ماں کی بات کا اعتبار نہیں تھا۔“

”تمہاری تو ہر بات کا اعتبار ہے ماں! پر ابو بڑی الٹی کھوپڑی کے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے دو تین کو سر کائے بغیر وہ میری شادی کا نہ تو نام لیں گے نہ ہونے دس گے، تب ہی تو میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔“ ”آگے کا کچھ سوچا تو نے، تیرا باپ کیا حشر کرے گا، کچھ اندازہ ہے؟“ امی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

”بڑا اچھا سو اگت کر رہی ہو، سو کا۔ ایک گلاس پانی کو بھی نہیں پوچھ رہیں۔“ عدنان ان کے خدشات کی پرواہ کیے بغیر اپنی ہی ہانک رہا تھا۔ ساری بہنیں کمرے میں اکٹھی چپ چاپ ان تینوں کو دیکھ اور سن رہی تھیں۔

”ابھی تو میں اس کو نیچے کے کمرے میں چھوڑ رہا ہوں، ابو آئیں تو ذرا تم طریقے سے سمجھا لیتا۔“ عدنان نے لجاجت سے کہتے ہوئے ماں کے گھٹنے چھوئے۔

”تم ہی سمجھانا انہیں، میرے بس کے نہیں ہیں وہ جانتا تو ہے ان کا غصہ۔“ امی نے کورا جواب دیا۔

”چلو دیکھتے ہیں۔“ عدنان اٹھ کھڑا ہوا اور دلہن کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

رات میں باپ سے پہلے فرحان گھر واپس آیا تھا۔ آتے ہی ماں سے مخاطب ہوا۔

”عدنان کسی لڑکی کو کھرا لیا ہے؟“

”خبر مل گئی تھی۔“ امی نے گہری سانس لی۔

”مکلی کے لڑکوں سے پتا چلا ہے، کوئے یہ کھڑے سب کے سب باتیں کر رہے ہیں کہ یہ کسی لڑکی کو بھگا کر لایا ہے۔“ فرحان نے پٹھے کے نیچے کھڑے ہو کر شرٹ کے بٹن کھولے۔

”نکاح کر کے لایا ہے۔“ امی نے بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔

”نکاح کر کے بھگائے یا بھگا کے نکاح کرے۔ ایک ہی بات ہے۔ اگر لڑکی کے گھر والے پولیس لے کر پہنچ گئے نا تو ساری عشق و عاشقی ناک سے نکال دیں گے۔“ فرحان کے تیور خراب ہو چلے تھے۔

”پولیس تو بعد میں آئے گی، اس سے پہلے تمہارے ابو آئیں گے۔ ان کا سوچو۔“ امی کے صرف چہرے سے ہی نہیں، لفظوں اور لہجے سے بھی پریشانی اور خوف جھلک رہے تھے۔

”جو کر کے لایا ہے وہی نمٹے گا ان سے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔“ فرحان نے نسبتاً نرم لہجے میں انہیں تسلی دی اور خود واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ فریش ہو کر ہاتھ منہ دھو کر آیا تو راجہ کھانا گرم کر کے اس کے لیے دسترخوان لگا چکی تھی۔ فرحان نے بمشکل دو چار لقمے ہی کھائے تھے کہ نیچے سے شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں۔ فرحان نے تلخ مسکراہٹ سے ماں کو دیکھا۔

وہ بھلا کیا کر سکتی تھیں۔ چپ چاپ بیٹھی وہ شور شرابا سن رہی تھیں۔ جس میں شوہر کی مغلظات اور ڈانٹ پھنکار کی آواز نمایاں تھی۔ عدنان کی بھی تیز آواز آرہی تھی جو وہ برابر سے جواب دے رہا تھا۔

فرحان کھانا کھا کر پانی پی رہا تھا جب دھڑ دھڑ میڑھیاں چڑھتے ابو اور آئے، سانس چڑھی ہوئی، چہرہ اور جسم پسینے میں تر تر، کمرے میں آکر دھپ سے نیچے بیٹھ گئے اور دیوار سے ٹیک لالی۔

”یہ لو ابو! پانی پی لو۔“ فرحان نے ٹھنڈے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھایا۔

انہوں نے گلاس پکڑ کر نمن پر شیخ دیا، کچھ پانی چھلک کر نیچے گرا۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ گہرے گہرے سانس لیتے رہے پھر گلاس اٹھا کر غٹا غٹ پانی چڑھا گئے۔

”دل تو ایسا چاہ رہا ہے کہ اس الو کے پٹھے کو جان سے مار دوں۔“ وہ بیوی کی جانب دیکھ کر غرائے۔

”اس سے بول دینا فروا کی شادی سے پہلے پہلے یہاں سے دفعتاً ہو جائے اس لونڈیا کو لے کر ورنہ میں دونوں کو اگلے جہاں میں پہنچا دوں گا۔“

”ایسے تو اور بدنامی ہوگی۔ سب کو پتا تو چل ہی جائے گا۔ اب معاملے کی ڈھکا چھپی کر کے ولیمہ کر دیں گے۔ کچھ تو عزت رہ جائے گی۔“ وہ منمنائیں۔

”سالے نے پہلے ہی کون سی عزت بخشی ہے ہمیں جو اس کی وجہ سے ہماری بدنامی ہوگی۔ کمینہ پہلے جیل یا تڑا کر کے آگیا، اب لونڈیا بھگا کر لے آیا، آگے چل کر جانے کیا کارنامے دکھائے گا۔“

ابو کے منہ سے ایک بار پھر مغلظات کا سیلاب بہہ نکلا، رات گئے تک وہ بیٹے کو ایسے ہی صلواتیں سناتے رہے۔ اسی غم و غصے میں کھانا بھی نہیں کھایا ایسے ہی پڑ کر سو گئے۔ اللہ جانے سوئے بھی تھے یا جاگتے ہی رہے، امی کی تو ہمت نہیں ہوئی ان سے دوبارہ کچھ کہنے کی۔ لڑکیاں بھی چپ چاپ رات گئے تک اپنی اپنی سوچوں میں الجھی الجھی جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گئیں۔

اگلے روز امی نے سمیرا حمیرا دونوں کو فون کر کے اپنی مدد کے لیے بلا لیا، دوپہر میں ہی دونوں بھاگی بھاگی چلی آئیں۔

”ارے ہائے امی یہ کیا کر دیا اس کمینے نے۔“ سمیرا نے گود کے نیچے کو عمیرہ کے حوالے کیا اور ماں سے مخاطب ہوئی۔ سبائی بچوں کو خالائیں پہلے ہی اپنی حفاظتی تحویل میں لے چکی تھیں۔ کمروں میں چاروں طرف شادی بیاہ کے حوالے سے کپڑے اور دیگر سامان پھیلا ہوا تھا۔ نیچے سب سے پہلے ان کی طرف لپکے تھے۔

”جو کرنا تھا وہ تو کر دیا، اب ذرا اپنے ابو کو سمجھاؤ،“

شادی سر پر کھڑی ہے۔ وہ بیٹے کو گھر سے نکال رہے ہیں۔ ”امی خاص طور پر حمیرا سے مخاطب ہوئیں۔ سب سے بڑی ہونے کے ناتے وہ باپ کی ذرا زیادہ لاڈلی تھی ان کے آگے بات کرنے کی جرات بھی رکھتی تھی اور کبھی اپنی منوا بھی کہتی تھی۔“

”ویسے وہ ہے کہاں؟“ دونوں کے لہجے میں تجسس در آیا۔

”رات کو تو عدنان نیچے لے گیا تھا۔ آج تو اس نے ٹھیکہ بھی نہیں لگایا، اللہ جانے نیچے ہی ہے یا اسے لے کر کہیں چلا گیا میں تو ڈر کے مارے نہ خود نیچے گئی ہوں نہ لڑکیوں کو جانے دیا۔ تمہارے ابو کو پتا چل گیا تو ہم سب کا گلا گھونٹ دیں گے۔“ امی نے اس کے تجسس کے غبارے میں سے ہوا نکالی۔

”ارے کوئی پتا نہیں چلے گا انہیں میں بس یوں گئی یوں آئی۔“

حمیرا تیزی سے نیچے چلی گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد دوبارہ اوپر آئی تو حمیرا سمیت ساری بہنیں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔

”نیچے ہی ہیں دونوں میں گئی تو دروازہ بند کیے سو رہے تھے۔ میں نے جا کر جگایا ہے، میرے سامنے ہی ہاتھ منہ دھو کر آئی ہے شکل و صورت تو کوئی خاص نہیں ہے۔ باتوں سے بھی کافی تیز اور چلتا لگ رہی ہے۔“ حمیرا روایتی باتیں کرنے لگی۔

”چلتا نہ ہوتی تو اتنے ہنڈسم لڑکے کو کیسے قابو کرتی ایسی لڑکیاں ہی اس طرح کے کارنامے دکھاتی ہیں۔“

حمیرا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”عدنان تو حلوہ پوری لینے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ باجی اس کے پاس بیٹھی رہنا۔ میں ابھی آ رہا ہوں، تم بھی یہیں ناشتا کر لینا، میں نے کہا کہ بھیا جی ہمارا تو اب کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ تم کرونا ناشتا اور اپنی دلہن کو کرواؤ۔ میں تو اوپر آ گئی۔“

”یہ کچھ لائی بھی ہے اپنے ساتھ یا ایسے ہی خالی ہاتھ بھاگ آئی گھر سے؟“ حمیرا نے امی سے سوال کیا۔

”ہاں! رُک بھر کے جینز لائی ہے۔ میں نے چھپا کر

رکھ دیا اتنے بڑے گھر میں۔“ امی اس کے اس سب سے روپا سوال سے جھلا کر بولیں۔ سب کی سب ہنس پڑیں۔ حمیرا خفیف ہو گئی۔

”کھانا کھا کروہ دونوں تو اپنے اپنے بچوں کو لے کر انڈیا غفل ہو گئیں، امی لیٹی تھیں مگر نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، ساڑھے چھ بجے اور ماہرہ باقی رہ جانے والے جوڑے اور بیڈ شیٹ پک کر رہی تھیں، ٹائپ اپنے دوپٹے میں ستارے، سوئی ٹانگے میں منہمک ہو گئی۔“

”فروا آنکھوں پر ہاتھ رکھے چپ چاپ لیٹی تھی خدا جانے سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔“ رابعہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ ڈائجسٹ میں بھی دل نہ لگا تو اسے ایک طرف ڈال کر قلم اور ڈائری فوراً اٹھالی۔

”ہم جیسے لوگوں کی خوشیاں ادھوری اور غم پورے ہوتے ہیں نہ جانے تقدیر ہمارے ساتھ ایسے بھیا تک کھیل کیوں کھیلتی ہے جس میں ہم کمزور اور بے بس لوگوں کی ہار یقینی ہے، جب شکست ہی مقدر ہے تو یہ آنکھیں کیوں یہ خواب کیوں؟ یہ دل کیوں؟ یہ خواہشیں کیوں اور یہ زندگی؟ کیوں یہ امیدیں کیوں؟ ایک پھول کی آرزو میں اتنے کانٹے کہ روح تک لوہان ہو جائے۔ یہ کیسے زخم ہیں جن کے بھرنے کے آثار نہیں یہ کیسی موت ہے جو بار بار آتی ہے اور خیم جان کر کے چھوڑ جاتی ہے۔“

”چھوڑنا ابو! اب جو ہوتا تھا وہ ہو گیا، ابھی فروا کی شادی سر پر ہے۔ تم ایک نئے پھڈے میں ٹانگ اڑا رہے ہو، فروا کی بارات کے دن ان دونوں کو بھی اسٹیج بٹھا کے ولیمہ کرو۔ اللہ اللہ خیر صلا، اچھا ہے خود ہی کر کے لے آیا ہم کرتے تو کتنا پیسہ خرچ ہوتا، اب وہی رقم کسی لڑکی کی شادی میں کام آجائے گی ہمارے گھر تو ویسے بھی لائن لگی ہوئی ہے یہ بھی تو دیکھو، بیوی بچوں کے بہانے لگ کر تو کمائے گا۔ آوارہ دوستوں سے جان چھوٹے گی۔“ حمیرا پورا زور بیاں صرف کر رہی تھی کہ کسی طرح باپ کو قائل کر لے۔

”اچھا بھئی جو تمہاری مرضی ہو کرو۔ سب کی الگ الگ بولیاں ہیں۔ میرا ساتھ کون دے گا۔“ وہ جھلا کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”شکر، یہ اپنی ضد سے کچھ تو بچے۔“ امی نے طمانیت کا سانس لیا۔

”سوچ رہا ہوں میں بھی تم لوگوں کی مشکل آسان کروں۔“ بغیر رقم خرچ کیے شادی کرنے کا کتنا آسان نسخہ ہے۔ ”باپ کے جانے کے بعد فرحان شروع ہو گیا۔“

”کیوں کوئی دیکھ رہی ہے کیا؟“ حمیرا چمک کر بولی۔

”نہیں دیکھی تو دیکھ لیں گے، اس میں کیا مشکل ہے۔“ فرحان نقا خرے گویا ہوا۔

”ارے بنا! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ اب ایسی باتیں کر کے میرا دل مت دہلاؤ تم لوگ؟“ امی لجاجت سے کہنے لگیں۔

”ارے امی! فکر کیوں کرتی ہو مذاق کر رہا ہوں میں۔“ فرحان ہنس پڑا۔

خوب صورت لائٹنگ اور بہترین آرائش و زیبائش نے ہال کو بے حد نور بنایا ہوا تھا۔ حمیرا سمیرا کی شادیوں کی طرح فروا کی شادی پر بھی دل کھول کے رقم خرچ کی گئی تھی۔ جینز دو لہا کا سامان، پسنائیاں، کھانا، ہر انتظام بہترین اور ہر شے خوب سے خوب تر تھی۔ رشتے دار، محلے دار سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

”اے لو، کہنے کو اتنا زرا سا گھر جیسے ماچس کی ڈبیا، جوان جہان لڑکیوں سے گھر بھر ہوا اور شادی میں ٹھاٹ باٹ دیکھو۔“ محلے کی خواتین ہلہول میں بوٹیوں کی چونٹیاں کھڑی کیے حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

”تو خالہ! یہ لوگ اپنا گھر بنانے میں پیسہ ضائع نہیں کرتے وہی تو لڑکے ہیں وہ اوپر نیچے رہ لیں گے یا اپنا انتظام خود کر لیں گے۔ لڑکیاں تو آٹن کی چڑیاں ہیں۔ ایک ایک کر کے اڑ جائیں گی، پھر یہ بھی تو ہے کہ ایسی

شادی اور جینز دیکھ کر ہی تو دوسری لڑکیوں کے رشتے بھی آئیں گے۔“

سب کی سب کھاتی جا رہی تھیں اور بولتی جا رہی تھیں، فروا کی اتنے دنوں کی چپ رخصتی کے وقت بھی نہ ٹوٹی تھی۔ بغیر روئے دھوئے وہ یونہی خاموشی سے رخصت ہو گئی۔ ”اپنے اندر ہونے والی برسات کس کو نظر آتی ہے، یہ دنیا، یہ رسم و رواج، یہ خیالات کسے ایک جتے جاگتے انسان کو کسی اثر ہے کی طرح نگل لیتے ہیں۔“ دلہن کے روپ میں رخصت ہوتی فروا کو دیکھ کر رابعہ نے سوچا تھا۔



فروا کی شادی کو ایک ہفتہ ہی گزرا تھا جب ایک دن بڑی پھوپھی کی تشریف آوری ہوئی، رابعہ سے نیچے ہی مڈ بھینٹ ہو گئی۔ اس نے کپڑے دھونے کے لیے مشین لگائی ہوئی تھی۔ زیادہ تر کپڑے دھل چکے تھے۔ بس تھوڑے سے ہی باقی تھے۔ اس نے پانی کی موٹر چلا کر بڑا والا ڈرم بھرا جو تقریباً ”خالی ہو چکا تھا۔“

”السلام علیکم پھوپھی!“

”وعلیکم السلام بیٹا! دلہن نیچے ہے یا اوپر؟“ انہوں نے کھڑے کھڑے سوال کیا۔

”دلہن؟“ ایک لمحے کو رابعہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر وہ مسکرا دی، ”نیچے ہی ہیں۔“

”دروازہ تو بند ہے کمرے کا، لی وی کی آواز آرہی ہے۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر جھانکا۔

”بتاؤ ذرا، مہمان کی آواز سن کر بھی نہ دروازہ کھولا نہ باہر آئی۔ توبہ توبہ کیسی دیدہ ہوائی، ہو میں ہیں آج کل کی۔ ایک ہمارا دور تھا ہا۔ صبح سے لے کر رات گئے تک سسرال والوں کی نظروں کے سامنے ہی سب کام کاج کرتے رہتے تھے۔ رات میں بھی اپنی کوٹھری میں سب کے سونے کے بعد جاتے تھے۔ اب تو دن دھاڑے کمرہ بند کیے پڑی رہتی ہیں۔“ زور زور سے بولتی ہوئی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگیں۔

رابعہ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہی۔ بولتی

بھی تو کیا نئی بہو کا مزاج کچھ اور ہی تھا۔ شروع شروع دنوں میں ابو کی باتوں کی وجہ سے ہی وہ کچھ کٹی کٹی سی رہتی تھی۔ حالات کچھ بہتر ہوئے تب بھی وہ زیادہ تر نیچے اپنے کمرے میں ہی پائی جاتی تھی۔ دوسرے میں امی کھانا کھانے کے لیے بلواتیں۔ کبھی آجاتی کبھی نہیں رات میں یا ابو کے سامنے وہ کبھی اور نہیں آتی تھی۔ عدنان بازار سے ہی کچھ نہ کچھ لے آسانی الحال دونوں کا گزارا ہو رہا تھا۔

”فروا کے کیا حال ہیں؟ ٹھیک رہ رہی ہے؟“ اوپر پھوپھی امی سے باتیں کر رہی تھیں۔ مائے نے شربت کے گلاس ان کے آگے رکھے۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ پرسوں ترسوں آگئی تھی ذرا دیر کو میاں کے ساتھ پھر واپس چلی گئی۔“ امی نے شربت کا گھونٹ بھرا۔

پھر دوسرے کا کھانا لگنے تک وہ عدنان کی بیوی کے بارے میں گفتیش اور قیاس آرائیاں کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر لیٹیں تو ذرا سی دیر میں ہی ان کے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔

”توبہ ہے خود تو مزے سے سو گئیں اور ہم بیٹھ کر ان کا آرکسٹرا سنیں۔“ عمیرہ نے بڑبڑاتے ہوئے تکیے سے اپنے دونوں کان دبائے مگر خراٹوں کی آواز تھی کہ تیز سیٹی کی مانند کانوں میں گھسی جا رہی تھی۔ شام میں انھیں فریش ہو کر ہاتھ منہ دھو کر ایک بار پھر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر انہوں نے سیٹ سنبھال لی۔ ”اری زہرہ یان تو لگا دے ذرا“ منہ ایسا کیلا کیلا سا ہو رہا ہے۔ با آواز بلند جمائی لیتے ہوئے انہوں نے اپنی بھانج سے فرمائش کی۔

”مائے چائے بنا رہی ہے تپا! چائے پی لیں پھر لگا دوں گی۔“ انہوں نے تائید میں سر ہلایا۔

”ارے! ان لڑکیوں کو تو اچھی خاصی سلائی آتی ہے۔ سلائی پہ کپڑے کیوں نہیں سینٹیں باپ بھائی کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا۔“ کچھ دیر بعد انہوں نے بات نکالی۔

”ہم تو بہتر اسی لیں سلائی کے کپڑے کئی بار میں

نے کوشش بھی کی مگر آپ کے بھائی اور بھتیجے کرتے ہیں۔“

”اے وہ کیوں؟“ وہ تعجب سے بولیں۔

”بس ان لوگوں کو برا لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم کسی لیے کما رہے ہیں جس چیز کی یا پیسوں کی ضرورت ہے ہم سے کہو۔ ہم پورا نہ کریں تو بات ہے۔“ امی نے دکھڑا نہیں سنایا۔

”ہمارے خاندان کے مرد بھی عجیب کھوپڑیوں کے ہیں“ اے ہمارے میاں بھی ایسی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ہم تو دن بھر ان سے چسپ چسپا کر اپنی سلائیوں کے کام کرتے تھے۔ ان کے گھر آنے سے پہلے سب کچھ سمیٹا اور رکھ دیا۔ تم لوگ بھی ایسے ہی گر لیا کرو

پھوپھی نے کئی بار کی سناٹی ہوئی اپنی رام کہانی ایک بار پھر سنائی اور ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا۔ رات میں ابو آئے تو پھوپھی نے تب ان سے وہ مقصد بیان کیا جس کے لیے وہ یہاں آئی تھیں۔

”میں اپنے بھائی سے کچھ مانگنے آئی تھی آج۔ کھانے کے بعد پان لگاتے ہوئے وہ ابو سے مخاطب ہوئیں۔

”ابھی ابھی تو شادی کر کے بیٹھا ہوں بیٹی کی۔ اس وقت تو ہاتھ بالکل خالی ہیں تپا! تم جانتی تو ہو سب کچھ۔“ ابو نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

”اے ہے میں کوئی ادھار مانگنے تھوڑی آئی ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کچھ مانگنے آئی ہوں۔“ پھوپھی بھی پسلیاں بھجوا رہی تھیں امی کا ہاتھ ٹھنک گیا ان کی بات سن کر۔

”ارے میں یہ کہہ رہی تھی کہ مائے کو مجھے دے میرے پو کے لیے۔“ انہوں نے پان کا پیرا اپنے کلمے میں دبایا اور انگلیوں پہ لگا کھانچا چاٹ لیا۔

”چرسی موالی تو ہے تمہارا بیٹا۔ کچھ سدھرا بھی نہیں؟“ ابو بغیر کسی لحاظ کے اپنی عادت کے مطابق ان سے مخاطب ہوئے۔

”ارے لو تمہیں یہی نہیں معلوم، جہاں سے

عدنان کا علاج ہوا۔ ہم نے وہیں سے پورا علاج کروایا ہے۔ اللہ قسم اب تو ایسی ویسی چیزوں کے قریب بھی نہیں پہنچتا کام پر بھی یا بندی سے جا رہا ہے۔ روز کی کبھی تین سو کبھی چار سو کی دسواڑی بنا لیتا ہے تب ہی تو یہاں آتی ہوں۔ ورنہ مجھے کیا شوق ہے اپنی بچی کی زندگی خراب کرنے کا۔“ وہ قسمیں کھا کر اپنی بات کا یقین دلانے لگیں۔

”سوچ کے بتائیں گے آپا! ابو کچھ دیر بعد بولے۔

”ہاں ہاں سوچ لو، خوب اچھی طرح سوچ لو، مگر فیصلہ میرے حق میں ہی کرنا ہاں،“ بھتیجی ہے میری پسلا اور سب سے زیادہ حق تو میرا ہی ہے۔“

”بڑے دو بیٹوں کی شادی کرتے وقت یہ بھتیجیاں اور رشتہ یاد نہیں آیا۔ بیٹے قابل تھے تو چھانٹ کر خوب مال دار گھرانوں سے حسین و جمیل بیویاں لے کر آئیں اب ناکارہ، ٹکٹے بیٹے کے لیے بھتیجی اور پھوپھی کا رشتہ یاد آگیا۔“ امی نے دل ہی دل میں سوچا۔

پھوپھی تو نیا شو شاپھوڑ کر رخصت ہو گئیں مگر مائے کی نیند اور سکون برباد کر گئیں امی بھی پریشان تھیں شوہر ابھی خاموش تھے نہ انکار کیا تھا نہ ہی اقرار۔

فرحان نے البتہ دو چار بار باپ سے استفسار ضرور کیا اس کی رائے تھی کہ یہ رشتہ کرونا چاہیے۔

”وہی تو ہمارے دیکھے بھالے ہی ہیں۔ آخر پھوپھی کا گھر ہے پھر بھی میں نے محلے والوں سے اور معلومات کی ہیں۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ پو نے نشہ چھوڑ دیا ہے۔ ذمہ داری اور پابندی کے ساتھ روزانہ اپنے روزگار پہ جا رہا ہے پھر ابو! رشتے داری کا معاملہ ہے ایسے منع کریں گے تو بلا وجہ بات خراب ہوگی۔ پھوپھی الگ ناراض ہوں گی۔“ وہ ایک روز بیٹھا باپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تو کیوں ہتھیلی پہ سرسوں جما رہا ہے نہ ہم کہیں بھاگے جا رہے ہیں نہ تیری پھوپھی۔ دے دیں گے جواب، تجھے کاہے کی جلدی ہو رہی ہے؟“ باپ نے محکوک نظروں سے اسے گھورا۔

”میں تو بس یونہی۔۔۔ آخر میری بہن ہے۔“

فرحان گڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔



رات کی سیاہی نے چاروں طرف اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ کمرے میں موجود سارے نفوس سو چکے تھے سوائے ان دونوں کے، جن کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔ اور بہنوں کی نسبت دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھیں اور ایک دوسرے کی ہمدردی غم گسار بھی زیادہ تھیں۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ فرحان بھائی کو آخر میری شادی کی ایسی فکر کیوں ہو گئی ہے وہ بھی پھوپھی کے ہی گھر، کبھی ابو سے کبھی امی سے ایسے اصرار کر رہے ہیں جیسے کسی نشہ باز کا نہیں بلکہ کسی کمشنر کا رشتہ آیا ہو۔“ مائے کی آواز رندھی ہوئی تھی ایک تواتر سے بننے والے آنسوؤں کو اس نے بے دردی سے ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کیا تھا۔

”ایسا لگتا ہے ہمارا تو کسی سے کوئی رشتہ ہے ہی نہیں، بس سب اپنی غرض کے غلام ہیں خود غرض مفاد پرست۔“ رابعہ دھیرے سے بڑبڑاتی۔

”ہم لڑکیاں ہی رہ گئی ہیں، ان سب کی خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھنے کے لیے۔“ مائے کے آنسو پھر بننے کو بے تاب تھے۔

”میں خود کشی کر لوں گی دیکھا اگر میرے ساتھ کسی نے زبردستی کی تو۔ میں فروا نہیں ہوں کہ چپ چاپ اپنی زندگی یوں تباہ کر لوں۔“ مائے کے لب و لہجے سے چھلکتی بغاوت اور عزم کو محسوس کر کے رابعہ سن رہ گئی۔

”کیا ہم لوگوں کے پاس بس یہی دو راستے ہیں یا تو اپنے ہاتھوں خود کو مار لو یا زندگی کے ہاتھوں پتا نہیں ہمارے نصیبوں میں اتنی تاریکیاں کیوں ہیں۔“ رابعہ آج دل کی بھڑاس کلم کے بجائے اپنی زبان سے نکال رہی تھی۔

”تم لوگ کیا آدھی رات کو کھسر پھسر کر رہی ہو،

سونے دوگی یا نہیں۔“ برابر سے سارہ کی نیند میں ڈوبی جھٹائی ہوئی آواز آئی، اس کی نیند بہت کچی تھی، معمولی سی آہٹ پر بھی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

”سو جاؤ، تم آرام سے سو جاؤ، اب کوئی کچھ نہیں بولے گا۔“ ثانیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اسے جواب دے کر آنکھیں بند کر لیں، جہاں گرم گرم آنسو، پلکوں کی باڑ توڑ کر بہ نکلتے کو بے تاب تھے۔

رنگ تو وہی پہلے جیسا ہی تھا، کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر بہ حال چہرے پہ ایک چمک اور رونق سی ضرور تھی جو پہلی نظر میں ہی دیکھنے والوں کو نظر آرہی تھی، گلابی جارحٹ کا ہلکی پھلکی کڑھائی والا سوٹ، کانوں میں سونے کی سادہ بالیاں، میچنگ چوڑیاں اور گھنے بالوں کی موٹی سی چوٹی باندھ کر اس میں گجر لگایا ہوا تھا۔ کلائیوں میں بھی چوڑیوں کے ساتھ، موتیا اور گلاب کے کنگن مک رہے تھے۔

”کہیں سے آرہی ہو، کیا کہیں جارہی ہو؟“ فروا شوہر کے ساتھ میکے آئی تو اس کی سچ دیکھ کر سارہ نے سوال کیا، وہی سب سے پہلے ٹکرائی تھی فروا سے۔

”یہ آکس کریم کھلانے لے گئے تھے۔ وہیں سے آ رہے ہیں، واپسی پہ یہ گجرے اور کنگن بھی انہوں نے لے لیے۔“ فروا کچھ مسکراتے کچھ شرماتے ہوئے بتا رہی تھی۔

اس کا مطمئن اور خوش باش چہرہ دیکھ کر امی کے دل کو کچھ اطمینان ہوا تھا، ورنہ ہر بار اس کی میکے آمد پر وہ روایتی ماؤں کی طرح ہی سوالات کرتیں کہ میاں کیسا ہے، خیال رکھتا ہے؟ بچے یا سسرال میں کوئی اور تنگ تو نہیں کرتا، ساس کا برتاؤ کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

فروا کے کہنے کے مطابق شوہر اتنے اچھے ہیں، اس کا خیال رکھتے ہیں۔ دونوں بچے زیادہ تر دادی پھوپھی کے لاڈ پیار میں رہتے ہیں، ساس ہنڈیا خود بناتی ہیں، باقی سارا کام بہو کے ذمے ہے، نند بھی کچھ کام کروا لیتی ہے۔ وہاں کو گاہے بگاہے ساری تفصیلات بتاتی رہتی۔

”لڑکیاں بھی چمک دمک کی چیزوں سے لٹی جلدی ہل جاتی ہیں۔“ رابعہ نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

”پتا نہیں بہلاوا ہے یا سمجھوتا؟“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

اس عرصے میں پھوپھی دوبار آکر جواب کا تقاضا کر چکی تھیں۔

”جو بھی جواب دیتا ہے۔ سوے دو“ بیچ میں کیوں لٹکایا ہوا ہے۔“ فرحان بہت جھنجھلایا ہوا تھا۔ آج کل نہ جانے کیوں اس کا مزاج سوانیزے پر ہی رہتا تھا۔

”ابے دے دیں گے جواب، تو کیوں مرچیں چبا رہا ہے۔“ ابو النسا اس پر بھڑک گئے۔ فرحان بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا، امی اس کے تیر دیکھ دیکھ کر حیران تھیں۔

”خدا جانے اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔“ انہوں نے پاندان اپنی طرف کھیٹتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

انہیں ابھی تک خبر ہی نہیں تھی کہ فرحان بھی اپنے چھوٹے بھائی کے نقش قدم پر چل نکلا ہے، فروا کی شادی کے دوران کیویڈ کے تیر کا شکار ہوا اور ایسا شکار ہوا کہ مرغ بکل بن گیا اور محبت میں تو یونہی انہونیاں ہوتی ہیں کہ سینکڑوں بار دیکھی ہوئی پھوپھی کی نالکہ، فروا کی مایوں سے لے کر ویکمہ تک ہر دن اپنی ہرج و مرج اور ناز و انداز کے ساتھ اس کے دل میں اترتی چلی گئی اس کا ہر روپ قاتل تھا، ہر بار چھب نرالی تھی، فرحان تو یوں گھائل ہوا کہ سیدھا پھوپھی سے حال دل کہہ بیٹھا، وہ ہنس پڑیں۔

”اے بیٹا! ایک دوں گی تو ایک لوں گی۔“ انہوں نے فوراً اپنے نکتے اور ناکارہ بیٹے کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا۔

”تو آکر ابو سے بات کر لو نا۔“ نئے نئے شکار نے بے قراری کا مظاہرہ کیا۔

”اور جو تیرے باپ نے منع کر دیا تو؟“ انہوں نے فرحان کی بے قراری سے حفا اٹھایا۔

”وہ میرا ذمہ، تم گھر تو آؤ۔“ فرحان نے باپ کو منانے کا وعدہ کیا مگر ابھی تک ثانیہ کے معاملے میں

کوئی واضح جواب نہیں دیا گیا تھا، اس کی جھنجھلاہٹ غصے میں بدل گئی تھی، نالکہ الگ شو مارتی رہتی تھی۔

”میرا فلاں جگہ سے رشتہ آیا ہوا ہے، فلاں گھر سے رشتہ آیا ہے جلدی کچھ کرو۔“ موبائل پر اس کی کالز اور ایس ایم ایس وصول کر کر کے فرحان کا دماغ اور خراب ہو رہا تھا۔

یہ معاملات اپنی جگہ کہ گھر میں عدنان نے ایک نیا قضیہ کھڑا کر دیا۔ وہ گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ بقول اس کے یہاں نہ اس کی کوئی عزت تھی نہ اس کی بیوی کی، لہذا وہ یہاں مزید رہ کر خود کو اور بیوی کو شینشن میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ارے کل کا جاتا، آج چلا جائے، میری بلا سے جنم میں جائے اس بھگوڑی کو لے کر وہاں بہت عزت ہوگی دونوں کی، جانے دو، دو چار دن کرائے پر رہیں گے تو خود ہی ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“ باپ کے سامنے یہ معاملہ آیا تو وہ حسب عادت بھڑک اٹھے۔

”کرائے پر جا کون رہا ہے؟“ نیچے عدنان نے ان کے چیخنے چلانے کی آواز سنی تو طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ سوچا۔

اس کی تینوں سالیاں جاب کرتی تھیں۔ گھر اور باپ کو مدیجہ سنبھالتی تھی۔ اس کی شادی کے بعد ان لوگوں کو بہت مشکل ہو رہی تھی۔ لہذا عدنان کو آفر کی گئی تھی کہ وہ برائے نام کرائے پر گھر و اماں میں کر رہے، مدیجہ تو خیر خوش تھی کہ میکے میں ہی مستقل قیام پذیر ہو رہی تھی، ہر مہینے جب بھی تنخواہ ملتی، اس کی خدمات کے عوض بہنیں کچھ نہ کچھ کرم فرمائی ضرور کر دیتی تھیں، کبھی نقد کی شکل میں، کبھی چیزوں کی شکل میں، سو اس کے لیے وہاں رہنا اتنا منگنا سودا نہیں تھا، عدنان یوں خوش تھا کہ باپ کے ساتھ آئے دن کے اور بڑی بہنوں کے ساتھ کبھی کبھار کے فضاختوں اور لڑائی جھگڑوں سے جان چھوٹے گی، پھر برائے نام رقم جو گھر میں ماں کو دیتا تھا، اس کی بھی بچت ہو جائے گی، اور ان دونوں کے جانے سے فرحان یوں شاداں و فرحان تھا کہ نیچے کا کمر خالی ہو رہا تھا، اب تم از کم اسے اس شینشن

سے تو نجات ملی کہ اگر اسے بھی عدنان کی طرح ایمر جنسی میں نکاح یا شادی کرنی پڑی تو بیوی کو لا کر کہاں رکھے گا۔ لہذا اس نے جھوٹے منہ بھی عدنان کو روکنے یا سمجھانے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ماں نے تو بہت اصرار کیا تھا کہ وہ چھوٹے بھائی سمجھائے۔

”جب اس نے تمہارا اور ابو کا لحاظ نہیں کیا تو میرے کچھ کہنے یا سمجھانے کا کیا خاک اثر ہو گا، پہلے بھی اپنی من مانی کی تھی، اب بھی کر رہا ہے، کرنے دو، ٹھو کریں کھائے گا تو خود ہی واپس آجائے گا!“ ماں کو ٹکا سا جواب دے کر اس نے تو صاف دامن چھڑا لیا۔

گلابی اور ہرے رنگوں کے امتزاج سے بنے کا مدار سوٹ میں ملبوس ہلکی پھلکی جیولری اور میک اپ سے آراستہ بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ کسی کٹھ پتلی کی مانند بیٹھی تھی۔ پھوپھی اور ان کی بہوؤں، بیٹیوں نے ہار پھول پہنا کر، مٹھائی کھلا کر ہاتھ پر شگن کی رقم رکھی اور اسے پو کے ساتھ منسوب کر دیا۔

”بہت جلد اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جاؤں گی میں۔“ پھوپھی نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

فرحان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، اس کے پیار کی منزل بہت قریب آگئی تھی۔ ثانیہ کی شادی تو ابھی ایک ڈیڑھ سال دور تھی تب تک کون انتظار کرتا۔ اس نے ماں سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ باپ تک معاملہ پہنچا تو وہ خلاف توقع خاموش ہو گئے پھر کچھ دیر بعد گویا ہوئے۔

”یہ تو وٹہ سٹہ ہو گیا۔ ہماری تو سمجھ سے باہر ہے اس قسم کے رشتے کرنا۔“

”تو یہ بھی تو سوچو کہ ان پر ہمارا رعب رہے گا، ایک لڑکی دے کر ایک لے رہے ہیں۔ ہماری بہن کے ساتھ کوئی بُرا بھلا کرتے وقت دس بار سوچیں گے وہ لوگ اب!“ فرحان نے انہیں قائل کرنے کے لیے دلیل دی۔

”شہر جا بٹا“ ذرا سوچنے دے۔“ ابو نے معاملے کو آئندہ کے لیے ٹالا مگر فرحان کو بہت جلدی تھی ماں کے سر ہو گیا کہ جسے بھی ابو کو سمجھائیں اور پھوپھی سے نانکہ کا ہاتھ مانگیں۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر نانکہ کے لیے رشتہ دیا تو پھوپھی جلدی شادی کے لیے اصرار کرنے لگیں۔

”ثانیہ کی شادی تو میں ابھی نہیں کر سکتا، میری کوئی تیاری نہیں ہے، چند مہینے پہلے ہی تو فروا کی کر کے فارغ ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی دوسری کا کہاں سے کروں۔“ ابو نے عادت کے مطابق دو ٹوک بات کی۔

”ایسا کرو، ابھی نانکہ اور فرحان کی کرلو اور ثانیہ کا نکاح دے دو، بعد میں رخصتی لے لوں گی۔“ پھوپھی نے تجویز پیش کی۔

”ٹھیک ہے، یہی کر لیتے ہیں۔“ ابو نے کچھ دیر سوچا اور ہاں کہہ دی۔



”ہماری زندگیاں بھی بس مذاق ہی ہیں پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتے ہمارا ابا اب زہر دے دیں، ایک ہی بار مرجائیں گے۔ روز روز کا مرنا مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔“ ثانیہ ماں کے آگے چی رہی تھی۔

”اپنے یہ ڈانڈا لگ ابو کو سنا، ان ہی کا فیصلہ چلنا ہے گھر میں، امی بھلا کیا کر لیں گی بلا وجہ انہیں پریشان کر رہی ہے۔“ سمیرا مسکے آئی ہوئی تھی۔ ثانیہ کا رونا دھونا اور چیخا چلانا سن کر ناگواری سے بولی۔

”میں کیا کروں بھلا کیا کر سکتی ہوں، سمجھانے کی کوشش کی تھی تمہارے ابو کو، مگر تم لوگ تو ان کا مزاج جانتی ہی ہو، لہذا مجھے ہی چھتیس باتیں سنا دیں۔ میرے بس میں ہوتا تو کبھی اپنی بیٹیوں کے لیے ایسے فیصلے نہیں کرتی۔“ بے بسی سے بولتے بولتے امی کی آواز رندھ گئی۔

”اب ایک ہفتے بعد بھائی کا ولیمہ ہے، اس کا نکاح ہے، اب ان سب باتوں سے کیا فائدہ یا تو جب ہی بولنا تھا جب رشتہ طے ہوا تھا۔ اب ہوش آ رہا ہے، جب

پانی سر سے اونچا ہو گیا۔“ سمیرا ہمدردی کرنے یا حمایت کے بجائے ان کے لئے لے رہی تھی۔

”تم تو آرام سے اپنے گھر بیٹھی ہوتا، تمہیں کیا احساس ہو گا ہمارا؟“ ثانیہ کو اس کی باتوں پر بھی غصہ آنے لگا۔

”ہاں بہت آرام سے بیٹھے ہیں اپنے گھر، قبر کا حال تو مرہ ہی جانتا ہے، اب کس کس بات کو رو میں۔“ وہ شروع ہو گئی۔

”بیٹے کی پیدائش کے چکر میں پانچ بیٹیوں کو جنم دے کر میں تو ایسی گنہگار بن گئی کہ جس کی کوئی معافی نہیں ہے۔ شوہر نے بیٹے کے لیے دوسری شادی کر لی۔ میری ساس کے طعنے بہتے ہی کیا کم تھے کہ یہ قصور بھی میرے کھاتے میں ہی لکھا گیا، دوسری کے تازہ خمرے اٹھانے میں ساری آمدنی خرچ کر کے گھر آتا ہے۔ میں سارا دن گھر کا کام بھی کرتی ہوں، بچوں کو سنبھالتی ہوں اور سلائی بھی کرتی ہوں تاکہ کم از کم ان پانچ جانوں کا دوزخ تو بھر سکوں، نصیب کا لکھا سمجھ کر زندگی بھگت رہی ہوں، یہی سوچ لیا کہ کم سے کم چھت کا آسرا تو ہے، ورنہ پانچ بچیوں کے ساتھ کہاں جاؤں گی۔“

سمیرا بولتے بولتے ہانپ گئی، کم عمری کی شادی اور اوپر تلے پانچ بچوں کی پیدائش۔ وقت اور عمر سے پہلے ہی وہ بیاریوں میں گھر گئی تھی۔

”ہم لوگوں کی زندگیاں کیا ہیں بس سمجھوتے ہیں۔ شادی نہ کرو تو زندگی کھائی ہے مگر لو تو زندگی کنواں ہے اب تمہاری مرضی ہے کھائی میں رہو یا کنویں میں گرد۔“ سمیرا بول رہی تھی اور سچ تو ایسا ہی ہوتا ہے سفاک اور تلخ، سب چپ تھے۔ ثانیہ بھی خاموش ہو گئی۔



فرحان کے دل کی مراد بر آئی تھی اسے لگتا تھا دنیا میں اس سے زیادہ خوش کوئی نہیں ہے۔ ساری دنیا جیسے اس کے قدموں تلے بھی وہ اپنا ہنی مون پیرید گزار رہا تھا اور نانکہ نے ان دو چار دنوں میں ہی اپنے

رجل ہٹنگ دکھانے شروع کر دیے تھے۔

”گھر آتا چھوٹا، اتنا تنگ ہے، دم گھٹتا ہے میرا نہ کہیں سے ہوا آتی ہے، نہ روشنی، نہ دھوپ۔ آئے دن پانی غائب، روزانہ بجلی غائب، گھر میں یہ سہولت نہیں ہے، وہ سہولت نہیں ہے۔“ وہ روزانہ فرحان سے اور شکایتیں کرتی جیسے شادی کے بعد ہی پہلی بار اس گھر میں آئی ہو یا اس گھر کو دیکھا ہو، حالانکہ اپنے بچپن سے اس کا یہاں آنا جانا تھا، کئی بار یہاں رہ کر بھی غلطی تھی، خوب جانتی تھی کہ کیسا گھر ہے اور کیسی سہولتیں ہیں، گھر کے کاموں کی کوئی خاص ذمہ داری اس پر نہیں تھی، پھر بھی اس کے خمرے اور گلے شکوے بڑھتے ہی جارہے تھے۔

عدنان اپنی بیوی، نئے نویلے بیٹے اور مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ گھر آیا تھا، داوا بننے کی خوشی میں باپ نے فی الحال اس کے سارے قصور معاف کر دیے تھے، ماں اور بہنیں بچے کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ دوبارہ جلدی آنے کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہوا تو سب سے زیادہ امی کا دل بے قرار تھا، ابھی تو پوتے کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا، ہمیشہ کی طرح اس معاملے میں بھی اپنا دل مار کر رہ گئیں۔

”تم لوگ بہت خوش نصیب ہو جو یہاں سے نکل گئے، ہمیں دیکھو، اس کال کو ٹھہری میں پڑے ہوئے ہیں۔“ وہ بظاہر ہنس کر مدح اور عدنان سے مخاطب ہوئی تھی۔

”یہ کیا چاہتی ہے؟“ ابو بہرے تو نہیں تھے نہ گھراتا بڑا کہ ایک کی بات دوسرے کو سنائی نہ دے، بھوکا تبصرہ سن کر کڑے تیوروں کے ساتھ بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

”کچھ نہیں ابو! اتنے چھوٹے گھر میں رہنے کی عادت نہیں ہے نا اسے پھر آئے دن یہاں کچھ نہ کچھ مسئلہ رہتا ہی ہے بجلی اور پانی کے ساتھ ساتھ اب اکثر گیس بھی غائب ہونے لگی ہے۔ اس کو پریشانی ہوتی ہے یہاں۔“ فرحان نے کھوکھلے لہجے میں بات بنانے کی کوشش کی۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- کیاں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریداجا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے منی آرڈر بھیج کر جسر ڈپارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے

3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

”دینفس میں ایک گھر کرائے پر لے اور اپنی مہارانی کو وہیں لے جا بہت بڑے گھر سے آئی ہے یہ اس قید خانے میں کیے رہے گی۔“ ابو نے دونوں کو طنز کے دوچار پتھر مارے اور تن فن کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ نانکہ کی زبان درازیاں اور بد تمیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ گھر کے ہر فرد کے ساتھ ہی اس نے جھگڑا مول لیا ہوا تھا اس پر مستزاد فرحان کا بدلتا رویہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے لب و لہجے میں بھی سختی آتی جا رہی تھی۔ گھر کی صورت حال روز بروز کشیدہ ہو رہی تھی۔ ایک روز تو بات اتنی بڑھی کہ فرحان ماں اور باپ دونوں سے ہی الجھ پڑا۔

”جب یہاں کسی کو بھی میرا اور میری بیوی کا وجود برداشت نہیں ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے یہاں رہنے کی، میں اپنا الگ بندوبست کر لوں گا کہیں۔“ فرحان غصے میں بولتا ہوا باہر نکل گیا اور یہ محض دھمکی نہیں تھی، ایک ہفتے بعد وہ اپنی بیوی اور اس کے جینز سمیت کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گیا تھا۔ نانکہ کے دل کی خواہش بڑی جلدی اور آسانی سے پوری ہو گئی تھی۔

پھوپھی آئی تھیں، چکنی چڑی باتیں بنا کر رخصت ہو گئیں۔

”ارے یہ آج کل کی اولاد بڑی بے کہنی ہے، اللہ قسم، تم یقین کرو نہ کرو، میں نے تو دونوں میاں بیوی کو ہی بہت سمجھایا، اللہ جانے سمجھ میں آیا کہ نہیں لیکن تم فکر نہ کرو، وقتی غصہ ہے، کچھ دنوں بعد پھر اسی گھر میں دونوں لوٹ آئیں گے، ارے ناخن بھی کبھی ماس سے جدا ہوتا ہے۔“ وہ بھائی بھانج کو تسلیاں دے کر اور ثانیہ کی جلدی رخصتی کا غنڈہ دے کر چلی گئیں۔



دو دن بعد ابو کو فالج کا انیک ہوا تھا۔ گھر والوں پہ قیامت صغریٰ گزر گئی۔ سرکاری اسپتال میں وارڈ کے باہر لکڑی کی بیچ پر بیٹھی وہ اپنے ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی۔

دونوں بھائی اور بھانجیں آئے تھے اور رسمی تسلیاں دے کر رخصت ہو گئے، غنڈان تو اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات اور منگائی کا رونا ہی روتا رہا، البتہ فرحان نے کچھ رقم کے بندوبست کا وعدہ کیا تھا مگر کب اور کتنی یہ اس نے وضاحت نہیں کی، رشتے دار، محلے، پڑوس کے لوگ عیادت کر کر کے جا رہے تھے، رابعہ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی، فی الحال تو امی کا ایک چھین لاکٹ بیچ کر کام چلا لیا گیا تھا۔ مگر آگے۔ آگے کیا ہو گا امی سمیت سب کے ذہنوں میں یہی سوال تھا۔ ”کاش ہم لڑکیاں ہی کسی قابل ہوتے تو جیسے تیرے گھر کی گاڑی گھسیٹ ہی لیتے۔“ رابعہ کے دل میں شدت سے ہوک اٹھی تھی۔ امی اور سائرہ کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے گئی تھیں، وہ گھر پہنچیں گی تو مارہ اور ثانیہ آجائیں گی۔

”ہاں رابعہ بیٹی! کیسی ہو؟ ابو کیسے ہیں تمہارے؟“ اپنے بالکل قریب ایک جالی پچانی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔

ابو کے دیرینہ دوست اور بڑی برکت اللہ اس کے پاس کھڑے تھے اس نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، رابعہ کا دل بھر آیا، آنسو روکنے کے لیے وہ چہرہ نیچے کیے پلکیں جھپکنے لگی۔

”اللہ کا شکر ہے حالت خطرے سے باہر ہے، ڈاکٹروں نے امید تو دلائی ہے کہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“ رابعہ نے ان کے استفسار پر بھیگی ہوئی آواز میں مختصر لفظوں میں جواب دیا۔

”شکر ہے اس پاک پروردگار کا۔ آگے بھی ان شاء اللہ وہ رحم کرے گا، تم پریشان مت ہونا بیٹی کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بلا جھجک بتانا۔“

”شکریہ چاچا! بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں، یہی کافی ہے ہمارے لیے۔“ رابعہ نے ایک گہری سانس لی۔

”اچھا، تمہارے ابو کو دیکھ کر آتے ہیں!“

”جی وائیں جانب تیسرا بیڈ ہے۔“

”اچھا، چلیں مولانا صاحب۔“ وہ اپنے ساتھ آئے

کیسی اور شخص سے مخاطب ہوئے جو رابعہ کی طرف پشت کیے دیوار میں لگی بڑی سی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔

”چلئے برکت صاحب!“ وہ مڑے اور برکت صاحب کے ساتھ سامنے کھلے وارڈ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

رابعہ دوبارہ سر جھکا کر اپنے خیالات میں گم ہو گئی تھی اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ برکت چاچا کے ساتھ آنے والا نووارد کون تھا۔



اسپتال سے ابو گھر آگئے تھے، ان کا دایاں حصہ فالج سے متاثر ہوا تھا، علاج اور فزیو تھراپی سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے، اپنی ضروریات کے لیے کسی کے محتاج نہیں تھے لیکن بہر حال جسمانی و نفسیاتی کمزوری اور بیماری کے تھوڑے بہت اثرات اپنی جگہ تھے۔

”اللہ کا شکر ہے اس نے محتاجی سے دور رکھا۔“ ابو سمیت سب ہی نے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ دونوں بھائی تو اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے اگر خدا نخواستہ ابو محتاج ہو جاتے تو کون دیکھے والا تھا؟

”کبھی دل چاہتا ہے اپنے سارے رسالے اٹھا کر روڈی میں بیچ دوں۔“ رابعہ کے چہرے پہ مایوسی اور حزن و ملال کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مارہ اور ثانیہ دونوں ہی اسے حیرت سے دیکھا، اپنے رسالوں کو وہ جی جان سے لگا کر رکھتی تھی۔ پرانے ہونے کے باوجود صاف ستھرے اچھی حالت میں تھے بچوں سے تو کیا ان بیویوں سے بھی دور رکھتی تھی جو پڑھتے وقت اس کا حلیہ بگاڑ دیں۔

”بس یو کی؟“ وہ یاسیت سے گویا ہوئی۔ ”ویسے بھی ان کہانیوں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ سوائے خوابوں کی دنیا کے، ان افسانوں کی دنیا، ہماری حقیقی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ ہم انہیں پڑھ کر خواب دیکھنا سیکھ جاتے ہیں۔ مگر ان خوابوں کی تعبیر ہمارے بس میں

نہیں ہوتی، پھر کیا فائدہ ایسی کہانیاں پڑھنے کا؟ ایسے خواب دیکھنے کا۔“

وہ عادت اور مزاج کے برخلاف، بڑے کھوئے کھوئے لب و لہجے میں اپنے دل کی بات ان سے شیئر کر رہی تھی۔ ”کہانی کو کہانی سمجھ کر پڑھو، دل و دماغ پر سوار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ سائرہ نے حقیقت پسندانہ بات کی۔

رابعہ نے چپ کی بکل مار لی مگر خیالات پر روک کیسے لگاتی جو ایک کے بعد ایک آرہے تھے۔

”جان بوجھ کے ایسا کوئی نہیں کرنا، بس خود بخود ہو جاتا ہے، کون نہیں چاہتا، وہ خوب صورت ہو، محبت سمیت بہت سی آسائشیں اور خوب صورتیاں اس کا مقدر ہوں، اس کے ارد گرد اسے چاہنے والے، سرائے والے ایثار و وفا اور قربانی کے پیکر رشتے ہوں۔ کون نہیں چاہتا زندگی اس کے لیے نرم اور آسان ہو۔ جب اسے یہ سب کچھ رنگین اسکرین یا چھپے ہوئے لفظوں میں ملتا ہے تو وہ خود کو اس کردار کی جگہ رکھ کر یہی خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہر ایک کے ساتھ نہ ہوتا ہو مگر۔“ رابعہ نے ایک گہری سانس لے کر سوچا مگر ”میرے ساتھ تو ایسا ہوتا ہے میری کمزوری ہے یا پتا نہیں، پتا نہیں کیا ہے؟ شاید وہی لڑکیوں کی ایک عمومی عادت، خواب دیکھنے کی، ہم ساٹھ گز کے چھوٹے سے گھر میں اپنے معمولی سے وجود کے ساتھ بیٹھے ایسے ایسے خوش رنگ خواب دیکھتے ہیں کہ کبھی اپنا ہی دل اپنا مذاق اڑانے لگتا ہے اور خاص طور سے جب چاروں طرف گھور اندھیرا ہو تو سورج، چاند اور ستاروں کی نہ سہی مگر ایک ننھی سی کرن کی آرزو کرنا کوئی انوکھی بات تو نہیں، طوفانوں کی زد میں آئے ہوئے لوگ کتنی اور ساحل کی تمنائیں کریں تو کیا کریں، چپ چاپ خود کو مرتا ہوا دیکھتے رہیں؟“



”ہائے ہائے! کیا ناک کٹواؤ گی ہماری تو یہ توبہ! امی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔“ پورے خاندان بلکہ برادری

میں دیکھ لو، کہیں کوئی ایسی مثال ہے کہ کوئی لڑکی نوکری کرنے کے لیے باہر نکلی ہو، تھوکیں گے لوگ، ہم پر۔“ مجھے صرف یہ سمجھا دیں کہ کب تک گھر کا راشن ادھار آئے گا اور کب تک اور کس کس سے قرضہ لے کر ابو کی دوائیاں منگوائیں گی اور یہ بھی سمجھا دیں کہ یہ سب قرضہ کب اور کیسے واپس ہو گا۔“ ثانیہ کو ماں سے ایسی ہی باتوں کی توقع تھی اس لیے اس نے بڑے آرام سے پوچھا تھا۔

بات نکالی تو رابعہ نے تھی مگر باقی تینوں بہنیں اس کی ہم نوا تھیں۔

”فرحان اور عدنان کچھ نہ کچھ کر دیں گے۔ میں نے فون تو کیا تھا دونوں کو۔“ امی نے جواب تو دیا مگر ان کو خود اپنے کھوکھلے پن کا احساس تھا۔

”جب سے ابو اسپتال گئے ہیں تب سے لے کر آج تک بیسیوں بار ان دونوں کو فون کر کر کے سارے حالات بتا چکے ہیں، جو کہ وہ خود بھی جانتے ہیں، ایسے ننھے ننھے تو نہیں ہیں دونوں پھر کیا جواب ملا، سوائے آئیں بائیں شائیں کے۔“ سائرہ غصے سے بولی۔

”ارے وہ دونوں بڑی چندا لیں ہیں، میرے بیٹوں پہ جانے کیا جادو کر دیا ورنہ ایسے تو نہ تھے وہ۔“ امی نے بھی غصے میں جل کر جواب دیا، روایتی ماؤں کی طرح بیٹوں کی برائی ذرا سی بھی ان کی برداشت سے باہر تھی۔

”خوش فہمیوں میں رہنا چھوڑ دیں امی اور لوگوں سے ڈرنا بھی، اگر ہم کئی وقت کے فافے سے ہوں یا ابو کی دوا اور علاج کے لیے ہمارے پاس پھونی کوڑی نہ ہو تو برادری اور خاندان کا کوئی فرد آگے بڑھ کر ہمارے سر پر ہاتھ نہیں رکھے گا، دیکھ چکے ہیں سب کو اور ہم کسی سے امید رکھیں بھی کیوں، جب ہمارے ماں جائے ہمیں اکیلا چھوڑ گئے تو کسی اور سے کیا توقع کیا شکوہ۔“

رابعہ سرد اور سپاٹ انداز میں گویا ہوئی۔

”میں نے جوابات کی تھی اس کا جواب دیں۔“

”گھر بیٹھے کچھ کر لو، جس سے چار پیسے کا سہارا ہو جائے۔“ کچھ دیر بعد وہ شکست خوردہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”گھر بیٹھے بھی کسی کام کا ملنا آسان نہیں ہے اس کے لیے بھی باہر نکلنا لوگوں سے تعلقات ضروری ہیں پھر ضروری نہیں کہ وہ اجرت ہماری ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہو۔“ رابعہ نے دو ٹوک جواب دیا۔

”تو گھر سے باہر کیا نوکری کرو گی، نہ کوئی خاص تعلیم ہے نہ ہنر۔“ امی چڑ گئیں۔

”اللہ مالک ہے، قدم اٹھائیں گے تو وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔“ رابعہ کے لہجے میں اتنا یقین اور اعتماد تھا کہ امی ایک ٹک اسے دیکھے چلی گئیں۔

”اے ابو سے پوچھا؟“ وہ دھیرے سے بولیں۔

رابعہ کی آواز بھرا گئی، اسے جانے کیوں رونا آ گیا، اسے اس وقت بھی رونا آ گیا تھا جب اس نے ابو سے یہ بات کی تھی۔

”ابو جی! اسے میری خود سری یا گستاخی مت سمجھے گا، میں آپ سے اجازت نہیں مانگ رہی، صرف بتا رہی ہوں کہ میں نوکری کرنا چاہتی ہوں، اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔“ باپ نے فقط ایک نظر اس پر ڈالی پھر سر جھکا لیا۔

”کتنی دیر وہ وہاں کھڑی رہی مگر نہ انہوں نے سر اٹھایا نہ کچھ بولے۔“

”تم نے اس طرح بات کیوں کی؟“ تینوں بہنیں متعجب تھیں۔

”ان کی اتنا اور خود داری بچانے کے لیے، اگر وہ ٹھیک ہوتے اور کام کرنے کے لائق ہوتے تو ہمیں کبھی بھی گھر سے باہر نہ نکلنے دیتے، میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس کا بوجھ اپنے سر پر رکھا ہے ان پر نہیں۔“

رابعہ بہت سنجیدگی سے جواب دے کر خاموش ہو گئی۔



وہ بہت بڑا ہال تھا، مختلف عمروں کی خواتین اور لڑکیوں سے بھرا ہوا، بھانت بھانت کے چہرے وہاں موجود تھے، شوخ، خوب صورت، فیشن ایبل بھی، سادہ پروقار بھی اور حالات، عمر، تھکن کی مار کھائے سے

ہوئے چہرے بھی، ہر چہرے کی اپنی ایک الگ ہی داستان تھی مگر یہاں کے فرصت تھی ان داستانوں کو کھوجنے یا پرہیز کی، نظریں اپنے کام پر اور ہاتھ تیزی سے اسے نشانے میں مصروف تھے۔

ایک ہفتہ لگا تھا اسے کام سمجھنے میں اور مزید کچھ دن لگیں گے ہاتھوں میں روانی آنے میں، رابعہ کو اس چار منٹس فیکٹری میں آئے آج نواں دن تھا۔ پانچویں دن سے ہی وہ خود کو کسی کی نظروں کے حصار میں محسوس کر رہی تھی، کبھی اسے لگتا یہ اس کا وہم ہے مگر فیکٹری کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت تھی، گھر کی نزدیکی سڑک پر اترتی اور کچھ دور چل کر گھر آجاتی، پھر بھی دن بھر کی تھکن جسم و جان کے ریشے ریشے میں گھسی ہوئی جسے دور کرنے کا بس ایک ہی نسخہ تھا کہ کپڑے بدل، ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھائے اور نیند بھری آنکھوں کے ساتھ لیٹ جائے تاکہ اگلی صبح کی مشقت کے لیے جسم تیار ہو سکے۔

اف باہر نکل کر محنت مشقت سے روزی کماتا، کتنا کٹھن ہے، ایک روز اپنے دکھتے ہوئے تلووں کو دباتے ہوئے اس نے بے اختیار سوچا۔

کبھی گھر آتے یا فیکٹری جاتے، راستے میں اوباش اور آوارہ، فالتو بیٹھے لڑکوں کی طرف سے ایسے ایسے گھٹیا تبصرے اور ڈانٹا لگزنے کو ملتے کہ اس کا دل چاہتا، آج کے بعد گھر سے کبھی باہر نہ نکلے، اتنی بد صورت دنیا ہے باہر کی اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مگر نہیں، اس دنیا میں اچھا خاصا حسن اور خوب صورتی بھی ہے۔ اسے تقریباً ایک ماہ بعد احساس ہوا تھا، کسی کی نظروں کی تپش جو وہ محسوس کر رہی تھی وہ اس کا وہم نہیں حقیقت تھی۔

”بہت کم لڑکیاں میں نے دیکھی ہیں جن کی عزت کرنے کو خود بخود دل چاہتا ہے یہ جو ہمارے گھروں سے باہر کی دنیا ہے۔ سراسر کچر پڑی کچر ہے۔ اس میں کہیں کہیں کنول کے پھول ملیں تو آنکھیں اور دل خود بخود تعظیم کے لیے جھک جاتے ہیں۔“

وہ عفان تھا، ان کے ڈپارٹمنٹ کا سپروائزر، ڈرازنڈ، ہینڈ سم، ہنس مکھ مزاج کا وہ شخص، وہاں موجود جانے کتنی لڑکیوں کا آئیڈل تھا، مگر یہ گوہر نایاب چمکے سے رابعہ کی ہتھیلیوں میں یوں آن گرا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور خبر ہوئی تو اپنی خوش نصیبی پہ یقین نہ ہوا۔

ڈیوٹی آورز میں وہ فقط ایک سپروائزر تھا۔ پکا پروفیشنل۔ کسی دوسرے کو تو کیا خود رابعہ کو بھی محسوس نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ اس کے دل اور زندگی میں کوئی خاص مقام رکھتی ہے، موبائل نے بہر حال ایک دوسرے سے رابطے کو بہت آسان بنا دیا تھا۔ دونوں ہی بہت محتاط تھے۔ رات کو جب سب سو جاتے تو رابعہ اپنی ڈائری میں موبائل رکھ کر مصروف ہو جاتی اب تو تھکن اور نیند کا غلبہ بھی بہت کم ہوتا تھا۔ شاید محبت ایسا جادو اثر جذبہ ہے کہ بھوک پیاس کے ساتھ ساتھ تھکن اور نیند کا احساس بھی کم ہی ہوتا تھا۔

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے مسیح کیا۔

”محبت خواب ہی تو ہے ایک خوب صورت خواب، جس کی تعبیر اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہوتی ہے۔“ عفان نے جواب میں لکھا تھا۔

”مجھے اپنی خوش نصیبی پہ یقین نہیں آتا، کبھی ڈر لگتا ہے کہ میں پنکھ پھیلائے جس فضا میں پرواز کر رہی ہوں۔ وہاں سے منہ کے بل نیچے نہ آن گروں۔“

”تم اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ محبت کو، اس کی خوب صورتی کو، اس کی لطافت کو محسوس کیوں نہیں کرتیں؟“

”جب انسان طویل عرصے تک اندھیرے میں رہ کر یکایک تیز روشنی میں آئے تو اس کی آنکھیں اتنی جلدی ان اجالوں سے مانوس نہیں ہوتیں، وہ اک دم گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور ان بند آنکھوں کے پیچھے اندھیرے کو محسوس کر کے سوچتا ہے کہ وہ روشنی واقعی ایک حقیقت ہے یا اس کا وہم۔“

”کبھی سوچتا ہوں، کس فلسفی لڑکی سے محبت کر بیٹھا میں روشنی کی بات کرتا ہوں تو وہ اندھیروں کا ذکر

کرنے لگتی ہے، میں پھولوں کا ذکر کرتا ہوں تو اسے کانٹے یاد آتے ہیں، میں آسمان کی جانب نگاہ کرتا ہوں اور وہ زمین پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹاتی، تم آخر اتنی قنوطی کیوں ہو؟

”اگر تم نے اب تک وہ زندگی گزاری اور دیکھی ہوتی جو میں نے گزاری اور دیکھی ہے تو تم بھی شاید ایسی ہی باتیں کرتے۔“ رابعہ نے سوچا مگر پھر لکھتے لکھتے رک گئی۔

”کیا ہوا؟ جواب دو۔“ اسکرین پھر جگمگانے لگی۔
”کچھ نہیں۔“
”نیمند آرہی ہے؟“
”نہیں۔“

”کیا میری یاد آرہی ہے؟“
”جو ہر وقت دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتے ہوں ان کے یاد آنے کا کیا سوال؟“
”کبھی کبھار ہی دل خوش کرنے کی باتیں کرتی ہو تم۔“

”دل تو چاہتا ہے باتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو مگر اپنی غرض کے لیے تمہیں مزید بے آرام نہیں کرنا چاہتا“
اب تم سو جاؤ، صبح جلدی اٹھنا ہے، تمہیں بھی مجھے بھی۔ ٹھیک ہے؟“
”جو حکم۔“

”حکم نہیں در خواست ہے میری ہماری روز کی طرح ایک محبت بھرا گڈ ٹائٹ اسکرین کچھ دیر جگمگا کر تاریک ہو گئی۔

رابعہ نے سیل آف کر کے تکیے کے نیچے رکھا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی، مگر جن آنکھوں میں محبت کے خواب سجے ہوں ان میں نیند کی گنجائش ذرا کم ہی نکلتی ہے۔

”خضر بھائی! شادی میں صرف دو ہفتے رہ گئے ہیں، ای بہت پریشان ہیں کہہ رہی تھیں کچھ آسرا بھی ہے یا بس آپ یونہی بے وقوف بنا رہے ہیں۔“ بی بی ٹی

شروع ہوتے ہی وہ حسب معمول ایک چکر لگانے اور آتا تو صبا شروع ہو گئی۔

”صبری بی! صبر، میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ لوگ پہلے ساری انوسٹمنٹیشن کریں گے کہ فیملی واقعی مستحق ہے یا نہیں پھر مدد کریں گے تو اب ان کی انوسٹمنٹیشن مکمل ہو گئی ہے ان شاء اللہ تین دن کے اندر اندر سارا جیمز کچ آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔“ خضر نے مفصل بات کر کے اسے اطمینان دلایا۔

”اب ذرا میری بھی عرض سن لو بیٹی!“ فریدہ آنٹی نے اپنا نقش کھولتے ہوئے اسے پکارا۔
”جی، حکم۔“ وہ وہاں جا کر کھڑا ہوا۔
”کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے حکم دیا۔

”اللہ آپ کے رزق میں برکت دے بہت شکر ہے، کیسے کیا بات ہے۔“ وہ مسرت سے گویا ہوا۔
”وہی پوچھ رہی تھی کہ اپنے بیٹے کی نوکری کے لیے کما تھا نام سے تو کچھ کام بنا؟“

ان کے بیٹے نے ابھی بی کام کیا تھا۔ کئی جگہ نوکری کے لیے اپلائی کیا مگر ہر جگہ بحیرہ مانگا جاتا تھا بالآخر فریدہ آنٹی نے خضر سے اس کی نوکری کے لیے کہیں کوشش کرنے کو کہا تھا۔ خضر بھی یہاں کا ایک ملازم ہی تھا مختلف سماجی و مذہبی تنظیموں سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اس کی فطرت میں نیکی اور خلوص تھا، لہذا اپنے سوشل کانٹیکٹس کو اپنے مفاد کے بجائے ضرورت مند افراد کی مدد اور فلاح کے لیے استعمال کرتا تھا کسی کی تعلیم کا مسئلہ ہو، شادی کے اخراجات کا روزگار کا یا کوئی اور مسئلہ اس سے جو کوئی بھی اپنے کسی معاملے میں مدد مانگتا وہ خلوص نیت کے ساتھ اس کے حل کے لیے کوشاں ہو جاتا۔

”اللہ پہ بھروسہ رکھیں اسی سے مدد مانگیں۔ ان شاء اللہ سب کام بن جائیں گے۔ آپ دعا کریں، میں کوشش کر رہا ہوں، اللہ ضرور مدد کرے گا ٹھیک ہے۔“ اپنے مخصوص نرم اور دل نشیں لہجے میں انہیں تسلی دیتا وہ آگے بڑھ گیا۔
”اور عروج جی بی، آپ کی امی اب کیسی ہیں؟“

”پہلے سے بہت بہتر ہیں خضر بھائی! آپ کا بہت شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ اتنا مہنگا علاج ہم تو کبھی بھی افرار نہیں کر سکتے تھے، آپ کی وجہ سے آدھے سے بھی کم خرچا ہوا۔“ عروج کا لہجہ اور الفاظ ممنونیت کے احساس سے بو جھل تھے۔

”شکر اور حمد اللہ کے لیے جس نے مدد کی توفیق دی امی کا خیال رکھیے گا دنیا و آخرت دونوں کی جنت ان ہی کی خدمت میں پوشیدہ ہے۔“ بزرگانہ انداز میں نصیحت کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

رابعہ چپ چاپ اپنا لیچ ختم کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ نوجوان سوشل ورکر جو خضر بھائی کے نام سے مشہور تھا۔ سارے جہاں کا دروہمارے جگہ میں ہے کی عملی تفسیر بنا لوگوں کے مسائل، دکھوں اور پریشانیوں کو اپنی حتی الامکان مدد اور تعاون سے کم یا ختم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ سچائی اور خلوص نیت کا اثر تھا کہ وہ کسی حد تک اپنے مقصد یا مشن میں کامیاب بھی تھا۔

”پتا نہیں خضر بھائی کو یہ سب کر کے کیا ملتا ہے۔ نری خواری دوسروں کے کاموں کے لیے اوہرا اوہرا خوار ہوتے رہو، آج کل کی دنیا بڑی مطلبی ہے، اپنا کام نکلنے کے بعد احسان ماننا تو دور کی بات، کوئی کسی کو پہچانتا بھی نہیں۔ خیر مجھے کیا جس کی جو مرضی ہو وہ کرے۔“ کئی بار کی سوچی ہوئی باتیں، ایک بار پھر سوچیں پھر ہمیشہ کی طرح انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ بھلا سوچنے کے لیے عفو کیا کیا تھا۔

گھر کی فضا میں ننھی منی قلقاریوں کی آواز سُریلی گھنٹیوں کی طرح ہر سو پھیلی تھی۔ فروا اپنی ننھی منی بی بی کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔ سانولے سلونے چہرے پہ ممتا کا نور اور غور لیے اس کی چھب الگ ہی تھی۔

”اس کے ابو کو بی بی کی خواہش تھی، اللہ نے ان کی خواہش پوری کر دی۔“ بڑے مطمئن اور مگن انداز

میں بی بی کے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے وہ بتا رہی تھی۔ ”چلو کوئی تو ہے جسے بی بی کی خواہش ہے ورنہ سب تو بیٹیوں کے نام پر یوں بدگتے ہیں جیسے خدا خواستہ کوئی آفت نازل ہو گئی ہو۔“ عمیرہ نے با آواز بلند تبصرہ کیا۔

”ہاں تو اس کی پیدائش پہ اس کے ابو ہی خوش ہیں، دادی، پھوپھیوں نے تو کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بس اس تمنا کا اظہار کر دیا کہ چلو، اگلی بار اللہ بیٹا دے۔“ فروا نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انکشاف کیا۔

”لڑکے کی خواہش سب ہی کو ہوتی ہے۔ تمہارا میاں خوش ہے بس کافی ہے، باقی سب کی باتوں کو چھوڑو۔“ امی بولیں۔

”میں تو بس یونہی بتا رہی تھی مجھے۔!“ اس کی بات منہ میں ہی دب گئی۔
پھپھو سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتی کانپتی سامنے سے آ رہی تھیں۔

کتنی دیر بیٹھ کر وہ اپنا سانس قابو کرتی رہیں، پھر سب کے سلاموں کا جواب دیا۔

”اللہ توبہ، جانے کیا ہو گیا ہے، دو قدم چلتی ہوں تو سانس پھول جاتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ لوں تو اور غضب۔“ ٹھنڈے ٹھار پانی کا گلاس پی کر وہ تکیہ سر کے نیچے جما کر لیٹ گئیں۔

”ارے ثانیہ نظر نہیں آرہی، کیا کر رہی ہے۔“ بڑی دیر بعد انہیں خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔
”وہ تو اسکول گئی ہیں۔“ امی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سائرہ کھٹ سے بول پڑی۔

”اسکول؟ کیا دوبارہ داخلہ لے لیا اسکول میں۔“ پھپھو نے اپنی دانست میں مذاق کیا۔

”بڑھانے جاتی ہیں۔“ سائرہ نے ماں کی تنبیہی نظروں کا نوٹس نہ لیتے ہوئے مختصر جواب دیا، کوئی چھپانے والی بات تو تھی نہیں آج، بس توکل، پتا تو چلنا ہی تھا۔

”اولیٰ پڑھانے؟ کیا اس نے بھی نوکری کر لی۔“ وہ

اپنے بھاری بھر کم وجود کے ساتھ اٹھ بیٹھیں۔
”قرب میں اسکول ہے اور آدھے دن کی تو بات ہے پھر۔ امی گھبرا گھبرا کر وضاحتیں پیش کر رہی تھیں۔

”تم لوگوں نے برادری میں ہمارے ٹاک کنواوی پہلے ایک کو باہر نکالا نوکری کے لیے، اب میری بہو صاحبہ بھی نکل پڑیں نہ پوچھنا نہ گھننا نہ جتنا پتا بھی ہے خاندان میں کیسی کیسی باتیں بن رہی ہیں۔“ پھپھو غصے میں شروع ہو گئیں۔

”ضرورت کے تحت باہر نکلی ہیں آپ سب کو نظر تو آ رہا ہے سب کچھ ورنہ ہمیں کوئی شوق تھوڑی ہے بیٹیوں سے نوکری کروانے کا۔“ امی دبی زبان میں صفائی پیش کرنے لگیں۔

”سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ بیٹیوں کی کمانی کھا رہے ہو تم لوگ، اب بتاؤ بے شری بے غیرتی ہے یا نہیں۔“ پھپھو نے ایسا تیر مارا کہ سب کی رو حیں تک لولہاں ہو گئیں۔

”بیٹے کسی قابل ہوتے چھوڑ کر نہ جاتے تو یہ نوبت کیوں آئی، پہلے بھی تو بچیاں گھر میں ہی بیٹھی تھیں۔“ امی نے آنسو ضبط کرتے ہوئے ایک آہ بھری۔

”ارے سب کے بیٹوں کا یہی حال ہے یا تو الگ ہو جاتے ہیں ساتھ رہیں تو کوئی فائدہ نہیں۔“ نکلتے نکھٹو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ لڑکیوں سے نوکری کرواؤ گھر میں محنت مزدوری کے بہترے کام ہیں۔ گھر بیٹھے کچھ کر لیں کہ چار پیسوں کا آسرا ہو جائے۔ شریف ہو بیٹیاں تو سوکھی روٹی اور پوند لگے کپڑوں میں بھی گزارہ کرتی ہیں، تر نوالوں کے لیے بن سنور کے باہر نکلتا ضروری ہے کیا؟“ بھلو بھلو کر یوں جوتے مار رہی تھیں جیسے کسی جنم کی دشمنی کا بدلہ لے رہی ہوں۔

”اسلام علیکم۔“ ثانیہ اسکول سے آگئی تھی مگاہوں اور اسکارف اتار کر دوپٹہ اوڑھا، مارہ اس کے لیے پانی لے آئی۔
بلا کی کرنی پڑ رہی تھی وہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو کر

آئی اور وہیں بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔
”باپ کہاں ہے تمہارا؟“ پھپھو نے جاننے کیل موضوع بدل دیا۔

”نیچے ہیں۔ بڑوس کے برکت چاچا آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھے ہیں۔“ ثانیہ نے جواب دیا۔ وہ ابھی ان دونوں کو سلام کر کے اور حال احوال پوچھ رہی آرہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد پھپھو ثانیہ سے کرید رہی تھیں کہ اسکول کا ماحول کیسا ہے؟ کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ مہو حضرات کتنے ہیں؟ لڑکیاں کتنی ہیں؟ ثانیہ میک اپ کر کے اسکول جاتی ہے یا بغیر میک اپ کے؟ ثانیہ نے اپنی جانب سے انہیں نسلی بخش جوابات دینے کی کوشش کی مگر لگتا یہی تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

”میں تو اس ارادے سے آئی تھی کہ تم لوگوں سے رخصتی کی بات کروں، کھانا کھا کر پان لگاتے ہوئے انہوں نے اپنے بھائی بھانج کو مخاطب کیا۔

”سوچ کر بتا دیں گے۔“ ابو نے تذبذب سے جواب دیا۔

”اے بھیا! سوچنا کیا۔ نکاح تو ہو چکا ہے، شہرت کے پالے یہ رخصتی دے دو ہمیں اب کیا لبا چوڑا اہتمام کرو گے، حالات ویسے ہی ٹھیک نہیں ہیں تمہارے۔“

”پھر بھی کچھ نہ کچھ تیاری تو کرنی ہے۔“
”ارے چھوڑو تیاری واری کو، میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ شہرت کے پالے یہ رخصتی دے دو، بس اب کی بار آؤں گی تو تاریخ لے کر ہی جاؤں گی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بول کر کھڑی ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆
ہری مرچ، پیاز کا پھولا پھولا گرم آلیٹ، نکل کر پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ دسترخوان پر۔
”ناشتہ تیار ہے۔“ وہ خوشگوار انداز میں چکا۔
”اللہ خضر بھائی! میں ابھی بنا لیتی، آپ بھی بس۔“
عائشہ منہ دھو کر سیدھی ادھر ہی آرہی تھی۔

”ارے بیٹے کے چہرہ دن تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا ناشتا کھاتے ہیں، ایک دن تمہارے آرام کا سہی۔“ او جلدی سے آجاؤ سب کچھ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ خضر دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ جہاں امی پہلے سے ہی موجود تھیں۔
”رات کو معاذ نے بہت ہی تنگ کیا، تین ساڑھے تین بج گئے اسے سلاتے سلاتے۔“ عائشہ بولتی ہوئی بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا طبیعت تو خراب نہیں ہے، زیادہ تو نہیں رویا۔“ امی فکر مند لہجے میں پوچھنے لگیں۔
”طبیعت بالکل ٹھیک ہے، موصوف کھیل رہے تھے بس دن میں اپنی نیند پوری کر لیتے ہیں، رات میں پھر ہمیں جگاتے ہیں۔“ عائشہ مسکرائی۔
”عباد نہیں اٹھا؟“

”وہ بھی رات کو جاگتے رہے، بیٹے کے ساتھ ساتھ اب دونوں اپنی نیند پوری کر رہے ہیں۔“ صبح فجر کے لیے اٹھے تھے، نماز پڑھ کر تھوڑی دیر بعد پھر سو گئے۔“ عائشہ نے توس پہ جھکن لگایا اور ساس کے آگے رکھا۔
”نہیں بیٹا! میں بس آلیٹ کھا رہی ہوں کافی ہے، بہت زیادہ چکنائی ہو جائے گی۔ عجیب طبیعت ہو جاتی ہے پھر۔“ امی نے پیار سے اسے منع کیا۔

”پھر میرے بیٹے نے بڑے پیار سے میرا ناشتہ بنایا ہے وہی کھاؤں گی۔“

محبت اور شفقت کی دھنک مسکراہٹ ان کے شفیق چہرے پہ بکھر گئی۔ ایسا سلجھا ہوا، تابعدار میٹا خوش نصیب والدین کو ہی ملتا ہے۔ جو اپنے برائے سب کی خوشیوں اور غموں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کو تیار رہتا تھا۔ اللہ کی رحمت کا شکر ادا کرتے وہ نہیں کھکتی تھیں۔ انہیں اپنے اس ہیرے بیٹے پہ بڑا فخر تھا جو آج کے اس پُر آشوب دور میں سچ سچ سورج کی ایک بہت روشن کرن بنا ہوا تھا، اپنوں کے لیے بھی اور غیروں کے لیے بھی۔

”خضر بھائی کی بیوی بڑی خوش نصیب ہو گی۔“
عائشہ ان کی بہو بعد میں بنی، پہلے بھانجی تھی، اپنے بچپن سے ہی خضر کو خضر بھائی کہہ کر پکارتی تھی، وہی عادت

اب بھی برقرار تھی۔
”اس میں کیا شک ہے۔“ امی نے لہجے میں غور نہیں، انکسار بھرا فخر اور دامن تھا جو ایسے بیٹوں پر ہر ماں کو ہوتا ہے۔

”ہر سنڈے، میاں کے ہاتھوں کا بنا ناشتہ کھائے گی۔“ عائشہ ہنسی۔ خضر چپ چاپ مسکراتے ہوئے ناشتہ کر رہا تھا۔

”بیٹے! ذرا صبر، آئی دو بار آچکی ہیں، بے چاری بہت پریشان ہیں، تم دیر سے گھر آرہے تھے ملاقات بھی نہیں ہو سکی، اب جو بھی بات ہے، انہیں بتا دو۔“ امی نے ناشتہ کرتے کرتے اسے مخاطب کیا۔

”جی امی! میں آج کل ان ہی کے کام کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا ہوں، اس لیے لیٹ نائٹ گھر آ رہا تھا۔

دراصل معاملہ ہے پیچیدہ۔ اب بقول ان کے اور ان کے بیٹے کے اس نے تنظیم چھوڑ دی تھی مگر تنظیم اتنی آسانی سے ایسے لڑکوں کو نہیں چھوڑتی، خاص طور سے وہ جو بہت اندر تک گھسے ہوئے ہوں، پولیس بھی ایسے ہی لڑکوں کی ٹاک میں رہتی ہے، اب سب کو علم ہے کہ اس پر ڈکیتی کا جھوٹا مقدمہ ہے مگر سب تنظیم اور پولیس والوں کی ٹلی بھگت ہے، ایک کو قربانی کا بکرا اور دوسرے کو ایک شہید کی لاش چاہیے، جس پر اپنی سیاست چکا سکیں، اب میں نے کافی اوپر تک اپروچ تو کی ہے، امید ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ پھر یہ ہے کہ آئی زرمینہ جتنی جلد ہو سکے اسے اپنے بھائی کے پاس سعودیہ بھجوا دیں، تاکہ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہ رہے۔“ خضر نے تفصیل سے اپنی بات مکمل کی۔

”ارے بیٹا! وہ بھی تو تیار ہی تھیں کہ اس کے جانے کے سب انتظامات مکمل تھے، بس یہ ناگہانی آگئی، اللہ اس کی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے، پانچ بہنوں کا ایک بھائی ہے، اب اٹے سیدھے چکروں سے نکل کر سدھرنے لگا تھا تو اس مصیبت میں گھر گیا۔“ امی دل سوزی سے بول رہی تھیں۔

”بدی سے نیکی کی طرف آنا آسان نہیں ہوتا،

آزائش تو آئی ہی ہیں، اللہ مشکلات کو آسان کرنے والا ہے۔ ویسے تو میں خود بھی انہیں فون کر لوں گا، اگر آپ سے ملیں تو تسلی دے دیجئے گا۔ ان شاء اللہ ان کا بیٹا بہت جلد چھوٹ جائے گا۔“ خضر نے اپنے مخصوص نرم اور اطمینان بھرے انداز میں بات کی۔

”اچھا چلو، یہ بات تو ہو گئی، اب ذرا اپنا معاملہ بھی ایک طرف کرو، مجھے بیچ میں لٹکایا ہوا ہے۔“ امی نے جگ سے تازہ جوس گلاس میں اٹھایا۔

”کون سا معاملہ؟“ خضر ان کی بات سمجھ گیا تھا پھر بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولا۔

”ارے بھئی، اتنی لڑکیاں تمہیں بتا چکی ہوں جاننے والوں کی، کسی ایک کو تو فاسل کر لویا اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو وہ ہمیں بتا دو۔“

”چلیں اس معاملے سے بھی نمٹتے ہیں۔ تھوڑا ٹائم دیں مجھے۔“ خضر کی آنکھوں کے سامنے ایک سنجیدہ سی شبیہ لہرائی وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”یار! بہت ظالم ہو تم۔“

”کیوں؟“

”اس کیوں کا جواب تم اچھی طرح جانتی ہو؟“

عفان نے جتلانے کے انداز میں کہا۔

”مگر میں کیا کروں گی تمہارے گھر آکر؟“ رابعہ متذبذب تھی۔

”جب آجاؤ گی تب بتاؤں گا۔“

”ابھی بتانے میں کیا حرج ہے۔“ رابعہ ہنوز محتاط تھی۔

”بس میں فون پہ نہیں بتانا چاہتا، تم سامنے ہو گی تو کہنے کا مزہ ہی کچھ اور ہو گا۔“

”آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔“ رابعہ کی آواز میں الجھن تھی۔

”یوں کہو، مجھے یہ اعتبار نہیں ہوا اب تک۔“ عفان کے لہجے میں ناراضی چھلک رہی تھی۔

”ایسی بات نہیں، اعتبار نہ ہوتا تو اتنی آگے تک

آپ کے ساتھ لیے چلتی۔“ رابعہ نے گھبرا کر اپنی صفائی پیش کی۔

”کہاں آگے تک چلی ہو میرے ساتھ، مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تم آج بھی وہیں کھڑی ہو جہاں پہلے دن تھیں۔“

”مگر مجھے تو یوں لگتا ہے، جیسے میں اس رستے پہ بہت دور تک نکل آئی ہوں۔“ رابعہ دھیرے سے بولی۔

”فقط خوابوں، خیالوں میں، حقیقت میں نہیں۔“

عفان نے ایک پھرا سے جتایا۔

”اچھا چلیں، میں آجاؤں گی۔“ رابعہ نے کچھ لمحے سوچنے کے بعد ہائی بھری۔

”کب؟“ عفان کی آواز سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

”جب آپ کہیں!“ رابعہ کی آواز میں محبت آمیز سپردگی تھی۔

”میں تو کہوں گا کہ ابھی آجاؤ۔“ اس نے ایک گہری سانس بھری۔

”رات کے تین بجے؟“

”تم آؤ گی تو میرے لیے تو سویرا ہو جائے گا۔“

”پھر ڈانٹاؤں گا؟“

”کیا کریں، فی الحال ڈانٹاؤں گے پر ہی گزارہ کر رہے ہیں۔“ عفان نے پھر ایک آہ بھری۔

”ٹھیک ہے، پھر آپ گزارہ کریں میں اب فون بند کر رہی ہوں۔“

”اتنی جلدی، یار کچھ دیر تو دو۔“

”بس اب کل، اس سے پہلے کہ کوئی اٹھ جائے اور گڑبڑ ہو، میں اب بند کر رہی ہوں۔“ ٹھیک ہے خدا حافظ۔“

”ایک تو تم اتنے پیار سے بولتی ہو کہ بندہ آگے سے فقط سر تسلیم ہی خم کر سکتا ہے اور جو مزاج یار میں آئے۔“ رابعہ نے مسکرا کر لائن کٹ دی۔

”اور زندگی اتنی بد صورت بھی نہیں، جتنی ہم کبھی سمجھنے لگتے ہیں ان ہی اندھیروں میں کہیں کہیں چمکتے

خوابوں کے امیدوں کے اور امکانات کے جگنو، ہمیں رات دکھانے کو موجود ہوتے ہیں۔“

نیند کی آغوش میں جاتے جاتے رابعہ سوچ رہی تھی

”مجھے تو لگتا ہے جیسے اللہ نے کوئی فرشتہ غیب سے بھیج دیا ہو ہماری مدد کے لیے۔“

ابا کے چہرے پہ صحت اور خوشی کی چمک تھی۔

اوا کل عمری سے ہی محنت مزدوری کر کے کمانے کی عادت تھی یوں اچانک بیمار پڑ کر کئی مہینوں کے لیے گھر تک ہی محدود ہو کر رہے اور بیٹیوں نے جیسے تیسے گھر سنبھالا تو ان کی عزت نفس اور خود داری پہ زبردست چوٹ پڑی تھی۔

اولاد کا دست نگر ہونا، خاص طور پہ بیٹیوں کا ان کے لیے دوہری اذیت تھی پھر خاندان اور برادری والوں کی باتیں جسمانی تکلیف ختم ہو گئی مگر ذہنی تکلیف مستقل تھی۔

ان ٹھٹھن اور مشکل حالات میں دو افراد نے ان کی ٹوٹی ہمت بندھانے اور ہر طرح سے ان کا ساتھ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک ان کے دوست اور پروسی برکت اللہ اور دوسرے مولوی صاحب، جنہوں نے باقاعدگی سے ان کی خیریت دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل و دماغ کو پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہیں اب احساس ہوا تھا کہ اچھی اور نیک صحبت اور قربت کی کیا اہمیت ہے۔

دل و دماغ پہ چھائی پرسوں کی جہالت کی کائی دھیرے دھیرے ہتی جا رہی تھی۔

اپنے دونوں ہی خواہوں اور دوستوں کے سامنے انہوں نے شدت سے اس خواہش کا اظہار اکثر کیا کہ وہ یوں گھر بیٹھے بیٹھے ایک محتاج اور بیمار کی سی زندگی نہیں گزارنا چاہتے بلکہ جیسے تیسے اپنے زور بازو سے محنت کر کے اپنے گھر والوں کو سپورٹ کرنا چاہتے ہیں۔

ان دونوں نے دوستی اور خیر خواہی کا حق ادا کیا اور اس کام میں ان کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مولوی صاحب نے بہت تلاش بسیار اور چھان پھٹک کے بعد

ایک ایسی دکان کا بندوبست کیا جو ان کے گھر سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھی پھر اس کے ایڈوانس اور پہلے ایک سال کے کرائے کی فکر سے بھی انہیں آزاد کر دیا۔ چونکہ ان کی صحت اور حالت اب اس قابل تو نہیں تھی کہ وہ اپنا بزرگ کاٹھ پھل پہلے جیسا لگا سکتے اور چلا سکتے مگر یہی کام وہ دکان پر با آسانی کر سکتے تھے۔

چھوٹی سی دکان ان کے کام کے لیے کافی تھی، آگے فٹ پاتھ پر لگانے کے لیے چند ہینچوں، گریسوں اور میزوں کا انتظام بھی کر دیا گیا تھا، گھر سے دکان تک پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری برکت اللہ صاحب نے لے لی تھی وہ ریٹائرڈ تھے، اپنی موٹر سائیکل ہر وقت گھر پر کھڑی رہتی تھی، لہذا ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔

پھر انہوں نے سلمان کاروبار سمیٹنے میں مدد کروانے کے لیے ایک لڑکے کو ان کے ساتھ منتھی کر دیا تھا۔ روزانہ کی دیہاڑی پر وہ لڑکا ان کے ساتھ کام کرنے پر بخوشی راضی تھا۔

ان کے اس چھوٹے سے بزنس کی ساری تیاریاں آج مکمل ہو چکی تھیں اور کل سے باقاعدہ آغاز تھا وہ ابھی وہیں سے آرہے تھے، گھر والوں نے اتنا خوش انہیں کم ہی دیکھا تھا۔

”زیادہ محنت نہیں کیجئے گا ابو! طبیعت ذرا بھی ایسی ویسی محسوس ہو تو سب بند کر کے گھر آجائیے گا۔“

رابعہ ان سے مخاطب ہوئی اس کے لہجے اور لفظوں سے فکر، تشویش اور محبت عیاں تھی وہ مسکرا لیے۔

”نہیں بیٹی! میں اپنے کاندھوں کا بوجھ اپنی بیٹیوں کے کاندھوں پہ کب تک ڈالوں۔ یہ تو میرے آنگن کی چڑیاں ہیں، آج ہیں کل اڑ جائیں گی بس جب تک اللہ ہمت دے میں یہ ذمہ داریاں خود اٹھاؤں گا۔“ ابو یکایک سنجیدہ ہو گئے۔

امی کی خاموشی مصلحت آمیز تھی، شوہر کی صحت کی فکر انہیں تھی مگر بیٹیوں کی فکر بھی تھی پھر لوگوں کی الٹی سیدھی باتیں، اب کم از کم طنز کے تیروں سے تو نجات ملے گی۔ انہوں نے کچھ طمانیت محسوس کی جلتے

ہوئے صحرا میں یہ چند جان فزا جھونکے خوشگوار ہوا کے
غنیمت تھے۔ دو بیٹوں کے بل بوتے یہ کیا کیا نہ سوچ
رکھا تھا مگر وہ تو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور اور
عارضی سہارے نکلے۔ بس کبھی کبھار گھر آکر ماں باپ
کو اپنی صورت دکھا جاتے، زیادہ سے زیادہ اپنے اپنے
بچے کو لے آتے، بیویاں تو یہاں سے جانے کے بعد
ایک دوبار ہی آئی تھیں۔
”اللہ جہاں رکھے خوش رکھے۔“ ماں کا ممتا بھرا دل
چاہے کتنا ہی دکھی ہو دعا ہی دیتا ہے۔



ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تیلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو۔
دھیمی آواز میں گنگناتے ہوئے وہ بہت خوش تھی،
آئینہ دیکھتی تو یوں لگتا جیسے ایک نئی رابعہ اس کے
سامنے ہے، چمکتے ستاروں جیسے خواب آنکھوں میں
دک رہے تھے، چہرے پہ خوشی کے گلاب کھل رہے
تھے، کل عفان سے اس کی ملاقات تھی۔
ہو سکتا ہے کہ وہ باقاعدہ پرپوز کرے، اس کا دل
خوابوں کے تانے بانے بننے میں مگن تھا۔ پھول، محبت
کی خوشبو اور تمہارا ساتھ، بس زندگی مکمل ہو جائے
جیسے، رابعہ سوچتے سوچتے مسکرائی، عفان کے بارے
میں محبت کے بارے میں، آنے والی بہار رت کے
بارے میں سوچنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ جیسے۔
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بوجہ قرار آجائے
رابعہ کے احساسات اور جذبات کو فیض نے اپنے
لفظوں کی زبان دی، وہ ہولے ہولے مسکراتی رہی۔
گنگناتی رہی، زندگی بھی تو اب کچھ اسی طرح ہو چلی
تھی کہ۔
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
”جلدی بیٹھو، اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟“ عفان نے

اپنا ہیلرٹ سر پر فٹ کیا۔
”ڈر لگ رہا ہے، کوئی دیکھ نہ لے۔“ رابعہ مستثنائی
محبت کے نام پہ دل نے اتنی جرات تو کر لی تھی کہ قدم
یہاں تک آچکے، مگر ہچکچاہٹ کا شکار وہ اب بھی تھی۔
”یہ اتنا برا خیمہ ہے تمہارا، اس سے چہرہ ڈھانک لو،“
جلدی بیٹھو، ہری اپ۔ اس سے پہلے کہ لوگ ہماری
طرف متوجہ ہوں۔“ عفان نے رابعہ کی بڑی سی کالی
چادر کی طرف اشارہ کیا۔
”وہ تو میں ڈھک لوں گی پھر بھی۔“ رابعہ نے اپنی نم
ہتھیلیوں سے چادر اچھی طرح اپنا آپ ملفوف کیا،
خاص طور پر چہرہ اور اس کی ہمرانی میں پیچھے بیٹھ گئی۔
اس کی باتوں اور خوابوں کے سہارے سفر کیسے کٹا
اسے پتا ہی نہیں چلا۔
پوش علاقے میں بڑی سی صاف ستھری عمارت میں
اس کا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا۔ فلیٹ کے ذریعے وہ با
آسانی پہنچ گئے۔ فلیٹ کا لاک کھول کر وہ اندر داخل ہوا
اور سامنے ہی لاؤنج میں اسے لے آیا۔
”بیٹھو۔“ عفان نے بے حد نفیس اور نازک
ڈیزائن والی ڈائنگ ٹیبل کی کرسی پیچھے گھسیٹی اور اسے
بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود فریج کی جانب بڑھ گیا۔
”آپ کی امی۔۔۔؟“ رابعہ نے جھجھکتے ہوئے
اسے دیکھا۔ فلیٹ میں بالکل خاموشی اور سناٹے کا راج
تھا، اس کی ہتھیلیاں پھر بھگنے لگیں۔
”امی تو پرسوں کی فلائیٹ سے امریکہ چلی گئیں
بڑے بھیا کے پاس!“ اس نے کولڈ ڈرنک گلاس میں
انڈلی اور رابعہ کی طرف برہمائی۔
”آپ نے بتایا نہیں۔“ رابعہ چونک پڑی۔
”دھیان نہیں رہا ہو گا، یار! تم سے بات کرتا ہوں تو
بس اپنا اور تمہارا خیال رمتا ہے، باقی سب بھول جاتا
ہوں۔“ عفان اپنا کولڈ ڈرنک کا گلاس لے کر اس کے
مقابل بیٹھ گیا۔
”تم گھبرا کیوں رہی ہو، یہ پو۔“ وہ لاپرواہ لہجے میں
مخاطب ہوا۔
”کوئی بھی نہیں ہے گھر پہ، عجیب سا لگ رہا ہے

مجھے!“ رابعہ نے بڑے محتاط لفظوں کا انتخاب کر کے
کہا۔ عفان کا سوا بڑی جلدی خراب بھی تو ہو جاتا تھا۔
”تم تو ایسے ڈر رہی ہو جیسے میں کوئی بد معاش
ہوں۔“ عفان کا مزاج برہم ہو گیا۔ ”اگر تم جانا چاہتی
ہو تو جا سکتی ہو، میں نے دروازہ لاک نہیں کیا ہوا
ہے۔ دوبارہ اسی برہم انداز میں بے مروتی کے
ساتھ گویا ہوا۔
”میرا یہ مطلب نہیں تھا، تم بلاوجہ ناراض ہو رہے
ہو۔“ رابعہ کمزور لہجے میں بول رہی تھی عفان کی
ناراضی اور برہمی اس کی برداشت سے باہر تھی۔
”اتنا اچھا سوڈ تھا میرا، کچھ یادگار وقت تمہارے
ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، یار! محبت میں اتنا حق تو حاصل
ہے مجھے، مگر تم۔“ وہ ایک لمحے کو رکتا تمہاری ٹفل کلاس
زینت کبھی بدلے گی نہیں، وہ دھیرے سے برہم ہوا۔
رابعہ کو اس کی اس بات سے تکلیف پہنچی تھی مگر
وہ ضبط کر گئی چند لمحے خاموشی کے یو نہی سرک گئے۔
”اب یہ کولڈ ڈرنک تو پی لو، میں نے کچھ ملایا نہیں
ہے۔ اس میں۔“ عفان نے ایک بار پھر طنزیہ انداز
اختیار کیا۔
”آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“ رابعہ
رد ہانسی ہو گئی۔
”تو، تم بھی تو اپنے آپ کو دیکھو، جب سے تئی ہو،“
چادر لپیٹ کر ایسے سمٹ کر بیٹھی ہو جیسے مجھ سے کوئی
خطرہ ہو۔ گھر پہ کوئی نہیں ہے تو چہرے پہ بارہ بجنے
لگے۔
”میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو آپ
سوچ رہے ہیں۔ اعتبار نہ ہوتا تو آپ کے ساتھ یہاں
نہ آئی۔“ رابعہ نے کولڈ ڈرنک کا گلاس منہ سے لگایا۔
”میں تمہیں بہت اچھا سا لپچ کھاتا ہوں، اپنے
ہاتھوں سے بنا کر۔“ وہ مسکرایا۔
لاؤنگ والی نیلے رنگ کی شرٹ اور کالی پنٹ میں
اس کا دراز قد اور نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ
بھی اس کے چہرے اور شخصیت کی طرح دلکش تھی۔
”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا آج زیادہ ہینڈ سم لگ رہا

ہوں۔“ عفان نے اس کی بے اختیار نظروں کی چوری
پکڑ لی تھی۔
”دیکھ رہی ہوں، آپ کتنے ہینڈ سم ہیں، میں تو اتنی
خوب صورت نہیں ہوں، آپ نے پتا نہیں کیا دیکھا
مجھ میں۔“ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی رابعہ
یکدم سنجیدہ ہو گئی۔
”میں نے آپ میں کیا دیکھا؟ ابھی تک تو کچھ نہیں
دیکھا، آپ اجازت دیں تو بندہ کچھ جرات کرے۔“
عفان نے کچھ آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا،
اس کی نظروں سے انداز سے اور لفظوں سے بے باکی
عیاں تھیں، رابعہ کا ایک خوف زدہ ہو گئی۔ اس کے ہاتھ
ٹھنڈے ہونے لگے۔ اے سی کی خنکی کے باوجود اسے
اپنی پیشانی پہ سینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔
اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کیا کہتی؟ فقط
بے بسی سے عفان کو دیکھ کر رہ گئی۔
”ریلیکس یار!“ عفان نے میز پہ رکھا اس کا ہاتھ
تھپتھپایا اور دوبارہ فریج کی طرف بڑھ گیا۔
”تمہیں مشروم پسند ہیں؟“ اس نے فریج سے
ایک ڈبّا نکالا۔
رابعہ نے اس چیز کا صرف نام ہی سنا اور پڑھا تھا،
کبھی کھانے کا اتفاق تو ہوا نہیں تھا، اب وہ کیا بتاتی کہ
اسے مشروم پسند ہے یا ناپسند، وہ خاموشی سے اسے
دیکھے چلی گئی نہ جانے کیوں اسے شدت سے احساس
ہو رہا تھا کہ یا تو کچھ غلط ہو گیا ہے یا ہونے جا رہا ہے۔
”ہیلو میڈم، کہاں کھو گئیں؟“ عفان نے اس کی
آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔
”میں کچھ کھاؤں گی نہیں، مجھے بھوک بھی نہیں
ہے اور دیر بھی ہو رہی ہے۔“ رابعہ نے سامنے کی دیوار
پہ لگے خوب صورت اور نفیس کلاک میں گھومتی
سوئیوں کو دیکھا۔
”بور کر رہی ہو یار! بولو، کیا چاہتی ہو؟“ عفان پھر
سے اس کے سامنے کرسی پر براجمان ہو گیا۔ رابعہ کی
کولڈ ڈرنک کا آدھا گلاس یو نہی پڑا تھا۔
”تم نے یہ بھی پورا نہیں پیا۔“ عفان نے گلاس کی

طرف اشارہ کیا۔

”دل نہیں چاہ رہا۔“ رابعہ بے دلی سے بولی۔ یکایک ہی اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگا تھا۔ آتے وقت وہ جتنی خوشی اور خوابوں سے بھر ادا اپنے ہمراہ لائی تھی اس وقت وہ سب کچھ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

”کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا“ کچھ پینے کو دل نہیں چاہ رہا۔ پھر دل کیا چاہ رہا ہے سوٹ ہارٹ! “ عفان نے بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”عفان۔۔۔“ رابعہ نے بمشکل اسے پکارا۔

”تمہارے چہرے پہ اتنی ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟ دیکھو! میں عفان ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم مجھے اپنے روبرو اور قریب کیا کر یہ بات کیوں بھول گئیں؟“ عفان پہلے والا عفان بن گیا جو وہ فون پر ہوتا تھا اس کا لب و لہجہ بہت نرم اور محبت کی چاشنی لیے ہوئے تھا رابعہ کے ڈوبتے دل کو کچھ سہارا ملا تھا اس نے ایک گہری سانس لے کر اس دشمن جان کو دیکھا جو پل پل رنگ بدلتا رہا تھا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے عجیب و غریب ہوں گے۔“

”میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہوں، جتنا تم سوچ رہی ہو یا سوچ سکتی ہو۔“ وہ ہنسا۔

”آپ کی امی کب تک آئیں گی؟“ رابعہ نے موضوع بدلا۔

”وہ تو اب ایک سال بعد ہی آئیں گی۔۔۔ میری شادی پہ اپنی بہو کے ساتھ۔“ عفان کا انداز لا پرواہی لیے ہوئے تھا۔

”شادی۔۔۔؟ بہو کے ساتھ؟“ رابعہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

”ہاں بھئی۔ شادی جو ہر شریف انسان زندگی میں ایک بار تو ضرور کرتا ہے جو زیادہ شریف ہوتے ہیں وہ ایک سے زیادہ بار بھی کرتے ہیں۔“ عفان نے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

”میں سمجھی نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ رابعہ

کو یوں لگا جیسے وہ کسی گہرے اور اندھے کنویں کے کنارے کھڑی ہے۔

”ایک منٹ۔ میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں، پھر تمہاری سمجھ میں شاید میری بات آجائے۔“ عفان نے کھڑے ہو کر پینٹ کی جیب سے اپنا موبائل نکالا پھر دوبارہ کر سی۔ بیٹھ کر اس نے اسے آن کیا۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے اپنا موبائل رابعہ کی طرف بڑھایا رابعہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی موبائل ہاتھ میں لے کر ایک نظر دیکھا ایک بہت خوب صورت اور طرحدار الرٹنا ڈرن لڑکی کی تصویر تھی۔

”یہ بٹن دھیرے سے ٹچ کرتی جاؤ، آگے اور فوٹوز آتے جائیں گے۔“ عفان نے ایک بٹن کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”یہ کون ہے؟“ رابعہ کی آواز اندھے کنویں کی تہ سے آرہی تھی۔

”یہ عازنہ ہے، میری کزن اور منگیترا۔ اگلے سال ہماری شادی ہے۔“ عفان بڑے اطمینان سے بتا رہا تھا۔

”میرے ساتھ کیا کھیل، کھیل رہے تھے آپ؟“ اندھے کنویں کے پاتال میں گہری بے دم رابعہ کی آواز بڑی مشکل سے نکلی تھی۔

”کھیل؟ کیا کھیل؟ میں نے محبت کا دعوا کیا تھا تم سے۔ وہ اب بھی کرتا ہوں شادی کا ذکر یا وعدہ تو میں نے کبھی نہیں کیا۔“ عفان کی معصومیت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔

”جب شادی نہیں کرنی تھی تو محبت کا دعوا کیا۔“ رابعہ کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بکھر بکھر کر نکل رہے تھے۔

”ایک تو تم لڑکیوں کے دماغ میں شادی کا خیال بتا نہیں کیوں ٹھونس ٹھونس کر بھرا ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر کچھ سوچتا ہی نہیں۔“ وہ جھنجھلا گیا۔

”دیکھو، محبت ایک الگ چیز ہے اور شادی ایک الگ معاملہ، شادی کے بعد تو بندہ باؤنڈ ہو کر ایک روٹین لائف گزارنے پر مجبور ہوتا ہے ایک معاشرتی

جال میں پھنس جاتا ہے، چاہے مرد ہو یا عورت، تو یہ جو شادی سے پہلے کا گولڈن پیریڈ ہوتا ہے نا، آزادی کا، اختیار کا، تو اسے میں ضائع کرنے کا قائل نہیں۔ اب مجھے کتنی لڑکیوں سے محبت ہوئی ہے مگر میں ہر ایک سے شادی تو نہیں کر سکتا نا، محبت کے نام پر ٹائم اچھا گزر جاتا ہے۔ کچھ اچھے منگے سے گفتگوں دے دو، تھوڑا مالی سپورٹ کر دو، تو تمہارے جیسی لوزر مل کلاس لڑکیاں اچھا خاصا تعاون کر لیتی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم یہ بات سمجھتی ہو گی۔“ عفان اس کی حالت سے بے نیاز بولتا جا رہا تھا۔

”دیکھو لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے یہاں، نوٹ خرچ کرو تو ایک سے ایک لڑکی مل جاتی ہے، مگر میرا نقطہ نظر کچھ اور ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر رقم خرچ کرنی ہی ہے تو لڑکی کو دو چار اچھے لہجے اور ڈنر کراؤ۔ کچھ اچھے اچھے گفتگوں دو، اس سے تھوڑی جان پہچان کرو اس طرح کچھ نہ کچھ تو محبت ڈولپ ہو گی اور جب محبت درمیان ہو تو وقت بہت اچھا گزرتا ہے پھر وہ دو اور دو چار والا معاملہ نہیں ہوتا کہ کچھ لو اور کچھ دو، ایسے معاملات ذرا چپ لگتے ہیں مجھے۔“

رابعہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی، اس کا ذہن بالکل خالی تھا جیسے۔ عفان کیا کہہ رہا تھا، کیوں کہہ رہا تھا اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور جو کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اسے اس کا دل قبول کرنے سے انکاری تھا۔

”تم اتنی خاموش کیوں بیٹھی ہو، دیکھو تمہاری مرضی کے بغیر میں تمہیں ٹچ بھی نہیں کروں گا۔ زبردستی کا قائل نہیں ہوں میں، جو بھی ہو گا وہ تمہاری مرضی اور خوشی سے ہو گا تم کچھ تو کہو یہاں یا نا۔“ عفان اسے غور سے دیکھتا ہوا دوبارہ بولا۔

اور رابعہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ جس کنویں کے پاتال میں گہری ہے وہاں غلاظت اور گندگی کا ایک ڈھیر پہلے سے پڑا تھا جس میں وہ بری طرح لتھڑ چکی ہے اسے اپنے آپ سے کراہیت نہیں بلکہ نفرت محسوس ہو رہی تھی اس پر مستزاد ذلت اور بے

جی کا احساس۔

”کیا محبت اتنی بد صورت، اتنی بھیا تک اور اتنی نفرت انگیز بھی ہوتی ہے؟ اس نے تو ہمیشہ ڈراموں، فلموں اور کہانیوں میں محبت کو بہت خوب صورت، بہت طاقت ور اور بہت حسین دیکھا، سنا اور پڑھا تھا، پھر یہ سب کیا تھا؟ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں اور اس کے کان جو کچھ سن رہے تھے وہ کیا ہے؟

”تم تو گوتم بدھ بن کر بیٹھ گئی ہو، اپنا بھی ٹائم ویسٹ کر رہی ہو اور میرا بھی۔“ عفان اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر بولا۔ ”اگر تم چاہو تو اپنی مرضی کا لمانٹ بتا سکتی ہو۔“

اس بار اس نے واضح لفظوں میں اسے پیشکش کی۔ رابعہ کو لگا جیسے وہ اس کے منہ میں غلاظت ٹھونسنے کی کوشش کر رہا ہو اسے ابکائی آنے لگی، وہ بے اختیار منہ پہ ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ عفان بھی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ رابعہ کچھ کہنے سے اور دیکھے بغیر سیدھی دروازے کی طرف بڑھتی ہی چلی گئی۔ باہر کاریڈور میں لفٹ کا انتظار کیے بغیر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور اندھا دھند اترتی چلی گئی۔

لاکھ ضبط کے باوجود بھی آنکھیں تھیں کہ آنسوؤں سے لبالب بھرے جا رہی تھیں۔ آنکھیں اور چہرہ اچھی طرح صاف کر کے وہ بلڈنگ سے باہر مین روڈ پر آئی اور آہستہ آہستہ قدموں سے ایک طرف چلتی چلی گئی۔ چاروں سمت چار سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب بہہ رہا تھا اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور اسے اپنے گھر جانے کے لیے کس روٹ پہ کھڑے ہو کر کون سی گاڑی میں بیٹھنا ہے، وہ غائب و مافی کے عالم میں کچھ دیر یونہی چلتی رہی اور پھر اچانک اس پہ ایک روح فرسا حقیقت کا انکشاف ہوا۔

اس کا ہینڈ بیگ عفان کے فلیٹ میں میز پر ہی رکھا رہ گیا تھا جس میں اس کا موبائل اور کچھ نقدی بھی سوہ اس وقت بالکل خالی ہاتھ گاڑیوں اور انسانوں کے ہجوم میں تنہا تھی۔ رابعہ کے بڑھتے قدم خود بخود ہی ٹھہم

گئے۔ کانٹے دل اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ وہ سڑک کنارے گھڑی تھی۔

”یا اللہ۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور تب ہی وہ اس کے قریب آکر رکا۔

”شکر خدا کا تم مل گئیں۔“ ایک مانوس آواز سن کر رابعہ نے اپنے سامنے دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ دنیا جہاں کی حیرت اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔



ایک طویل اور گرم گرم بحث کے بعد جب یکایک ہی چپ ہو گئے، جیسے کسی کے پاس بھی کہنے کو کچھ بچا ہی نہ ہو۔ خاموشی کا یہ راج کچھ منٹ رہا پھر پھپھو کی بڑی بیٹی نے دوبارہ تازہ دم ہو کر بحث کا آغاز کیا۔

”اچھی طرح سوچ سمجھ لو ماموں! آج کل اچھی بھلی کنواری لڑکیوں کو کوئی نہیں پوچھ رہا تو تمہاری طلاق یافتہ کو کون پوچھے گا؟“ بولتے بولتے اس کا لہجہ استہزا سیہ ہو گیا۔

”اللہ مالک ہے اپنی بیٹی ایک نشے باز کے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے میرے گھر پر رہے، کم سے کم یہاں اس کی زندگی جہنم تو نہیں بنے گی۔“ ابو ہر صورت اپنے موقف کا دفاع کر رہے تھے۔

”یوں کہو، بیٹی کی کمائی کا چسکا لگ گیا۔“ پھپھو نے ایک بار پھر طعنہ مارا۔

”ہم نے اسے کمانے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ اپنی مرضی سے اسکول میں پڑھاتی ہے اور یہاں اتنی کمائی نہیں ہے جس کا کسی کو چسکا لگ سکے، اس کی مرضی چاہے تو پڑھائے چاہے تو نہ پڑھائے۔ ہماری طرف سے نہ کوئی پابندی ہے نہ روک ٹوک۔“ ابو نے ترنت انہیں جواب دیا۔

”مگر ابو! یہ بھی تو سوچو، پہلے ہی اتنی بے عزتی ہو چکی ہے ہماری۔ گھر کی لڑکیاں باہر نکل کر نوکری کر رہی ہیں اب تم طلاق کا شوشہ چھوڑ رہے ہو، کتنی بدنامی کرواؤ۔“

گے ہماری۔“ بڑا بیٹا اپنی ساس اور ساسے کا حوالہ دیتا آیا تھا اور مسلسل کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔

”میری جو بھی بے عزتی اور بدنامی ہوئی ہے میرے بیٹوں نے کروائی ہے، بیٹیوں نے نہیں اور اس معاملے میں اپنی چونچ بند رکھیں تو بہتر ہو گا۔“ نے اپنا روئے سخن بیٹے کی طرف کیا تو وہ گرا ہوا ہوئے تھا۔

”اپنے تو میں اپنی بہو کو نہیں چھوڑوں گی، بیٹیوں کے بٹھاؤں کی خاندان برادری کی اب تو یہ فیصلہ وہیں ہو گا وہی لوگ پتا چلائیں گے کہ بیٹی کے لیے کوئی دوسرا باپ نے ڈھونڈ کے رکھا ہے یا بیٹی نے خود ڈھونڈ لیا ہے جو طلاق کی اتنی جلدی ہو رہی ہے۔“ پھپھو کے لفظوں میں دھمکی دیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ای اور سب لڑکیوں کے چہرے فق ہو گئے، بیٹیوں کا معاملہ نازک تھا اگر فیصلہ ان کے خلاف آیا اور انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا تو سب خاندان اور برادری والوں کی طرف سے ان کا بایکاٹ ہو جانا عرف عام میں حقہ پانی بند کرنا کہلاتا تھا۔ ایسی صورت میں ان سے ملنا جلنا ان کے گھرانے میں رشتے قائم کرنا سب ختم ہو جاتا۔

”اب کیا ہو گا ابو!“ سمیرا اور حمیرا باپ کے قریب آن بیٹھیں۔

”اللہ مالک ہے، تم لوگ پریشان مت ہو۔“ انہوں نے دونوں کے سروں پہ ہاتھ رکھ کر بڑی بروہاری لہجے سے جواب دیا۔ ثانیہ بڑی ہمت کر کے ان کے پاس آئی۔

”آپ رہنے دیں۔ جو میرے نصیب میں ہو گا مجھے بھگت لوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو، میری زندگی تباہ کرنے کے چکر میں میری چھوٹی بہنوں کی زندگی خراب ہو جائے۔“ ثانیہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں ان بات کی۔

دراصل ابو کی ایک چچا زاد بہن نے سارا اور دونوں کے لیے اپنے بیٹوں کے رشتے کا عندیہ دیا تھا لڑکے اور فیملی کافی معقول تھی، پھر سب سے بڑی

کہ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے لوگ تھے جو ان کے خاندان میں ذرا نایاب ہی تھے۔ اگر یہ رشتے ہو جاتے تو ان کے لیے بہت خوشی کی بات ہوتی مگر پھوپھی کی پختہ دہائی دھمکی کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی ساری خوشیاں کھٹائی میں بڑنے والی ہوں۔

”ارے میری بچی، تو فکر مت کر، میرے ہوتے ہوئے تم میں سے کسی کو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ابو کا لب و لہجہ شفقت لیے ہوئے بڑا مضبوط اور توانا تھا۔ کچھ عرصے سے ان کا لب و لہجہ بیوی اور بیٹیوں کے معاملے میں بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک غیر محسوس سی شفقت اور ملانعت ان کے لہجے میں سمٹ آئی تھی اور پھر ان کے خیالات باتیں سب کچھ بہت حد تک پہلے سے مختلف تھا۔

”ہو سکتا ہے، میرے نصیب میں یہی لکھا ہو ورنہ نکاح کی نوبت کیوں آئی۔“ ثانیہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولتا اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

”وہ میری غلطی تھی، میرے غلط فیصلے کا بوجھ میری اولاد کیوں اٹھائے اور پھر۔“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سر نیچے جھکا لیا اور دھیمے دھیمے بولنا شروع ہوئے، بیوی اور بیٹیاں انہیں حیرت سے دیکھ اور سن رہی تھیں۔

”تم لوگ اپنے باپ کو ظالم، جابر اور تنگ دل خیال کرتے ہو گے اور ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی ہو مگر بیوی بیٹیوں میں نے کبھی تم سے نفرت نہیں کی نہ ہی تمہیں حقیر خیال کیا، بس میں ڈر گیا تھا، تم لوگوں کی تعداد سے۔ اس دنیا سے اپنے خاندان اور برادری کے رسم و رواج سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ بچپن سے ہی بچیوں کے لیے بوجھ کا لفظ سنتا چلا آیا تھا۔ تم لوگ ایک ایک کر کے دنیا میں آئیں تو خود کو اس بوجھ تلے محسوس کر کے اور بھی کمزور ہو گیا اس کمزوری نے جلد بازی کی راہ دکھائی اور بس جیسے تیسے ایک ایک کر کے اپنے طور پر اس بوجھ کو اپنے کندھوں سے اتارنے لگا، تمہاری زندگیوں میں آنسو آئے یا ہنسی، اسے مقدر کے لکھے پر چھوڑ دیا۔ گھر کی چار دیواری میں اس لیے

قید رکھا کہ باہر کی دنیا سے تمہیں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔“ وہ ایک لمحے کو رکے، سناٹا ایسا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز آجائے۔

”بیٹے چھوڑ گئے، بیماری آئی تو احساس ہوا کہ بیٹیوں کو رحمت کا نام یونہی نہیں دیا گیا، اگر میری بیٹیاں نہ ہوتیں تو میں کسی سڑک ٹمٹپا تھا یا خیراتی ادارے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا ہوتا۔ میری وجہ سے تم سب کی زندگی میں جو مشکلات آئی ہیں ان کے لیے مجھے معاف کر دو۔“ بمشکل بولے تو ان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

سب کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر رابعہ ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس رونے میں پچھتاوے اور پشیمانی کے آنسو بھی شامل تھے۔

”آپ نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ آپ نے ہمیں عزت دی، تحفظ دیا، گھر کی چار دیواری میں قید نہیں بلکہ محفوظ رکھا۔ آپ نے ہر طرح سے ہمارا خیال رکھا۔ آپ کی محبت کا بس انداز جدا تھا اگر آپ کو ہم سے محبت نہ ہوتی تو سترہ سترہ گھنٹے موسموں کی سختیاں برداشت کر کے ہمارے لیے محنت مشقت نہ کرتے، ہمارے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور دوسری ضروریات کا دھیان نہ رکھتے۔“ اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”جو باپ اپنی بیٹیوں سے محبت کرتا ہو اسے ہی پتا ہوتا ہے کہ اس کی کس بیٹی کو گلاب جامن پسند ہیں، کون سی بیٹی کو گئے کارس اچھا لگتا ہے، ہمسوے اور آلو کی چاٹ کسے بھاتی ہے اور کون شہوت اور فالسے کی دیوانی ہے، ہم تو آپ کی ہر محبت، شفقت کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے رہے، کبھی یہ نہیں سوچا کہ ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں آپ جیسا باپ ملا اور ابو جی ہمیں اپنے نصیب کے لیے نہ آپ سے کوئی شکایت ہے نہ اللہ سے کوئی شکوہ۔“ سمیرا آگے بڑھی اور ان کے پاس بیٹھ گئی، اس کی آواز اور آنکھیں دونوں بھیگی ہوئی تھیں۔

”ماں، باپ کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے، آپ نے جو

بھی فیصلے ہمارے لیے کیے وہ ہماری بھلائی اور خوشی کے لیے ہی کیے، آگے ہمارا مقدر اور اللہ کی مرضی میں بھی اپنے گھر خوش ہوں ابو! شروع شروع میں مجھے آپ سے اور سب سے بہت شکوے شکایات تھے مگر اب کسی سے کوئی شکایت نہیں اور آپ سے تو بالکل نہیں اس عمر اور اس بیماری کے ساتھ آپ اپنی بیٹیوں کے لیے محنت کر رہے ہیں، آپ بہت عظیم ہیں ابو! ہمیں آپ پر بہت فخر ہے۔“ فرما آگے بڑھ کر بولی تو بولتی ہی چلی گئی۔

”تمہاری ماں کو تو ضرور ہی مجھ سے شکایتیں ہوں گی۔“ ابو آج اپنے احتساب کے موڈ میں تھے۔

”مجھے بھلا کیا شکایت ہوگی آپ سے۔ ساری عمر کا کرکھلایا آپ نے ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ اولاد کا خیال کیا، ایک عورت کو اور کیا چاہیے! امی کا لہجہ سچائی لیے ہوئے تھا۔

”اب یہ بتائیے، ثانیہ کے معاملے کا کیا کرنا ہے؟“

سب سے بڑی حمیرا نے سوال کر کے موضوع بدلا اور اس جذباتی سچویشن سے سب کو نکالا۔

”جو میں نے کہا ہے وہی کرنا ہے۔ میں جانتے بوجھتے اپنی بیٹی کو کنوس میں نہیں دھکیل سکتا۔“ ابو نے دونوں اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

”ایک محبت ہی تو کی تھی وہ بھی بہت احتیاط بہت خیال کے ساتھ، پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ خوابوں کے تلی کے پیچھے دوڑنے کا عمل اتنا بھیانک تجربہ نکلا کہ سیدھی غلاظت کے ڈھیر میں جا گری، احساس ذلت پیچھا نہیں چھوڑتا۔ رواں رواں جیسے کسی ان دیکھی آگ میں جل رہا ہے، اذیت ہی اذیت جس سے چھٹکارا پانے کا کوئی سامان نہیں، آنسو ہی آنسو درد ہی درد کیسی ہوتی ہے محبت اور کیسی ہو جاتی ہے زندگی۔

کیا محبت کے خوش رنگ پھول فقط کمانیوں میں ہی ملتے ہیں؟ اصل زندگی میں نہیں تو پھر تو پھر یہ لفظ یہ

کمانیاں ہمیں خواب دیکھنا کیوں سکھاتے ہیں۔ دھڑکنے کیوں سکھاتے ہیں۔

یا پھر شاید محبت ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے وہ ہمارے خوشنما پھولوں جیسے لوگ اور ہی ہوتے جو محبت کرتے ہیں جن سے محبت کی جاتی ہے۔ خزاں رسیدہ خشک پتوں جیسے لوگ ہیں جن کے تلوں میں فقط قدموں تلے چر مرانا لکھا ہے۔

اچھا اگر ایسا ہے تو یونہی سہی، اب ان آنکھوں پر پھر اور اس دل کو بھر کر لیں گے، اب نہ ان پتھر آنکھوں میں کوئی آنسو ہو گا نہ کوئی خواب۔ اب اس دل میں چاہت کا کوئی پھول کھلے گا نہ دھڑکن کا کوئی گیت ہو گا۔

بس زندگی خاموش ہے تو خاموش ہی سہی۔ زندگی تنہا ہے تو تنہا ہی سہی۔

رابعہ نے ڈائری بند کی اور اپنی آنکھوں کو بے دردی سے مسل کر خشک کر ڈالا جس میں بے اختیار رہی آنسو اندے چلے آ رہے تھے۔

”شکر ہے بی بی! آپ مل گئیں، پتا بھی ہے کہ سے خوار ہو رہا ہوں میں، آپ کو ڈھونڈنے کے لیے میں۔“ وہ اپنے انہی نرم لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

”آپ۔۔۔؟“ رابعہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ آنکھوں میں ابھی تک آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر میلی چار کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

”چلے بیٹھے، میں آپ کو اسٹاپ۔ چھوڑ دیتا ہوں بلکہ آپ کے روٹ کی ویگن میں بٹھا دوں گا۔ یہاں سے بس تھوڑی ہی دور ہے وہ روٹ۔“

”نہیں۔“ رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں کا کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔ ”گھر نہیں جانا اس نے سوال کیا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں مرجاؤں۔“ رابعہ کی شفاف آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔

لگیں۔

”اس سے کیا ہو گا؟“ اس نے بڑے اطمینان سے سوال کیا۔ رابعہ خاموش رہی۔

”رابعہ بی بی! میں آپ کو بہت سمجھ دار خیال کرتا تھا مگر آپ میں تھوڑی سی بے وقوفی ابھی بھی ہے۔ ایک لیکچر میں آپ کو دوں گا مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو آپ کی اہل گھر پہنچنے کی کریں۔“

”خضر بھائی کو کیسے پتا کہ میں یہاں ہوں اور کیا وہ عافان کے اور میرے بارے میں جانتے ہیں؟ یہ مجھے ڈھونڈ کیوں رہے تھے؟“ رابعہ کے ذہن میں ایک کے بعد ایک سوال آ رہے تھے مگر وہ کسی بُت کی مانند ساکت اور خاموش کھڑی تھی۔

”یہ سوچ بچار گھر جا کر بھی ہو سکتی ہے۔“ رابعہ نے غائب دماغی سے اسے دیکھا۔

”جلدی کریں شام ہو جائے گی تو رش بڑھ جائے گا۔ مگر تک پہنچنے میں ٹریفک جام ملے گا آپ کو۔“ خضر اب تک بڑے تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ رابعہ چند لمحوں کے لیے چپ چاپ دیکھتی رہی پھر اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔ بمشکل پانچ منٹ بعد اس نے ایک سڑک کنارے بائیک روک دی۔ رابعہ اتر کر کھڑی ہو گئی۔

”یہاں سے آپ کے گھر جانے والی ویگن مل جائے گی۔“ خضر نے اسے ہدایت کی۔

”میرا پرس، موبائل۔“ رابعہ کے منہ سے بمشکل آواز نکلی۔

”کل دونوں چیزیں مل جائیں گی ان شاء اللہ۔ آپ چھٹی نہیں کیجئے گا، نہ ہی جاب چھوڑنے کی ضرورت ہے جس طرح زندگی چل رہی تھی، اسی طرح چلائیے۔“

”زندگی؟ زندگی ہے کہاں اور اگر ہو بھی تو پہلے جیسی کہاں؟ مجھے تو خود اپنے آپ کا سامنا کرنے میں شرم آ رہی ہے، دنیا والوں کا سامنا کیسے کروں گی؟“ رابعہ کا دل پھر کر لائے لگا۔

”یہ رکھ لیں، کرائے کے لیے!“ خضر نے اپنا والٹ نکال کر دو تین لال نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ اس

نے خاموشی سے وہ نوٹ تھام لیے خضر اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک وہ ویگن میں سوار نہیں ہو گئی۔ اسے نہیں معلوم وہ گھر تک کیسے پہنچی، بس ایک آگ سی جسم و جان میں لگی ہوئی تھی جس کی اذیت جھیلنے ہوئے وہ گھر پہنچ گئی، اندر کی آگ پھیلنے پھیلنے باہر تک آگئی تھی۔ رات ہونے تک اس کا پورا جسم شدید بخار میں جھلس رہا تھا۔ سر تھا کہ الگ درد سے پھٹا جا رہا تھا، اس بخار اور سردی نے اس کے بستے ہوئے آنسوؤں کی لاج رکھ لی۔

بمشکل ایک بسکٹ کھا کر اس نے چائے کے ساتھ ٹیبلٹ نکلی اور پھر لیٹ گئی۔ اگلے دن شام میں اس کی سانس دور کر عالیہ آنٹی اس سے ملنے آگئی تھیں، ان کا گھر یہاں سے بس ایک اسٹاپ آگے تھا۔

”مجھے پتا چلا تم بیمار ہو، میں نے سوچا دیکھ آؤں۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر رابعہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ جو انہیں دیکھ کر انھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ امی مغرب کی نماز پڑھنے اٹھ گئی تھیں۔

”رابعہ! یہ خضر بیٹے نے آپ کی ایک امانت دی ہے آپ پرسوں فیکٹری میں بھول گئی تھیں۔“ انہوں نے ایک پیکٹ رابعہ کو دیا۔

”خضر بھائی کو میرا شکریہ کہیے گا۔“ رابعہ نے ایک جبری مگر پھکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

”میں تو کہہ دوں گی مگر تم خود اپنے منہ سے کہو گی تو اچھا لگے گا۔ اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور فیکٹری آنا شروع کر دو۔“ انہوں نے پیار سے اس کے گلے تھپتھپائے، امی نماز پڑھ کر آئیں تو کچھ دیر اور امی سے باتیں کر کے وہ رخصت ہو گئیں، چلتے چلتے وہ اس گھرانے کو ایک خوش خبری دے گئی تھیں۔

”ناکامی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے مگر اس کے لیے جو جدوجہد کرنا جانتا ہو اور ناامیدی کے لفظ سے نا آشنا ہو۔“

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan
a Complete Set of
5 Painting Books
in English



Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

آپ آرٹ کے طالب علم ہیں یا پروفیشنل آرٹ
برش چلانے سے مکمل پینٹنگ تک آپ بن سکتے
ہیں ایک مکمل آرٹ

اب پینٹنگ سیکھنا بہت آسان ایک ایسی کتاب
جس میں پینٹنگ سے متعلق ساری معلومات



Art With You

شائع ہو گئی ہے

قیمت - 350/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

محبت جس کی تلاش میں جس کی چاہ میں دنیا کا ہر
انسان رہتا ہے، عجیب و غریب جذبہ ہے جس میں
ہم کر انسان بھی شیطان کا روپ دھار کر پستیوں میں
گر جاتا ہے اور کبھی اس اعلیٰ و ارفع جذبے کو پاکیزگی
اور خلوص سے ملنے کے ساتھ اپنے دل اور زندگی میں
شامل کر لے تو فرشتوں سے بھی افضل ہو کر قرب الہی
حاصل کر لیتا ہے۔

محبت کے کئی روپ کئی شکلیں ہیں، کئی انداز کئی
طریقے ہیں۔ مگر بد قسمتی سے دنیا بھر سمیت ہمارے
معاشرے میں بھی محبت کے ایک ہی روپ کو زیادہ
پورٹریٹ کیا جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا ہو کر الیکٹرونک میڈیا
اسی روپ کو گلیمرائز کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

محبت کے ایک روپ سے مجھے میرے والدین نے
روشن کر دیا۔ بہت بچپن کا یاد نہیں، مگر جب سے
ہوش سنبھالا، یہی دیکھا کہ امی بابا کسی کی تعلیم مکمل
کرنے میں مدد کر رہے ہیں کسی گھرانے کی کفالت کر
رہے ہیں، کسی کی شادی کا مسئلہ ہے۔ روزگار کا گھریلو
لامنی جھگڑے ہیں یا کچھ اور معاملات، وہ بساط بھر ہر
ایک کی مدد کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔

بابا کہا کرتے تھے، مخلوق خدا کے کام آنا عبادت ہے
یہی اصل محبت ہے اور خدا کی محبت پانے کا ذریعہ بھی
جیسے جیسے ہم بسن بھائی بڑے ہوتے گئے اس رنگ میں
رنگتے گئے جس میں ہمارے والدین رنگے ہوئے تھے۔

یہ راہ آسان نہیں بہت مشکلات بھی آتی ہیں اور
مصائب بھی، کبھی کوئی نیکی الٹی ایسے اپنے گلے پڑ جاتی
ہے کہ ہم خود گناہ گار بن جاتے ہیں، مگر بقول امی نیت
صاف، منزل آسان، تو خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہر
امتحان سے سرخرو کیا۔ جب شروع کی تو اپنا کام یہاں
بھی جاری رکھا، داسے، درے، سنے، جس کے لیے جتنا
ہوسکا کیا اور اس سفر میں اکیلا نہیں بلکہ مختلف
حوالوں سے کئی محیر حضرات کا تعاون بھی شامل ہے۔

میں جس گارمنٹ فیکٹری میں ہوں، یہاں بھی

اپنی نوکری مزید جاری نہ رکھے بلکہ چھوڑ دے۔
”اب تو تمہارے ابو کام کر رہے ہیں ضرورت ہے بلاوجہ خود کو بھگانے کی، دیکھو تو پھر
دن میں کیسا ذرا سامنے نکل آیا!“ وہ فکر مندی سے اس
کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے چارپانچ دن نہیں بلکہ چار
پانچ صدیاں گزر گئی ہوں جسم و جان ایسی مشکل اور
ازیت سے چورتے جیسے بہت سی طویل سفر ایلیمپیا گیا ہو
اپنا آپ اندر سے خالی خالی لگ رہا تھا جسے خوابوں کے
ساتھ دل بھی کسی نے نوج کر پھینک دیا ہو جیسے
خواہشوں کے ساتھ روح بھی کسی نے کھینچ کر نکال لی
ہو۔

پھوپھی نے اپنے کہنے کے مطابق خاندان اور
برادری کے بڑوں کی پنجائیت بٹھائی تھی، مگر بیچوں کا
فیصلہ ان کے خلاف تھا، سب کے ہی علم میں تھا کہ ان
کے بیٹے نے دوبارہ نشہ شروع کر دیا ہے اور نشے کی لبت
میں گرفتار شخص پھر کسی اور کام کے قابل نہیں رہتا۔
ایسے شخص کے ہاتھ میں کون اپنی بیٹی کا ہاتھ دتا؟
پھوپھی اور ان کے گھروالے اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔
برادری کے بڑوں نے فیصلہ سنا کر اسی وقت طلاق
کی کارروائی بھی مکمل کروائی تھی۔ ثانیہ اور گھروالے
سجدہ شکر بجالائے تھے، انہوں نے اللہ سے مدد مانگی تھی
اور اللہ نے ایسی مدد کی اور ایسے راستے کھولے کہ وہ خود
بھی حیران رہ گئے۔ اس دن فیکٹری سے جو آتی تھی
تھیں وہ اپنے بھانجے کے لیے لڑکی کی تلاش میں
تھیں، انہیں محض نے ثانیہ کو دیکھنے بھیجا تھا۔ انہوں
نے دوبارہ آنے کا عندیہ دیا تھا، ان کے بسن بہنوئی فوت
ہو چکے تھے بھانجے کو انہوں نے ہی پالا پوسا تھا۔ اب وہ
اپنے شوہر کے ساتھ چھٹی کے دن آنے والی تھیں۔
”خضر بھائی کو ثانیہ کے بارے میں یا ہمارے گھر
کے حالات کے بارے میں کیسے پتا چلا؟“ رابعہ سنا

سوچ کر پریشان تھی۔
اپنی نوکری مزید جاری نہ رکھے بلکہ چھوڑ دے۔
”اب تو تمہارے ابو کام کر رہے ہیں ضرورت ہے بلاوجہ خود کو بھگانے کی، دیکھو تو پھر
دن میں کیسا ذرا سامنے نکل آیا!“ وہ فکر مندی سے اس
کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

میں ناامید نہیں ہونا چاہتی مگر کیا کروں، زندگی جیسے
کوئی بند گلی ہے، راستہ ختم، قدم ختم گئے، پلٹنا بھی
ممکن نہیں، آگے بڑھنا بھی مشکل، کیا کریں، کہاں
جائیں۔ ابو نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ میٹرک تک پڑھائی
بہت ہے۔

کلج جانا کوئی ضروری نہیں تو میرا یہ خواب خواب
ہی رہے گا۔
ہاں مگر ایک چھوٹی سی کھڑکی امید کی کھلی ہے۔ امی
نے کہا ہے کہ وہ میرے برائے پڑھنے کے لیے ابو کو
راضی کر لیں گی۔ اچھا تو جب سارے سارے ایک
ایک کر کے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جائیں تو اللہ کا
سہارا اور آسرا تو ہمارے لیے ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس
سے خوب صورت احساس بھلا اور کیا ہو گا۔

”محبت کی تہلی ہر ایک کے ہاتھ میں نہیں آتی مگر
جس کی ہتھیالیوں میں قید ہو جائے وہ سر تلاء و لکش
رنگوں میں سج جاتا ہے۔ میری ہتھیالیاں اس تہلی کے
حصول کے لیے پھیلی ہیں۔“

خوشی، غمی، اداسی، خواب، آنسو، مسکراہٹیں، ہر
صفحے پر کچھ نہ کچھ بکھرا تھا خضر بڑھتا جا رہا تھا اور کبھی
مسکرا دیتا، کبھی سنجیدہ ہو جاتا۔

کسی کے نئی احساسات اور خیالات پڑھنے کی غیر
اخلاقی حرکت وہ کبھی نہ کرتا مگر بس ایک خیال، بلکہ
ایک خواہش نے اس سے یہ ڈائری پڑھوائی تھی۔

اپنے پرس کے ساتھ اپنی ڈائری دیکھ کر وہ حیران اور
پھر پریشان ہو گئی۔ گھر کے ہر کونے کھد رے میں اس
ڈائری کو ڈھونڈنے میں ناکام ہوئی تو فاتحہ پڑھ کر دوسری
ڈائری بنالی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید غلطی سے وہ ڈائری
ردی میں بک گئی ہے۔ مگر یہ خضر بھائی کے پاس کیسے
آئی؟ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی مگر کوئی برا نہیں مل رہا
تھا۔

چار دن بعد بخار کا زور کچھ ٹوٹا تھا۔ مگر کمزوری اور
نفاہت ابھی باقی تھی۔ امی تو منع کر رہی تھیں کہ اب وہ

لوگوں کے وہی مسائل ہیں، مگر لڑکیوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے، مجبوری میں گھر سے نکل کر کام کرنے والی ہر لڑکی کرپٹ نہیں ہوتی مگر ہر لڑکی کی آنکھوں میں کچھ خواب اور دل میں معصوم سی تمنائیں ہوتی ضرور ہیں۔ ان بھولی بھالی چیزوں کی سادگی اور معصومیت کا شکار کرنے والے بہت سے شکاری ناگ میں رہتے ہیں کہ کوئی چیز ان کے جال میں پھنس جائے اور محبت کا جال ایک ایسا جال ہے جو عموماً لڑکیوں کو فریب خوردہ کر دیتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اس جال کی طرف بڑھی چلی آتی ہیں۔

بے شک محبت کا نام لینے والا یا محبت کرنے والا ہر شخص شکاری نہیں ہوتا مگر پھر بھی عفان جیسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے مذموم مقاصد اور اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے محبت کے نام پر لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں، ان کا شکار کرتے ہیں انہیں برباد کرتے ہیں یہاں معصوم لڑکیوں کو عفان اور اس جیسے لڑکوں سے بچانا میری ترجیح تھی۔ اس کام میں یہیں نوکری کرنے والی دو تین خواتین میری مددگار تھیں۔

رابعہ کا معاملہ جدا تھا۔ عفان تو خیر اپنے کھیل میں ماہر کھلاڑی تھا مگر رابعہ اتنی محتاط رہی کہ فریبہ آنٹی تک کو اپنا راز دار نہ بنایا جن کے وہ بہت قریب تھی اور اپنی ہر بات شیر کرتی تھی۔ بہت بعد میں جا کر مجھے علم ہوا کہ عفان آج کل جس نئے پرندہ کو جال میں پھنسا رہا ہے وہ رابعہ ہے۔ خیر رابعہ بچ گئی مگر اسے جو ذہنی دھچکا لگا ہے اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔

رابعہ کو میں بچپن سے جانتا ہوں، ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ پھر ہم وہاں سے شفٹ کر گئے رابعہ کو میں بچپن سے دیکھتا چلا آیا ہوں مگر دل میں کبھی کسی خاص جذبے نے سر نہیں اٹھایا۔ ہاں مگر جب بھی کسی باتوں باتوں میں اس کی شخصیت اور کردار کے روشن پہلو سامنے آتے، دل میں اس کے لیے پسندیدگی کا تاثر بھی آتا۔

جو لڑکی پورا موسم گرما لان کے دو جوڑوں میں نکال دے تاکہ اپنے بیمار باپ کو پابندی سے دوائیاں فراہم کر

سکے، گھر کی معاشی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی ضروریات پس پشت ڈال دے۔ ایسی لڑکی بڑی محبت اور ایثار کے جذبوں سے گندھی ہوئی ہوگی۔ سادگی اور سچائی، خلوص اور ایثار دل میں خود بخود جگہ بنا لیتے ہیں پتا نہیں کب اور کیسے وہ میرے دل میں اتر گئی۔ احساس ہوا تو تب جب اسے سوچنا اچھا لگا۔ جب کبھی اس پر نظر پڑتی، ایک بے حد نرم اور دلنشیں سا احساس دل کو چھو لیتا اور یہ دل کیا کہوں واقعی بڑا بے ایمان ہوتا ہے اچھا خیر یہاں تک تو کمال شاید ٹھیک ٹھاک ہی چل رہی تھی۔ بڑا صاف اور سیدھا معاملہ لگا مجھے، لڑکی اچھی ہے۔ اچھی لگی۔ بڑوں تک بات پہنچا دو اور بات بڑوں تک پہنچانے ہی والا تھا، وہ ایک گرم سی دوپہر تھی، بے زار کروینے والی، خشک اور بے مہر، جب میرے راز دار اور سب سے اچھے دوست عامر کی کال آئی۔

”یار! عفان کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھا ہے میں نے۔ بانیگ یہ جاری تھی اس کے ساتھ۔“ اس نے بغیر کسی تمہید کے اطلاع دی۔

”کون؟“ میرے منہ سے بے اختیار سوال نکلا۔ ”مجھے لگا کہ وہ رابعہ ہے۔“ عامر نے جھنجھکے ہوئے کہا۔

”رابعہ؟“ مجھے اک دم شاک لگا مجھے بالکل بھی علم نہیں تھا نہ ہی امید کہ اس بار عفان کا تاثر گٹ رابعہ ہے۔ میری رابعہ جو دھیرے دھیرے مجھے کتنی عزیز ہو گئی تھی۔

”اے، بے وقوف لڑکی۔“ میں سر تھام کر رہ گیا پھر میں نے بغیر وقت ضائع کیے، عفان کے فلیٹ کی طرف موٹر سائیکل دوڑا دی۔ راستے میں میں نے عفان کو کئی بار ٹرائی کیا مگر اس کا سیل آف ملا۔ بہت بعد جب میں اس کے فلیٹ کے قریب پہنچا تو وہ مجھے سے ہی نظر آگئی، سڑک کنارے تنہا، ایک ایسے جگہ سے ہارے لئے، بے مسافر کی طرح، جس کا سارا زور اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ چکا ہو اور وہ خوف زدہ اکیلا اپنے بچوں کو کھڑا سوچ رہا ہو کہ اب کیا کرے۔

وہ خزاں کی ایک اداس اداس سی شام تھی جب خضر کی امی اور بھانجی رابعہ کے گھر آئیں اور ان کے جانے کے بعد وہ خزاں آلود شام یکا یک بہار کی گلابی، سہانی سی شام میں بدل گئی تھی۔

”مولی! سوچنا اچھا لگا؟“ اس نے بے اختیار سوچا اور یہی سوال اس نے خضر سے کیا تھا۔ ”میں فرشتہ نہیں ہوں رابعہ! مگر اتنا سمجھتا ہوں کہ گناہ گار وہ ہے جو اپنے گناہوں پر اصرار کرے گناہ یہ باوم ہو کر اسے چھوڑنے والا، گناہ گار نہیں ہوتا۔“ خضر نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”کبھی طعنہ تو نہیں دیں گے؟“ رابعہ کا خوف ٹھیک سے دور نہیں ہوا تھا۔

”ایک شے ہوتی ہے یقیناً ایک چیز ہوتا ہے اعتبار۔ خاتون! اپنے دل اور زندگی میں انہیں مرکزی جگہ دے دیں۔ ہر قسم کے شکوک و شبہات اور خدشات کو دل سے نکال دیں۔ جگہ خالی ہوگی تو یقین اور اعتبار جھٹ پٹ آکر راجحان ہو جائیں گے۔“ خضر تلقین کر رہا تھا بے اختیار مسکرا رہی تھی۔

”آپ نصیحتیں بہت کرتے ہیں بزرگوں کی طرح۔“

”جی نہیں۔ میں ڈانٹا گز بھی بول سکتا ہوں۔“ نو جوانوں کی طرح۔ ”خضر نے روائی میں بالکل اس کی ٹون میں کہا۔ وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔

”اچھا پھر جلدی سے بتاؤ، ہنسی مون کے لیے کہاں جانا پسند کرو گی؟“

”آپ اور ایسی باتیں!“ رابعہ کا چہرہ گلابی ہونے لگا تھا۔

”کچھ مہمانوں نے مولوی صاحب کا لقب ضرور دیا ہوا ہے مگر زاہد خشک نہیں ہوں۔ سننے میں ایک عدد دل اور منہ میں ایک عدد زبان، ہم بھی رکھتے ہیں۔“ خضر نے تھمبا کر آواز اور انداز دونوں ہی شگفتہ تھے۔

”اچھا، پھر بعد میں بات کریں گے۔“ رابعہ نے اس کے تیور دیکھ کر گھبرا کر بلکہ شرما کر فون بند کرنا چاہا۔ ”بعد میں کب؟ شادی کے بعد؟“

”جی۔“ ”ٹھیک ہے معزز خاتون، چھ ماہ انتظار کریں گے۔“ خضر شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے جھٹ سے مان گیا۔

”یہ تو میں نے اپنی تسلی کے لیے فون کیا تھا آپ کو۔“ رابعہ نے وضاحت کی۔

”ہو گئی تسلی؟“

”جی۔“ ”ایک گزارش کروں؟“

”اپنے یہ جی“ بچا کر رکھیں، قاضی صاحب کے سامنے کام آئیں گے رابعہ! تم میرے لیے بہت اہم، بہت خاص ہو۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“ اچانک خضر مکمل سنجیدگی سے بولا تھا۔

”مجھے اعتبار ہے آپ پر بھی اور آپ کی باتوں پر بھی۔“ رابعہ نے بالکل سچے دل سے کہا تھا۔ اس کی آواز رندھنے لگی تھی۔ اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

”اتنی محبت، اتنی عزت، میں بھلا اس قابل کہاں تھی۔“

اسے رونا آ رہا تھا۔ اپنے رب کی بے پایاں رحمت پر۔ اس کی توقع سے، اس کی سوچ سے، اس کی دعاؤں سے کہیں زیادہ اسے مل رہا تھا۔

رابعہ رو رہی تھی مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔ تشکر کے تھے۔





وہ اپنا آخری پیریڈ لے کر کلاس سے باہر نکلی ہی تھیں جب ان کا سیل بج اٹھا۔ معین کا نمبر دیکھ کر پہلے ان کے چہرے کے زاویے بگڑے تھے پھر انتہائی کوفت سے انہوں نے کال اینڈ کی۔ دوسری جانب سے حسب معمول مدعا بیان کیا گیا تھا۔

”آپ! گھر آجاؤ۔ صبح سے بھوکا بیٹھا ہوں، سارے کام ادھورے پڑے ہیں۔ وہ لارڈ صاحب تو تک سک سے تیار ہو کر نکل گئے۔“ یہ اشارہ ولید کی سمت تھا۔ مہر النساء کا سر گھومنے لگا۔ ابھی تو وہ آخری پیریڈ میں بیٹھی سوچ رہی تھیں، برتن کب دھونے ہیں، مشین کب لگانی ہے، پھر گھر کی صفائی، کھانا پکانا، ابھی تو ان کے اپنے سارے کام جوں کے توں پڑے ہوئے تھے کجا کہ وہ پہلے ان کا کام نبھانے جاتیں۔

اور پھر یہ تو روز کا مسئلہ تھا جب سے ان کی امی کی وفات ہوئی تھی، دونوں بھائیوں نے یہی ڈراما چار کھا تھا۔

”شہزادی سے کہو، وہ آکر کام کر جائے پاس ہی تو ہے۔“ انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کا نام لیا۔ دونوں کے گھروں میں چار گلیوں کا ہی فاصلہ تھا۔

وہ خود گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھیں۔ بچوں کے ساتھ گھر اور نوکری کو ہی انہوں نے بمشکل سنبھال رکھا تھا اب تیسرا بکھیرا وہ نہیں پال سکتی تھیں۔

”اس کے سسرال میں شادی ہے کسی کی وہ گاؤں گئی ہے۔“

معین نے قدرے جھنجھلا کر کہا تھا۔ آپا کی بحث اس کا بی بی ہائی ہو رہا تھا۔ دوبار پر اٹھانے کی کوشش کی تھی اور جانے کون کون سے نقشے معرض وجود میں آئے تھے۔ چکن تورمہ بنانے کے چکر میں جو گوشت پریش میں پکنے کے لیے رکھا تھا۔ وہ الگ جل کر سواہر تھا واشنگ مشین میں کپڑے دھوتے ہوئے دوغی شریٹس کا رنگ ایک دوسرے پر چڑھ چکا تھا۔

”کتی بار کہا ہے تم سے شادی کرلو۔ ہمیں بھی کبھی گھر کا دروازہ کھلا ملے۔ ہماری بھی کوئی تواضع کرے والا موجود ہو۔“

”یہ ذمہ داری بھی میں نے آپ کو سونپ رکھی ہے۔ اب آپ خود ہی اتنی ست ہیں تو کوئی کیا کرے فریج سے جوس نکال کر اس نے آپ کو تھمایا ہے ہاتھ میں پکڑنے کے بعد وہ مسلسل اسے گھورے جا رہی تھیں۔

”لڑکی تو آج مل جائے اگر تم اپنی حیثیت کے مطابق بات کرو تو۔“ انہوں نے بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

”حیثیت ہی تو بدلنا چاہتا ہوں۔“ جیب میں رکھے دس ہزار کے نوٹ اس نے دوبارہ گنتے ہوئے کہا۔

”ان دو کمروں کے گھر میں کوئی محل سے اٹھ کر نہیں آئے گی رہنے کے لیے۔“

راٹھا بٹلنے کے ساتھ ساتھ وہ اسے آئینہ بھی دیکھ رہی تھیں لیکن معین اس میں اپنا چہرہ دیکھنے کو تیار

نہیں تھا۔ سوڈھٹائی سے بولا۔
”تو نہ رہے۔ میں اس کے ساتھ محل میں رہنے چلا جاؤں گا۔“

”اس دنیا کا کوئی بھی پیسے والا شخص تم جیسے کنگلے کو اپنی بیٹی کیوں دے گا۔“ براٹھا اور آلیٹ اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے مہر النساء نے ابھرا چکائے۔
”ہو سکتا ہے اس کی بیٹی موٹی ہو، کالی ہو، جھینگلی ہو یا پھر اور کوئی نقص۔“
”بس۔“ مہر النساء نے درشتی سے ہاتھ اٹھائے۔
”بند کرو اپنی بکواس۔“ ان کا دل دہل اٹھا تھا۔

وہ اگلے تین روز تک ان کے گھر جا کر کام نمٹاتی رہی تھیں لیکن یہ کوئی مستقل مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس پر ولید الگ سے دھمکیاں دے رہا تھا۔
”اگر آپ زری کے گھر نہیں گئیں تو میں اسے بھاگ کر لے آؤں گا۔“ زری ان کے محلے میں ہی رہتی تھی۔ ولید اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر معیض کی ایک ہی شرط تھی کہ پہلے اس کی شادی ہوگی پھر ولید کی اس کے لیے وہ کئی رشتے دیکھ چکی تھیں۔ ایک دو جگہ بنی ہوئی بات بھی وہ بگاڑ چکا تھا۔

اب اس کے لیے پیسے والی لڑکیاں کہاں سے لائیں اس پر ولید کی ہٹ دھرمی۔ وہ تو ان دونوں کے چکر میں خوب گھن چکر رہی ہوئی تھیں۔

”مما! میں نے کپڑے استری کر دیے ہیں۔“

صبا کی اطلاع پر انہیں خیال آیا تھا کہ آج انہیں اپنی جھٹائی کے گھر منتقلی پر جانا تھا۔ ان کی چھوٹی بیٹی کی منتقلی تھی۔ وہاں سے واپس آئیں۔ بڑی بیٹی حرا کی صورت بار بار آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ آج اس نے لائٹ فیوزی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا جس میں اس کی کندن جیسی رنگت دکھ رہی تھی۔

”کتنی خوب صورت ہے اور قسمت دیکھو اتنی ہی خراب۔“ کالونی کی عورتیں اسے دیکھ کر مختلف تبصرے کر رہی تھیں۔ ایک آدھ ان کی سماعتوں سے

بھی ٹکرا گیا۔ منورہ بھابھی بھی اکثر اس کے متعلق سوچ کر آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ حرا بچپن میں پولیو کا شکار ہو گئی تھی۔ بہت علاج کروایا لیکن ایک پاؤں میں تھوڑا سا لنگ رہ گیا تھا اور دائیں ہاتھ کی مٹھی بند رہی تھی۔ اس میں جان تو تھی لیکن خون گردش نہیں کرتا تھا۔

کتنے ہی رشتے اس کے آئے تھے لیکن جس قدر نقص کی بنیاد پر پھر کوئی پلٹ کر نہیں آتا تھا۔ اب انہوں نے مجبور ہو کر چھوٹی بیٹی کی منتقلی کر دی تھی۔
”ہو سکتا ہے ان کی بیٹی موٹی ہو، کالی ہو، جھینگلی ہو یا پھر کوئی اور نقص۔“ اچانک معیض کی آواز کی بازگشت ان کے کانوں میں گونجی اور وہ ایک خیال کے تحت اٹھ بیٹھیں۔

”معیض اور حرا۔“ ایک نئی سوچ نے ان کے اندر سر ابھارا تھا۔ ان کے میاں امین اور جمیل دو ہی بھائی تھے اور ان کی بھی اپنی جھٹائی سے اچھی بنتی تھی۔ اس رشتے سے ان کے دو فائدے ہونے والے تھے۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کے مزید قریب آجائے۔ سسرال میں واہ واہ ہو جاتی اور معیض کو امیر لڑکی مل جاتی تو ولید کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ اسی وقت انہوں نے امین سے مشورہ کر لیا۔ وہ سن کر نہ صرف بہت خوش ہوئے تھے بلکہ ان کے دل میں مہر النساء کا مقام اور بڑھ گیا تھا۔

”تمہارا دیاغ تو درست ہے۔“ شہزادی تو سنتے ہی بھڑک اٹھی تھی۔

”ہمارے بھائی کے لیے ساری دنیا میں ایک وہی رہ گئی ہے۔“ اس کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ آخر مہر النساء نے ایسا سوچا بھی کیسے تھا۔ اس پر بچوں نے الگ اودھم مچا رکھا تھا۔

”مما! حرا باجی تو اتنی سڑل سی ہیں۔ ان سے تو ماموں کی شادی ہرگز نہیں ہوگی۔“ یہ صبا بھی ان کی سب سے بڑی بیٹی۔

”تو اور کیا مجال ہے جو کبھی انہوں نے ہم سے جدھے منہ بات کی ہو۔“ زینب نے فوراً تائید کی۔
”ایک بار میں نے ان کا فریق کھولا تھا۔ اتنا ڈانٹا مجھے۔“ مہم نے منہ بسورا۔

”مہم بچوں کو کس نے اجازت دی ہے کہ بیوی کی باتوں میں دخل اندازی کرو۔“ اتنے سارے اعتراضات سن کر مہر النساء کا دل غ گھوم گیا تھا۔ انہوں نے بچوں کو ڈانٹ کر چپ کر لیا، پھر شہزادی کی سمت متوجہ ہوئیں۔

”دیکھو! اب نہ تو امی حیات ہیں نہ ابو بھائی ہمارے دل رہے ہیں۔ ہم ان کے متعلق نہیں سوچیں گے تو کون سوچے گا اور وہ جو معیض شرط عائد کر کے بیٹھا ہے کہ شادی کروں گا تو کسی امیر لڑکی سے تو خود سوچو! دس ہزار تنخواہ پانے والے ملازم کو کون پیسے والا اپنی بیٹی سے گا اور ولید کے متعلق تو سوچ سوچ کر مجھے ہول لگتے ہیں۔ تین بھائی ہیں زری کے۔ کچھ التائید ہا کر پاؤں کیا وہ چھوڑ دے گا۔“

”وہ سب تو تھیک ہے لیکن ایک بات کی طرف غلط فہمی نے غور نہیں کیا۔“ شہزادی کا انداز سنجیدگی سے ہوئے تھا۔ مہر النساء نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ تمہارے جیٹھ کی بیٹی ہے، وہ سڑ۔“
”ارے بھئی! وہ اچھے سلجھے ہوئے بڑھے لکھے لوگ ہیں۔ تم یہ نیا شوشہ مت چھوڑو اور شیرس کو فون کرو اسے مطلع کرنا بھی تو ضروری ہے۔“ شیرس ان کی سب سے چھوٹی بہن تھیں جو بیاہ کر اسلام آباد سدھار چکی تھیں۔ شہزادی نے بے دلی سے نمبر ملا کر فون پر انہیں کو پکڑا دیا۔ وہ بھی پہلے تو سن کر خوب بولی تھی مگر پھر مہر النساء اور شہزادی کے سمجھانے پر مان گئی۔ ولید کی تو اس معاملے میں کوئی رائے ہی نہیں تھی البتہ معیض فوراً مان گیا تھا۔

منورہ بھابھی ان کی بے حد مشکور اور احسان مند تھیں جو انہوں نے ان کی بیٹی کے لیے دست سوال دراز کیا تھا۔

”زیادہ کھٹ راگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس سادگی سے ہی نکاح کر لیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ لڑکے پر کوئی قرض وغیرہ کا معاملہ ہو۔“ جمیل بھائی نے ان کی دوسری شکل بھی آسان کر دی تھی لیکن معیض نے دو ماہ کے لیے انہیں ٹال دیا تھا۔

”کب کرے گا معیض شادی؟ کل بھی بھائی صاحب پوچھ رہے تھے۔ اتنا شرمندہ ہونا پڑا مجھے ان کے سامنے۔ اب تو منتقلی کو بھی پانچ ماہ ہو چکے ہیں۔“

امین صبح و شام ان سے پوچھتا نہیں بھولتے تھے۔ وہ خود بھی اب اس معاملے کو ٹالتے ٹالتے تھکنے لگی تھیں۔ آخر معیض کیا چاہتا ہے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ کل اسکول سے واپسی پر شہزادی کو لے کر گھر جائیں گی۔

”کہاں سے کروں شادی۔ ایک دھیلا نہیں ہے میرے پاس۔ تمہیں اگر اتنی ہی جلدی ہے تو اپنے پاس سے کر دو ورنہ ان سے کہہ دو ڈھائی تین سال تک انتظار کریں۔“ وہ نکا سا جواب دے کر نکل گیا تھا گھر سے باہر۔

”یہ شروع سے ہی کمینہ ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ سے ہی دوسروں کی جیب پر ہوتی ہے۔ ابھی ایک ہفتہ قبل اس کی کمینہ نکلی ہے پچاس ہزار کی لیکن اب تم رشتہ کروا کر پھنسی ہوئی ہو تو فائدہ اٹھائے گا۔“ ولید اس کے جاتے ہی اپنی بھڑاس نکالنا شروع ہو چکا تھا۔ شہزادی نے اپنے بیگ سے دس ہزار نکال کر رکھ دیے۔

”اب وہ تو دے گا نہیں تو سب مل ملا کر ہی کر لو۔“ مہر النساء نے پریشانی سے ولید کو دیکھا تو اس نے بھی چندہ ہزار لا کر دے دیے۔ شیرس نے دس ہزار کے علاوہ اسے انگوٹھی بھی پہنائی تھی جبکہ باقی کے تمام اخراجات انہیں اپنی جیب سے ادا کرنے پڑے تھے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی تھی۔ ان کے بھائی کا گھر بس رہا تھا۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

”تمہارے اکاؤنٹ سے پچاس ہزار کی رقم غائب ہے؟“ امین چیک بک ہاتھ میں لیے ان سے دریافت کر رہے تھے۔

”ہاں وہ معیض کی شادی میں خرچ ہو گئے۔“ وہ کپڑے استری کر رہی تھیں، سو مصروف سا جواب دیا جالا تک اس رقم کے لیے وہ ان کے سامنے جوابدہ نہیں تھیں۔ وہ بیسے ان کے اپنے تھے اور آج سے قبل انہوں نے کبھی ان سے سوال و جواب نہیں کیے تھے مگر آج جانے کیوں پوچھ رہے تھے۔

”اپنے بھائی کی شادی میں تم نے پچاس ہزار لٹا دیے اور میرے بھائے کے گھر دو ہزار پکڑا کر چلی آئیں۔“ مہر النساء نے پہلی بار انہیں اتنا غصے میں دیکھا تھا۔

”وہ پیسے میں نے حرا کی شاپنگ میں ہی خرچ کیے ہیں۔“ استری کا بیگ نکال کر وہ رمان سے بولیں۔

”ہاں تو کیے تو اپنے بھائی کی طرف سما۔ اب میں بھی حرا کو تحفے میں پچاس ہزار دوں گا جب بھابھی نے شکایت کی میری تو نظری نہیں اٹھ رہی تھی۔“ تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے مگر مہر النساء کی سوتی تو بھابھی پر ہی اٹک گئی تھی۔ پہلی بار بھابھی نے ان کی شکایت لگائی تھی۔ پہلی بار وہ ان سے جھگڑے تھے۔

انہیں اچانک ہی بھابھی پر بے حد غصہ آیا تھا۔ ”اور یہ تم اور شہزادی کیا آئے روز میکے چلی جاتی ہو۔ قریب رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے سر سے ہی نہ اترو۔“ اگلا حملہ اور بھی زور آور تھا۔ وہ کب بھلا اتنا جاتی تھیں لیکن یہ بھی بھابھی نے ہی کہا ہو گا۔ وہ اتنا پریشان ہو چکی تھیں کہ مزید کوئی کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ شہزادی کو فون کیا تو اس کے پاس سنانے کو مزید بہت کچھ تھا۔

”آج گئی تھی میں معیض کی طرف۔ حرا تو میرے پاس بیٹھی ہی نہیں۔ ایک کب چائے تک نہیں

پوچھا۔ گھر بھی اتنا گند اہو رہا تھا ساری صفائی کر کے آئی ہوں۔ فصیحہ تو میری اس سے اتنا ڈرتی ہے کہ کل اسکول سے واپسی پر کہہ رہی تھی۔ ماموں کے گھر جاؤں گی اور پورا گھنٹہ گلی میں بیٹھ کر آگئی۔ اندر نہیں گئی۔ اس ڈر سے کہ مای گھر سے نکال دیں گی۔“

”اچھا شہزادی! مجھے روٹیاں بنانی ہیں پھر بات کروں گی۔“ انہوں نے فون ہی بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دو ماہ بعد ولید کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ زری کو وہ بچپن سے جانتی تھیں۔ اچھی سلجھی ہوئی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ جلد ہی اس نے اپنی نرم خوبی، محبت اور خوش اخلاقی سے سب کا دل جیت لیا تھا۔ حرا کی البتہ وہی حرکتیں تھیں۔ محترمہ کو کمرے میں جا کر سلام کرنا پڑتا تھا خود سے آنے کی زحمت اسے گوارا نہیں تھی۔

”میری بیوی کیا ملازمہ ہے جو سب کام وہی کرے۔“ ایک روز ولید ان سے کہہ رہا تھا۔ وہ حیران ہوئیں۔ ”کیوں ہم نے تو کام دونوں میں برابر کے تقسیم کیے تھے۔“ کچن سارا حرا کے ذمے تھا، باقی صفائی، کپڑے وغیرہ زری کی ذمہ داری تھے۔

”زری تو اپنا کام مکمل کرتی ہے لیکن اس نے پہلے ہی دن سنا دیا تھا کہ معیض کام پہ لیٹ جاتا ہے۔ اس لیے تم اپنا اور ولید کا ناشا خود بنانا حالانکہ ہمارا ٹیکسٹری جانے کا وقت ایک ہی ہے پھر اس نے صبح کے برتن دھوئے چھوڑے۔ اس سے اگلے روز دوپہر کے بھی زری نے کہا، چلو کوئی بات نہیں۔ تم شام کے دھو دیا کرو اور اب وہ شام کے بھی نہیں دھوتی۔ سالن پکانے کے بعد اپنی اور معیض کی روٹی بنا کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے سارے ماسیوں والے کام تم نے زری کے ذمے لگائے ہوئے ہیں۔ صفائی، کپڑے، برتن اور وہ تنگ صاحبہ کی طرح کچن میں ہانڈی بنا کر فارغ۔“

”اچھا میں معیض سے بات کروں گی۔“ فی الحال تو انہوں نے ولید کو ٹالا تھا۔ لیکن اگلے روز شام کو معیض

چکر لگانے آیا تو انہوں نے پکڑ کر بٹھالیا اور ولید کی ساری شکایتیں من و عنان اس کے سامنے دوہرا دی۔ پہلے تو وہ سن کر خاموش رہا پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”میں نے ہی اسے زیادہ کام کرنے سے منع کیا ہے، تم تو جانتی ہو اس کا ایک ہاتھ بند رہتا ہے۔ وہ کہاں اتنے بکھیرے سنبھال سکتی ہے۔“

”تم بھول رہے ہو کہ دو سال سے اس نے اپنا سارا گھر سنبھالا ہوا تھا اور اسے ہر کام کرنے کی پریکٹس ہے۔“

”ہاں لیکن ان کے گھر صفائی، کپڑے اور برتنوں کے لیے نوکر تھے۔“

”تو ایک آدھ نوکر ساتھ کیوں نہیں بھیج دیا۔“ وہ بددلتے ہوئے اٹھ گئیں۔

ان کا دل حرا کے لیے بہت برا ہو چکا تھا۔ وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو برہا چڑھا کر اپنے گھر والوں کو سناتی تھی اور بھائی صاحبہ

کر امین صاحب کو بھڑکاتے تھے اور جھگڑا ان کے گھر شروع ہو جاتا تھا۔ ابھی بھی انہوں نے معیض کو گھر سے نکلنے دیکھا تھا اور بس انہیں گھر کر بیٹھ گئے تھے۔

”کیا بیٹیاں پڑھا رہی تھیں معیض کو حرا کے خلاف؟“

”میں نے کیا کہنا ہے۔“ وہ ایک دم سے بھڑک اٹھیں۔

”نوکر کی بات تو میں نے خود سنی ہے۔ کبھی تم کہتی ہو کہ اپنے سسرال والوں سے کہو، تمہیں کوئی کاروبار شروع کروادیں یا بیرون ملک بھجواؤں۔ اب نوکر رکھ کر دیں۔ تمہارے نئے بھائی کے لیے نہیں کمار ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے اسے عیاشیاں کرواتے پھریں۔ پہلے ہی اپنی بیٹی کے تمام اخراجات انہوں نے خود اٹھا رکھے ہیں۔“

یقیناً وہ آج پھر منورہ بھابھی سے کلاس لے کر لوٹے تھے اور وہ سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے معیض سے ایسی کوئی بات کب کہی تھی اور بالفرض اگر وہ اپنے

داماد کو سنبھال کرتے بھی ہیں تو فائدہ ان کی بیٹی کو ہی ہونے والا تھا لیکن ان ساری وضاحتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جتنا اپنا دفاع کرتیں، انہیں اتنا ہی سنانے کا موقع ملتا تھا۔

☆ ☆ ☆

شیریں کچھ روز کے لیے رہنے آئی تھی۔ انہوں نے سوچا، وہ اسکول سے واپسی پر ہی چکر لگا آئیں، گھر جا کر پھر آتا تو مشکل ہی ہو گا مگر روزانے پر لگتا دیکھ کر سخت کوفت نے گھیرا۔

”یہ کہاں گئی۔“ کچھ دیر وہیں کھڑے ہو کر سوچا اور پھر سیل فون نکال کر شہزادی کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ اندازے کے مطابق وہ ان ہی کے گھر میں تھی۔

”میں وہاں گئی تو تم یہاں آئی ہوئی تھیں۔“ شیریں سے گلے ملتے ہوئے انہوں نے ہلکا سا اعتراض کیا مگر وہ کارٹ کھانے کو دوڑی۔

”شوق سے نہیں آئی ہوں۔“ ”پیدل میں چل کر آرہی ہوں اور گرمی تمہارے دماغ کو چڑھی ہوئی ہے۔“ پنگھاتیز کرتے ہوئے انہوں نے منہ پھلایا۔

”تو کیا خالی گھر میں بیٹھ کر کھیاں مارتی۔“ وہ مزید بھڑکی۔

”خالی گھر کیا مطلب؟“ وہ کچھ بھی نہیں تھیں۔

”رات کو آئی تھی میں۔ صبح حرا اٹھی اور تیار ہو کر میکے چلی گئی۔ جاتے ہوئے سلام تک کرنا گوارا نہیں کیا۔ ناشتے کا بھی نہیں پوچھا۔ زری کو فون کیا تو کہہ رہی تھی شام تک آجاؤں گی۔“ شہزادی نے تازہ رپورٹ پہنچائی تو مہر النساء خاموش سی ہو گئیں۔ زری کی بہن کی ممکنہ تھی۔ وہ دو روز سے میکے میں تھی۔

”چلو چھوڑو، اب کیا کریں۔ اس کی عادتیں ہی عجیب ہیں۔“

”ویسے تم منورہ بھابھی سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ اب تو حد ہی ہو چکی ہے، وہ سمجھائیں اپنی ذرا بیٹی کو۔ ہم وہاں جائیں تو اس کا منہ بن جاتا ہے۔ وہ ہی تو بھائی

ہیں ہمارے اب کیا انہیں بھی چھوڑ دیں۔ ہماری تو چلو خیر ہے لیکن شیریں تین مہینوں بعد آئی ہے اس کا تو لحاظ کرتی۔“

”ہاں میں کروں گی بات۔“ انہوں نے بھی بات کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن اس سے قبل ہی ایک اور بات ہو گئی تھی۔ امین کسی شادی میں گئے تھے وہاں سے واپسی پر انہیں فوڈ پوائزن ہو گیا۔

دو روز بعد حرا اپنی بہن مرینہ کے ساتھ چاچو کی عیادت کے لیے آئی تھی۔ شیریں ابھی تک ادھر ہی تھی اور حرا تب سے میکے میں تھی۔ اب بھی وہ میکے سے ہی آئی تھی۔ صبا نے دونوں کو کولڈ ڈرنک دی۔ تب ہی زہنب نے باتوں کے دوران ویسے ہی مرینہ سے کہہ دیا تھا۔

”مرینہ باجی! آپ کے ہاتھ کیوں اتنے سانسو لے ہو گئے ہیں؟“ اور جواباً وہ اپنی تعریفوں کے پل باندھنا شروع ہو چکی تھی۔

”ایک تو گاؤں کی آب و ہوا اس پہ اتنی بڑی فیملی۔ سارا دن کام کرتے ہی گزر جاتا ہے۔ ہر وقت مہمانوں کی آمد و رفت لگی رہتی ہے۔ وہاں تو کبھی سر کھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ ہاتھوں کا خیال کون رکھے گا۔“

”اس لحاظ سے تو پھر حرا اچھی ہے۔“ مہر النساء کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

”وہ کیسے۔“ مرینہ چونکی۔

”اس کی مندریں آئی ہیں اور یہ میکے چلی جاتی ہے۔“

وہ خود کو کہنے سے روک نہ سکی تھیں اور پھر جو زبان درازی کا مظاہرہ حرا کی جانب سے ہوا تو وہ بھی اپنا غصہ ضبط نہیں کر پائی تھیں۔ انہوں نے اگلی پچھلی ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ پل میں کمرے کا خوشگوار ماحول اتنا کشیدہ ہو گیا کہ دونوں جانے کے لیے اٹھ گئیں۔

مہر النساء نے روکا بھی نہیں تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد گھر میں ایک بار پھر سے ہنگامہ ہوا تھا۔

”آپ ہر بار مجھے ہی کیوں مورد الزام ٹھہراتے ہیں؟“ بیٹی کی زبان کے جوہر اور کروت نظر نہیں

آتے آپ کو؟ ہم سب بہن بھائیوں کو دور کر دیا ہے اس نے۔ ہمارے رشتے میں دراڑ ڈال چکی ہے۔ میں نے تو محض اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی جگہ صبا ہوئی تو اسے بھی میں ہی کہتی۔“

”تم نے اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی نظر کیا تھا اس پر۔ اگر وہ صبا کی جگہ تھی تو تم اپنی بہن اور اسے دونوں کو بٹھا کر معاملہ دریافت کرتیں۔ وہ میری عیادت کے لیے آئی تھی تم نے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکال دیا۔“

”اچھا ہے بھائی صاحب اور منورہ بھابھی کو بھی پتا چلے اپنی بیٹی کی حقیقت۔ وہاں سچ جھوٹ ملا کر مظلوم بن جاتی ہے۔ ان کو بھی ہمارے خلاف ورغلا رکھا ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی پھر اچھے بھلے اور تماشا ہمارے گھر میں ہر روز۔“

”مما ٹھیک کہہ رہی ہیں پاپا! پانچ مہینے ہو چکے ہیں آپ دونوں کو لڑتے جھگڑتے اور وہ بھی کسی اور کی وجہ سے۔ جب آپ کو یا ہمیں ممما سے کوئی شکایت نہیں ہے تو پرانے جھگڑوں کو لے کر آپس میں نہ جھگڑیں پلینز۔“ صبا آج تنگ آ کر بولی تھی مگر وہ مزید بھڑک اٹھی۔

”تمہاری ماں انوالو ہوتی ہے ہر بات میں۔“

”حرا باجی کا مزاج کس کو نہیں پتا وہ کسی کے ساتھ بنا کر رکھنے والی نہیں ہیں۔“ زہنب زیر لب بریڈروائی لیکن ان کی سماعتیں بھی کافی تیز تھیں۔

”دیکھا! بچوں کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ تم ہی سکھاتی ہو انہیں ایسی باتیں۔“ وہ ان سے حد درجہ بدگمان تھے۔

دو روز گزر چکے تھے۔ وہ سوچ رہی تھیں بھائی صاحب کی جانب سے امین کا بلاوا کیوں نہیں آیا ابھی تک جبکہ اس سے اگلے روز بچوں نے آکر ایک نئی بات سنائی تھی۔

”مما! معیذ ماموں نے فریق بند کر دیا۔ زری ہامی کی

چیزیں نکال کر باہر رکھ دیں اور ولید ماموں سے کہا ہے کہ اپنا کچن بنا لو۔ وہ ایک مہینے کے اندر اندر گھر میں دیوار اٹھا دیں گے اور فریق حرامی نے فون کر کے بند کر دیا ہے۔ ولید ماموں نیا فریق لینے گئے ہوئے ہیں۔“

حسن کی اطلاع پر مہر النساء نے ایک جتنائی ہوئی سی نگاہ امین پر ڈالی تھی۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

”حرا ایسا نہیں کر سکتی۔“ وہ ایسا کر چکی ہے۔“ مہر النساء نے کپڑوں کی سلوٹیں نکالتے ہوئے لب بھینچے۔ اندر سے ان کا دل کٹ رہا تھا۔

”تم گھر بیٹھ کر مفروضے نہ بناؤ۔ وہاں چل کر ہی اصل معاملہ دریافت ہو سکتا ہے۔“

وہ اٹھے تو مہر النساء بھی اندر سے چادر لے آئی تھیں۔ زری اور حسن کے بیان میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا لیکن امین سے حرا کا نام ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے فون کر کے بھائی صاحب کو وہیں بلوایا تھا۔ شہزادی پہلے سے وہاں موجود تھی۔

بھائی صاحب نے معیذ سے آکر پوچھا۔ تمہیں حرا نے ایسا کہا تھا تو معیذ صاف مکر گیا۔ سر کے سامنے سارا الزام خود پر لے لیا۔

”حرا نے نہیں کہا تھا۔ میں نے خود ہی فریق بند کیا تھا۔“

”لو خود سن لو۔“ امین صاحب نے فوراً مہر النساء کو گھورا۔

”ابھی دو روز قبل جو بات ہوئی مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔ مہر النساء! تم گھر میں سب سے بڑی ہو۔

بڑی مند ہونے کے ساتھ ساتھ چاچی بھی ہو۔ ساس کی جگہ بھی اب تمہاری ہی ہے۔ تمہیں اگر کوئی شکایت تھی تو ہم سے آکر کہتی۔ بچیاں تمہارے گھر عیادت کے لیے آئی تھیں۔ تمہارا ان سے بات کرنا بننا نہیں تھا۔“ بھائی صاحب کو بھی ستانے کا موقع مل گیا تھا۔

”مجھے آپ سے اور بھابھی سے ہی بات کرنا تھی لیکن اس روز بس اچانک ہی بات شروع ہو گئی اور رہی

بات معیذ کی تو یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے یہ سب حرا نے ہی کہا ہے۔ وہی ہے سارے فساد کی جڑ۔ آپ کو جانے کیا جھوٹ سچ ملا کر سناتی رہتی ہے۔ اس پر معیذ کا دماغ الگ سے خراب کر رکھا ہے جو وہ الگ ہونے کی بات کر رہا ہے۔ یہاں اگر کبھی ہم آجائیں تو دونوں میاں بیوی کا منہ پھول جاتا ہے۔ وہ تو کبھی سلام تک کرنے کمرے سے نہیں نکلتی۔ چار ماہ بعد شیریں آئی تھی اور یہ اٹھ کر میکے جا بیٹھی۔ گھر کے کاموں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ زری بیچاری اکیلے ہی لگی رہتی ہے۔“

”تم نے شروع سے ہی اس کے ساتھ سلوک اچھا نہیں کیا۔ زری کو تم بہنوں نے سر پہ بٹھایا ہوا ہے اور اس کی گھر میں کوئی ویلو ہی نہیں ہے۔ ہمارے گھر دو ہزار دیے تم نے اور زری کے گھر پانچ ہزار۔ زری کو اپنے گھر دعوت پر بلایا اور حرا کو پوچھا تک نہیں۔ آتے ہی تم لوگ زری کے کمرے میں گھس جاتی ہو۔ بچوں کو بھی یہی سکھا رکھا ہے کہ زری ماما اچھی ہیں اور حرا تو بہت ہی بری ہے۔ دونوں میں فرق ڈالنے والی تو تم ہو۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر کافی غصے سے بولے تھے۔

”معیذ کی شادی کا تو سارا خرچہ ہی مہر نے کیا تھا اور حرا کو بھی دعوت پہ بلایا تھا۔ اس نے صاف معذرت کر لی۔ اب جو آکر چاہت سے ملے گا۔ اس کے کمرے میں ہی جائیں گے نا اور بچوں کی تو بات نہ ہی کریں۔ انہیں سکھانے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بھی سب دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔“ ان کی جگہ جواب شہزادی نے دیا تھا۔

”ٹھیک ہے تو حرا ہی بری ہے۔ وہ تم لوگوں کو سدھے منہ بلاتی نہیں۔ تمہاری آؤ بھگت نہیں کرتی۔ گھر کے کام میں دلچسپی نہیں لیتی۔ ساری برائیاں اسی میں ہیں تو پھر تم لوگ اپنے لیے کوئی نئی اور اچھی بہولے آؤ۔ حرا اپنے گھر میں ہی ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھے تو امین نے بھی فوراً تقلید کی۔

”اور تم بھی اپنے گھر میں ہی رہو۔“ یہ جملہ انہوں نے مہر النساء سے کہا تھا۔

”پوچھا ہے وہ کہتے ہیں ماں کا نام لیا تو تم لوگوں کو بھی وہیں چھوڑ آؤں گا۔ ماما! آپ لوگ دوسروں کی بات سنوارنے گئے تھے یا پھر اپنی بگاڑنے۔؟ بس آپ جلدی گھر آئیں۔“

”ابھی تم سو جاؤ۔ صبح ہوگی تو کچھ سوچوں گی۔“ انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور پھر ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ بچوں کو وہ اپنے ساتھ یہاں نہیں رکھ سکتی تھیں اور کہیں الگ مکان کرائے پر لے کر رہتیں تو بھی کئی مسائل لڑکیاں بھی تو جوان ہو رہی تھیں۔ پھر اپنا گھر کیسے چھوڑ دیتیں! ایک ایک چیز کو اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا، عمر بھر کی کمائی اس گھر کو بنانے میں لگادی تھی۔

فرار کی تمام راہیں ان کے لیے ہی مسدود کیوں تھیں۔

صبح کا فون صبح پھر آیا تھا۔ ”ماما! میں آج اسکول نہیں گئی۔ میرا اتنا ضروری ٹیسٹ تھا پاپا کو کوئی چیز نہیں مل رہی تھی۔ وہ غصہ ہم پر نکالتے رہے۔ سب کو ناشتا بنا کر دیا۔ مجھ سے نہیں سنبھالا جاتا یہ سب۔“ وہ روہا سی ہو رہی تھی۔

”آپ گھر آئیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ پاپا آپ کو یوں بے قصور سزا نہیں سنا سکتے۔ اگر انہوں نے آپ کو گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو ہم لڑیں گے ان سے۔ یہ گھر آپ کا ہے۔“

صبا کی باتوں نے ان کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ اس طرح کبوتر کی طرح وہ آنکھیں میچ کر کتنے دن یہاں گزاریں گی۔ صبا کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی آج اسکول نہیں جاسکی تھیں، پھر ان کے بچے تو ان کے ساتھ ہی تھے، لیکن امین کے ساتھ دل کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ ایک بندھن باقی تھا جو صرف بچوں کی خاطر تھا۔ حرا اسے تو انہوں نے ہر تعلق ختم کرنے کا سوچ لیا تھا لیکن امین کے ساتھ قائم ہوئے اس دوہرے رشتے کو اب عمر بھر شاید ایسے ہی چلنا تھا۔

”ٹھیک ہے آپا! اب تم بھی یہیں رہنا۔ چار دن میں عقل ٹھکانے آجائے گی۔“ ان کے دہلیز پر گرتے ہی ولید ان سے بولا تھا۔ شہزادی نے بھی تائید کی۔

”ہاں مہر! اب جب تک خود لینے نہیں آتے مت جانا۔ کچھ دن گزر جانے دو۔ ان کو تمہاری قدر بھی ہوگی اور پتا بھی چل جائے گا کہ وہ لوگ کس طرح انہیں استعمال کر رہے ہیں اپنے مفاد کی خاطر اور یہ معیذ۔ دیکھتی ہوں کیسے جاتا ہے حرا کو لینے۔“ پیچھے بیٹھے معیذ کو بھی اس نے ایک دھب لگائی تھی۔

”میں نے تو کل ہی چلے جانا ہے۔ کسی کے لیے میں کیوں اپنا گھر خراب کروں۔“ وہ بے مروتی سے کہتا اٹھ کر چھت پر چلا گیا تھا۔ جبکہ مہر النساء سب کے درمیان سن سی بیٹھی تھیں! امین بھلا یوں اس طرح کیسے چھوڑ کر جاسکتے تھے آخر اٹھارہ سال کا ساتھ تھا۔ کیا نہیں دیا تھا انہوں نے اس شخص کو۔ محبت، وفا، سکھ، بچے اور زندگی بھر کی انتھک کمائی۔

وہ گھر جس سے ایک پل میں انہیں بے دخل کر دیا تھا۔ اس گھر کی ایک اینٹ کے بعد دوسری اینٹ انہوں نے جوڑی تھی اور یہ سب کہہ رہے تھے، تم یہیں رہو۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ اتنا پرست شخص کبھی منانے نہیں آئے گا۔ تو کیا وہ ایسے ہی اتنی آسانی سے سب کچھ اس کے نام کر دیں گی۔

”نہیں! میں الگ گھروں کی اور بچوں کو وہاں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ میں کسی بھی صورت اپنے بچوں سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ میں اکیلے بھی ان کی پرورش کر سکتی ہوں۔“ پہلا حل یہی سوچا تھا۔

”بلکہ میں تو کہتا ہوں یہ مریم اور حسن کو بھی گھر بھجوا دو۔“ ولید کہہ رہا تھا اور مریم نے سن کر ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ ویسے بھی سب سے چھوٹی تھی اور ماں کے بغیر رہنے کا تصور ہی اس کے لیے محال تھا۔ کچھ دیر بعد صبا کی کال آئی۔

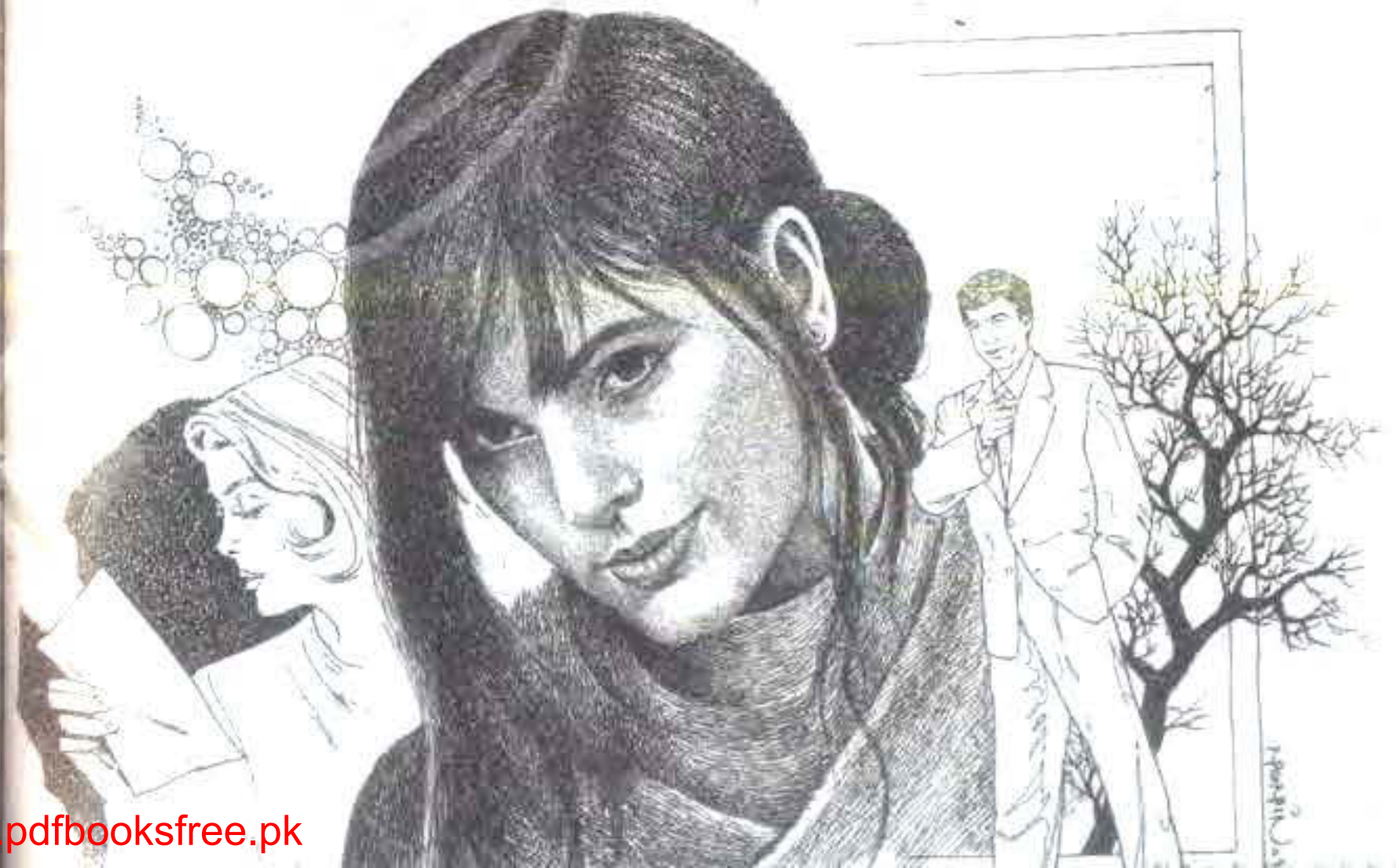
”ماما گھر کیوں نہیں آئیں؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”اپنے باپ سے پوچھو۔“ ان کا انداز جارحانہ تھا۔



سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سین پچھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سین پچھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے داوڑ کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے وہاں۔ مجرا احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔ داوڑ کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولید والے دن حیا سے بیہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست چکی حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکالرشپ پر اپنی کالج فلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں اور ابو ظہبی ایر پورٹ پر ایک جھشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبد اللہ حیا اور ڈی جے کی

منکرہ احمد



موت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق پتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرد مزاجی سے ملتا ہے، تاہم بنین پچھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حسب معمول حیا کو ملنے والے سفید پھولوں کے ساتھ کانڈر پر حیا کے دوست معصوم کو لیموں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کانڈر کو پیش پہنچاتا ہے تو وہاں ”اے آر پی“ لکھا ہوتا ہے۔ حیا جہان اور ڈی جے جزیرہ بیوک ادا کی سیر پر جاتے ہیں۔ وہاں ایک جنگلے میں داخل ہو جاتی ہے، جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی ش میں پاشا نے پہلی بار حیا کو دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور مجرا احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ مجرا احمد کرئل گیلانی کا بیٹا ہے، جسے جہان کے ابا پھنسا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا بچہ دے کر جانے دیتی ہے۔ حیا پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت پچھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آ جاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سردہری سے ملتے ہیں، تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مہوش کی شادی والے دن پنکی حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبہ دیتا ہے، جو ایک پہلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی، ڈولی اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ وہ چھوٹی کو ڈھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے، جہان سے بھی کہتی ہے، پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبہ کھلوانے کے لیے حیا، معصوم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈیونانی منظر ہر اقلیت پس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روسی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر Who لکھ دیتا ہے۔ حیا عثمان شہیر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے جنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشے اور ہمارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پسیلوں پر رکھے گئے کوڈ والے وہ ڈبے عائشے اور ہمارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے مجرا احمد کے۔ مجرا احمد حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہی پنکی ہے اور ڈبے پر پسیلیاں بھی وہی لگھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور رو جیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ رو جیل سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور رو جیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ رو جیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو گولی لگی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ارم کی منگنی ہو جاتی ہے۔ عائشے اور ہمارے کی غیر موجودگی میں حیا پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

ہمارے کا پزل باکس کھل گیا۔ اس میں سے نیکلس نکلتا ہے مگر وہ سمندر کی لہروں میں بہہ جاتا ہے۔ حیا کو پتا چلتا ہے کہ پاشا کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے، جو بظاہر یونان میں ہے۔

پاشا اپنی سیکریٹری دیمت سے اپنے مسئلے پر مشورہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی اسے زبان بند رکھنے کے لیے اس کے ایک راز سے اپنی واقفیت بھی ظاہر کر دیتا ہے۔

جہان بیوک ادا آتا ہے۔ حیا اس کا پیچھا کرتی ہے مگر کچھ جان نہیں پاتی۔ اخبار میں چھاپنے کے لیے ایک کہانی وہ جہان اور پاشا کو سناتی ہے۔ جہان اسے شائع کروانے سے منع کرتا ہے جبکہ پاشا بھڑک اٹھتا ہے۔ پاشا بیوک ادا آتا ہے تو اسے حیا کا پزل باکس ملتا ہے۔ وہ اسے چھپا لیتا ہے۔ ہمارے کو علم ہوتا ہے پھر جب عائشے گل اور حیا اسے ڈھونڈتی ہیں تو ہمارے چپکے سے اسے لا کر دے دیتی ہے۔ اس پر پاشا ہمارے سے ناراض ہوتا ہے۔

سلیمان صاحب ترکی آتے ہیں۔ حیا ہوٹل مرمر میں ملنے جاتی ہے تو ان کے ساتھ ولید لغاری اور اس کا اپنے باپ موجود ہوتا ہے۔ حیا جہان کو فون کر کے بلا لیتی ہے۔ وہاں جہان اپنا تعارف حیا کے شوہر کی حیثیت سے کروانا ہے۔ حیا اپنا

موبائل مرمت کرانے جاتی ہے تو دوکان والا بتاتا ہے کہ اس کے فون میں ٹریسر لگا ہے۔ حیا اسے لگا رہنے دیتی ہے۔ سلیمان صاحب اپنی بہن کے ساتھ مل کر حیا اور جہان کی باقاعدہ منگنی کرتے ہیں۔ عائشے گل کے کہنے پر حیا اسکا راف پہننا شروع کر دیتی ہے۔ ایک کافی شاپ میں پاشا سے سامنا ہوتا ہے۔ تو حیا اس کے مت پر کافی پھینک کر بھاگ جاتی ہے۔

ایک سینما ر میں شرکت کرنے کے بعد حیا باقاعدہ نقاب لینا شروع کر دیتی ہے۔ حیا کا پزل باکس کھل جاتا ہے مگر اندر ایک اور پہلی نکلتی ہے۔ جس کے سلسلے میں وہ سسلی امانت لا کر جاتی ہے۔ وہاں اسے پاشا کا میسج ملتا ہے کہ برگر کنگ میں ایک سربراہ ہے۔ وہ سب چھوڑ کر وہ جہان کے ریسٹورنٹ پہنچتی ہے۔ وہاں پاشا اور جہان ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ حیا جہان کا پاشا سے تعلق نکلنے پر بے حد خفا ہوتی ہے اور ترکی چھوڑ کر فوراً پاکستان آ جاتی ہے۔

امانت لا کر سے حیا کو فلیش ڈرائیور ملتی ہے جو کسی پاس ورڈ سے کھلے گی۔ حیا کی سسلی زارا اس کے حجاب لینے پر تنقید کرتی ہے، جہان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ بنین پچھو ان کی میت لے کر بائیس سال بعد پاکستان آتی ہیں۔ جہان دوسرے دن پاکستان پہنچتا ہے۔ بنین پچھو پاکستان میں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ ارم کی منگنی کے فنکشن میں حیا حجاب لے کر شرکت کرتی ہے۔ اسے سب کی سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ فنکشن سے واپسی پر حیا جہان کو شروع سے لے کر اب تک اپنے ساتھ ہونے والے تمام واقعات سناتی ہے۔ جو ابا ”جہان بتاتا ہے کہ اس نے ہوٹل گرینڈ میں کچھ عرصہ کام کیا ہے اور وہ پاشا اور اس کے بھائی کو جانتا ہے۔ وہ دونوں سکے بھائی نہیں ہیں اور یہ بات آنے اور جہان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ فیملی کے جعلی پاسپورٹ بنانے میں تاخیر پر جہان سے پاشا کی تلخ کلامی ہوئی تھی جس پر حیا پاکستان آ جاتی ہے۔ پاشا عائشے اور ہمارے کو جعلی ناموں سے دوسرے ملک بھجوا رہا ہے۔

امریکا میں رو جیل نے بدھست عورت سے شادی کر لی۔ جہان اس بات سے واقف ہوتا ہے، تاہم ایک احسان کے بدلے وہ اس کا پردہ رکھتا ہے۔ سلیمان صاحب کو اس بات پر ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ حیا ان کے آفس جانا شروع کر دیتی ہے۔ تایا فرقان اور زاہد چچا کو بہت برا لگتا ہے۔ ولید لغاری ان کے برنس کا دس فیصد کا پارٹنر ہے۔ وہ ہیڈ آرکیٹیکٹ کے ساتھ مل کر ٹریڈ سینٹر کے نقشے میں جان بوجھ کر غلطی کرتا ہے۔ جس سے ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا الزام سب حیا کے سر ٹھوپ دیتے ہیں، تاہم وہ وینڈر سے مل کر سپلائی جاری کروا دیتی ہے۔ جس سے ان کا حالیہ پروجیکٹ متاثر ہو رہا تھا۔ فرخ کے ولیمہ والے روز حیا جب اپنے تایا زادے پر وہ کرتی ہے تو تایا فرقان اس کے حجاب پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے خوب بے عزت کرتے ہیں۔ زاہد چچا بھی اس کی حمایت نہیں کرتے حتیٰ کہ فاطمہ بھی حیا کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔

جہان حیا سے دبے لفظوں میں گھر والوں کی حمایت کرتا ہے تو حیا سختی سے حجاب نہ اتارنے کا فیصلہ سناتی ہے۔ جہان بغیر کچھ کے چلا جاتا ہے۔

جہان کے چلے جانے پر سب حیا کو مورد الزام ٹھراتے ہیں۔ حیا کی دوستیں اس کے نقاب کی وجہ سے اس سے دور ہو گئی ہیں۔ ارم دوبارہ حیا سے اس کا موبائل مانگتی ہے۔ حیا اپنے ڈرائیور کا فون اسے دے دیتی ہے۔ بعد ازاں ڈرائیور کے موبائل سے وہ نمبر اپنے پاس بھی محفوظ کر لیتی ہے۔ ارم کی زبانی حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان کے حیا سے ناراض ہو کر چلے جانے پر عابدہ چچی اپنی بیٹی سحرش کی جہان سے بات چلانے کے چکر میں ہیں۔

حیا فلیش ڈرائیو کا پاس ورڈ بوجھ کر فائل کھول لیتی ہے۔ اس ویڈیو فائل میں جہان کو دیکھ کر حیا چونک جاتی ہے۔ ویڈیو میں جہان حیا کو مخاطب کر کے بتاتا ہے کہ جہان، ڈولی، مجرا احمد اور عبدالرحمن پاشا ایک ہی شخص کے چار حوالے ہیں۔ اس بات سے عائشے گل اور ہمارے بھی واقف ہیں۔

جہان نے حیا کو چیریٹی شو میں دیکھا تھا۔ وہاں وہ اپنے دوست حماد کی بیوی ثانیہ سے ملنے گیا تھا۔ ثانیہ نے جہان کا کوئی خفیہ کام کیا تھا۔ ان کی ملاقات اسی سلسلے میں تھی۔ جہان، ثانیہ کو حیا کے بارے میں مختصراً بتاتا ہے۔ جہان کے والد آرمی میں تھے۔ انہوں نے غداری کی جس کی وجہ سے ترکی میں جہان کے دادا اور ممی کو کافی مشکلات برداشت کرنا پڑیں۔ جہان اپنے دادا کے بہت قریب تھا۔ جہان کے ابا اور دادا میں ایک روز شدید جھگڑا ہوتا ہے۔ دادا دل برداشتہ ہو کر مر جاتے ہیں۔

انٹاکہ میں جہان کے ابا ایک پاکستانی جاسوس کو قتل کر دیتے ہیں پھر جہان کی مدد سے فارم ہاؤس کے والان میں فوارے کے پاس دفن دیتے ہیں۔ اس جاسوس سے جہان کو بہت انیسیت محسوس ہوتی ہے۔ جہان یہ بات کسی کو نہیں بتاتا مگر وہ اکثر خواب میں یہ واقعہ دیکھتا ہے۔ بین پھپھو جہان کو بتا دیتی ہیں کہ اس کے ابا نے کچھ فوجی راز بیچے ہیں جس کی سزا کے طور پر وہ جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ سکندر شاہ اب بیمار رہنے لگے ہیں۔ بین پھپھو کو دگنی مشقت کرنی پڑ رہی ہے۔ جس کی میں جہان ایک ورکشاپ میں کام کرنے لگتا ہے۔ اس کے مالک کرامت بے کی بھانج فریجہ اکثر جہان کو پناہ گزین کی اولاد کا طعنہ دیتی تھی۔ جہان کو فریجہ اور کرامت بے کے ناجائز تعلقات کے علم ہو جاتا ہے۔ ممی کے کہنے پر جہان سلیمان ماموں کے گھر جاتا ہے اور کوریئر شاپ پر چند لفافوں پر پرانی تاریخوں کی مر لگواتا ہے۔ راستے میں وہ سرخ گلابوں کا بو کے لینے کے لیے رکتا ہے مگر پھول والے کے پاس صرف سفید گلاب ہوتے ہیں۔ وہ ان پر سرخ رنگ کا اسپرے کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

کیا سپین قسطنطین

جہان کا اس سے ہٹ کر بھی ایک اضافی کام کر چکا تھا۔ وہ بھی کر چکا ہوتا تب بھی اس کے کارڈ کے باعث کربھی دیتا۔

”نٹری نہیں کرنی بھائی؟“ جب وہ لفافے واپس جیکٹ میں رکھنے لگا تو غنفر حیرت سے بولا۔

”اول ہوں۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ لمبا کام ہو جائے گا اور گھر میں سب ٹھیک ہے؟“

”جی بھائی!“ غنفر اسے گھر کی باتیں بتانے لگا۔ اس کا وہ بھائی جس کو جیل سے نکلوانے میں جہان نے مدد کی تھی اب کام پہ لگ گیا تھا اور وہ اس بات سے کافی آسودہ لگ رہا تھا۔

”میں چلتا ہوں تمہارا بھی آف کرنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔“ اس کی بات تحمل سے سن کر اور تبصرو کر کے اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ماموں کے گھر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غنفر سے مصافحہ کر کے وہ باہر آیا۔

ست رو لڑکا ابھی بو کے پلاسٹک کور کے گرد رہا باندھ رہا تھا۔

”اسپرے نہیں کیا؟“ اس نے سفید گلاب کے پھولوں کو دیکھ کر اچھٹے سے ابرو اٹھائی۔

”میں نے ابھی دیکھا صاب! اسپرے ختم ہو گیا

پھولوں والا لڑکا جلدی جلدی باسکٹ سے سفید گلاب نکالنے لگا۔

”تم گلدستہ بناؤ میں آتا ہوں۔“ اس کی رفتار دیکھ کر وہ جان گیا کہ ابھی اسے کافی وقت لگے گا اس لیے وہ اندر کوریئر شاپ کی طرف بڑھ گیا۔ اسے اگر کسی شے سے از حد چڑھی تو وہ وقت ضائع کرنے سے تھی۔

کوریئر شاپ میں دو افراد کھڑے اپنے اپنے لفافے جمع کروا رہے تھے۔ ڈیسک کے پیچھے بیٹھا لی کیپ بنے لڑکا کمپیوٹر پر مصروف نظر آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً ملازم لڑکے نے ٹائپ کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہان پہ نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پہ شناسائی کی رمق ابھری۔ وہ جلدی جلدی کام پٹانے لگا۔

دونوں افراد کو فارغ کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”جی احمد بھائی! کوئی خدمت؟“

”ہاں“ چھوٹا سا کام ہے۔“ وہ جیکٹ کی جیب سے چند صاف لفافے نکالتے ہوئے اس کے سامنے کاؤنٹر پہ آیا۔

”ان کو کچھ بیک ڈش میں اسٹیمپ کرنا ہے اور کچھ کو آگے کی ڈش میں۔ یہ دیکھو۔“ وہ اسے کام سمجھانے لگا۔ غنفر اس کو جانتا تھا اس سے پہلے وہ

آپ ایسے ہی لے جائیں۔ دیکھیں! یہ سبز پتے ساتھ میں لگائے ہیں، کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔“

”اچھا“ زیادہ لیکچر مت دو۔ کتنے پیسے ہوئے؟“ باگاری سے ٹوکتے ہوئے اس نے بوٹہ نکالا۔ اندر سے چند نوٹ نکالتے ہوئے اس کی نگاہ اپنے سروس کارڈ پہ پڑی۔ کیا ماموں کو یہ دکھانا تھا؟ نہیں، ابھی بہت جلدی ہو گا۔ پہلے اسے ان کا اعتماد جتنا ہو گا اور وہ ان کی نازک اندام مشغور سی بیٹی۔ ان سب لوگوں کی زندگی کا حصہ بننا مشکل لگ رہا تھا۔

بو کے چھوٹا سا تھا۔ اس کو پہلو میں لٹکے ہاتھ میں لا پرواہی سے پکڑے وہ سڑک کنارے چلنے لگا۔ ماموں کا گھر یہاں سے قریب تھا۔ مگر وہ کچھ دیر مرکزی سڑکوں کے کنارے چلنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ صرف اپنی سوچوں کو مجتمع کرنا چاہتا تھا۔

وہ کیا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی یقین نہیں تھا۔ یا پھر وہ جو چاہتا تھا اسے کہنے سے ڈرتا تھا۔ ماں سے کہنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر خود سے تو کہہ ہی سکتا تھا اور اصل بات وہی تھی جو ثانیہ نے آج دوپہر میں کہی تھی۔ وہ اپنے ماموں سے ڈرتا تھا۔ وہ ان کے طعنے سے ڈرتا تھا۔ اتنے سالوں بعد بھی وہ ان کے سامنے سر اٹھانے سے ڈرتا تھا۔ مگر ممی کہتی تھیں وقت بدل گیا ہے۔ فرقان ماموں اور سلیمان ماموں نرم ہو گئے ہیں۔ البتہ بچھلے برس ہونے والی سلیمان ماموں سے ملاقات کے بعد اسے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی کہ ان کے

مزان کی سختی اور غرور ختم ہو گیا ہے۔ وہ ویسے ہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ اب سلیمان ماموں کو اپنی بیٹی کی فکر تھی اب وہ بیٹی والے تھے۔ ان کا ہاتھ نیچے تھا اور اس کا اوپر۔ پہلے کی بات اور تھی۔ تب ان کی بیٹی چھوٹی تھی۔ اب مستقبل کی فکر نہیں تھی لیکن اب اس کی شادی کی عمر تھی۔ رشتے بھی آتے ہوں گے۔ اب وہ اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہوں گے اور ان کی پہلی ترجیح ان کا بھانجا ہی تھا۔ کوئی بھی اپنی خوشی سے بچپن کا نکاح نہیں توڑتا۔ سلیمان ماموں سے بھی اسے

یہ امید تھی کہ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہوں گے۔ نہ وہ خود چاہتا تھا۔ لیکن بھانجا۔ یہیں آکر وہ رک جاتا تھا۔ یہ رشتہ بھانجا بہت مشکل تھا۔

وہ ایسی چھوٹی سوچ کا حامل آدمی تو تھا نہیں کہ رائے انتقام لینے کے لیے ان کی بیٹی کو لٹکائے رکھتا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ وہ ان سے مل لے تاکہ دونوں فریقین دیکھ لیں کہ یہ رشتہ چل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر اسے محسوس ہوا کہ وہ بھاسکتا ہے تو ممی کو آگاہ کر دے گا اور اگر اسے لگا کہ وہ نہیں بھاپائے گا تو۔ وہ پھر اسی مقام پہ آکر رک گیا۔ ممی ہرٹ ہوں گی۔ یہ وہ آخری چیز تھی جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ اتنے سال اگر اس نے جان بوجھ کر ماموں کی فیملی سے لا تعلقی اختیار کیے رکھی تو اس لیے کہ دور اندر وہ یہ رشتہ نہیں چاہتا تھا۔

سڑک کنارے سرخ کا کر چلتے ہوئے اس نے خود سے سچ بولنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ خود ہی یہ رشتہ نہیں چاہتا تھا۔ اس کی یہ ساری بے رخی، لا تعلقی اور اعراض برتا سب لا شعوری طور پہ اسی لیے تھا کہ وہ لوگ تنگ آکر خود ہی رشتہ ختم کر دیں اور وہ ماں کو دکھ دینے کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔ یہ الگ بات تھی کہ یہ خود کو دھوکا دینے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جو بھی یہ رشتہ ختم کرے ذمہ دار تو وہی ہوتا۔ اس کے خشک رویے کے باعث ہی یہ رشتہ ٹوٹے گا۔

لیکن وہ لوگ اس سے اور کیا توقع رکھتے ہیں؟ کس نے کہا تھا انہیں کہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا رشتہ طے کر دیں؟ اسے کبھی ان سب ذمہ داران پہ

از حد غصہ چڑھتا تھا۔ ممی یہ البتہ نہیں چڑھتا۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ صرف اپنے بھائیوں کے ساتھ تعلق قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا بس رشتے بچانے کے لیے ہی کیا۔ وہ جان بوجھ کر ماں کو شک کا فائدہ دے دیا کرتا تھا مگر ماموں کو نہیں۔ بے انصافی ہے تو بے انصافی سہی۔

بہت دیر وہ سڑکوں پہ بے مقصد چلتا سوچوں میں غلط رہا۔ وہ ابھی ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا مگر ماں

کے سامنے اس کے ”میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں“ اور ”یہ بہت جلدی ہے مجھے سوچنے کا وقت دیں“ جیسے بہانے نہیں چلتے تھے۔ اسے ایک دفعہ جانا ہی پڑے گا۔

گھڑی کی سوئیاں دس سے اوپر آچکی تھیں۔ جب اس نے خود کو سلیمان ماموں کے گھر کے بیرونی گیٹ کے سامنے کھڑے پایا۔ گیٹ بند تھا۔ اندر گھر کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں ساتھ والے گیٹ پر پھیلیں۔ یہ فرقان ماموں کا گھر تھا۔ وہ پہلے ایک دن آکر یہ گھر دیکھ گیا تھا اور پھر فیس بک پر روجیل نے ان دونوں گھروں کے اندر باہر کی اتنی تصاویر لگا رکھی تھیں کہ اسے اندرونی نقشہ بھی حفظ تھا۔

وہ ان دونوں وسیع و عریض اور خوب صورت بنگلوں کے سامنے سڑک پہ گویا کسی دور پہ پہنچا تھا۔ اندر جائے یا یہیں سے پلٹ جائے؟ اسے صرف ایک بہانہ درکار تھا اس گھر اور اس کے مکینوں سے دور بھاگنے کا۔ صرف ایک وجہ وہ ڈھونڈ لے اور واپس پلٹ جائے لیکن کوئی وجہ بھی نہیں۔ اسے اندر جانا ہی تھا۔

دفعۃً ”فرقان ماموں کے گیٹ کے پیچھے کھڑا ہوا اور پھر بولنے کی آوازیں قریب آتے قدم وہ سیر اختیاری طور پر تیزی سے ایک طرف ہوا۔ کالونی میں نیم اندھیرا سا تھا۔ گھروں کی بیرونی بتیاں بھی اس جگہ کو روشن کرنے میں ناکام تھیں۔ وہ فرقان ماموں کے گیٹ کے داہنی طرف ایک گھاس سے بھرے جنگلے کی اوٹ میں ہو گیا۔

ٹیٹ سے فرقان ماموں چند افراد سمیت باہر نکل رہے تھے۔ شلوار قمیص میں ملبوس مسکراتے ہوئے وہ خوش اخلاقی سے اپنے مہمانوں کو چھوڑنے باہر آئے تھے۔ مہمان تین مرد حضرات تھے جن کی کار سڑک کے پار ایک خالی پلاٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں سے ذرا دور نہ جانے کیوں۔ ماموں اب ان افراد کے ساتھ باتوں میں مگن اسی طرف جارہے تھے، پیچھے گیٹ

کھلا رہ گیا تھا۔ گارڈ چوکیدار فی الوقت کوئی بھی نہ حذر شادی قریب تھی۔ سو مصروفیت نے ملازموں کو بھی گھیر رکھا ہو گا۔

وہ اندھیری جگہ پہ دم سادھے کھڑا فرقان ماموں کو دیکھتا رہا۔ دل میں ایک عجیب سی ہوک اٹھی تھی۔ پرانی باتیں پھر سے یاد آنے لگی تھیں۔ اس نے بے اختیار سر جھٹکا اور جیسے اذنی یادوں کو رفع کرنا چاہا۔

ماموں اب اپنے مہمانوں کی گاڑی کے ساتھ کھڑے ان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اسے یوں وقت ضائع ہونے پہ الجھن ہو رہی تھی۔ چند منٹ تو وہ کھڑا رہا، مگر جب اسے لگا کہ ماموں اور ان کے مہمانوں کی گفتگو لمبی ہوتی جا رہی ہے تو وہ جنگلے کے عقب سے نکل آیا۔ وہ لوگ بہت دور تو نہیں تھے۔ البتہ ایسے رخ سے کھڑے تھے کہ کسی کا بھی چہرہ گیٹ کی جانب نہیں تھا۔

وہ فرقان ماموں کا سامنا کیے بغیر اندر جانا چاہتا تھا۔ کیا حرج تھا اگر وہ یوں ہی اندر داخل ہو جائے۔ فرقان ماموں کو متوجہ کرنا اور ان کے سوالات کا جواب دینا؟ نہیں، ابھی نہیں۔

بہت آرام اور آہستہ سے وہ کھلے گیٹ کے اندر چلا آیا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ لان خالی تھا۔ سب اندر تھے۔ اس نے گردن اڑھراوہر گھما کر درمیانی دروازہ تلاش کیا۔ وہ سامنے ہی تھا۔ اس پہ گھنٹی لگی تھی لیکن اس نے پہلے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اسے جانا تو سلیمان ماموں کی طرف تھا، سوادھر رکنا بے سود تھا۔ وہ دروازے سے گزر کر سلیمان ماموں کے لان میں داخل ہو گیا۔

اتنے برسوں سے بنا اجازت دو سروں کے گھروں، لاکرز، موبائلز اور ای میلز میں خاموشی سے داخل ہونے اور نکلنے کی عادت کے باوجود وہ آفیشل کام کے بغیر ٹریس پاسنگ نہیں کیا کرتا تھا۔ اب بھی یہ کرتے وقت اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ وہ اس کے ماموں کا نہیں، بلکہ سر کا بھی گھر ہے۔ اندر جا کر وہ جتا

دے گا کہ وہ کس طرح داخل ہوا سبقت ختم! سلیمان ماموں کا ہر ابھر الان بھی سنسان اور سرور پر تھا۔ اسے چھتاوا ہوا کہ اس نے پھول اٹھانے کا تکلف کیوں کیا۔ خواجواہ ایک بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ اس نے گلدستہ لان کی میز پر رکھ دیا اور خود گھر کے داخلی دروازے کے سامنے آکھڑا ہوا۔

گھنٹی باہر گیٹ پہ تھی اندر اس داخلی دروازے پہ نہیں۔ اب کیا صرف دروازہ کھٹکھٹانے پہ کوئی نکلے گا؟ بہت تذبذب سے اس نے داخلی دروازے پہ دستک دی۔ البتہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اندر کمرے میں موجود افراد اس وقت یہ دستک نہیں سن پائیں گے۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح کر رہا تھا، تاکہ اسے ان سے ملنا نہ پڑے اور وہ کہہ سکے ”مئی میں گیا تھا، مگر آپ کے بھائیوں نے دروازہ ہی نہیں کھولا، میں کیا کرتا، سو واپس آگیا۔“

حسب توقع دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔ وہ سرور پڑتے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے گھر کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے یوں ہی جائزہ لینے لگا۔ اس گھر میں کون کون ہے۔ مہمان بھی آئے ہوں گے شادی کے۔ کوئی جاگ رہا ہے یا نہیں اور ایسی ہی باتوں کا سرسری سا معلوم کرنے وہ گھوم پھر کر گھر کو دیکھنے لگا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ البتہ لان کے داہنی رخ پہ کھلتی ایک کھڑکی کے دو شیشے کے پٹ کھلے تھے۔ اتنی سردی میں کون کھڑکی کھول کر بیٹھا ہے؟

وہ اچھٹے سے بھنوس سکیڑے اس طرف آیا۔ شیشے کھلے تھے، البتہ جالی بند تھی۔ اس کے پیچھے پردے بھی گرے تھے۔ دو پردوں کے درمیان ایک درز کی تھی، جس سے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں وہ عادت سے مجبور تھا۔ نچلا لب دانت سے دبائے، اس نے احتیاط سے گردن ذرا اونچی کر کے اندر دیکھا۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی تھی۔ صرف ایک ہی بلب جل رہا تھا۔ روشنی کا دو سرا مبیض بیڈ کے نیچے یہ رکھا لپ ٹاپ تھا۔ جس کے سامنے وہ کہنیوں

کے بل اوندھی لیٹی تھی۔ اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ وہ ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھے، دوسرے ہاتھ کی انگلی لپ ٹاپ کے ٹیچ پیڈ پہ پھیر رہی تھی۔

یہ وہی تھی جس کو اس نے دوپہر میں دیکھا تھا۔ اس نے وہی سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سلکی بال ملائی سے بنی جلد۔

اس کی کزن، اس کی بیوی، کیسا عجیب رشتہ تھا کہ دل میں کوئی احساس نہیں جاگتا تھا۔ نہ ہی اس سے ملنے کی کوئی خواہش تھی۔ نہ جانے کیوں، وہ مایوس ہوا تھا۔ جس طرح لوگ مڑ مڑ کر اسے ہوٹل کی لابی میں دیکھ رہے تھے، اسے وہ سب کچھ ناگوار لگا تھا۔ اس کا لباس گوکہ ایسا نہ تھا، آستین پوری تھیں، قمیض لمبی تھی، نیچے کھلا ٹراؤزر تھا۔ مگر اس کے کپڑوں کی قال ہی کچھ ایسی تھی اور کچھ اس کا انداز کہ وہ توجہ کھینچتے تھے۔ اسے ایسی لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اسے یہ لڑکی بھی قطعاً اچھی نہیں لگی تھی۔

رات کی مقدس خاموشی میں بٹنوں کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا تو وہ چونکا۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بے چینی سے موبائل پہ کال ملا رہی تھی۔ ”ہیلو زارا؟“ شاید رابطہ مل گیا تھا۔ تب ہی وہ دبے دبے جوش سے چکی۔ ”کیسی ہو؟ سو تو نہیں گئی تھیں؟ حیا بول رہی ہوں۔“

جہان نے سوچا، وہ کیوں سردی میں باہر کھڑا کسی کے کمرے میں جھانک رہا ہے؟ اس کو مئی نے ماموں وغیرہ کے سارے نمبرز دے رکھے تھے، پھر وہ ان کو کال کر کے بتا کیوں نہیں رہا کہ وہ ان کے گھر آچکا ہے۔ اگر اس کی نیت اندر جانے کی ہوتی تو وہ لاک توڑ کر بھی اندر داخل ہو جاتا۔ ساری بات نیت کی تھی۔

”ساری باتیں چھوڑو زارا اور میرے پاس جو بڑی خبر ہے وہ سنو اور تم یقین نہیں کرو گی، میں جانتی ہوں۔“

وہ اندر موجود لڑکی کی باتیں بے توجہی سے سن رہا

ہیوٹی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO



- اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت 75 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور مٹی آرڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں 200 روپے

تین بوتلیں 275 روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

بی بی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

دستی خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔

فون نمبر 32216361

ہندی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ دس قدموں چلتا لان میں رکھی کرسیوں تک آیا، میز پر رکھا، بو کے اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے گھر کو دیکھا۔ گدھر رکھے وہ اس کو؟ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سب سے پہلے حیا دیکھے۔ اس کے ماں باپ نہیں۔ حیا۔ یہ نام بھی کتنا غیر مانوس تھا۔

اسے یہ گھر کے اندر رکھنا چاہیے۔ کچن کا ایک دروازہ عموماً باہر کی طرف کھلتا ہے شاید وہ کھلا ہو۔ یہی سوچ کر وہ گھوم کر گھر کے دوسری طرف آیا۔ کچن کا بیرونی دروازہ بند تھا لیکن ایک کھڑکی جو باہر کی طرف کھلتی تھی اس میں سے وہ یہ بو کے اندر رکھ سکتا تھا۔ کھڑکی اس طرح سے بنی تھی کہ باہر کی طرف شیشے کے ٹیٹ تھے اور اندر کی طرف گرل تھی۔ گرل کا ڈیزائن کچھ ایسا تھا کہ وہ بو کے اس کے اندر سے گزار کر سامنے کاؤنٹر پر رکھا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے پہلے شیشے والے ٹیٹ کو کھولنا ہو گا۔

اس نے بس دو دفعہ کھینچا اور بیٹ کی کنڈی اکھڑ گئی۔ ویسی چیزیں، خیر! اسے صرف پھول اندر رکھنے سے غرض تھی۔ نہایت آہستگی سے گلہ ستہ اور بند لفافہ گرل میں سے گزار کر اس نے کاؤنٹر پر رکھا، پھر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ شیشے والا بیٹ احتیاط سے بند کرتے ہوئے وہ پلٹ گیا۔

صبح جو بھی وہ پھول دیکھے گا لفافے پہ درج نام بڑھ کر ان کو حیا کے حوالے کر دے گا۔ وہ ضرور سوچے گی کہ رات کو ان کے گھر کے اندر کون پھول رکھ کر جاسکتا ہے۔ اس سے آگے کیا ہو گا؟ یہ اسے ابھی طے کرنا تھا، لیکن جو بات اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اس زبردستی کی ملاقات سے بچ گیا۔ ایک ان چاہے، مجبوری کے بندھن سے فرار کی مہلت میں چند دن کا اضافہ ہو گیا۔ اب وہ می کو کیمہ سکتا تھا کہ وہ اس لیے اندر نہیں گیا کیونکہ ان کی بیٹی کی ترکی آرہی ہے اور یہ بات می کو پریشان کر دینے کے

خیالی میں ہونے والے اس عمل سے گملا لڑھک گیا۔ نیچے گھاس تھی اس لیے وہ ٹوٹا نہیں، مگر پتوں کی ہلکی سی کھڑکھاہٹ بھی اندر سنائی دی تھی تب ہی اس نے اس لڑکی کو چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھتے دیکھا۔

وہ بہت احتیاط سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اتنی بے وقوف یا لاپرواہ نہیں تھی اس کی حیات کافی تیز تھیں۔ اسے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے اس سے قبل کہ وہ پکڑا جائے۔

”ابا نے مجھے کبھی اس کافر لینے یا سر ڈھکنے پہ مجبور نہیں کیا، تھینک گاڈ۔“ وہ کھڑکی کی طرف نہیں آئی، بلکہ سلسلہ کلام وہیں سے جوڑے کہنے لگی۔ وہ دوسری دفعہ چونکا تھا۔ تھینک گاڈ؟ اس بات پہ تھینک گاڈ کہ اس کے باپ نے کبھی اسے سر ڈھکنے کو نہیں کہا؟ عجیب لڑکی تھی یہ۔

چند لمحوں میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اندر نہیں جانا۔ اسے ان لوگوں سے ابھی نہیں ملنا اسے پہلے اپنی ”بیوی“ سے بات کرنی ہوگی۔ اسے ان سے ملنے اور ان کو اپنی جانب سے کوئی بھی امید دلانے سے قبل اس لڑکی کو جاننا اور اعتماد میں لینا ہو گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کو ترکی کا اسکالر شپ حاصل کرنے سے روکنا تھا۔ اللہ، اللہ، اگر وہ ترکی آگئی تو وہ بری طرح سے پھنس جائے گا۔ کسے سنبھالے گا وہ سب کچھ؟

اس نے گردن موڑ کر لان کی میز پر رکھے گلہ ستہ کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر جیب سے لفافوں کا بنڈل نکالا۔ وہ لفافہ جس پہ ایک روز قبل کی مہر درج تھی اس نے وہ علیحدہ کیا، پھر اندرونی جیب سے پین نکالا۔

چند لمحے سوچتا رہا، پھر لفافے کے اندر رکھا چوکور سفید موٹا کاغذ باہر نکالا اور اس پہ لکھا ”ویلم ٹو سبائیجی“ یہ اس کو چونکانے کے لیے بہت ہو گا۔ کسی اور مقصد سے لیے گئے لفافے پہ اس کا نام لکھ کر اس نے ٹھیک سے اسے بند کیا۔

اندروں اپنی دوست کو ابھی تک پرسوں ہونے والی

تھا۔ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے وہ سلیمان ماموں کو فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے نمبر ملایا، پھر ہند کر دیا۔ پھر ملایا، پھر ہند کر دیا۔

”کین یو بلیو اٹ زارا کہ مجھے یورپی یونین نے

اسکالر شپ کے لیے سلیکٹ کر لیا ہے؟“ موبائل کی اسکرین پر انگلی سے نمبر لکھتا وہ جیسے چونکا تھا۔ یورپی یونین کا اسکالر شپ، ارسس منڈس ایچینج پروگرام؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی دوست سے جو گفتگو کر رہی تھی اس میں یہی نام اس نے لیا تھا۔ کیا وہ اسکالر شپ کے لیے کہیں جارہی تھی؟

اس نے موبائل واپس جیب میں ڈالا۔ اس کی ساری حیات اندر ہوتی گفتگو پہ لگ گئیں۔

”بالکل سچ کہہ رہی ہوں زارا۔“ اب وہ کسی یونیورسٹی کی طرف سے آنے والی ای میل کا پتہ اپنی دوست کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بالکل دم سادھے کھڑا نہ گیا۔ اسے صرف یورپ کی اس یونیورسٹی کا نام سننے میں دلچسپی تھی جہاں وہ جارہی تھی۔

”نہیں، اسپین کی Deusto نہیں، بلکہ ترکی کی سبائیجی یونیورسٹی نے ہمیں سلیکٹ کیا ہے اور اب ہم ایک سمسٹر پڑھنے پانچ ماہ کے لیے استنبول جارہے ہیں۔“

باہر سردی اور تاریکی میں کھڑکی کے ساتھ کھڑے جہان کو محسوس ہوا کسی نے اس کا سانس روک دیا ہو۔ ترکی؟ استنبول؟ پانچ ماہ؟ اس نے بے یقینی سے پردوں کی درز سے جھلکتے منظر کو دیکھا۔ اس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔

وہ اب اپنی دوست کو سبائیجی میں ہیڈ اسکارف پہ پابندی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کی توجہ پھر بھٹک گئی۔ اسے لگا اسے پیشانی پہ پینہ آگیا ہے، جیکٹ کی آستین سے ماتھا صاف کرتے ہوئے وہ ذرا پیچھے کو ہوا تو ساتھ میں لگے گملوں سے ہاتھ نکلایا۔ بے

لیے کافی تھی۔
گھر سے نکلنے سے قبل کچھ سوچ کر وہ پورچ میں
کھڑی گاڑیوں کی طرف آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فریحہ نے گردن موڑ کر کچھ اچنبھے، کچھ نخوت سے
اسے دیکھا۔
”بولو!“

”میرا خیال ہے ہم ادھر بیچ بیٹھ جاتے ہیں۔“
پراعتاد سی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ سے
سڑک کنارے بنی بیچ کی طرف اشارہ کیا۔
”لو کے! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، جو کہنا
ہے یہیں کہو۔“

”ٹھیک ہے۔ اب آپ میری بات سنیں۔“
کندھوں کو ذرا سا اچکا کر وہ اس کے سامنے کھڑا کہنے
لگا۔ ”آپ نے مجھے پناہ گزین کی اولاد کہا تھا۔“
”اب بھی کہتی ہوں اور بہت جلد تمہیں اس جگہ
سے نکلوا کر بھی دکھاؤں گی۔“ اس نے ہلکی سی
استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”لیڈی فریحہ! پناہ گزین کی اولاد ہونا بہتر ہوتا ہے
اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی کے ساتھ تعلقات استوار
کرنے اور ہر دو روز بعد رات کے ساڑھے بارہ بجے
مکینک شاپ میں وہ کرنے سے جسے گناہ کہتے
ہیں۔“

اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اس نے کسی گلابی سنہری
سے انسانی چہرے کو سفید پڑتے دیکھا تھا۔ ایسا جیسے کسی
نے سفید پینٹ کر دیا ہو۔ فریحہ کا سارا خون ہی چڑ گیا۔
کتنے ہی بل تو وہ شل کھڑی رہی۔

”اب آپ میری بات سنیں۔ مجھے اور میری فیملی کو
اگر آپ نے یہاں سے نکلوانے کی کوشش کی تو میں
آپ کے شوہر کے پاس چلا جاؤں گا اور یہ مت سوچئے
گا کہ وہ میری بات نہیں مانیں گے۔ میں ان کو وہ ثبوت
بھی دکھاؤں گا جو میں نے اکٹھے کیے ہیں۔ یہ مت
بھولیے گا کہ کیمرا ہر گھر میں ہوتا ہے۔“

فریحہ نے شاید کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یوں پکڑی
جائے گی۔ وہ اتنی ششدر تھی کہ جواباً ”کچھ بھی نہ کہہ
سکی۔ وہ اسے یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر پلٹ آیا۔ اس کا اپنا
دل بھی زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ بہت دنوں سے
اس نے فریحہ کے سامنے خودیہ اعتماد قائم کیا تھا اور یہ
کیمرے والی بات تو ایک خالی دھمکی تھی اس کے پاس
کوئی ثبوت نہ تھا۔ سامنے کوئی مرد ہوتا تو رکھ کے دو
تھپڑ لگاتا اور بک جھک کر چلتا کرتا، مگر فریحہ کا غور کچھ
ایسے گھائل ہوا تھا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکی اور وہ دبی
مسکراہٹ کے ساتھ واپس آ گیا۔

پھر دوبارہ وہ کبھی کرامت بے کی دکان پہ نہیں گیا۔
علی کرامت کے گھر جانا بھی اس نے ترک کر دیا۔ اس
کی عزت نفس کو گوارا نہیں تھا کہ اب وہ ان کے گھر
جائے۔ لیکن اکثر اسکول سے جاتے ہوئے بس اسٹاپ
پہ ششل کا انتظار کرتے وہ علی کرامت کو اپنی ڈاکٹر مٹی
کے ساتھ آتے دیکھتا تو پھر کافی دیر ان کو دیکھتا رہتا۔
نقاب سے بے بھی ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ اور
نرمی چھپتی نہ تھی۔

عمر حاقان اکثر نخوت سے کہتا نظر آتا کہ اس کی چچی
ایک بد صورت، سیاہ فام عورت ہے۔ مگر جہان کو وہ
عورت بہت خوب صورت لگتی تھی۔ مرہ جلیلہ۔ اس
کی مرہ جلیلہ۔ اس نے بہت عرصے بعد بالآخر ایک دن
وہ مرہ جلیلہ والا کارڈ ان کو دے ہی ڈالا۔ وہیں بس اسٹاپ
پہ کھڑے کارڈ پلٹ کر دیکھتے وہ بے اختیار ہنس دی
تھیں۔

پھر بہت عرصہ نہیں گزرا جب اس نے سنا، ناٹا کی
طبیعت خراب تھی۔ مٹی کو اس خبر نے بے چین کر دیا
تھا۔ وہ بار بار پاکستان فون کرتیں۔ اسے نہ بتاتیں، مگر وہ
دروازے کی اوٹ میں کھڑا سنتا رہتا۔

”پلیز بھائی! مجھے اس طرح منع مت کریں۔ میں ابا
سے ملنا چاہتی ہوں۔ بس میں اور جہان آئیں گے، کسی
کو پتا نہیں چلے گا، پلیز آپ مجھے آنے دیں۔“
وہ آنسو پونچھتی منت بھرے لہجے میں کہہ رہی
ہو تیں۔ ایک شام اس نے ہمت مجتمع کر کے ابا کے

کمرے کا ایک سٹیشن ریسور تب اٹھایا، جب ابا سو
رہے تھے اور مٹی لوٹک روم میں بیٹھی پاکستان بات
کر رہی تھیں۔
”کوئی ضرورت نہیں ہے سین! بابا بالکل ٹھیک
ہیں۔ تم یہاں آنے کا مت سوچو۔“ دوسری طرف
فرقان ماموں کہہ رہے تھے۔
”مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ میں آنا
چاہتی ہوں۔“

”ہرگز نہیں۔ تمہارے اس مغرور شوہر نے
مارے زبانی میں ہمیں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم
سارے ہی لوگوں سے اس بات پہ منہ چھپاتے پھرتے ہیں
کہ ہمارا بہنوئی مغرور ہے اور سیاسی پناہ لے کر رہا
ہے۔ اب تم آؤ گی تو ساری دنیا کیا کہے گی؟“

”مجھے ابا سے زیادہ کسی کی پروا نہیں ہے اور سکندر
میرے ساتھ تو نہیں آ رہے۔ میں بس ایک دن کے
لیے آجاتی ہوں، اگر رشتہ داروں سے سامنا ہو گیا تب
بھی وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ابا سے ملنے آنے پہ
کون مجھ پہ انگلی اٹھا سکتا ہے بھائی؟“ مٹی کو ماموں کی
بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”میری بات سنو سین! ہم نے تمہارے شوہر کے
اس کارنامے کے بعد لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ سکندر
ذلت و شرمندگی کے باعث ساری زندگی پاکستان کا رخ
نہیں کر سکتا۔ آخر کار نامہ بھی تو خاصا شرم ناک انجام
دیا ہے نا۔ ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے تم لوگوں سے
قطع تعلق کر لیا ہے۔“

فون لائن پہ چند لمحے کو ایک ششدر سی خاموشی
چھا گئی، پھر مٹی کی ڈوبتی آواز سنائی دی۔

”آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں بھائی؟ میں آپ کی بہن
ہوں، آپ مجھے یوں ڈس اون نہیں کر سکتے۔
ہمارے ہمارے بچوں کا رشتہ ہوا ہے۔“

”سلیمان کی بیٹی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس رشتے
کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ ویسے بھی یہ تم نے
اپنی خود غرضی کے باعث کیا۔ تم جانتی تھی کہ سکندر
نے کیا کیا ہے اور تمہیں ڈر تھا کہ ہم لوگ تمہیں

چھوڑ نہ دیں اس لیے تم نے یہ رشتہ کیا۔“
”ہاں! میں نے دکھائی خود غرضی۔ ہاں! میں نے
چھپائی حقیقت۔ مگر میں نے یہ رشتہ جوڑنے کے لیے
کیا۔ صرف اس لیے کہ میں آپ سے نہ کٹوں۔ اب
آپ مجھے میرے باپ سے ملنے سے روک رہے ہیں۔
اس لیے کہ آپ لوگوں کے سامنے جھوٹے ثابت نہ
ہو جائیں؟“ مٹی دبی دبی چنچنی تھیں۔

”اگر تم اس طرح آؤ گی تو نہ صرف ہم میں سے کوئی
تمہیں لینے نہیں جائے گا، بلکہ ہم واقعتاً تمہارے
ساتھ قطع تعلق کر لیں گے اور جب ابا جان کو یہ معلوم
ہو گا تو ان پہ کیا گزرے گی، یہ سوچ لینا اور یہ بھی کہ اگر
ان کو کچھ ہوا تو اس کی ذمہ دار صرف اور صرف تم
ہو گی۔“

”بھائی!“ مٹی کہتی رہ گئیں مگر دوسری طرف سے
فون رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے مٹی کے ریسور رکھنے کا
انتظار کیا۔ پھر آہستہ سے فون رکھ کر باہر آیا۔ مٹی
صوفے پہ بیٹھی، سر ہاتھوں میں دیے، دبی دبی سسکیوں
سے رو رہی تھیں۔

اس نے ٹشو کے ڈبے سے دو ٹشو نکالے اور ان کے
سامنے لا کر دیے۔ مٹی نے پھیکا چہرہ اٹھایا۔

”مٹی! آپ ماموں کی بات نہ سنیں، ہم پاکستان
ضرور جائیں گے۔ اگر وہ ہمیں لینے نہیں آئیں گے تو
ہمارے پاس ان کا ایڈریس ہے، ہم کیب کر کے ان کے
گھر چلے جائیں گے۔“

وہ بس نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ شاید
انہیں معلوم تھا کہ وہ دوسرے فون پہ سب سنتا رہا
ہے۔

”ہم ان کے گھر جائیں گے، مگر ہم وہاں کچھ کھائیں
گے نہیں۔“ اس نے جیسے انہیں یاد دلایا۔ وہ آنسوؤں
کے درمیان ہلکا سا مسکراہٹیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔
تب اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں مسکراتی ہیں۔
بہت سال بعد اسے احساس ہوا کہ وہ شاید اپنے کم عمر
بیٹے کی خود داری اور عزت نفس کے پاس پہ نخر سے
مسکراتی تھیں۔

مئی نے ماموؤں کی ایک نہیں سنی۔ انہوں نے مئیے جوڑنے شروع کیے۔ وہ زیور جو انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے رکھا ہوا تھا، وہ بھی بیچ دیا۔ اب وہ صرف روائی کے انتظامات میں لگی تھیں۔ ابا کی طبیعت بہت بگڑتی جا رہی تھی۔ مئی کو ان کے ساتھ کسی کے رہنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ ابھی روائی میں دو دن تھے کہ ماموؤں کا فون آگیا۔ نانا جان کا انتقال ہو گیا تھا۔

مئی کے لیے نانا کے انتقال کی خبر کا صدمہ اس صدمے سے کہیں چھوٹا تھا جو انہیں یہ جان کر لگا تھا کہ نانا کا انتقال اس روز نہیں بلکہ ایک ہفتہ قبل ہوا تھا، مگر چونکہ مئی کے آنے سے ماموؤں کی عزت اور شان پہ انگلی اٹھائی جانے کا خدشہ تھا، اس لیے ان کو اطلاع ہی دیر سے دی گئی، تاکہ وہ ان کی وفات کی رسومات میں بھی شامل نہ ہو سکیں۔

وہ انٹرنیٹ کا دور نہیں تھا، خط اور فون کا زمانہ تھا، مگر مئی کا نمبر اور ایڈریس (بہت دفعہ گھریلے اور دیگر رشتہ داروں سے رابطہ نہ رکھنے کے باعث) فقط ماموؤں کے پاس تھا۔ اس لیے کسی اور سے بھی اطلاع نہ پہنچ سکی۔ اس روز اس نے پہلی دفعہ اپنی بہت صبر والی مضبوط ماں کو جن کی سسکیوں کی آواز سانس کی آواز سے اونچی نہیں ہوتی تھی، پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح روتے دیکھا۔ ان کا تو جیسے سب کچھ لٹ گیا تھا۔ ان کے پاس رونے کو بہت سے غم تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کس بات کا ماتم کریں۔ باپ کے مرنے کا، یا بھائیوں کے رویے کا۔

دو روز تک وہ ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہ سکیں۔ وہ بس خاموشی سے ان کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ تیسرے روز وہ علی کرامت کی مئی کو بلا لایا۔ وہ آئیں اور مئی کو تسلی دینے لگیں۔ مئی ذرا سنبھل گئیں۔ انہوں نے کھانا بھی کھا لیا۔ مگر ان کے جانے کے بعد وہ اس سے بولیں۔

”سنو جہان! میرا خیال تھا کہ تم راز رکھنا جانتے ہو۔ ہمارے مسئلے اور ہماری پریشانیوں بھی راز ہی ہوتی ہیں۔ ان کا دو سروں کے سامنے اشتہار نہیں لگاتے بیٹا!

جو انسان اپنے آنسو دو سروں سے صاف کروانا ہے خود کو بے عزت کر دیتا ہے اور جو اپنے آنسو خود پونچھ رہا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط بن جاتا ہے۔“

اس نے خفت سے سر ہلا دیا۔ یہ بات اس نے اپنے ذہن میں دل میں اور ہاتھ کی لکیروں میں نقش کر لی کہ اسے اپنے مسئلے خود ہی اکیلے اور تنہا حل کرنے ہیں۔ کبھی بھی لوگوں کو بتا کر نہ ہمدردی ملتی ہے اور نہ ہی تحسین مانگنی ہے۔

مئی نے پاکستان جانے کا ارادہ بدل دیا۔ نانا جان رہے نہیں اور جن لوگوں کے دل میں ان کی اور ان کے شوہر کی عزت و حرمت نہ تھی، ان لوگوں کے درمیان جا کر وہ کیا کرتیں؟

دوبارہ وہ اس کے سامنے نہیں روئیں، مگر اب وہ بہت دکھی رہنے لگی تھیں۔

ابا کی طبیعت ان ڈراؤنے خوابوں سے بگڑنے لگی تھی، جو ان کو اب ”قربا“ ہر رات ستاتے تھے۔ کچھ خواب تو اسے بھی آتے تھے، مگر اس کے خواب میں اس کو ملامت نہیں کیا جاتا تھا، بس وہ آواز۔ وہ پاک اسپانی، وہ گھوڑا، وہ فوارہ۔ وہ سارا منظر پھر سے مانہ ہو جاتا، ایسے جیسے زخم تازہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کیا دیکھتے تھے، مگر وہ اکثر راتوں کو جاگ کر چیخا چلاتا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مئی کے چہرے پر کوئی نشان دیکھتا تو جان جاتا کہ ابا نے ہاتھ میں اٹھائی چیز ان کو دے ماری ہوگی، مگر مئی کوئی شکایت نہیں کرتی تھیں۔

یہ وہ سکندر احمد شاہ نہیں تھے جنہوں نے اپنے ملک سے غداری کی تھی۔ یہ ایک ذہنی مریض قابل رحم آدمی تھے اور اب انہیں مئی کی ضرورت تھی۔

پھر کچھ عرصہ وہ اسپتال بھی داخل رہے، پھر جب واپس آئے تو ان کو مستقل رکھنا پڑا۔ یہ دو آئیں ان کو سارا دن خاموش اور پرسکون رکھتیں، چاہے وہ جاگ رہے ہوتے یا سو رہے ہوتے۔ کچھ ہی عرصے بعد لبا ایک انسان سے ایک ایسے مریض بن گئے تھے جو کمرے تک محدود ہو گئے۔ ہاں، ہر پندرہ بیس دن بعد ایک دورہ ان کو پڑتا اور وہ توڑ پھوڑ کرتے، چیختے چلاتے

مگر مئی سنبھال لیتیں۔ اپنے مسئلے خود ہی حل کرتے کرتے وہ پہلے سے بہت مضبوط ہو گئی تھیں۔



کرامت بے کی دکان چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد اس نے ایک چالی ساز کے پاس نوکری کر لی تھی۔ شام میں اب وہ اس کی دکان پہ جاتا جو ان کے گھر سے دس منٹ کے پیدل راستے پہ تھی۔ اگر اسے کسی کام میں مڑا آتا تھا تو وہ چابیاں بنانے میں تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ صرف سیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ عام چابیوں کے بعد وہ چاندنی تالوں اور پیچیدہ اقسام کے سیف کی نجی سازی لینے لگا۔ اس کے پاس لائبریری سے لی گئی ان کتابوں کا ذخیرہ ہوا کرتا تھا، جن میں لاک توڑنے یا نجی سازی کے متعلق کوئی بھی معلومات ہوتی۔ بہت مہارت سے یہ ضرب لگائے تالا توڑنا، چاہے وہ ماسٹر کی سے یا لوہے کا بن سے، وہ اس فن میں طاق ہوتا جا رہا تھا۔

ان سب مشغلوں کا اثر اس کی پڑھائی پہ البتہ ضرور پڑا۔ وہ کبھی کبھی بہت لائق قسم کا طالب علم نہیں بن سکتا۔ اس کے گریڈز ہمیشہ میڈیم رہے۔ وہ ذہین تھا، مگر اس کو پڑھائی میں دلچسپی نہ تھی۔ دوسرے کام اسے زیادہ دلچسپ لگتے تھے۔

اس کی چودھویں سالگرہ گزرے زیادہ وقت نہیں بیتا تھا۔ جب فرقان ماموؤں نے اطلاع دی کہ وہ اور سلیمان ماموؤں ترکی آرہے ہیں۔ خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے، اس نے یہ دیکھ لیا۔ مئی پرانی تلخیاں بھلا کر ان کے آنے کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ انہوں نے جیسے دل سے ماموؤں کو معاف کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں ماموؤں ان کے اس سوال کے جواب میں یہاں آرہے تھے جو چند روز پہلے انہوں نے فون پہ ان سے پوچھا تھا کہ اگر وہ اور جہان، سکندر شاہ کو لے کر پاکستان آئیں اور ان کا مقدمہ لڑیں تو کیا ماموؤں ان کو سوشل سپورٹ دیں گے۔ مالی مدد کا ایک ٹکا نہیں چاہیے تھا انہیں، بس ماموؤں کا ساتھ درکار تھا۔ فرقان ماموؤں جو اب ”خاموش“ ہو گئے تھے، پھر انہوں نے

بتایا کہ وہ اور سلیمان کچھ روز تک آئیں گے، تب اس بارے میں بات کریں گے۔

مئی کی اور بات بھی، مگر اس کا دل اپنے ماموؤں سے اتنا بدظن ہو چکا تھا کہ اسے ان کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے ہوئے مئی کو سنتا رہتا جو اب اٹھتے بیٹھتے کہا کرتیں۔ ”ہم پاکستان ضرور واپس جائیں گے، اتنے برس ہو چکے ہیں، لوگ بھول بھال گئے ہوں گے۔ اب یہ جلا وطنی ختم ہونی چاہیے۔ بھائی ضرور میرا ساتھ دیں گے۔ میرے بھائی بہت۔“

اور مئی ڈھونڈ ڈھونڈ کر ماموؤں کی خوبیاں گنواتی رہتیں۔ اس نے بہت عرصہ بعد انہیں اس طرح خوش اور پر امید دیکھا تھا۔ وہ انہیں کہہ نہیں سکا کہ اپنے مسائل کے حل کے لیے انہیں اب دو سروں کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ انہیں اپنی کئی بات یاد رکھنی چاہیے، مگر مئی بھائیوں کے نرم رویے دیکھ کر انہیں دو سروں کی فہرست سے نکال کر اپنوں میں لے آئی تھیں۔

اس میں ہمت نہیں تھی کہ یہ سب کہہ کر ماں کو مغموم کرے۔ ابا کا ہونا، نہ ہونا برابر تھا، مگر مئی اس کے لیے سب کچھ تھیں۔ ان کی مشقت، محنت، قربانیاں اور ایک کمزور عورت سے ایک مضبوط عورت میں ارتقا کا عمل جو اس نے عمر کی منزلیں طے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے بہت دعا کی کہ مئی دکھی نہ ہوں، مگر اسے لگتا تھا کہ مئی غلط لوگوں سے امید لگا کر دکھی ضرور ہوں گی۔ لیکن جو ہوا، وہ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دونوں ماموؤں آ ہی گئے دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ برتن اٹھا کر انہیں پکچن کے سنک میں دھونے کے لیے جمع کر رہا تھا تو مئی اور ماموؤں کے درمیان ہونے والی گفتگو اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ ”بالکل“ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تم لوگ پاکستان آ جاؤ۔“ صوفیہ بہت کڑو فرے بیٹھے رعب دار سے فرقان ماموؤں کہہ رہے تھے۔ ان کی بات پہ

بچن میں کھڑا جہان تو ایک طرف، مئی بھی حیرت زدہ رہ گئیں۔ اتنی جلدی ماموں ماں جائیں گے، ان دونوں نے نہیں سوچا تھا۔

”تم لوگ ہمارے ساتھ آکر رہو۔ وہ سب تمہارا ہی ہے سین! پرانی باتیں بھول جاؤ، آگے کی سوچو۔ جہان کی پوری زندگی پڑی ہے۔ وہ بھی وہیں پڑھ لے گا، پھر ہائی اسکول کے بعد ہم اسے باہر بھیج دیں گے، کسی بہت اچھی یونیورسٹی میں۔ آخر وہ ہمارا بیٹا ہے اور پھر ہمارا داماد بھی تو بنے گا۔“

فرقان ماموں نے کہتے ہوئے ایک نظر سلیمان ماموں پر ڈالی۔ انہوں نے تائیدی انداز میں سرکواشات میں جھپٹ دی۔ وہ ایسے ہی تھے بڑے بھائی کے ادب میں ان کی ہر بات کی تائید کرنے والے۔

”تم جہان کی زندگی کا سوچو سین! اس کو ایک بہترین مستقبل دو، ہم اس کے بڑے ہیں، ہم اس کو باپ بن کر پالیں گے۔“

باپ بن کر؟ وہ بالکل ٹھہر گیا۔ اس نے تل بند کر دیا۔ لاؤنج میں خاموشی تھی، مگر ایک آواز اب بھی آرہی تھی۔ جو بند تل کے منہ سے قطرے ٹپکنے کی ہوتی ہے، جو اس کی ماں کی ساری امیدوں، خوابوں اور توقعات کے بننے کی تھی۔ اسے ماموں کی بات ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آئی تھی، مگر کئی دن سے خود کو ہلانے والی اس کی ماں فوراً سمجھ گئی تھی۔

جب مئی بولیں تو ان کی آواز میں بھائیوں کی محبت کو ترسی، رشتوں پر مان رکھنے والی عورت نہیں، بلکہ ایک خوددار عورت کی جھلک تھی، جس کے نزدیک اپنے گھر کی خودداری سب سے بڑھ کر تھی۔

”میرے بیٹے کا باپ ابھی زندہ ہے بھائی! اور اس کی ماں۔ ہاتھ بھی سلامت ہیں۔ میں خود محنت کر کے اسے پاکستان بھی لے جاسکتی ہوں اور سکندر کا کیس بھی لڑ سکتی ہوں۔ مجھے سکندر کو مظلوم ثابت نہیں کرنا، بلکہ بیماری کے باعث سزا میں کمی کی اپیل کرنی ہے اور مجھے آپ سے مورل سپورٹ کے علاوہ کچھ نہیں درکار تھا۔“

”تم ایک انتہائی ضدی عورت ہو۔“ فرقان ماموں ایک دم بھڑک اٹھے تھے۔ ”جس مغرور اور بددل آدمی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا، تم اس کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟ تم اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“

”وہ آدمی میرا شوہر ہے اور بیمار ہے۔ وہ مجھ پر انحصار کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں میں اسے چھوڑ دوں؟“

”اس کا فیصلہ کرنے والے آپ یا میں نہیں عدالت ہے اور اب تو وہ بیمار ہیں۔ ان کو میں کس طرح اکیلا چھوڑ سکتی ہوں؟ نفرت گناہ سے کی جاتی ہے گناہ گار سے تو نہیں۔“

”یعنی کہ تم اس کو ہر جرم سے بری الذمہ قرار دے رہی ہو؟“ ماموں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

”میں یہ نہیں کہہ رہی، لیکن آپ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ہم نے جلا وطنی کالی ہے اور کئی برس کالی ہے۔ اب وہ بیمار ہیں۔ سکندر وہ انسان نہیں رہے جنہوں نے جرم کیا تھا، وہ صرف ایک مریض رہ گئے ہیں۔ آپ مجھ سے یہ کہہ بھی کیسے سکتے ہیں کہ میں انہیں چھوڑ دوں؟“ مئی کی آنکھیں حیرت اور دکھ سے بھر گئیں۔

”اگر تم یوں اس کا ساتھ دو گی تو تم ہر رشتہ کھودو گی۔ سب تم سے دور ہو جائیں گے سین! تم غلط کر رہی ہو۔“ سلیمان ماموں نے دھیمے مگر افسردہ انداز میں کہا۔

”اگر میری فیملی کو کاٹ کر سب مجھ سے خوش رہتے ہیں تو مجھے یہ خوشی نہیں چاہیے نہ ہی ایسے رشتے۔“ انہوں نے اپنی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکنے دیا۔ رندھی ہوئی آواز میں وہ سر اٹھا کر مضبوطی سے بولی تھیں۔

”تم ہماری بات مان لیتیں۔ سکندر سے طلاق لے کر ہمارے ساتھ چلتیں تو ہم تمہارے بیٹے کو بھی بڑھاتے اور اسے سر اٹھا کر جینے کے قابل بناتے لیکن اگر تم ہماری بات یوں رد کرو گی تو ہم بھی کبھی تمہارا ساتھ نہیں دے پائیں گے۔“ فرقان ماموں کا انداز دو ٹوک اور مزید سخت ہو گیا تھا۔ وہ ترکی فتح حاصل

کرنے آئے تھے ماکہ جب بسن کو اپنے ساتھ واپس لے کر جائیں تو سر اٹھا کر لوگوں سے کہہ سکیں کہ انہوں نے ایک قابل نفرت آدمی کو اپنے خاندان سے نکال پھینکا اور پھر بسن بھانجے کے سر پر ہاتھ رکھنے پر انہیں تحسین و تمنے بھی مل جائیں مگر مئی کو اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے یہ مظلوم، ترحم آمیز کردار منظور نہ تھا۔ سر اٹھا کر جینا چاہتی تھیں۔

”پہلے بھی آپ نے کب میرا ساتھ دیا جو اگر اب نہیں دیں گے تو کوئی فرق پڑے گا۔“

”تم رشتوں کو کھو کر پچھتاؤ گی۔“

”میں رشتوں کو جان کر بھی پچھتا ہی رہی ہوں بھائی! کتنے ہی سیاست دان ہیں جو ملک سے غداری کر کے باہر چلے جاتے ہیں، مگر ان کی واپسی پر آپ ہی ان کو ووٹ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ امیر لوگ ہوتے ہیں ہم آپ کی نظروں میں معیوب اس لیے ہیں کیونکہ ہم غریب ہیں۔ ہمارے پاس ترکی میں لمبی چوڑی جائیداد نہیں ہے۔ کوئی بہت اونچا سوشل اسٹیٹس نہیں ہے اگر ہوتا تو آپ کبھی ہم سے یوں قطع تعلق نہ کرتے۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں رہو گی تو کیا عزت سے رہو گی؟ نہیں۔ تم ہمیشہ معیوب ہی رہو گی۔ ایک مغرور قوی مجرم کی بیوی بن کر ذلیل ہو گی ہمیشہ۔“

فرقان ماموں غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلیمان ماموں بھی ساتھ ہی اٹھے۔ ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ بڑے ماموں سے متفق ہیں۔ البتہ ان کو اس طریقہ کار سے اختلاف تھا، لیکن وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔

”اور تم۔“ بڑے ماموں کی نظر بچن کے دروازے میں کھڑے اس دبلے پتلے لڑکے پر پڑی تو انہوں نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں عزت سے جی سکو گے؟ کبھی نہیں۔ تم ذلیل ہو گے۔ تم خوار ہو گے، کیونکہ تمہارا باپ تمہارے نام پر ایک شرمناک دھبہ ہے۔ تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تمہارے باپ کا نام تمہارا سر ہمیشہ شرم سے

جھکا رہا ہے گا۔ تم کتوں کی سی زندگی گزارو گے۔ کبھی عزت اور وقار سے اپنے ملک کا رخ نہیں کر سکو گے۔“

وہ غصے میں بولتے کانپنے لگے تھے اور کانپ تو اس کا دل بھی رہا تھا۔ وہ بہت ہراساں سا دروازے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا تھا۔

”بس کریں بھائی! میرے بیٹے کو یوں نارحمت کریں!“ اس نے اپنی ماں کو اپنے سامنے آکر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا قد اپنی ماں سے ذرا سا اونچا تھا، پھر بھی وہ اس کے سامنے ایک ڈھال تھیں۔

”کیوں؟ اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ اس کی ماں نے اس کے لیے کتنا غلط فیصلہ کیا ہے۔ میں نے تمہیں ایک آپشن دیا تھا، جو تمہارے بیٹے کے لیے اپنے ملک عزت سے لوٹنے کا واحد راستہ تھا، مگر تم نے وہ ٹھکرا دیا۔ تم نے اپنی ضد کی وجہ سے اس کی زندگی بھی جنم بنا دی ہے۔“

”میں اس کی زندگی جنم نہیں بننے دوں گی۔ سنا آپ نے؟ یہ سر اٹھا کر جیے گا۔ یہ مہاجر احمد کا پوتا ہے۔ یہ ان ہی کی طرح فوج میں جائے گا۔ مجھے آپ کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھیجوں گی اپنے بیٹے کو فوج میں اور آپ دیکھیے گا، میرا بیٹا ایک دن سر اٹھا کر ضرور جیے گا۔“ اس نے اپنی نرم خویاں کو اپنے سامنے ڈھال بن کر کہتے سنا۔

”فوج؟ مائی فٹ!“ فرقان ماموں نے میز پر رکھا اپنا سگریٹ لائٹر اٹھاتے ہوئے استہزا سے سر جھٹکا۔ ”تم بھول رہی ہو سین! تمہارا بیٹا ”غدار کا بیٹا“ ہے اور غدار کے بیٹے کو فوج میں کبھی نوکری نہیں ملتی۔ ارے! وہ تو اسے چھاؤنی کے قریب بھی نہیں ٹھکنے دیں گے اس لیے ایسی کوشش بھی مت کرنا اور اگر کرنے کے بعد بے عزت کر کے نکالے جاؤ تو مدد کے لیے میرا دروازہ نہ کھٹکھٹانا۔“

بات کرتے ہوئے انہوں نے اپنی شعلہ بارنگاہوں کا رخ جہان کی طرف کیا جو بالکل دم سا دھم انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی طرح انگشت شہادت اٹھائے انہوں

نے اسے ان آخری الفاظ سے متنبہ کیا جو ایک عمر اس کے ذہن میں گونجتے رہے تھے۔
”تم لوگوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب تمہیں مدد چاہیے ہو تو ہمارے پاس مت آنا۔ ہمارا در مت کھٹکھٹانا، لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد پچھتاؤں گا شکار ہو کر ہمارے دروازے پہ ضرور آؤ گے۔“ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ ملال زدہ سے سلیمان ماموں بھی ان کے پیچھے ہو لیے۔

مئی سرہاتھوں میں لیے صوفے پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئیں اور وہ اسی طرح بت بنا کچن کی چوکھٹ پہ کھڑا رہا۔ فرقان ماموں کے الفاظ نے اس کا اندر باہر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اتنی ذلت، اتنی بے عزتی، کتوں کی سی زندگی گزارنے کی بددعا۔ ماموں نے اپنی زخمی انا کی تسکین کے لیے کیا کچھ نہیں کہہ دیا تھا۔ تب اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی سر اٹھا کر نہیں جی پائے گا۔ وہ فوجی چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا، پاک اسپائی بننا تو پھر دور کی بات تھی۔ یہ احساس ہی اس کے سارے خوابوں کو ڈبو گیا۔ کئی دن تک تو وہ اور مئی نارمل ہی نہیں ہو سکے۔ دونوں چپ چپ سے رہتے تھے، ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے، اپنے کام پھناتے رہتے۔ آہ، وہ بہت تکلیف دہ دن تھے۔

مگر مئی روئیں نہیں۔ انہوں نے اپنا کام برہمالیا۔ اس نے بھی اپنے کام کا دائرہ کار برہمالیا۔ ابا کی بیماری بھی بڑھتی گئی۔ کبھی کبھی تو وہ بہت ہی قابو سے باہر ہو جاتے۔ چیختے چلاتے، ہاتھ میں آئی چیز دے مارتے، ان بلیو پرنٹس کا ذکر کرتے جو انہوں نے آگے بھیجے تھے۔ اس پاک اسپائی کا ذکر کرتے جس کو انہوں نے قتل کیا تھا، مگر اب مئی اور وہ انہیں سنبھال لیا کرتے۔ بس خود کو سنبھالنے میں انہیں بہت عرصہ لگا تھا۔ کہنے والے تو کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، مگر سننے والوں کے لیے وہ باتیں ساری زندگی کے لیے ایک چیمبن بن جاتی ہیں۔

وقت پھر بھی گزر رہا تھا۔ باسفورس کے پل تلے پانی بہتا گیا۔ سمندری بگلے استنبول کے اوپر پرواز کرتے

رہے۔

وہ ہائی اسکول کے آخری سال میں تھا، جب ہیون نے آکر اسے اطلاع دی کہ ہاؤس ماسٹر کے آفس میں کوئی ملاقاتی اس کا منتظر ہے۔ وہ ابھٹا ہوا کلاس سے نکلا اور ہاؤس ماسٹر کے آفس کے دروازے تک آیا۔ اندر جیسے کوئی طوفان بد تمیزی مچا ہوا تھا۔

ہاؤس ماسٹر کے آفس کے اندر جیسے کوئی طوفان بد تمیزی مچا ہوا تھا۔

کھلی درازیں، بکھرے کانڈ، ہر چیز الٹ پلٹ پڑی تھی۔ ہاؤس ماسٹر احمیت طور پریشانی کے عالم میں ایک دراز کھنگال رہے تھے۔ ان کا اسٹنٹ دوسری دراز کی چیزیں نکال نکال کر باہر رکھ رہا تھا۔ ذرا دور رکھی — کرسی پہ ایک صاحب خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ”آخر چابی گئی کدھر؟“ احمیت بے جھنجھلا کر کہہ رہے تھے۔ جہان کی نظریں دیوار کے ساتھ لگے لاکر پہ پھسل گئیں، جو مقفل تھا۔ یقیناً ”اس کی چابی نہیں مل رہی تھی۔“

”بولو! ہاؤ! اب میں ہیڈ ماسٹر کو کیا کہوں کہ میرے اسٹنٹ کی لاپرواہی کی وجہ سے لاکر نہیں کھل رہا اور فائل نہیں نکالی جاسکتی؟“ اپنی جھنجھلاہٹ اور پریشانی میں انہوں نے دروازے میں کھڑے لڑکے کو نہیں دیکھا تھا۔

”سر! میں نے یہیں رکھی تھی میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ ابھی۔“ اسٹنٹ کی بات کو فون کی کھنٹی نے کاٹا۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔

”جی جی سر! بس احمیت بے آپ کے پاس فائل لا رہے ہیں۔ جی بس ایک منٹ!“ بمشکل اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے اس نے فون پہ کہا اور پھر ہاؤس ماسٹر کو دیکھا جن کے سرخ پڑتے چہرے کے تاثرات ناقابل بیان ہو رہے تھے۔

”سر۔!“ اس نے انگلی کی پشت سے دروازہ بجایا۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جیسے انہیں بھول

گیا تھا کہ اسے وہاں کیوں بلایا گیا تھا۔ کرسی پہ بیٹھے صاحب نے بھی گردن پھیر کر اسے دیکھا تھا۔
”میں مدد کروں؟“
”نہیں!“ ان کے چہرے پہ الجھن در آئی۔

وہ خاموشی سے آگے آیا اور لاکر کے کی ہول کو انگلی سے چھو کر جیسے کچھ محسوس کیا۔ کمرے میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ ساری کھڑکیں، متحرک ہاتھ، سب ٹھہر گیا۔

اس نے پینٹ کی جیب سے تین پینیں نکالیں، پھر ان میں سے ایک الگ کی اور باقی واپس جیب میں ڈال دیں۔ آگے ہو کر اس نے وہ پین ترچھی کر کے کی ہول میں ڈالی، پھر گردن اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا۔

وہ تینوں نفوس جیسے دم سادھے اس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نچلا لب دانت سے دبائے، اپنے ہاتھ کو مخصوص سمتوں میں اوپر نیچے کر رہا تھا، جیسے موسیقی کا کوئی رد ہم ہو۔ چند لمحے سر کے اور کلک کی آواز کے ساتھ لاک کھل گیا۔ اس نے پھر گردن موڑ کر وال کلاک کو دیکھا۔ ایک منٹ اور گیارہ سیکنڈ لگے تھے اسے باؤسی ہوئی۔ شاپ پہ اس طرز کا سیف کھولنے میں اسے کم سے کم پچاس سے پچپن سیکنڈ لگتے تھے۔

اس نے ہینڈل اٹھایا۔ سیف کا دروازہ کھولا اور بہت ادب سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا۔

”تم نے۔۔۔ تم نے یہ کیسے کیا؟“ ہاؤس ماسٹر شذر تھے۔

”سر! اگر آپ میری کہانی سننے میں وقت ضائع کریں گے تو فائل ہیڈ ماسٹر کے پاس کب پہنچے گی؟“ کسی اچھے چابی ساز کی طرح اس نے اپنا راز نہیں کھولا۔

”کوہ ہاں!“ وہ پیشانی کو ہاتھ سے چھوتے اٹھے۔
”تمہارا شکر یہ یک منٹ!“

ان کے جانے کے بعد وہ ان صاحب کی جانب متوجہ ہوا جو کرسی پہ بیٹھے بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”نہیں جہان سکندر ہوں۔ آپ مجھ سے ملنے آئے

ہیں؟“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
”اسکول ریکارڈ میں تمہارا نام جہان سکندر احمد لکھا تھا، حالانکہ سکندر کا سر نیم ”شاہ“ ہے۔“
”احمد میرے دادا کا نام تھا، میں ان کا نام ساتھ لگاتا ہوں، مگر آپ میرے ابا کو کیسے جانتے ہیں؟“
بات کرتے ہوئے اس کے اندر کچھ اٹھل پھل سی ہوئی تھی۔ فرقان ماموں سے آخری ملاقات پھر سے تازہ ہو گئی۔ ان لوگوں کا سامنا کرنا جو اس سے اس کے باپ کے حوالے سے واقف ہوں، بہت اذیت ناک تھا۔

”ہم باہر چل کر بات کر سکتے ہیں؟“ وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ پلٹ گیا۔

”میں تمہارے ابا کا ایک زمانے میں بہت اچھا دوست رہا ہوں۔ کرنل رؤف گیلانی شاید تم نے میرا نام سنا ہو؟“ باہر اسکول کے فٹ بال کے میدان کے کنارے۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے بتایا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے غور سے ان کو دیکھا۔ وہ سفید اور کوٹ میں ملبوس اچھے قد کاٹھ کے مہذب سے انسان لگتے تھے۔ مگر ان کے چہرے پہ ایک نقاہت تھی اور ان کی آواز سے کمزوری جھلکتی تھی۔ اگر وہ ابا کے دوست تھے تو ان کو اتنا معمر نہیں لگنا چاہیے تھا، جتنے وہ لگ رہے تھے۔ شاید بیمار تھے۔ اسے بے اختیار دادا کا چہرہ یاد آیا جو ان کی زندگی کی آخری رات اس نے دیکھا تھا۔ تھکا زدہ، بیمار چہرہ۔

”تمہارے ابا قصور وار تھے مگر انہوں نے بہت کچھ میرے اوپر ڈال دیا اور ملک سے فرار ہو گئے۔ میں نے بے قصور ہوتے ہوئے بھی کئی سال نارچر سیل میں سزا کائی۔ تین برس ہوئے میں باعزت بری کر دیا گیا ہوں۔ سارے چار جزی ہٹ گئے ہیں۔ میرے بچے پھر سے سر اٹھانے کے قابل ہو گئے ہیں اور اب جب کہ میں علاج کے لیے لندن جا رہا تھا تو سوچا ایک دن کے لیے ترکی آجاؤں۔ اس لیے نہیں کہ میں سکندر کی بریادی کا تمنا نہ دیکھوں، بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔“

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جس شخص نے ان کی

زندگی کے کئی برس برباد کر دیے۔ اس کے بیٹے کو وہ کیوں دیکھنا چاہتے تھے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

”میرا بیٹا حماد بھی تمہاری عمر کا ہے۔ اس نے بھی بہت برا وقت گزارا ہے۔ میری بیوی نے بھی سزا کالی ہے۔ وہ بھی اتنے بے قصور تھے جتنے تم اور تمہاری والدہ۔“

”ہم سکندر شاہ کے گھر والے ہیں اور ہم یہ سب ڈیزرو کرتے ہیں۔ مجھے آپ کی ہمدردی نہیں چاہیے۔ اس کی آواز میں تلخی کھل گئی تھی۔

”نہیں تم یہ ڈیزرو نہیں کرتے تھے۔ جلا وطنی کی سزا سب سے اذیت ناک سزا ہوتی ہے۔ تم لوگوں نے بہت عرصہ یہ سزا کالی ہے۔ کیا اب وہ وقت نہیں آگیا کہ تم سر اٹھا کر جو جیسے اب حماد جیسے گا؟“

”اس کے فادر بے قصور تھے میرے قصور وار ہیں۔ میں کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکتا میں جانتا ہوں۔“ وہ دونوں ایک درخت تلے نصب بیچ پہ بیٹھ گئے تھے۔ سامنے سرسبز سامیان تھا جس پہ سورج کی کرنیں ترچھی ہو کر پڑ رہی تھیں۔ استنبول میں سرما کا سورج ایسا ہی ٹھنڈا ہوتا تھا۔

”مجھے تم سے ہمدردی نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہارا خیال ہے۔ میں نے اپنے گھر والوں کی اذیت دیکھی ہے بچے! اور میں آج تمہاری ماں سے جب ملا تو میں نے انہیں بھی اسی اذیت میں دیکھا۔ وہ سکندر کو نہیں چھوڑ سکتیں، مگر تم تو اپنے ملک واپس جاسکتے ہو۔“

”میں نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں میں کبھی فوج میں نہیں جاسکتا۔ مجھے وہ کبھی چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ میں پھر سے ذلیل ہونے وہاں نہیں جانا چاہتا۔“

وہ بہت تکلیف سے بول رہا تھا۔ فرقان ماموں کی باتیں کسی انی کی مانند ابھی تک دل میں گڑی تھیں۔

”یہ تمہیں کس نے کہا کہ تمہیں فون میں کمیشن نہیں مل سکتا؟“ وہ حیران ہوتے۔

”کیونکہ میں ایک غدار کا بیٹا ہوں اور غدار کے بیٹے

کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں کسی نے غلط گھڑا دیا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں نامور فوجی خدایوں کے نام گنوا سکتا ہوں۔ جن کے خاندان کے کتنے ہی لڑکے فوج میں کام کر رہے ہیں۔ اگر تم قاتل ہو اور تم ایک دفعہ پھر سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ رکھتے ہو تو تمہیں چاہیے کہ تم اپنے ملک واپس آ جاؤ۔“

وہ کئی ہی دیر بیٹھے اسے سمجھاتے رہے کہ اسے ایک دفعہ کوشش کرنا چاہیے اور پھر ملک کے لیے قاتل قدر خدمت سرانجام دے کر وہ اپنے خاندان کے نام پہ لگا دھبہ مٹا سکتا ہے۔ اچھائی برائی کو ڈھانپ دیتی ہے۔ ان کا اپنا بیٹا بھی اگلے سال آرمی میں کمیشن کے لیے درخواست دینے جا رہا تھا وہ بھی ہائی اسکول ختم کر کے ان کے پاس آ جائے اور ساتھ ہی امتحان دے۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اگر اسے کوئی شک و شبہ تھا کہ وہ دھوکے سے اس کے باپ کو ملک واپس لے جانے اور سزا دلوانے کے لیے یہ سب کر رہے تھے تو وہ زائل ہو گیا۔ پھر بھی اس نے ان کو کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ وہ اس سچ پہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ فرقان ماموں کی خواہش کے مطابق وہ کتوں کی طرح ذلیل ہو کر زندگی گزار تو رہے تھے، باعزت جینے کا حق ان کو نہیں تھا۔

سہ پہر میں جب وہ گھر لوٹا تو مٹی نے کرنل گیلانی کی آمد کا بتایا اور یہ بھی کہ وہ ان سے اسکول کا پتا پوچھ کر گئے تھے۔ ان کی فلائٹ شام میں تھی اور وہ آج ہی اس سے ملنا چاہتے تھے۔ پھر اس نے بھی سب کچھ بتا دیا۔

”مگر میں ادھر نہیں جاؤں گا۔ مجھے فرقان ماموں کے گھر نہیں جانا۔ میں ان لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملنا چاہوں گا۔“ اس نے اپنے تئیں بات ختم کر دی تو مٹی خاموش ہو گئیں۔

لیکن سوچیں خاموش نہیں ہوئیں۔ خواب خاموش نہیں ہوئے۔ وہ خواب کسی بوجھ کی طرح دل کو گھیرے رہا۔ کچھ دن بعد نیند میں وہ خود کو دیکھ پاتا۔ انطاکیہ میں وہ بڑا سا دالان عوارہ اور ساتھ کھڑا ٹھوڑا

لوہا جب وہ ملنے لگتا تو اسے پکارا جاتا۔ شعور کی منزلیں ملنے کرتے کرتے وہ خواب جو آغاز میں ”خوف“ تھا، اب ”دھم“ بنا گیا۔ جانے وہ کون تھا، اس نے اپنے انہوں سے اس وجہ سے آدمی کو دفنایا تھا، مگر وہ کبھی اس کے خاندان کو نہیں تلاش کر سکے گا۔ اس کی بیوی اپنے برسوں اس کی راہ نکلیں گے۔ حکومت، فوج، ایجنسی، کسی کو علم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کہاں دفن تھا۔ جاسوس کی زندگی، جاسوس کی موت، یہی تھی جاسوس کی قسمت۔

پھر کیوں جوانوں میں یہ ہمت ہوتی تھی کہ وہ اپنی گردنیں اللہ کے پاس رہن رکھ دیں؟ وہ کہاں سے یہ جذبہ اپنے اندر لاتے تھے کہ بناوردی، بنا تمغوں اور بنا ستاروں کے خود کو کسی عظیم مقصد کے لیے صرف کر دیں؟ چپ چاپ اپنا فرض نبھائیں اور چپ چاپ مرجائیں؟ بلاشبہ وہ عظیم لوگ تھے اور وہ ان میں سے کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بعض دفعہ انسان اپنے خواب کی شے میں ڈال کر ان کو سیل بند کر دیتا ہے۔ موم کی ایسی سیل جو کوئی کھول نہ سکے۔ اس نے بھی اپنے خواب مہر بند کر دیے تھے۔

پہ چند ماہ بعد کی بات تھی۔ ابھی اس کا ہائی اسکول ختم نہیں ہوا تھا کہ اسکول کا ایک ٹرپ انطاکیہ کے لیے پلان ہونے لگا۔ تاریخی اور قدیم شہر انطاکیہ جانے کے لیے تمام طلباء و طالبات بہت پر جوش تھے۔ وہ بھی تھا مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کو اپنے خوابوں سے بچنا چھڑانے کا راستہ نظر آ گیا تھا۔ مٹی سے اس نے بہت اصرار سے اس فارم ہاؤس کا پتا پوچھ لیا جس کے دالان میں فوارے کے ساتھ کچھ ”آثار“ منبت تھے۔ وہ ان آثار کو کھوجنا چاہتا تھا۔ اس نے مٹی کو کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی ابا کا راز اور نہ ہی اپنا ارادہ جو کہ اس فارم ہاؤس کے مالک کو یہ کہانی سنانے کا تھا کہ وہ اس جگہ کو اکثر خواب میں دیکھتا ہے، شاید یہاں کوئی دفن ہے۔ وہ اسے راضی کر لے گا، وہ اس جگہ کی کھدائی کرے، پھر جب وہ لوگ اس پاک اسپائی کی نعش ڈھونڈ لیں گے تو وہ پاکستانی سفارت خانے اطلاع کر دے گا۔

شاید اس کی نعش واپس پاکستان بھجوانے کی کوئی سبیل نکل آئے۔

اس وجہ سے صورت پاکستانی اسپائی کو اس کے خاندان کو واپس لوٹانے کا اس سے بہتر لائحہ عمل اسے نہیں معلوم تھا۔ بالآخر وہ اس قرض کو اتار دے گا جو دادانے کہا تھا کہ اس کے کندھوں پہ اگر اسے بالآخر وہ لپاکے راز کے بوجھ سے نجات حاصل کر لے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ نعش آج بھی ویسی ہی گرم اور نرم ہوگی۔ اس کا خون اب بھی بہہ رہا ہو گا اور اس کی گردن پہ اب بھی پسینے کے قطرے ہوں گے۔ شہید مرتے ٹھوڑا ہی ہیں۔ وہ تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

بہت دقتوں سے وقت نکال کر، ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس فارم ہاؤس پہنچا۔ اندر کا راستہ اسے ابھی تک یاد تھا۔ بس اس گیٹ کو عبور کر کے ذرا آگے جا کر دائیں طرف مڑ جائے گا تو وہاں سے فوارے والا دالان صاف نظر آئے گا۔ گیٹ سے وہ جگہ نظر نہیں آتی تھی سلازم نے اسے اندر آنے دیا اور فارم کے مالک کو بلانے چلا گیا۔ جہان ادھر نہیں رکا، وہ تیز قدموں اور دھڑکتے دل کے ساتھ بھاگتا ہوا آگے آیا اور عمارت کے دائیں جانب سے آٹھ ماہ دالان۔ مگر۔

وہ دالان کے عین سرے پہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ پھر بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ چند لمحے کے لیے ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

اس نے ہر چیز سوچی تھی، سوائے اس کے کہ آٹھ برس بیت چکے تھے۔ سامنے جہاں پہلے کچی مٹی کا وسیع احاطہ اور درمیان میں فوارہ تھا، اب وہاں ایک گہرا اور خوب لمبا چوڑا سا تالاب تھا۔

وہ بے دم سا گھٹنوں کے بل زمین پہ آگرا۔ تالاب؟ اتنا بڑا تالاب؟ اس کو تعمیر کرنے کے لیے تو کئی فٹ نیچے تک زمین کھودنی پڑی ہوگی تو کھدائی کے دوران اس نعش کا کیا بنا ہوگا؟

”آپ کو یقیناً خواب میں ایسا کچھ نظر آتا ہوگا، مگر یقین کریں اچار سال پہلے اس پوری جگہ کی کھدائی میرے سامنے ہوئی تھی میں ایک دن بھی مزدوروں

کے سرے نہیں ہٹا اور ہم نے بہت نیچے تک زمین کھودی تھی۔ یہاں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ انسانی لاش تو دور کی بات، کپڑے کا ٹکڑا بھی نہیں ملا۔

جب فارم کا مالک آیا تو اس کی کہانی سن کر بہت وثوق سے بتانے لگا۔ اس کے لہجے اور آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔

”ہاں! صرف ایک بات تھی۔“ وہ کہتے کہتے ذرا رکا اور پھر جیسے یاد کر کے بولا۔ ”اس جگہ کی مٹی بہت اچھی تھی۔ اس سے عجیب سی خوشبو آتی تھی۔ ایسی خوشبو جو ہم نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ اس کی وجہ میں شاید کبھی معلوم نہ کر سکیں۔“

بہت سے آسمانوں نے اپنے اندر اتارے تھے۔ وہ خوشبو کی وجہ جانتا تھا، مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پاک ایسائی کی نعش کہاں گئی مگر یہ تو طے تھا کہ اس زندگی میں وہ کبھی نہیں جان پائے گا اور طے تو یہ بھی تھا کہ اس نے اس پاک ایسائی کو ہمیشہ کے لیے کھود دیا ہے۔

اس واقعے نے اسے ایک بات سمجھادی تھی۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ جاسوس لاوارث خاموشی سے مرجاتا ہے تو وہ غلط تھا۔ اللہ بہت غیرت والا ہے۔ کسی کا احسان نہیں رکھتا۔ جو آدمی اس کے لیے جان دے دے وہ اسے لاوارث چھوڑ دے گا؟ اس کو اپنی زمین میں باعزت جگہ بھی نہیں دے گا؟ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا۔

اس روز اسے شدت سے فرقان ماموں کی باتیں یاد آئیں مگر آج ان باتوں کی تکلیف پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے۔

”تم ذلیل ہو گے، تم خوار ہو گے، تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تم کتوں کی سی ذلیل زندگی گزارو گے۔“

مگر اب بالآخر اس کے خوابوں پہ لگی موم کی مہر پھل گئی تھی۔ سارے خواب پھر سے لفافے سے باہر آ گئے تھے۔

نہیں، وہ ان کی باتوں کو درست ثابت نہیں ہونے دے گا۔

وہ واپس جائے گا اور وہ بہت محنت کرے گا۔ اپنے ملک سے وفاداری کا عہد نبھائے گا۔ یوں منہ پر مجرموں کی طرح ایک دوسرے ملک میں ساری زندگی چھپ کر نہیں گزار دے گا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر کیوں نہیں جی سکتا؟ نہیں، کتوں کی سی ذلیل و رسوا کن زندگی نہیں جیے گا۔ وہ حشر کے بڑے دن اپنے دادا کو کیا چہرہ دکھائے گا۔ اسے سرخرو ہونے کے لیے وہی نوکری کرنی تھی جو اس کے باپ نے کی، مگر اسے اپنے خاندان اور دادا کے نام پر سے ذلت کا دھبہ اتارنے کے لیے وہ نہیں کرنا تھا، جو اس کے باپ نے کیا۔ اس کو یہ ثابت کرنا تھا کہ اچھائی برائی کو رفع کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ سب کر کے دکھائے گا۔ وہ فرقان ماموں کو یہ ثابت کر کے دکھائے گا کہ وہ اپنے باپ جیسا نہیں ہے۔ ایک دن آئے گا جب وہ ان کے سامنے سر اٹھ کر کھڑا ہو گا۔ اس دن سرخرو ہو جائے گا اس کی ماں اور دادا سرخرو ہو جائیں گے۔

اپنے تمام تر عزم و ہمت کے باوجود ایک بات طے تھی۔ اگر وہ پاکستان جائے گا تو کرنل گیلانی کے پاس جائے گا یا کسی اور کے پاس یا فٹ پاتھ پہ رات بسر کر لے گا مگر ماموں کے گھر نہیں جائے گا۔

”تم نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب تمہیں مدد چاہیے ہو تو ہمارے پاس مت آنا۔ ہمارا در مت کھٹکھٹانا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد بچھتاؤں کا شکار ہو کر ہمارے دروازے پہ ضرور آؤ گے۔“ یہی کہا تھا نا انہوں نے۔ اب اس کی عزت اسی میں تھی کہ وہ ماموں کی طرف نہ جائے۔ اس کے لیے یہ عزت نفس کا مسئلہ تھا، مگر مٹی یہ سب کسی اور وجہ سے چاہتی تھیں۔

”میں ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ تم بھی فوج میں جاؤ اور میں تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں مگر میں نہیں چاہتی کہ تمہارے ماموں اس بارے میں کچھ جانیں۔ میں اپنے بھائیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اس چیز کو اپنی ٹھکست سمجھتے ہوئے ہر ممکن کوشش کریں گے کہ تمہیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ تم ان

کے سارے کے بغیر کچھ بن جاؤ اور سب سے بڑی بات آرمی میں کوئی عہدہ پالو، وہ یہ کبھی برواشت نہیں کریں گے۔ وہ تمہارے خلاف ہو کر تمہیں اپ سیٹ کر دیں گے۔“

”پھر ہم اسے راز کیسے رکھیں گے؟“ اس کی بات پہ مٹی مسکرائی تھیں۔

”نہیں! ایک نہ ایک دن ان کو پتا تو لگتا ہی ہے مگر جب تک تمہیں اس قابل ہو جانا چاہیے کہ تم ان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہو سکو۔ ویسے بھی ہر سال سیکڑوں کڈٹ بھرتی ہوتے ہیں تمہارے ماموں کو کیا معلوم کہ ان کے نام کیا ہیں اور وہ کون ہیں؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔ یہ اتنا مشکل بھی نہیں تھا، جتنا وہ پہلے سمجھ رہا تھا۔

”ہمارا استنبول میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ حلقہ احباب بھی تھوڑا سا ہے۔ میں سب کو کہہ دوں گی کہ تم انقرہ گئے ہو، وہاں کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔“

”نہیں! انقرہ میں سبجوق عمران کے کزنز پڑھتے ہیں، وہ میرے ہم عمر ہیں، انقرہ کہا تو پول کھل جائے گا۔ یونان ٹھیک رہے گا۔“ مٹی نے غم مسکرائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

”ہاں، تمہیں راز رکھنے آتے ہیں۔“

مٹی کے بقول، ماموں کے آس پاس خاندان میں دور دور تک کوئی فوج میں نہ تھا۔ وہ سب کاروباری لوگ تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں اگر کوئی آرمی فیملی تھی بھی تو سکندر شاہ کے مشہور زمانہ کیس کے بعد فرقان ماموں وغیرہ اب ایسے دوستوں سے احتراز برتتے ہیں۔ کرنل گیلانی ویسے بھی لاہور میں رہائش پذیر تھے، اب جب وہ پاکستان گیا تو اسے اپنے ماموں کے گھر نہیں جانا پڑا تھا۔

ان سب احتیاطی تدابیر کے باوجود اسے علم تھا کہ جلد یا بدیر فرقان ماموں جان لیں گے کہ وہ ادھر ہی ہے اور اس وقت کا سوچ کر وہ خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ مٹی کے

سامنے وہ ہمیشہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ یہ سب اپنی انا کے لیے کر رہا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی، اس کی عزت نفس بلاشبہ بہت مجروح ہوئی تھی، مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ اپنے ماموں کے سامنے خود کو بہت کمزور محسوس کرتا تھا۔ وہ واقعی ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے یہی خوف تھا کہ وہ اسے اس کے باپ کا طعنہ دیں گے اور وہ ایک دفعہ پھر ٹوٹ جائے گا۔

رونف گیلانی بہت اچھے اور دھیمے مزاج کے حامل انسان تھے۔ وہ ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس کے باپ کی ساری زیادتیاں نظر انداز کر کے انہوں نے اسے اپنے گھر جگہ دی اور پھر ہر موقع پر اس کی مدد کی۔ صرف مالی مدد وہ ان سے نہیں لیتا تھا، مگر اخلاقی طور پر وہ ہمیشہ اس کا سہارا بنے رہے۔ وہ اور حماد اکٹھے کڈٹ بھرتی ہوئے تھے اور ترقی کی منازل انہوں نے اکٹھے طے کی تھیں۔ وہ سکندر شاہ غدار کا بیٹا ہے، یہ بات کبھی بھی اس کے لیے تازیانہ نہیں بنائی گئی۔ اب رونف گیلانی ان کی بیگم ارسلہ عہداد اور اس کی چھوٹی بہن نور العین (یعنی) اس کے لیے دوسری فیملی کی طرح تھے۔ چھائی میں عمومی طور پر آپ کے اپنے کردار اور اعمال کو آپ کی پہچان کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، نہ کہ آپ کے برکھوں کے کردار اور اعمال کو۔ اس نے اپنا نام جہان ایس احمد لکھنا شروع کر دیا۔ زیادہ تر وہ اپنے سر تیم احمد کے ساتھ ہی پکارا جاتا تھا مگر جب کبھی پورا نام لکھنا یا بتانا ہوتا وہ جہان سکندر احمد ہی لکھا اور بتایا کرتا۔

کرنل گیلانی کہتے تھے، مسلمان اپنی زندگی میں اپنے باپ کے نام سے ہی پکارا جانا چاہیے اور باپ کا نام اسے کبھی اپنے نام کے آگے سے ہٹانا نہیں چاہیے، چاہے باپ جیسا بھی ہو۔ بہت عرصے بعد اس نے بالآخر اپنے احساس کمتری کو دبا لیا تھا۔ رشتے ختم نہیں کر سکا تھا۔ ختم کرنے اور دبانے میں خلیج جتنا فرق تھا، اور یہی فرق اس کی ذات میں ایک خلیج چھوڑ گیا تھا۔

وہ چلا گیا تو مٹی نے مصلح ”ماموں“ سے ٹیلی فونک

رابطہ استوار کر لیا، تاکہ اگر کبھی وہ یہ خبر جان لیں تو مئی کو معلوم ہو جائے اور ایک دفعہ فرقان ماموں نے باتوں باتوں میں کہہ بھی دیا کہ کسی نے ان سے استفسار کیا تھا کہ کیا کرتل سکندر کا بیٹا لاہور میں پوشڈ ہے؟ تو جواباً ماموں نے بہت فخر سے بتایا کہ ذلت و شرمندگی کے مارے سکندر شاہ کا خاندان کبھی بھی پاکستان کا رخ نہیں کرے گا۔ آخر کار نامہ بھی تو خاصا شرمناک سر انجام دیا تھا انہوں نے۔ وہ کوئی اور جہان ہو گا۔

مئی خاموش ہو گئیں، پھر انہوں نے ماموں کو یہی کہا کہ وہ کوئی اور ہی ہو گا۔ ماموں کے ذہن میں ایک غلط تصور قائم تھا کہ غدار کا بیٹا فوج میں کبھی بھرتی نہیں ہو سکتا اس لیے انہوں نے اس معاملے کی کبھی چھان پھٹک نہیں کی۔ شاید کچھ عرصے بعد وہ جان بھی لیتے، مگر تب تک اس کا تبادلہ وہاں ہو گیا، جہاں کبھی کوشش کرنے سے بھی پوسٹ نہیں ملتی اور جو خود کو ”منفیہ والوں“ میں شامل کروانے کی رتی بھر بھی کوشش نہ کرے وہ وہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ اب اس جاب کی ضرورت تھی کہ وہ اپنا سوشل سرکل محدود رکھے۔ منہ بند اور آنکھیں و کان کھلے رکھے اور اپنے کام کو بھی خفیہ رکھے۔

بالآخر وہ پچیس برس کی عمر میں چھ ماہ کی ٹریننگ چار ماہ دس دن میں مکمل کر کے ایک ایجنٹ بننے جا رہا تھا۔ پاکستانی جاسوس جس کا وہ ہمیشہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب اسے امید تھی کہ شاید وہ برسوں دیکھا جانے والا خواب اسے دکھائی دیتا بند ہو جائے۔ گوکہ اس کی شدت میں کمی آچکی تھی مگر ہر حال وہ اب بھی اس کے ماضی کا آسیب بن کر اس کے ساتھ تھا۔

فوج اور ایجنسی میں (اس زمانے میں) آپ کا ایک ہی ہدف ایک ہی دشمن ایک ہی تعصب ایک ہی نفرت کا منبع ہوتا تھا۔

Bloody Neighbours!

جس رات اسے پہلی دفعہ غیر قانونی طور پر بھارت جانا تھا، اس سے پچھلے روز اس کے انٹرکٹر کی موجودگی میں عرصے کے مطابق ڈاکٹر نے اس کی داہنی

طرف کی ایک ڈاڑھ نکال کر اس کی جگہ ایک پلاسٹک کی بنی مصنوعی ڈاڑھ لگا دی تھی جس میں سائنڈ سے بھرا کیپسول تھا۔ سائنڈ جو کنگ کنگ پوائزنز تھا۔ یہ کیپسول ایک شیشے کے خول میں بند تھا اور زبان کی مدد سے باہر نکل آتا تھا۔ اگر غلطی سے نکل لیا جائے تو جب تک شیشہ نہ ٹوٹے، یہ با آسانی کوئی نقصان دینے بغیر جسم سے گزر جاتا ہے۔ لیکن اگر چھالیا جائے تو شیشہ ٹوٹ جائے گا اور انسان چند لمحوں میں مر جائے گا۔ یہ اس لیے تھا کہ اگر کبھی وہ گرفتار ہو جائے اور تشدد برداشت نہ کر سکے اور اسے خدشہ ہو کہ مزید تشدد کی صورت میں وہ اپنے راز اگل دے گا، تو بہتر تھا کہ وہ اپنی اس زہر بھری ڈاڑھ کو نکال کر چھالے اور خاموشی سے جان دے دے۔

یہ اس سے بہتر تھا کہ وہ تفتیشی افسران کے سامنے بولنا شروع کرے، اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالے اور ملک کو نقصان پہنچائے۔ مرجانا، راز اگل دینے سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔

وہ سو سال انڈیا میں ایک دوسری شناخت کے ساتھ رہا۔ کور شناخت وہ جعلی شناخت ہوتی ہے جس کے ذریعے جاسوس اس معاشرے میں متعارف ہوتا ہے۔ ہر کور کے ساتھ ایک لیجنڈ بھی ہوتا ہے۔ لیجنڈ اس فرضی ماضی کو کہا جاتا ہے جو اس جعلی کور کے پیچھے گھڑا جاتا ہے، مثلاً یہ آدمی کہاں پیدا ہوا، کہاں سے گریجویٹ ہوا، سابقہ بیوی کا نام، وغیرہ۔ آپ کے پیچھے آپ کی ایجنسی اس لیجنڈ کو اتنے اچھے طریقے سے نبھاتی ہے کہ اگر کوئی آپ کے بارے میں تحقیق کرنے نکلے تو اس کو آپ کی جائے پیدائش کے اسپتال میں آپ کا نام رجسٹر میں لکھا بھی مل جائے گا، گریجویٹیشن سرٹیفکیٹ بھی وہ دیکھ لے گا اور آپ کی سابقہ بیوی سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ یہ سب تاش کے پتوں کے گھر کی مانند ہوتا تھا، جس کو بعض دفعہ ایک پھونک سی اڑا کر بھیر دیتی تھی۔ اس چیز کو ایجنٹ کا کوہلو (Cover blow) ہوتا کہتے تھے۔ سو سال اس کا اپنی ماں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کا

پاکستان میں صرف ایک شخص سے رابطہ تھا، جو اس کے ”پاس“ تھے۔ وہ لوگ اپنا پاس اس کنٹرول ریا پینڈر کو کہتے تھے جو ہمہ وقت جاسوس سے رابطے میں رہتا تھا۔ مئی کو کوئی پیغام دینا ہوتا تو پاس تک پہنچاتیں اور وہ اس تک پہنچاتے۔ پاس کی ہر بات ماننا فرض تھا۔ بعض دفعہ اچھے بھلے حالات میں بھی دو دو ماہ خاموشی سے گھر میں بیٹھے اور اپنی سرگرمیاں محدود کرنے کا حکم ملتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کرنا پڑتا۔ بعض دفعہ مسلسل کام کرنا ہوتا جس جو اوہرے حکم آئے وہی کرنا ہوتا تھا۔ ہوتے ہیں ناکچھ لوگ جو اپنی گردنیں اللہ کے پاس رہن رکھوا دیتے ہیں۔ اس نے بھی رکھوا دی تھی۔

اور اپنی گردن رہن رکھوانا کیا ہوتا ہے؟ یہ اس کو تب علم ہوا تھا، جب سو سال تک ریڈیڈنٹ اسپائی کے طور پر کام کرنے کے بعد ایک دن بہت اچانک وہ گرفتار ہو گیا تھا۔



اس نے ہمیشہ گرفتاری کے امکان کو مد نظر رکھا تھا مگر ڈی ایم آئی کی تحویل اور تشدد کیا ہوتا ہے، یہ اسے تب معلوم ہوا جب اس نے خود کو ان کی حراست میں پایا۔

ایک چھوٹے سے ڈھابے نما ہوٹل پہ وہ وقت مقرر ہے ”دوست“ سے ملنے آیا تھا۔ دوست سے مراد اس کا کوئی فریڈ یا عزیز نہیں جس سے اس کی دوستی تھی بلکہ وہ اپنے ملک کے ایجنٹس کو ”دوست“ کہا کرتے تھے۔ اس مقامی دوست کو اس تک چند اشیاء پہنچانی تھیں۔ وقت جگہ سب کچھ دوست کا مقرر کر دیتا تھا۔ وہ پہلے بھی اس ساٹھی جاسوس سے کئی بار مل چکا تھا۔ وہ تیس بیس برس کا خوش شکل سا پاکستانی تھا، جو بھارت میں بھارتیوں کی طرح ہی رہ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر کبھی جہان کو نہیں لگا تھا کہ یہی دوست اس کو یوں دھوکا دے گا۔

وقت مقرر ہے اسے بلا کر وہ خود نہیں آیا۔ البتہ ایک دم پیچھے سے کسی نے اس کے سر پہ کچھ دے مارا اور وہ

ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چند لمحے کے لیے واقعتاً ”سنبھل“ نہ سکا اور بس۔ وہ چند لمحے اسے زندگی کے بدترین دور میں لے گئے۔

ڈی ایم آئی کی تحویل جو جہنم سے بھی بدتر تھی۔ اس کی آنکھوں کو پٹی سے اور ہاتھوں کو پشت پہ لوہے کے کڑوں میں باندھ کر وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ اتنے سارے اہلکار تھے اور وہ اکیلا تھا۔ وہ ان سے نہیں لڑ سکتا تھا۔

اس پہلی ہی ضرب نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ بھارت کی ڈی ایم آئی ایسی منظم گرفتاریوں کے لیے بہت مشہور تھی۔

کہیں کسی عمارت کے اندر ایک کال کو ٹھہری نما سیل میں لے جا کر اس کی آنکھوں سے پٹی اتاری گئی، پھر ایک آفیسر نے اس کو بالوں سے پکڑ کر چہرہ اونچا کیا، اس دوران دو تین افراد نے پاؤں تک سے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا تاکہ وہ ہل نہ سکے۔ ایک نے منہ پہ لگی ٹیپ اتاری اور زبان اور تالو کے درمیان ایک بڑا سا لوہے کا ٹکڑا پھنسا دیا جس سے اس کا منہ کھل گیا۔ ایک آدمی نے اب پلاس کی قسم کے آلے سے اس کے ہر ایک دانت اور ڈاڑھ کو باری باری کھینچا۔ جیسے ہی وہ آلہ نکلی ڈاڑھ پہ آیا، زہر بھری ڈاڑھ کھینچ کر الگ ہو گئی۔

ایک وقت تھا جب بھارتی اور پاکستانی افسران اکٹھے اسکٹ لینڈ یارڈ کے افسران سے ایک ہی کلاس میں تربیت لیا کرتے تھے اور یہ نقلی ڈاڑھیں لگانے کا طریقہ وہیں ان کو سکھایا جاتا تھا۔ سو انہوں نے پاکستانی جاسوس کو گرفتار کرتے ہی سب سے پہلے اس کا فرار کا واحد راستہ ختم کیا، پھر چار افراد نے مکوں اور ٹھنڈوں سے مار مار کر اسے اتنا بے حال کر دیا کہ وہ ہل بھی نہ سکے۔ قریباً ”دو گھنٹے گزرے تھے کہ وہ واپس آئے“ اور دوبارہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے اپنے ساتھ چلاتے باہر لے گئے۔ کہیں وہ اپنے سیل سے تفتیشی سیل کا فاصلہ اور سمت نہ جان لے اور اس طرح فرار ہونے کا کوئی منصوبہ ترتیب دے لے، اس لیے اسے ہر چند

قدم بعد لٹو کی طرح گھمایا جاتا تاکہ وہ سمت کھوے اور پھر وہ آگے چلاتے۔ وہ جانتا تھا کہ تفتیشی سیل اس کے سیل سے قریب ہی ہے مگر وہ جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کر رہے تھے۔ وہ اپنے قدم گننے لگ گیا۔ "قریباً" ساتھ قدم کے بعد وہ اسے ایک کمرے میں لائے، کرسی پر بٹھایا اور ہاتھ پاؤں کرسی کے ساتھ باندھے پھر آنکھوں سے پٹی اتاری۔

تاریکی سے تیز روشنی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ سامنے میز پر ایک بڑے ریفلیکٹو میں لگا بلب روشنی کے ٹارچ کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ اس کی روشنی سے آنکھوں میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے بے اختیار چہرہ پیچھے کر کے آنکھیں سیکڑیں اور سامنے دیکھنا چاہا۔ میز کے اس پار دو افراد کرسیوں پر بیٹھے تھے جو اپنے جیلے اور شخصیت سے ڈی ایم آئی کے سینئر آفیسرز لگتے تھے۔ ایک آدمی اس کے دائیں جانب ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا، جیسے ہاتھوں میں کچھ چھپا رکھا ہو۔

وہاں ہونے والی تمام گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی۔ انہوں نے اس پہلی گفتگو میں اس کو بتایا کہ اس کے پاس فرار کا راستہ نہیں ہے۔ ان کی جیلوں سے مروہ یا لپانج ہو کر ہی لوگ نکلتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ پاک اسپاکی (پاکستانی جاسوس) ہے اس لیے وہ سب کچھ بتا دے۔ اس صورت میں وہ اس کے ساتھ رعایت برتیں گے۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی گرفتاری دوست کے کہنے پر عمل میں آئی ہے اس کے پاس تک کو معلوم نہ تھا کہ وہ دوست سے کدھر ملے گا۔ ڈھابے پر ملنے کا وقت صرف دوست کو معلوم تھا اور پھر جس منظم طریقے سے وہ گرفتار ہوا اوصاف ظاہر تھا کہ وہ بخوبی واقف ہیں کہ وہ جاسوس ہے لیکن اس کے پاس جو اسمگلروں والا کور تھا (یہ کہ وہ ایک اسمگلر ہے اور اس دوست نے کسی پرانے بدلے کے باعث اسے جاسوس کہہ کر پھنسوایا ہے) کو اسے اب مرتے دم تک قائم رکھنا تھا۔ اس کا انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔

نام؟ فرید حیات۔
قومیت؟ پاکستانی۔
دین؟ اسلام۔
شہر؟ سیالکوٹ۔

کس نے تربیت دی؟

"جدی پشتی اسمگلرز ہیں ہم ہمارے باپ دادا ہماری تربیت کرتے ہیں۔" اس نے اپنی انٹی بے نیازی سے کہا۔

"میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ایک موقع اور دیتا ہوں۔" اس رعب دار آفیسر نے غصے سے کہا تھا۔ "بتاؤ بھارت کس لیے آئے تھے؟"

"ہیروئن اسمگلنگ کے لیے۔"

افسر نے ایک انگلی سے اشارہ کیا اور جہان کے ساتھ کھڑے آدمی نے کمرے کے پیچھے چھپائے چڑے کے تلے سے ملتی جلتی شے پوری قوت سے اس کے پیٹ پر مار دی۔ ایک دو تین پوری تین ضربوں کے بعد اس کا دماغ جیسے گھوم گیا۔ وہ سر کے پچھلے حصے میں پڑنے والی بدترین ضرب تھی۔

"ہاں اب بولو! اس لیے آئے تھے؟"

"تمہاری ماں سے ملنے۔"

ایک دفعہ پھر ساتھ کھڑے آدمی نے اس کے سر پر وہ تلامارہ ایسے لگتا تھا جیسے کھال تک کٹ گئی ہو۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ وہ کرسی پر پیچھے بندھے ہاتھوں کے ساتھ آنکھیں سختی سے میچے ذرا سا کراہتا تھا۔ درد۔ تکلیف۔ جلن۔

"اب بتاؤ! اس لیے آئے تھے؟" وہ پھر پوچھ رہے تھے۔

ہریار اس نے وہی جواب دیا۔ تیرہ چودہ دفعہ انہوں نے سوال دہرایا اور اتنی ہی ضربیں اس کے سر پر پڑیں پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو وہ واپس اپنے سیل میں زمین پر لیٹا تھا۔ آنکھیں کھولنے پر ہر سودھند تھی۔ کانوں میں باقاعدہ آوازیں آرہی تھیں۔ سر اتادکھ رہا تھا کہ لگتا تھا

ابھی پھٹ جائے گا۔ کنپٹی کے قریب سے خون نکل کر چہرے پر جم گیا تھا۔ سر میں گومڑا اور جسم پر کئی جگہ نیل خچے جیسے اس کے بے ہوش ہونے کے بعد بھی وہ اسارتے رہے تھے۔

اس نے آنکھیں بند کیں تو وقت جیسے کئی برس پیچھے استنبول پہنچ گیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بگلوں کی طرف اچھالتے ہوئے سمندر کنارے چل رہا تھا۔ دادا بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح آگے نکل گئے تھے۔ پھر ایک دم وہ پیچھے مڑے اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"کل تمہاری ماں کی سالگرہ ہے۔ اسے تو یاد بھی نہیں ہو گا۔ ہر وقت کاموں میں جو ابھی رہتی ہے۔ یوں کرتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی تحفہ لے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک۔" اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ "مگر اس کو بتانا مت۔ کل اسے سر پر انڈوس گے۔ نہیں بتاؤ گے نا؟" پھر رک کر انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں جہان؟" جہان نے آنکھیں کھولیں۔

ٹھنڈے فرش پر دکتے جسم کو اس نے محسوس کیا اور دھیرے سے بریدیا۔ "مجھے راز رکھنے آتے ہیں دادا!"

اس کا وہ بدترین درد جو پھر ہمیشہ اس کے ساتھ رہا تھا اس کا آغاز اسی جیل سے اسی روز ہوا تھا۔ پھر چند گھنٹے بے تو ایک ڈاکٹر آگیا۔ اس نے اس کے زخموں پر دوا لگائی۔ کھانے کو اسپرین کی دو گولیاں دیں اور چند مزید درد کی دوائیں اس اینٹ کے ساتھ رکھ دیں جس کو نگہبنا کر وہ آنکھیں موندے فرش پر لیٹا تھا۔

رات میں وہ ڈاکٹر دوبارہ آیا۔ اب کی بار اس کی موجودگی میں ہی چند تفتیشی اہلکار اسے اپنے مخصوص کمرے میں لے جانے کے لیے آئے تو ڈاکٹر نے انہیں سختی سے جھڑک دیا۔

"تم دیکھ نہیں رہے اس کا سر کیسے زخمی ہے۔ مجھے اس کو زندہ رکھنے کا حکم ہے، میں اس کو زندہ رکھوں گا۔"

اپنی تفتیش بعد میں کرنا۔ آج تم نے مزید اس کو تارچ کیا تو یہ مرجائے گا۔" جہان نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کو دیکھا جو ان اہلکاروں پر غصہ ہو رہا تھا۔ وہ بریدتے ہوئے واپس ہو لیے۔ ڈاکٹر اب تاسف سے سر جھٹکتا اس کے سر کی پٹی کرنے لگا تھا۔

"یہ انسان نہیں ہیں یہ درندے ہیں۔" وہ ساتھ ہی زیر لب انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ جہان بس اپنی نڈھال نیم ہوا آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم فکر مت کرو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔" پھر وہ اس کے قریب جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "میں مسلمان ہوں۔ اگر تمہیں قرآن یا جاع نماز چاہیے تو اس کا بندوبست بھی کروں گا۔" جہان چند لمحے خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

پھر بولا۔

"کیا تم مجھے سورۃ الایمان لا کروے سکتے ہو؟" "ہاں، بلکہ میں تمہیں پورا قرآن منگوادیتا ہوں۔" "منگوادو۔" وہ ہولے سے مسکرایا اور آنکھیں پھر سے موند لیں۔

کیا مسلمان تھا یہ ڈاکٹر جسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ قرآن میں الایمان نام کی کوئی سورۃ نہیں ہے۔ گدھانہ ہو تو۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مجرموں، خصوصاً جاسوسی کے مجرموں کی تفتیش کا پرانا طریقہ تھا۔ ایک آفیسر آپ بے حد سختی اور تارچ کرتا ہے، جبکہ دوسرا آپ کی طرف داری کرتا ہے۔ خود کو آپ کا ہمدرد ثابت کرتا ہے، تاکہ ایسے حالات میں جب انسان کو اپنے قریب کوئی نظر نہ آئے، وہ خود کو مدد کے لیے آنے والا فرشتہ ثابت کرے اور اہم معلومات اگلوالے۔

بہر حال وعدے کے مطابق اردو ترجمے والا قرآن اور جائے نماز اس کو لاد دی گئیں۔ وضو کاپانی بھی دیا گیا۔ یہ اس کال کو ٹھڑی کا واحد روزن تھا ورنہ وہ دن بہت تاریک تھا۔ اپنے ملک سے دور ایک دشمن ملک میں دشمنوں کے درمیان زخمی ہو کر قید رہنا، یہ اس دنیا کا سب سے تکلیف دہ امر تھا۔

وہ روزانہ اس کو تفتیشی کمرے میں لے جاتے۔
کبھی بازوؤں کے درمیان راڈ پھنسا کر دیوار سے لگا کر
پیٹا جاتا، کبھی الٹا لٹکا کر گرہ پائی کی بالٹی میں سر ڈبوایا جاتا۔
اس کے پاس کہنے کو بس ایک ہی بات تھی۔
”I am not a spy“ (میں جاسوس نہیں ہوں)

وہ چونکہ ایک دوست کے ہاتھوں پکڑوایا گیا تھا اس لیے ان کو اس بات میں قطعاً کوئی شک نہ تھا کہ وہ جاسوس نہیں ہے۔ ان تکلیف دہ پر تشددوں میں جہان نے اس ساٹھی ایجنٹ سے بہت نفرت کی تھی جس نے چند پیسوں کے لیے اسے اور نہ جانے کتنے لڑکوں کو پکڑوایا تھا۔ اس نے واقعتاً ”قسم اٹھائی کہ زندگی میں اگر کبھی اسے موقع ملا تو وہ اس آدمی سے بدلہ ضرور لے گا“ لیکن یہ موقع اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ اپنے اس دوست کا نام جانتا تھا نہ ہی کوئی دوسری شناخت اور اس دنیا کے ساڑھے چھ ارب انسانوں میں اس ایک آدمی کو وہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر کبھی وہ واپس جاسکا تو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ الگ بات تھی کہ ایسی کوششیں عموماً ”کامیاب نہیں ہوا کرتیں اور یہ بھی کہ واپسی ان دونوں بہت ناممکن سی چیز لگتی تھی۔

قریباً ”بارہ دن بعد اس نے سورج اس وقت دیکھا جب وہ اسے اس کے سیل سے نکال کر باہر برآمدے میں لائے، جہاں ایک طرف صحن میں چلتی ریت پکھی تھی اور دوسری طرف برف کے بڑے بڑے بلاک پڑے تھے۔ وہ پہلے اسے چلتی ریت پہ لٹاتے اور ایک فوجی اپنے بھاری بوٹ اس کی کمر پہ رکھ کر کھڑا ہوتا، پھر ٹھنڈی برف پہ لٹاتے۔ پیش اور جاڑے کا عذاب قریب تھا کہ وہ فالج سے ہی مرجاتا مگر اس کی انا اور مردانگی کو گوارا نہ تھا کہ ان لوگوں کے سامنے اس کے لبوں سے اف تک نکلے، مگر بعض اوقات کراہنے اور درد سے ہلکا اٹھنے سے وہ خود کو روک نہیں پاتا تھا۔ تب اسے بہت غصہ بہت بے بسی محسوس ہوتی تھی۔

پھر وہ اندھیر دن اور رات اس کے اندر سے ہر چیز

آہستہ آہستہ نکلنے لگے۔ اپنی ذات کا وقار اور عزت نفس تو وہ کھو چکا تھا، پھر جب ہر روز وہ اسے بے پناہ اندر دے کر کے نیم جاں حالت میں سیل کے سخت فرش پر پھینک کر چلے جاتے تو اندر موجود ہر چیز پر فرش کی گرہی میں بھسم ہونے لگتا جیل جانے سے قبل وہ انتحار اور بے حس نہیں تھا۔ زندگی اور زندگی کی تمام تر نرمی اس کے اندر موجود تھی۔ مگر ان تاریک دنوں نے ہر چیز اپنے اندر جذب کر لی۔ وہ دن اور رات کا حساب نہ کر پاتا۔ آہستہ آہستہ رات دن برابر ہو گئے۔

اس نے وقت کا حساب مکمل طور پر کھو دیا۔ جب کھانا آتا تو معلوم ہوتا کہ رات ہو گئی ہے۔ دال کی پلیٹ اور دو روٹیاں جو پہرے دار سلاخ سے جان بوجھ کر یوں ترچھا کر کے تھما کر اس کے پکڑتے پکڑتے پلیٹ زمین پہ گر جاتی۔ اسے اس گندی زمین سے دال اٹھا کر کھانی پڑتی جس کو چاہتے ہوئے بھی کڑیج کڑیج کی آوازیں آتی تھیں۔ زندگی، خواہشات، امیدیں، امتگیں اس کے اندر سب کچھ مر گیا تھا۔ ساری دنیا اور اس کی ہر چیز من گھڑت فسانہ تھی۔ اگر کہیں کوئی حقیقت بھی تو وہ یہ تنگ تاریک تحلیط ساسیل تھا۔

وہ اس روز بھی فرش پہ لیٹا چھت کو خالی خالی نگاہوں سے تک رہا تھا۔ اسے محمی یاد آ رہی تھیں۔ وہ ہر روز رات کو سونے سے پہلے سوچتی ہوں گی کہ ان کا بیٹا کہاں ہے۔ وہ ان سے عرصے سے رابطے میں نہیں تھا مگر اب تک تو شاید ان کو علم ہو گیا ہو کہ وہ زیر حراست ہے۔ کیا وہ پھر کبھی ان سے دوبارہ مل سکے گا؟ کیا وہ پھر کبھی پاکستان کو دیکھ سکے گا؟ اس نے سوچنا چاہا تو ہر طرف مہیب اندھیرا نظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا نہ ہی اس کا ملک کبھی اسے تسلیم کرے گا۔ کوئی ملک اپنے جاسوس کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر یہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔

اس نے خود یہ زندگی چنی تھی اور اس تمام اذیت کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اگر اسے دس زندگیاں دی جائیں تب بھی وہ یہی جواب دے گا۔ اسے اپنے کام سے محبت تھی۔ وہ کچھتا نہیں رہا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور

سوچتا تھا کہ اس پاکستانی جاسوسی کے گھر والوں نے نہ جانے کتنا عرصہ اس کا انتظار کیا ہو گا، جس کو اس نے اپنے ہاتھوں سے دفنایا تھا لیکن اسے لاوارث نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اس کی نعش کی بے حرمتی اللہ کی زمین نے نہیں ہونے دی تھی۔ تب اس کی صرف یہی خواہش تھی کہ اسے بھی لاوارث نہ چھوڑا جائے۔ پچھلی رات بھی پہرے داروں نے سیل میں دو سپو لپے چھوڑ دیے تھے، جنہیں اس نے اپنے تکیے والی اینٹ سے مارا تھا۔ اگر کل کو اس کے سوتے ہوئے وہ اس کو مار دیتا اور اس کی لاش کو دریا میں بہا دیتا تب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے نہ نام چاہیے تھا نہ شہرت نہ ستائش اسے بس ایک عزت دار جنازہ چاہیے تھا۔ وہ بہت اذیت ناک روز و شب تھے۔

اسی وقت جب وہ سوچوں میں غلطاں تھا، پہرے دار اس کے سیل میں لا کر کسی کو پھینک گئے تھے۔ اس نے آنکھیں کھول کر گردن ذرا سی موڑ کر دیکھا۔ وہ ایک کم عمر لڑکی تھی، جو بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس نے پاکستانی طرز کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور دوپٹا پھٹا ہوا تھا۔ چوٹی سے الجھے ہوئے بال نکل رہے تھے۔ اس کے حلیے سے لگ رہا تھا اسے شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

”کون ہو تم؟“ وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی۔ وہ اسی طرح لیٹے ہوئے گردن ذرا سی موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ ہم پوری فیملی کرکٹ میچ دیکھنے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں جانے نہیں دیا۔ یہ کہتے ہیں، ہم پاکستانی جاسوس ہیں۔“

وہ روتے روتے اسے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ اسے بیس دن ہو گئے تھے، ان لوگوں کی قید میں اور وہ بہت دکھی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی روداد سنتا رہا۔ ابھی وہ بول ہی رہی تھی کہ سپاہی دوبارہ آئے اور اسے کھینچتے، کھینچتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔ وہ بے اختیار خوف سے روتی چلاتی، جہاں کو دیکھ کر اسے مدد کے لیے بلاتی رہی۔

جہاں نے گردن واپس موڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
تین دن تک روز رات کو وہ اس لڑکی کو لے جاتے۔ ٹارچر سیل قریب ہی تھا۔ وہاں سے اس کی دردناک چیخیں، آہیں، سسکیاں، یہاں تک صاف سنائی دیتیں۔ صبح کے قریب وہ اسے سیل میں واپس پھینک جاتے، اس حالت میں کہ وہ مزید زخمی ہوئی اور لباس پہ تازہ خون ہوتا۔

تیسری صبح وہ اٹھا، اپنے درد کو بھلائے، اس نے پانی کے برتن سے ایک گلاس بھرا اور اس کے قریب لے کر آیا۔ وہ بند آنکھوں سے منڈھال سی کرا رہی تھی۔ اس نے اس لڑکی کی آنکھوں کو دیکھا تو ایک دم جیسے کوئی یاد ہو سوچھانے لگی۔

فریحہ ایکان رضا۔ خوب صورت اور طرح دار فریحہ۔

وہ ایک روز ان کے گھر گیا تو اس نے لاؤنج میں بیٹھی فریحہ کو اپنی بھنوں کو تراشتے دیکھا تھا۔ علی کرامت کی ممی اپنی بھنوں کو نہیں تراشتی تھیں۔ ان کے ابو قدرتی تھے مگر اچھے لگتے۔

”آپ کیوں مسز فریحہ کی طرح اپنی آئی بروز کو شہپ نہیں دیتیں؟“ اس نے ان سے پوچھ ہی لیا تو وہ ہنس کر بولیں۔

”اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں اپنی مرضی سے رد و بدل نہیں کرتے بیٹا! اللہ تعالیٰ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔“

وہ اس نیم بے ہوش پڑی لڑکی کی بھنوں دیکھ رہا تھا۔ بالکل فریحہ کی طرح کمان کی شکل میں بنی ابو بہت صاف تھیں۔ اگر وہ ایک ماہ سے زیر حراست تھی تو ابھی تک ابو کی شہپ خراب کیوں نہیں ہوئی تھی؟ کیا اسے جیل میں ابو تراش ملا کرتا تھا؟

”طعن ہے!“ اس نے گلاس پورا کا پورا اس کے چہرے پہ انڈیلا اور اٹھ کر واپس اپنی جگہ پہ آگیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی مگر زیادہ حرکت نہیں کی۔

پورا دن وہ اسی لڑکی پہ کھولتا رہا تھا۔ ایسے اسٹول

تینجین اکثر جیل میں مطلوبہ ملزم کے ساتھ ڈالے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی داستان اور اپنی چیخیں سنا کر ملزم کو ڈراسکے اور وہ اپنی زبان کھول دے یا کم از کم اس کی ہمدردی لے کر وہ اسٹول تینجین اس کے بارے میں کچھ جان سکے۔

وہ دونوں جب بھی سیل میں ایک ساتھ ہوتے وہ کراہنے کے دوران بھی اس کو مخاطب کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ پہلے پہل وہ نظر انداز کرتا رہا پھر اس لڑکی سے جواباً سوال پوچھنے لگ جاتا۔ کہاں سے آئی ہو؟ اچھا فیصل آباد سے۔ کس طرف گھر ہے تمہارا؟ وہ لڑکی چند ایک لمبے سیدھے جواب دے کر خاموش ہو جاتی۔

وہ اب دن رات اپنے فرار کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ وہ جیل اتنے زیادہ پسروں میں بند تھی کہ وہاں سے بھاگنا ناممکن تھا۔ کرے تو کیا کرے؟ اسے صرف اتنا ڈر تھا کہ اگر وہ اسے پولی گراف ٹیسٹ پہ لے گئے تو جج جھوٹ کا فیصلہ ہو جائے گا اور انجکشن دے کر وہ اس سے بہت کچھ اگلا لیں گے۔ پھر اس کی ایجنسی اس کا کبھی اعتبار نہیں کرے گی۔ وہاں یہی کہا جائے گا وہ غدار کا بیٹا تھا وہ باپ جیسا ہی نکلا۔ کیا کرے کہ ہر جائے؟

پورے پچیس دن بعد وہ اسے سیل سے نکال کر ایک مختلف کمرے میں لے آئے جہاں الیکٹرک شاکس کا انتظام تھا۔ بجلی کے جھٹکے لینے کا مطلب تھا ساری عمر صحت کے مختلف مسائل کا شکار ہو کر وہ فوج کے لیے ناکارہ ہو جائے۔ اس نے سوچنے میں بس ایک منٹ لگایا۔

”اوکے“ اوکے! آئی ایم اے اسپائی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اعتراف کر لیا۔ ”مجھے شاکس مت دو“ میں سب بتاتا ہوں۔“

تفتیشی ٹیم دوبارہ بیٹھی۔ ریکارڈنگ کا انتظام ہوا۔ سوال و جواب اور بیان دوبارہ لیے گئے۔ اس نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ان کو بتانا شروع کیا کہ وہ سویلین جاسوس ہے۔ اپنی ایجنسی کا نام اسے

نہیں معلوم اور چند دوسری کمائیوں کے بعد اس نے بتایا کہ اس ماہ کی تیرہ تاریخ کو اس کو اپنے ساتھی جاسوس سے ملنا ہے۔ وہ ان کو وہاں لے جائے گا تاکہ وہ اس ساتھی کو گرفتار کر لیں اور اس کے ساتھ رعایت برتیں۔

وہ جانتا تھا کہ اس جیل سے وہ نہیں بھاگ سکتا ہاں کھلی فضا میں شاید یہ ممکن ہو۔ اس نے کہا کہ اگر تیرہ تاریخ کو وہ نہیں آیا تو پھر ایک یا دو ہفتے بعد اسی جگہ پہ وہ دوبارہ آئے گا۔

خوب وارن کرنے اور جھوٹ بولنے یا فرار کی کوشش میں ملنے والی سزا کے بارے میں ڈرا دھمکا کر وہ یہ خطرہ لینے کو تیار ہو گئے۔ وہ انہیں ایک پر ہجوم جگہ پہ لے آیا مگر وہاں اتنی سیکیورٹی اور مکمل انتظامات تھے کہ اوہر سے فرار ہونا کسی اسپائیڈر مین کے لیے تو ممکن تھا مگر انسان کے لیے نہیں۔ وہ چپ چاپ واپس آ گیا۔

اگلے ہفتے وہ پہلے سے زیادہ سیکیورٹی کے ساتھ اسی جگہ پہ لے جایا گیا۔ اس کا کوئی دوست اوہر نہیں آتا تھا۔ سو کوئی نہ آیا۔ تین گھنٹے اس پل پہ اوہر اوہر پہل کر وہ اس سے ہٹ کر ایک بک اسٹال پہ چلا آیا۔ ہر طرف سادہ کپڑوں میں موجود سیکیورٹی اہلکار اس پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھے۔ وہ ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کا ارادہ گھنٹہ بھر مزید ٹہل کر یہاں سے واپس ہو لینے کا تھا۔ کون سا کسی نے آنا تھا۔ اب اتنی گرمی میں وہ کیوں خوار ہوتا رہے؟ رسالہ رکھ کر وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ شاپ سے نکلتی تین لڑکیاں ہنستی باتیں کرتی یوں ایک دم اس کے سامنے آئیں کہ وہ ان سے ٹکرا گیا۔

”اوہ!“ جس لڑکی سے وہ ٹکرایا تھا وہ ایک دم اتنی بوکھلائی کہ اس کی کتابیں اور فائل نیچے جا گریں۔ وہ جلدی جلدی معذرت کرتا اس کی کتابیں اٹھانے لگا۔

وہ کالج یونیفارم میں ملبوس لڑکیاں تھیں۔ جس سے وہ ٹکرایا تھا اس نے سر پہ دوپٹا لے رکھا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں چمکتا چہرہ بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ جہاں کے ساتھ جھک کر اس نے اپنی فائل اٹھائی

اور کچھ اس طرح سے اٹھائی کہ اس پہ لکھے الفاظ واضح ہو گئے۔

وہ بہت کوشش سے اپنی حیرانی ظاہر کیے بغیر اٹھا۔ دل ایک دم زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ لڑکیاں جلدی جلدی اپنی چیزیں سنبھال کر واپس مڑ گئیں۔ وہ خود کو ریسکون رکھتے ہوئے پھر سے بک ریک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک کتاب اٹھا کر اس نے چہرے کے سامنے تان لی تاکہ اس کے تاثرات اس کے نگراؤں سے چھپ سکیں۔

اس لڑکی کی فائل پہ ایک آفسر کا نام ریک اور اس کی تفتیشی ٹیم میں شمولیت کا دن لکھا تھا۔ ساتھ میں پہچان کے لیے جہاں کا اپنا کوڈ نمبر اور اس کے کوڈ نیم کا مختف بھی لکھا تھا۔ اے آر پی۔

Agent Rose Petal

اس میں اور گلاب کی پنکھڑی میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ یہ بس ایک کوڈ نیم تھا جیسے عموماً ہوا کرتے تھے۔ شاید جس نے الاٹ کیا تھا اس کے سامنے اس وقت روز پٹیل ٹشو کا ڈبا رکھا ہو بہر حال اس لڑکی کی فائل پہ لکھے یہ الفاظ پہچان کے لیے کافی تھے۔ اس نے کتاب واپس رکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں دکان کے شیشے کی دروازے کو دیکھا جہاں دور مخالف سمت جاتی تین لڑکیوں کا عکس نمایاں تھا۔

اسی پل فائل والی لڑکی نے گرون ذرا موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ تھی۔ مرہ جیلہ خوب صورت عورت۔

اگلے ہی لمحے مرہ جیلہ واپس پلٹ گئی۔ وہ تینوں لڑکیاں اب بس پوائنٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ سب کچھ اتنے عام سے انداز میں ہوا تھا کہ ان درجنوں نگراؤں نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپس چلے آئے۔

اب اس کے پاس مزید ایک ہفتے کا وقت تھا۔ اگلے ہفتے اس کو آخری دفعہ ان لوگوں کو اسی جگہ پہ لے کر جانا تھا۔ اس کے تعاون کے پیش نظر ہفتے دس دن اس پہ تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ کھانا بھی قدرے بہتر مل رہا

تھا۔ شاید وہ سمجھے کہ اگر وہ راز اگل دے تو وہ اس کو چھوڑ دیں گے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ تب بھی وہ مارا جائے گا مگر اب اسے امید تھی۔ اسے لاوارث نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اسے بس اس آفسر کا انتظار کرنا تھا جو چند دن میں اوہر آجائے گا اور فرار میں اس کی مدد کرے گا۔ پورے ایک ماہ دس دن بعد اس کو اس عقوبت خانے سے رہائی ملی تھی۔ وہ رہائی جو بمشکل وہ چھین پایا تھا۔ پھر تین ماہ وہ ایک سکھ سیاست دان کے بنگلے میں حفاظت کے پیش نظر رہتا رہا۔ ڈیڑھ برس بعد وہ جن حالات سے گزر کر پاکستان پہنچا وہ ناقابل بیان تھے۔ جب وہ واپس لاہور پہنچا تو اس کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے۔ مسلسل علاج اور دیکھ بھال کے بعد ظاہری زخم تو مندمل ہو گئے مگر وہ سر کا بدترین درد جس کا منبع ایم آر آئی سے بھی نہ مل سکا تھا اس کے ساتھ رہا۔ اس نے کبھی اپنے اس سردرد کو ظاہر نہیں کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بیماری یا معذوری اس کے سروس ریکارڈ کو خراب کرے اور وہ میدان جنگ سے واپس بیرکوں میں بھیج دیا جائے۔ ان کی ایجنسی کا ایک مشہور زمانہ مقولہ تھا کہ ”ہم زمانہ امن میں جنگ کرتے ہیں اور زمانہ جنگ میں اپنی کی ہوئی جنگ کا نتیجہ دیکھتے ہیں۔“ ابھی وہ مزید جنگ کرنا چاہتا تھا۔

مگر اس جنگ اور قید نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا تھا۔ جہاں ایک طرف وہ اپنے سروس ریکارڈ میں Reliable Under Torture (ریلا بیل انڈر ٹائرچر) کی ڈگری میں آگیا تھا وہاں دوسری طرف اس کے اندر بہت کچھ مر گیا تھا۔ وہ جو ایک فیملی بنانے کی ایک حسین لڑکی سے شادی کر کے اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے وہ خواہش مر گئی تھی۔ وہ دنیا سے بے اعتبار ہو چکا تھا۔ اس کے اندر اتنی تلخی بس چھٹی تھی کہ اب وہ ایک فیملی مین نہیں رہا تھا۔ وہ بس ایک ایجنٹ تھا۔ یہی اس کی زندگی اس کی محبت اس کی فیملی تھی۔ جب حکومت نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس کو ملک کی خدمت کے قابل بنایا تھا تو بہتر تھا کہ وہ یہی کام کرے۔ ماموؤں سے بغض و عناد

انتقام لینے کی خواہش، سب جیل نے نگل لیا تھا۔ اگر کچھ بچا تھا تو وہی ایک احساس کمتری، جو ماموں کا سامنا کرنے کا سوچ کر اسے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا۔ بس اور کچھ نہیں۔

رہائی کے کچھ عرصے بعد وہ ممی کے پاس ترکی گیا تو ایک اچھی خبر اس کی منتظر تھی۔ ممی نے اپنی جمع پونجی ملا کر جہانگیر والا گھر پھر سے خرید لیا تھا۔ دادا کا بنایا گھر ان کا اپنا گھر۔ مگر اب اس کو اس گھر نے بھی بہت زیادہ خوشی نہیں دی۔ وہ تو بس ایک خواہش تھی، پوری ہو گئی۔

قریباً "تین برس قبل وہ اپنے ترک پس منظر کے باعث ترکی بھیجا گیا وہاں وہ دو کورز کے ساتھ رہ رہا تھا۔ ایک اپنی پاکستانی شناخت "جہان سکندر" اور دوسری ایک انڈین شناخت "عبدالرحمن پاشا"۔

اپنے کام کے سلسلے میں آج کل وہ اسلام آباد واپس آیا ہوا تھا اور ممی کے مسلسل زور دینے پہ وہ بالآخر ماموں کے گھر جانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ہوٹل میں اپنی منگوحہ کو اتفاقیہ دیکھ لینے کے بعد اس کا ارادہ مزید ڈانوا ڈول ہو گیا تھا اور بعد میں بھی شاید وہ ماموں سے ملنے کی کوشش کرتا، مگر وہ لڑکی استنبول آ رہی تھی، یہ خیال اسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ ایسا کرنا تھا جس سے وہ اس لڑکی کو روک پائے، مگر کیا، یہ ابھی اسے طے کرنا تھا۔

وہ بیسن کی ٹوٹی بہ جھکا چہرے۔ پانی کے چھینٹے ڈال رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مگر وہ صورت اس کی جلد سے ہر نشان چھوڑ کر چلی ہے تو اس نے چہرہ اٹھا کر ہاتھ روم کے آئینے میں دیکھا۔ ساتھ پہ سامنے کو گرتے اس کے گہرے بھورے بال گیلے اور منہ دھلا دھلایا ہو چکا تھا۔ اس نے اسٹینڈ سے لٹکا تولیہ اتارا اور چہرے کو رگڑا یا ہر آیا۔

لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا۔ اس کا لب ٹاپ بھی آن پڑا تھا۔ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے تولیہ ایک

طرف ڈالا، پھر لب ٹاپ گود میں رکھتے ہوئے اپنا موبائل نکالا۔ اسے ممی کو فون کرنا تھا۔ دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔ وہ منتظر سا اسے سنے گیا۔ ذہن کے پردوں پہ آج کے واقعات پھر سے چلنے لگے تھے۔

گزشتہ رات ماموں کے گھر سے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لائحہ عمل تشکیل پا رہا تھا۔ جو آخری چیز وہ اپنی مشکل زندگی میں نہیں چاہتا تھا، وہ اپنی بیوی کا اس شہر میں آکر رہنا تھا، جہاں وہ پہلے ہی ایک مقیم ایجنٹ کی حیثیت سے دو زندگیاں گزار رہا تھا۔ اب اسے کسی نہ کسی طرح اس لڑکی کو روکنا تھا۔ جب اس نے بچپن میں سفید پھول رکھے تھے تو اس کے ذہن میں مکمل لائحہ عمل نہیں تھا، مگر پھر بھی وہ جاتے وقت اس کی کارپہ ایک جی پی ایس ٹریسر چسپاں کر آیا تھا۔ وہاں کھڑی دو گاڑیوں میں سے چھوٹی والی یقیناً "اسی کی تھی۔ وہ اس لڑکی پہ نظر رکھنا چاہتا تھا اور آج کل اس کے پاس اتنا ڈھیر سارا وقت تھا کہ وہ اس پہ نظر رکھ سکے اور بتا نہیں کیوں جب بھی وہ اس کے بارے میں سوچتا، اس کو وہ لڑکی کے نام سے ہی سوچتا۔ وہ اس کا نام نہیں لیا کرتا تھا۔ کچھ تھا جو اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔

وہ امریکی سفارت خانے کی سیکنڈ سیکریٹری کی وجہ سے آج کل ادھر تھا۔ وہ بھارتی نژاد امریکی شہری تھی اور اس کی پاکستان سے دو ماہ بعد روانگی تھی جہان کی دلچسپی کی بات یہ تھی کہ اس کی اگلی پوسٹنگ استنبول میں امریکی سفارت خانے میں ہو رہی تھی۔ اگر اس تک رسائی حاصل کر لے تو استنبول میں اس کے بہت سے کام آسان ہو سکتے تھے۔ مسئلہ بس اتنا تھا کہ وہ اس کی کار تک بھی رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اپنی کار کا شیشہ صرف اور صرف کسی خواجہ سرا بھکاری کے لیے کھولتی تھی کیونکہ اسے خواجہ سرا کی بددعا سے ڈر لگتا تھا۔ غالباً "خاندانی وہم تھا جسے وہ ایفسر امریکا میں اتنے برس رہنے کے بعد بھی نہیں ختم کر سکی تھی۔ صرف اس کی کار کے انتظار میں اب اسے روز شام میں خواجہ سرا کا روپ دھار کر ان راستوں پہ پھرتا تھا جہاں

وہ گزرتی تھی۔ کسی دوسرے کے لیے شاید یہ بہت عجیب بات ہو، مگر اس کے لیے نہیں تھی۔ اس کے نزدیک خواجہ سرا بننا بالکل ایسے تھا جیسے کسی ڈاکٹر کے لیے مکمل سفید اور آل کی بجائے آف وائٹ اور آل پہننا۔ ایسی تبدیلی جو محسوس ہوتی نہ ہی بری لگتی۔ اپنے کیریئر کے دوران وہ اتنا کچھ بن چکا تھا کہ بہت عرصہ ہوا وہ حس ہی ختم ہو چکی تھی جو عجیب و غریب حیلے کا احساس دلاتی۔ اپنے ذاتی کاموں کے لیے البتہ ایسے حیلے اس نے کبھی نہیں بدلے تھے، لیکن اب اس کی زندگی ذاتی رہی ہی نہیں تھی۔ اگر آج وہ حیا کی گاڑی کو ٹریس کر کے اس سے ملنے گیا تھا تب بھی اس کے ذہن میں اپنی اسی "جعلی" زندگی کی فکر تھی جو وہ استنبول میں گزار رہا تھا۔

وہ آئس کریم پارلر جہاں وہ اس لڑکی کی گاڑی کی موجودگی کا علم ہونے کے باعث آیا تھا، اس جگہ سے زیادہ دور نہ تھا، جہاں آج کل اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہاں خواجہ سرا اکثر نظر آتے تھے، اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی اصلی خواجہ سرا ہو۔ آدھے پروٹیشٹل اور باقی آدھے خفیہ والے ہوتے تھے جو ایسے روپ دھار کر حساس جگہوں کی نگرانی کیا کرتے تھے۔

وہ اس لڑکی کو ترکی جانے سے روکنا چاہتا تھا اور کل تک تو وہ اس سے ملنا بھی نہیں چاہتا تھا، مگر آج پتا نہیں کیوں، اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے بات کرے۔ وہ اسے کبھی نہیں پہچان سکتی۔ اسے یقین تھا وہ کیا ممی بھی اسے اس حیلے میں نہیں پہچان سکتی تھیں۔

اس روز اس لڑکی نے ملے آسمانی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ بال حسب معمول کھلے تھے۔ وہ مسکین پیتے ہوئے سوچ میں گم غالباً "شیشہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ وہ اس کے شیشے پہ جھکا تو وہ چونک گئی اور پھر اس نے اس کے سفید، گلابی چہرے کو خوفزدہ ہوتے دیکھا۔ تمام تر گھبراہٹ کے باوجود اس نے ٹھنڈا ٹھار مسکین جہان کے منہ پہ الٹ دیا۔ تب وہ پیچھے ہوا تھا۔ اسے مسکین

نے پیچھے نہیں دھکیلا تھا، بلکہ اس کی جرأت پہ وہ حیران ہوا تھا۔ گزشتہ روز اگر اسے لگا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی نازک سی لڑکی ہے، تو ایسا نہیں تھا۔ وہ کافی براعت اور ایک دم سے رد عمل ظاہر کر دینے والی لڑکی تھی۔ چلو، کوئی تو اچھی بات تھی۔

وہ وہاں سے سیدھا اپنے اپارٹمنٹ آیا تھا اور اب حلیہ ٹھیک کر کے ممی کو فون کر رہا تھا۔ ممی نے فون اٹھاتے ہی سب سے پہلے وہی پوچھا جس کی اسے توقع تھی۔

"تم ماموں سے ملنے گئے تھے؟"

"جی، مگر۔"

"ابھی میری صائمہ بھابھی سے بات ہوئی ہے، انہوں نے تو نہیں بتایا۔" وہ حیران ہوئیں۔

"آپ دو منٹ تسلی سے میری بات سنیں گی؟"

پورے دو منٹ اس کی بات تسلی سے سن لینے کے بعد بھی ممی بولی تھیں۔

"تم آج چلے جاؤ، آج فرقان بھائی کے گھر رات میں کھانا بھی ہے۔ سب اکٹھے ہوں گے۔ تم ان سے ایک دفعہ مل لو، پھر بعد میں دیا کو اعتماد میں لے کر بتا دینا۔ بات ختم۔"

اور اس کے جوابات میں آیا اٹھا کر میرے اوپر دے مارنا ہے اس نے بے اختیار سوچا تھا، پھر چند منٹ لگے اسے ممی کو راضی کرنے میں اور بمشکل وہ اس بات پہ متفق ہوئیں کہ ابھی ماموں سے ملنے کے بجائے بہتر ہے کہ پہلے وہ ماموں کی بیٹی سے ملے، ہو سکے تو اسے روک دے اور اگر اس کے رکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور وہ پانچ ماہ کے لیے استنبول آ رہی ہے تو پھر اسے ان لوگوں کو اپنے بارے میں آگاہی نہیں دینی چاہیے۔ یہ اس کی جاب کے اصول کے خلاف تھا۔ اسے ترکی میں اپنے ارد گرد کوئی ایسا شخص نہیں چاہیے تھا جو اس بات سے واقف ہو کہ اس کا نام عبدالرحمن پاشا نہیں، یا جہان سکندر نہیں، بلکہ میجر جہان سکندر احمد ہے۔ اس نج پہ پہنچ کر ممی راضی ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے، تم کرو جو تم کرنا چاہتے ہو میں انہیں نہیں بتاؤں گی کہ تم اسلام آباد میں ہو۔“ وہ خوش نہیں تھیں مگر خفا بھی نہیں تھیں۔ اس نے سکون کی گہری سانس اندر کھینچی۔ اب اس کے پاس اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے چند روز تھے۔

فون بند کرنے کے بعد وہ فوراً اٹھا اور لپارٹمنٹ مقفل کر کے باہر آیا۔ می نے فرقان ماموں کے گھر فیملی ڈنر کا بتایا تھا۔ اگر وہ یہی بات کارڈ پر لکھ کر ایک روز پرانی تاریخ کے مرزہ لفافے میں ڈال کر گلاب کے پھولوں کے ہمراہ اس کے گھر دے آئے تو یقیناً وہ اس کی توجہ پالنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہی وہ اس کی کوئی بات نہ کی۔

آج بھی وہ اسی پھول والے کے پاس آیا تھا اور آج بھی اس کے پاس سرخ گلاب نہیں تھے۔ اس نے دل ہی دل میں پھول والے اور سرخ گلاب دونوں پر لعنت بھیجتے ہوئے سفید گلاب خرید لیے۔ بار بار وہ موبائل پر اسے ٹیکسٹ کر رہی تھی۔ اس کی کار بھی تک گھر نہیں پہنچی تھی۔

اپنی مصروفیات میں سے اس لڑکی کے لیے وقت نکالنا ایک دم ہی اسے بہت دلچسپ لگنے لگا تھا۔



وہ داور کی مہندی کی دھپہ ہر تھی۔ جب می کا فون آیا۔ وہ اس وقت آفس سے نکل رہا تھا، یہاں سے اسے اپنی وہ کار لینے جانا تھا جو اسے اسلام آباد میں استعمال کرنی تھی۔ می کا نمبر اسکرین پر جلتا جھٹکا دیکھ کر وہ ذرا چونکا۔ شاید می نے ذہن بدل لیا تھا ورنہ وہ اس طرح اچانک کال نہیں کرتی تھیں، ماسوائے ہنگامی صورت حال کے۔

”جی می! خیریت؟“ اپنے دفتر کی مین بلڈنگ سے دور ہٹ کر سڑک کنارے چلتے وہ ان سے بات کرنے لگا۔

”تم آج جا کر ماموں سے مل لو۔“ وہی ڈھاک کے تین بات و دو جی بھر کر بے زار ہوا۔

”می! کل رات ہم نے کس بات پہ اتفاق کیا تھا، آپ بھول گئیں؟“

”جہان! میری بات سنو۔ مجھے خدشہ ہے کہ سلیمان بھائی حیا کی شادی کہیں اور نہ کریں۔“

”تو کریں!“ وہ یہ نہ کہہ سکا گو کہ وہ یہی کہنا چاہتا تھا مگر جب بولا تو آواز میں پتا نہیں کہاں سے خفگی در آئی تھی۔

”وہ اس طرح کیسے کر سکتے ہیں کسی اور سے اس کی شادی؟ ہمارا نکاح ہوا تھا، منگنی نہیں جو وہ اپنی مرضی سے توڑ دیں۔“

”وہ خلع بھی لے سکتے ہیں اور تم جانتے ہو ایک دو ہفتہوں میں فیصلہ ہو جایا کرتا ہے بچپن کے نکاح کا اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کے ذمے دار ہم ہوں گے۔“

”اور وہ خود کسی چیز کے ذمے دار نہیں ہیں؟“

”جہان سکندر! میں نے تمہاری پرورش اس منتقم مزاج سوچ کے ساتھ تو نہیں کی تھی۔“ انہیں جیسے دکھ ہوا تھا۔ وہ فوراً نادام ہوا۔

”اچھا، آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تھا کہ اگر ہم اس رشتے پہ خاموش ہیں تو بات وہ بھی نہیں کرتے۔“

”وہ بیٹی والے ہو کر کیسے خود سے بات کریں؟ کیسے کہیں کہ ہماری بیٹی کو رخصت کروا کر لے جاؤ؟ ایسے اپنی بیٹی کو کوئی ہلکا نہیں کرتا۔“

”ہاں، میرے ماموں کا غرور اور انا۔۔۔“ ادھر می کہہ رہی تھیں۔

”وہ ہماری طرف سے مایوس ہو چکے ہیں، اسی لیے سلیمان بھائی حیا کے لیے آنے والے رشتوں پہ غور کر رہے ہیں۔“ وہ ایک دم بالکل چپ ہو گیا۔

”آپ کو کس نے کہا یہ؟“ یہ تو طے تھا کہ وہ بلا تحقیق کسی بات پہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔

”صائمہ بھابی نے ابھی فون کر کے بتایا ہے۔ ان کے بقول سلیمان بھائی کو ہمارا انتظار بھی نہیں ہے۔ انہوں نے فرقان بھائی سے خود کہا ہے کہ ان کے کسی دوست نے اپنے بیٹے کے لیے حیا کا رشتہ بھجوایا ہے۔“

اور آج وہ فرقان بھائی کو اس لڑکی سے ملوائیں گے۔ شاید ان کے کسی بزنس پارٹنر کا بیٹا ہے، باہر سے پڑھ کر ابھی آیا ہے، فرقان بھائی نہیں ملے ابھی اس سے۔“

وہ بالکل خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے یہ سب بہت برا لگ رہا تھا۔ کیوں وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

”تم آج چلے جاؤ۔ میں اس رشتے کو توڑنا نہیں چاہتی جہان!“ وہ بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔

”جب وہ لوگ مجھے بے حد غیر اہم سمجھ کر میرے خطر ہی نہیں ہیں تو کیا فائدہ جانے کا؟“

”بھابی بتا رہی تھیں، حیا ہمارا پوچھ رہی تھی۔ اسے انتظار ہو گا۔“

”کیوں؟“ وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

”لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں بیٹا! میں کبھی کبھی خود کو اپنی بیٹی کی مجرم سمجھتی ہوں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں، میں یہ رشتہ نہیں ٹوٹنے دوں گا۔“

”یعنی تم جارہے ہو؟“ وہ جیسے کھل اٹھیں۔

”اب یہ بھی نہیں کہا تھا میں نے۔ بس آپ مجھ پہ بھروسہ رکھیں، میں سب فکس کر لوں گا۔“

اور می خاموش ہو گئیں ان کو شاید اس کی اس قابلیت پہ بھروسہ تھا کہ وہ اپنے ارد گرد موجود ہر خراب چیز کو فکس کر لیا کرتا تھا۔ رشتوں اور چیزوں میں فرق ہوتا ہے۔ شاید می نے یہ بھی سوچا ہو۔

آج اس کو دیکھتے ہی پھول والے لڑکے کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

”صاب! آج سرخ گلاب بہت سارے ہیں۔“

”مگر مجھے سفید ہی چاہئیں۔“ اس نے بوہ نکالتے ہوئے دو ٹوک انداز میں سنجیدگی سے کہا۔ لڑکے کا چہرہ جیسے اتر سا گیا، مگر پھر بھی وہ جلدی جلدی سفید گلابوں کو اکٹھا کرنے لگا۔

سفید گلاب بے شک بہت سے لوگوں کے نزدیک دشمنی کی علامت تھے مگر بہت سے اسے امن اور صلح کی نشانی ہی گردانتے تھے۔

وہ آج ان کے گھر کے اندر نہیں گیا، بلکہ ان کے گھر کے مقابل ایک زیر تعمیر ننگے میں چلا آیا۔

سریے، اینٹیں، آدھی بنی دیواریں، وہ گھر رات کے وقت ویران پڑا تھا۔ مزدور وغیرہ کب کے جا چکے تھے اور اب وہ وہاں اوپری منزل کے کمرے میں بیٹھ کر با آسانی سامنے سلیمان ماموں کے گھر کے کھلے گیٹ سے سب دیکھ سکتا تھا۔

مہندی کا فنکشن دونوں گھروں کے قریب ہی ایک کھلے پلاٹ میں شان دار سی قاتیں لگا کر کیا گیا تھا۔ اسے تقریب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف سلیمان ماموں کے کھلے گیٹ کو دیکھ رہا تھا جہاں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ خواتین کی تیاری اور اٹنے سیدھے فیشن اور روایات اور قد ریں جن کا ذکر می اکثر کیا کرتی تھیں، وہ اسے اپنے انھیال کی خواتین میں کہیں نظر نہیں آئی تھیں۔ داور کی بہن تو شاید باقاعدہ اسکا رف لیا کرتی تھی مگر وہ بھی ایسے سلور لیٹنگ میں بنا سر ڈھکے ادھر ادھر پھرتی نظر آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں شادیوں پہ لوگ سب بھلا دیتے ہیں؟ اسے افسوس ہو رہا تھا۔

بہت دیر بعد جہان نے بالآخر اسے دیکھ ہی لیا۔ وہ اپنی می کے عقب میں چلتی برآمدے سے اترتی ڈرائیو وے تک آ رہی تھی، جہاں سلیمان ماموں ایک فیملی کے ہمراہ کھڑے خوش گپوں میں مصروف تھے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ سنہرا لنگا اور ٹیکا اسے مزید حسین بنا رہا تھا مگر وہ اسے پھر بھی ”مرہ جمیلہ“ نہیں لگتی تھی۔

سلیمان ماموں اب اس کا تعارف ان لوگوں سے کروا رہے تھے جو ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ صاحب، خاتون اور غالباً ان کا بیٹا۔

اس نے اپنے سیل فون میں دور بین کا لینس نکالا اور ان کو فوکس کیا۔ اب وہ ان کے چہرے صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ تینوں مہمان بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے، بالخصوص ان کا بیٹا۔ اس کی نظریں تو بہت ہی۔ اسے پتا نہیں کیوں پھر سے غصہ آنے لگا اور

تب ہی اس نے حیا کے چہرے کی جوت کو ماند پڑتے دیکھا۔ وہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہی وہ ان کے پاس سے ہٹ آئی۔ گیٹ سے باہر آکر اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا۔

اس نے موبائل کے بٹن کو چند ایک دفعہ دبایا۔ وہ اس کی تصویر لینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی کوئی تصویر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے مل کر خوش نہیں تھی شاید یہی وہ رشتے والے تھے جن سے آج سلیمان ماموں کو فرقان ماموں سے ملوانا تھا۔ وہ اس پہ خوش اس لیے نہیں تھی کہ یہ رشتہ اس کے لیے ان چاہتا تھا۔ دل کے کسی کو نے میں اسے ایک گونہ اطمینان سا نصیب ہوا۔ جیسے تسلی سی ملی ہو، جیسے ڈھارس سی بندھ گئی ہو، وہ اب پہلے جتنا ناخوش نہیں تھا۔

وہ بہت دیر ادھر ہی بیٹھا رہا۔ اسے فنکشن دیکھنے کی آرزو نہ تھی، بس وہ اس کی واپسی کے انتظار میں وہیں موجود تھا۔ وہ اسے ایک دفعہ پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ کافی دیر گزری، تب وہ اسے واپس آئی دکھائی دی۔ وہ گھر کے اندر جا رہی تھی۔ کیا اسے اس سے ملنا چاہیے؟ یا اس کے ترکی آنے کا انتظار کرے؟ وہ یہی سوچ رہا تھا جب اس کا فون بجلا۔

اس نے سیل فون کی اسکرین کو دیکھا، پھر بے اختیار چونکا۔ یہ اس کی ترکی والی وہ سم تھی جو پوسٹ پیڈ تھی اور کبھی اس کے تو کبھی ممی کے زیر استعمال رہتی تھی۔ یہ نمبر ماموں کے پاس تھا اور اس میں ماموں کا نمبر محفوظ بھی تھا اور اب اس نمبر سے کال آرہی تھی۔ ماموں کے گھر سے کال؟ وہ لمحے بھر کو گڑبڑا سا گیا۔

مگر اس نے فون اٹھا لیا چونکہ یہ ترک نمبر تھا اس لیے وہ ایک ہی لمحے میں خود کو ترکی لے گیا۔ ایک پیشہ ور ایجنٹ ہونے کے ناطے اس کو یہ ظاہر نہیں کرنا تھا کہ وہ ترکی سے باہر ہے اور اس کا نمبر رو منگ ہے۔

وہ حیا تھی ناقابل یقین۔ اور وہ ممی کا پوچھ رہی تھی۔ وہ ان کی منتظر تھی، ممی ٹھیک کہتی تھیں۔ اس سب کے باوجود جب وہ بات کرنے لگا تو اس کا لہجہ خشک ہی تھا۔ وہ اتنی جلدی کسی کے ساتھ نرمی سے یا مکھل کر

بات نہیں کرتا تھا اور اس کو تو وہ ویسے بھی کوئی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔ پھر بھی، جب بات کے اختتام پہ اس نے حیا کی آواز کو بھیکتے ہوئے سنا تو اس کا دل دکھا تھا۔

فون بند کرتے ہی اس نے وہ خط کا لفافہ نکالا جو وہ پھولوں کے ساتھ رکھنے کے لیے لایا تھا۔ ابھی اندر موجود سفید موٹے کاغذ پہ اس نے لکھا نہیں تھا اور اب اسے معلوم تھا کہ اس کو کیا لکھنا ہے۔

”اس لڑکی کے نام جو کبھی کسی ان چاہے رشتے کے بننے کے خوف سے روتی ہے، تو کبھی کسی بن چکے ان چاہے رشتے کے ٹوٹنے کے خوف سے۔“

یہ آخری بات محض اس کا گمان تھا، مگر کیا پتا وہ صحیح بھی ہو۔ اس نے پی کیپ سر پہ لی اور مفلر گردن کے گرد یوں لپیٹا کہ اگر اب وہ خود کو گوریہ سروس میں کہہ کر گھر کے کسی ملازم کے حوالے وہ پھول کرے تو کل کو دن کی روشنی میں وہ اسے پہچان نہیں پائیں گے۔ پھول اور خط ایک ملازم کے حوالے کر کے وہ واپس چلا آیا۔ وہ صرف حیا کو چونکا نا چاہتا تھا اور اسے امید تھی کہ اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

داور کی بارات کے روز اس کا قطعاً ”ارادہ نہ تھا کہ وہ آج بھی حیا کے لیے ادھر جائے گا۔ آج ویسے بھی اسے اپنے کام بہت تھے۔ سیکنڈ سیکریٹری تک رسائی وہ ابھی تک حاصل نہیں کر سکا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ کام وقت طلب ہوتے ہیں۔ صبر، انتظار اور خاموشی یہ تین چیزیں اس نے اپنی جاسوسی مہمات کے دوران سیکھی تھیں۔ آج بھی اس کا کام نہیں ہو سکا تھا اور وہ واپس گھر جا رہا تھا، مگر صرف آخری منٹ میں اس نے یونہی سرسری سا سلیمان ماموں کے گھر کا جائزہ لینے کا سوچا۔ معلوم نہیں وہ بار بار وہاں کیوں جاتا تھا۔

جب وہ ان کی گلی کے دہانے پہ پہنچا تو اس نے زن سے اپنے سامنے گزرتی گاڑی میں حیا کو دیکھا۔ وہ بے اختیار چونکا تھا۔ اس گاڑی میں اسے وہی کل والی فیملی

نظر آئی تھی اور وہی بے باک نگاہوں والا فضول انسان گاڑی چلا رہا تھا۔

آخر وہ ان کے ساتھ کیوں جا رہی تھی۔

وہ فارغ تھا، اگر نہ ہوتا تب بھی ان کے پیچھے ضرور جاتا۔ جو بھی تھا وہ اس کی بیوی تھی اور وہ اس وقت کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ تھی جو اسے پہلی نظر میں ہی اچھے نہیں لگے تھے۔ کل اسے وہ ان سے مل کر ناخوش لگی تھی، مگر آج وہ ان ہی کے ساتھ تھی۔ وہ کل غلط تھا یا آج؟ وہ یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اور جب اس نے میرج ہال کے ایک طرف حیا کو گاڑی سے اتر کر دوبارہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے دیکھا تو اسے دھچکا سا لگا تھا۔ وہ کیسے یوں کسی کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی؟ کیا وہ ہر ایک کے ساتھ بیٹھ جانے والی لڑکی تھی؟ اسے شدید غصہ آیا تھا۔ ایک تو اس کا لباس، پھر وہ اتنا میک اپ کرتی تھی۔ اتنی تک سک سے تیار ہوتی تھی، اوپر سے رات کا وقت۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ ابھی اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اس آدمی کی کار سے نکال لے اور اگر اس نے وہ عجیب ساحلیہ نہ اپنایا ہوتا تو شاید وہ یہ کر بھی دیتا۔

جب وہ گاڑی سے نکلا تو فرائی پان بھی ساتھ ہی اٹھا لیا جو اپنے اس گیٹ اپ کے ساتھ وہ رکھا کرتا تھا۔ کاملیت اس کے ہر ”کور“ میں نمایاں ہوتی تھی۔ اور جب اس نے اس نوجوان کے سر کے پچھلے حصے پہ فرائی پان مار کر اسے گرایا تو بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا، کوئی حق نہیں جتا سکتا تھا، مگر وہ اس لڑکی کو گردن سے پکڑ کر میرج ہال کے دروازے تک چھوڑ سکتا تھا۔

اور یہ اس نے کیا۔ اپنے لباس کا وہ گھٹیا سے رنگ کا دوپٹا بھی اس پہ اچھال دیا مگر جب جانے لگا تو ایک دفعہ بہت سلگتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اگر وہ بولا تو صرف ایک لفظ جو اس کی زبان پہ آیا تھا۔ ”بے حیا۔“

ہاں وہ اسی قابل تھی۔ پچھلے دو روز میں اگر اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ جاگا تھا تو اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ جیسے کوئی دل سے اتر جاتا ہے، جیسے کسی کے بارے میں انسان شک و شبہ میں پڑ جاتا ہے۔ وہ اس وقت ایسا ہی

محسوس کر رہا تھا۔

اب وہ اس سے نہیں ملنا چاہتا تھا اور اگر وہ اسے استنبول آنے سے روک سکا تو ضرور روکے گا لیکن وہ ان کے گھر نہیں جائے گا۔ اس کا فیصلہ آسان ہو گیا تھا۔ ہر مشرقی مرد کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کی بیوی ہر کسی کی گاڑی میں بیٹھ جانے والی لڑکی نہ ہو اور آج جو اس نے دیکھا اس سے نہ صرف وہ بد ظن ہوا تھا بلکہ وہ اس لڑکی کے بارے میں شدید قسم کے شک و شبہ میں پڑ گیا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ اس لڑکے کو پسند کرتی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی جرات نے اسے بوکھلادیا ہو اور وہ فطری رد عمل کے تحت بھاگی ہو مگر کم از کم ایک بات واضح تھی کہ پسند نا پسند ایک طرف، مگر وہ کسی کو اپنے قریب آنے نہیں دیتی تھی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے اس لڑکے کے والد کے رشتہ بھجنے میں حیا کی رضا شامل ہو اور اسی لیے وہ جہان یا ممی جی آمد کا پوچھ رہی تھی تاکہ جلد از جلد یہ رشتہ منطقی انجام تک پہنچ جائے اور وہ اپنی مرضی سے کسی اور سے شادی کر سکے۔

”لعنت ہے مجھ پر جو میں نے سلیمان ماموں کی بیٹی اور فرقان ماموں کی بیٹی سے اچھی امید رکھی۔“

دل میں آئے بغض کو ختم کرنے کے لیے اسے بہت سا وقت چاہیے تھا۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں بعد ٹھنڈا ہو کر سوچنے پہ دل صاف کر لے۔ برسوں اس نے اس دنیا میں کام کیا تھا، جہاں ہر شخص کے دو سے زیادہ چہرے ہوتے تھے۔ دوسرے انسانوں پر سے اعتبار تو وہ بہت پہلے کھو چکا تھا، اب اپنی بیوی پر سے بھی کھو دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ ماموں سے ملنے نہیں گیا۔ امید دلائے بغیر رشتہ ختم کرنا زیادہ بہتر تھا۔ بس چند دن وہ اس لڑکی پہ مزید نظر رکھے گا۔ آخر اسے ممی کو اس رشتے کو توڑنے کے لیے ٹھوس وجوہات بھی تو دینی تھیں۔

ایک دفعہ پھر وہ اپنی سوچ میں ”حیا“ سے واپس ”اس لڑکی“ تک آ گیا تھا۔

وہ نوجوان جس کے ساتھ اس نے اس لڑکی کو بیٹھے دیکھا تھا اور بعد ازاں اسے فرائی پان بھی دے مارا تھا وہ اس کے ذہن سے نکل نہیں پارہا تھا۔ اگلے کچھ دن وہ بہت مصروف رہا اور اسے اپنے ماموں کے گھر کے قریب سے بھی گزرنے کا وقت نہ ملا لیکن شک کا جو کھٹکا اس کے دل میں بڑ گیا تھا اس کی تصدیق کے لیے اس نے حیا کے ای میل ایڈریس پر "کلون" لگا دیا تھا (اس کا ای میل ایڈریس مئی نے رو حیل سے لے کر دیا تھا اسے) اس کلون ہیکو کے باعث اب اس ای میل ایڈریس میں جیسے ہی کوئی میل آتی یا باہر جاتی تو اگلے ہی سیکنڈ وہ اسے اپنے فون پر موصول ہو جاتی۔ وہ اس لڑکے کا نام نہیں جانتا تھا اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا پھرے۔ اسے بس یہی معلوم کرنا تھا کہ اس کی منکوہ کسی اور کے ساتھ وابستہ تو نہیں۔ اگر ہے تو بہت اچھا، کوئی ٹھوس چیز اس کے ہاتھ لگ جائے پھر مئی کو راضی کر لے گا۔ ابھی تک اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تھی مگر اس کا تذبذب سہر حال ختم نہیں ہوا تھا۔

داور کی شادی کو آٹھ نو دن گزر چکے تھے۔ اس سہ پہر جب وہ اپنے پارٹنر منٹ کالا کھول رہا تھا اس کا موبائل بجلا۔ دروازہ احتیاط سے تھوڑا سا کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے آنے والا پیغام کھولا۔ وہ حیا کی ایک ای میل کی کاپی تھی جو اس نے ابھی ابھی بھیجی تھی۔ دروازہ دوبارہ اندر سے لاک کرتے ہوئے جہان نے موبائل کی اسکرین پر چمکتا پیغام پڑھا۔

"نیشنل رسپانس سینٹر فار سائبر کرائم" اس نے اپنے جیسے سے اس ایڈریس کو دیکھا جس کو ای میل بھیجی گئی تھی۔ اس کو کیا ضرورت پر گئی سائبر کرائم سیل کو میل کرنے کی؟

میل میں ایک ویب سائٹ پر کسی ویڈیو کا پتا لکھا تھا اور ساتھ میں ایک مختصر سی شکایت تھی جس کے مطابق اس کے کزن کی مندی کی تقریب جو کہ چند روز قبل منعقد ہوئی تھی، کی کوئی میل ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈال دی گئی تھی۔ وہ اس کے خلاف پراسیو کی ایکٹ کے

تحت شکایت کر رہی تھی کہ اسے فوری طور پر ہٹایا جائے۔

جہان نے ویڈیو کے پتے کو چھوا، مگر بہت بھاری ہونے یا نیٹ کی رفتار کم ہونے کے باعث کھل نہ سکی۔ خیر ویڈیو بعد میں دیکھ لے گا، ابھی اسے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ تو طے تھا کہ جس سائبر کرائم سیل سے اس نے رجوع کیا تھا وہ ایک غیر فوجی ایجنسی کا سیل تھا اور وہ میل کا جواب تین چار دن بعد ہی دیا کرتے تھے اور ان کا طریقہ کار ذرا پیچیدہ تھا۔ وہ پہلے شکایتی فارم بھیجتے، جو ایف آئی آر کے مترادف ہوتا اور پھر ایک دفعہ بیان لینے کے لیے ایجنسی کے تھانے ضرور بلایا کرتے تھے۔ اب یہ خاندانی لڑکیاں کدھر تھانے پچھری کے چکر کاٹی پھرس گی، اس لیے اسے کچھ کرنا چاہیے۔ اس سے لاکھ لے شکوؤں کے باوجود وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

مئی سے اس نے حیا کا موبائل نمبر بھی ای میل ایڈریس کے ساتھ لیا تھا۔ (مئی سے حیا کا کوئی خاص رابطہ تو نہ تھا، بس ایک دفعہ فاطمہ مائی نے حیا کے موبائل سے کال کیا تھا تو نمبر آگیا، اس نے چند لمحے سوچا اور پھر اپنے لینڈ لائن سے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ سرکاری فون تھا، اس کا نمبر کسی کی سی ایل آئی پر نہیں آتا تھا۔ صرف "پرائیوٹ نمبر" لکھا آتا تھا۔

آواز بدلتا کبھی بھی اس کے لیے مسئلہ نہیں رہا تھا۔ ان کو اس چیز کی بہت اچھی تربیت دی جاتی تھی، مگر صرف آواز بدلنے میں غلطی کا یا پکڑے جانے کا احتمال کافی زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے

Voice changing application بھی آن کر دی۔ یہ خود کار نظام اس کے لبوں سے نکلے ہر لفظ کو سیکنڈ کے دسویں حصے بعد حیا کی سماعت تک ایک مختلف مردانہ آواز میں پہنچاتا تھا۔

جب وہ اس سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز دھبی تھی۔ خوب صورت، مگر مدھم سا گھبرپن لیے۔ صوفے پر تیم دراز ہوئے، وہ بہت اطمینان سے ایسی باتیں کر رہا تھا جو اس لڑکی کو چونکانے کے لیے کافی تھیں۔ ویڈیو ہٹانے کا وعدہ لے کر اس نے وہی بات کہی

جو سائبر کرائم ہوائے بھی لازماً کہتے۔ ہمارے آفس آ کر باقاعدہ رپورٹ کریں۔ اس بات پر وہ باقاعدہ سٹپا گئی اور پھر جلدی سے فون بند کر دیا۔ جہان نے قدرے اپنے جیسے سے ریسپور کو دیکھا۔ وہ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی تھی؟ شاید مسئلہ سنگین تھا۔ اسے ویڈیو دیکھ لینی چاہیے۔

قریباً "دس منٹ بعد وہ اپنے لیب ٹاپ پر اس ویڈیو کو کھول رہا تھا۔ جیسے ہی صفحہ لوڈ ہوا اور اوپر ویڈیو کا نام دکھایا وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔ جیسے جیسے ویڈیو چلتی جا رہی تھی اس کے چہرے کے تاثرات سخت ہوتے گئے۔ پیشانی کی رگیں تن گئیں اور آنکھوں میں شدید غصہ در آیا۔

یہ تھا اس کے ماموں کا عزت دار خاندان؟ فرقان ماموں اور سلیمان ماموں کی عزت و عصمت والی بیٹیاں؟ وہ مکمل طور پر زنانہ فنکشن نہیں تھا۔ اسے پیچھے پس منظر میں ویٹرز اور ڈی جے بھی نظر آرہے تھے۔ وہ بھی تو مرد تھے۔ ان سے کوئی پردہ نہیں؟ کوئی شرم، لحاظ نہیں؟ کسے لوگ تھے یہ؟ کیا ہو گیا تھا پاکستان کو؟

دھک، طیش، استعجاب۔ ایک دم وہ بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ بے حد غصے سے اس نے لیب ٹاپ بند کیا اور اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹھنلے لگا۔ جیل میں گزرے وہ ایک ماہ دس دن اس کے اندر بہت سختی بھر گئے تھے اور گو کہ وہ اس سختی کو دبا گیا تھا، مگر ختم نہیں کر پایا تھا اور دبانے اور ختم کرنے میں خلج بھر فرق ہوتا ہے۔

اسے اتنا غصہ تو اس لڑکی کو اس گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر بھی نہیں آیا تھا جتنا اس واہیات ویڈیو کو دیکھ کر آ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس جیسے آدمی کے ساتھ تو کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ بہت باکردار اور اچھا تھا۔ بس وہ دونوں دو مختلف طریقوں سے پروان چڑھنے والے دو مختلف انسان تھے۔ دریا کے دو کنارے اور اب تو وہ مئی کی خوشی کے لیے بھی اس کے ساتھ باقاعدہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسے پچھتاوا ہوا کہ اس نے "مبجرا احمد" یعنی اپنا نام

فون پر کیوں بتایا۔ سہر حال اس غلطی کو وہ کور کر لے گا۔ وہ اسے معلوم نہیں ہونے دے گا کہ وہی مبجرا احمد ہے۔ یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی مسئلہ اس کے اسکارل شپ کا تھا۔ جب یہ طے تھا کہ وہ اس کے ساتھ رشتہ نہیں رکھنا چاہتا تو پھر وہ کیوں اگلے پانچ ماہ استنبول میں اس کے لیے ہلکان ہو؟ مئی کا خیال تھا کہ وہ آئے کی تو ان ہی کے پاس رہے گی اس صورت میں تو اور بھی مسئلہ ہو گا کہ وہ استنبول میں دو شناختوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کبھی جمائیکر میں رہنا پڑتا تو کبھی بیوک ادا میں۔ اگر وہ دو دن بھی اس کے گھر رہی تو جان جائے گی کہ اس کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ ایسے میں اس کے لیے خود کو چھپا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا اور اب جب کہ اسے زندگی میں شامل نہیں کرنا تو پھر رازوں میں بھی شریک نہیں کرنا۔

وہ یہی بات بار بار سوچے جا رہا تھا۔

ان کے ہاں کام کرنے کے دو طریقے بتائے جاتے تھے۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ۔ بلاواسطہ طریقہ وہ عموماً پہلے استعمال کرتا تھا، اگر وہ ناکام ہو جائے تب بالواسطہ راستہ چننا جاتا۔

فی الحال وہ یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ لڑکی ترکی نہ آئے۔ اس کی وجہ اس نے اپنے آپ کو یہی بتائی کہ وہ یہ صرف اور صرف اپنی دو سری زندگی میں کوئی گڑبڑ ہونے سے بچاؤ کے لیے کر رہا ہے۔ وہ آئے کی اور پھر وہ اس سے ملے گی، اس سے امیدیں وابستہ کر لے گی یا شاید وہ طلاق لینا چاہے، اس صورت میں مئی ہرٹ ہوں گی، اف۔۔۔ ان سارے مسئلوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ کچھ ایسا ہو جائے جس سے وہ رک جائے اور استنبول جانے کا پروگرام منسوخ کر دے۔

حماد اس کے آفیشل کام میں آج کل اس کی مدد کروا رہا تھا۔ وہ اپنے ایکسپلنٹ کے بعد بھی چھٹی پر تھا، اس لیے با آسانی اس کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ اس نے حماد سے مدد لینے کا سوچا۔

”دیکھو! میں صرف تمہاری تسلی کے لیے تمہاری مدد کرنے پہ تیار ہوں، ورنہ میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہاری بیوی ترکی بڑھنے جا رہی ہے، تمہاری نگرانی کرنے نہیں۔ اس کو کبھی بھی تمہاری سرگرمیوں پہ شک نہیں ہو گا۔ تم ہر چیز ٹھیک سے سنبھالنا جانتے ہو اصل بات یہ ہے کہ تم اس کو وہاں اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتے، تمہیں ڈر ہے کہ کہیں تم اس سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ اور اس صورت میں تمہیں اپنے ماموں کے سامنے ہارنا پڑے گا۔ تمہارا دل اس رشتے کو رکھنے پہ راضی ہے، مگر دل غور آج بھی اپنے ماموں سے انتقام لینے کا خواہش مند ہے، خائف ہے کہ کہیں دل کے جذبات انا پہ حاوی نہ ہو جائیں۔ پھر بھی میں جو کر سکا کروں گا۔“

حماد نے بہت اطمینان سے کہا تھا۔ جہاں خفگی سے سر جھٹک کر رہ گیا، جیسے اسے سچ سن کر برا لگا ہو۔ بہر حال، وجہ جو بھی ہو، وہ پاکستان سے روانگی سے قبل اس درد سر سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس نے وہ ویڈیو انٹرنیٹ پہ ڈالنے والے کو بھی ٹریس کر لیا تھا۔ وہ وہی مووی میکر تھا جو ہندی کی تقریب کی ویڈیو بنانے وہاں گیا تھا اور یہ کام اس نے اپنے موبائل کے کیمرے کے ذریعے ایک ویٹر سے لیا تھا۔ اس نے اپنی ایجنسی کے سائبر کرائم سیل والوں کے حوالے اس آوی کو کرا دیا تھا، اور اس نے جس جس کو وہ ویڈیو دی تھی، وہ بھی نکوالی تھی۔ پھر بھی، اگر نیٹ پر سے کسی نے اسے اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا ہو تو اس کا کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ کہیں نہ کہیں تو وہ ویڈیو ضرور ہوگی۔ ساری دنیا سے تو وہ نہیں نکلا سکتا تھا۔ بہر حال اس نے اس مووی میکر کے اکاؤنٹ کو اپنی دسترس میں لے لیا تھا۔ ویڈیو اس نے ہٹائی نہیں کہ ہٹانے کی صورت میں وہ لڑکی کبھی اس سے ملنے نہ آتی۔ مگر اس کا صفحہ ہلاک ضرور کر دیا، یوں کہ اس کے ماموں کے گھر کے سیکڑ کے علاوہ وہ ملک میں کہیں بھی نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اپنی ویڈیو ہٹوانے کے لیے وہ اس کے پاس ضرور آئے گی۔

اگلے روز اس کو حماد کے ساتھ چار پانچ گھنٹے سڑک پہ میڈم سیکنڈ سیکرٹری کی کار کے انتظار میں گزارنے تھے۔ وہ ایک ایسی مرکزی شاہراہ تھی جہاں ہریل رش ہوتا تھا۔ اس کو موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ بھی یہاں سے گزرے۔ وہ عموماً ”ہر وقت باہر ہی نکلی ہوتی تھی۔ وہ گھر میں بیٹھنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔“

اس سڑک پر تو نہیں مگر قریب میں ایک ذیلی سڑک پر وہ ایک ٹریفک جام میں ضرور پھنسی ہوئی تھی۔ جہاں اور حماد کا کام آج بھی نہیں ہو سکا تھا سو اس نے سوچا، وہ یہ دوسرا کام پٹنہ ہی دے۔ پاکستان میں اس نے عورتوں کو اگر کسی شے سے بہت ڈرتے دیکھا تھا تو وہ خواجہ سرا کی بددعا بھی، بالخصوص سفر سے پہلے اگر خواجہ سرا بددعا دے دے تو اس بد شگونی کے بعد لوگ سفر ترک کر دیا کرتے تھے۔ وہ اس وقت بددعا کے اس اصل کو بھول جایا کرتے تھے کہ بددعا چاہے نیک آدمی دے، یا فاسق، چاہے معذور دے یا صحت مند، وہ تب تک آپ کو نہیں لگ سکتی، جب تک آپ اس کے اہل نہ ہوں اور اگر آپ اس کے اہل نہ ہوں تو وہ دینے والے پہ پلٹ آتی ہے مگر اسے امید تھی کہ اس کی بیوی بھی ان ہی ضعیف العقیدہ لوگوں میں سے ہوگی جو خواجہ سرا کی بددعا سے ڈرتے تھے۔

وہ صرف پانچ منٹ اس کام کے لیے نکال سکتا تھا، اسے واپس جا کر رپورٹ کرنی تھی۔ مگر جب ان دونوں نے اسے متوجہ کیا تو وہ ایک دم اتنے غصے میں آگئی کہ ان کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔ حماد تو جانے کون سی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ مگر وہ کچھ سننے پہ تیار نہ تھی۔ اس نے جیسے بھلا دیا تھا کہ ڈولی نے اس پہ بھی کوئی احسان کیا تھا۔ وہ کوئی بات سننے پہ تیار ہی نہ تھی، بلکہ مسلسل ان کو ہٹنے اور جانے کا کہہ رہی تھی۔ یہاں تک ہو آ تو ٹھیک تھا، مگر وہی اس لڑکی کی ایک دم سے ری ایکٹ کر دینے کی عادت۔

اس نے حماد کی انگلیاں شیشے میں دے دیں۔ وہ ذرا سار غم اتنا تکلیف نہ ہوتا، اگر حماد کا وہ ہاتھ

فہمکچو کے بعد اب تندرستی کی طرف نہ برہم رہا ہوتا۔ ایسے میں اس کی وجہ سے وہ ہاتھ زخمی ہوا۔ اسے شدید غصہ آیا۔ دوسری طرف اس کا دوسرا کام بھی نہیں ہو سکا تھا، ان دونوں باتوں پہ وہ شدید غصے کا شکار ہو رہا تھا۔

وہ ایسے نہیں روک سکا۔ اسے اپنی یہ بے بسی غصہ والا رہی تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ منظر جب وہ اس لڑکے کی کار میں بیٹھ رہی تھی اور وہ ویڈیو۔ وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر پاتا تھا۔ اسے اس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا، پھر بھی ایک دفعہ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اسے کسی طرح اسکا لرشپ لینے سے باز رکھ سکتا تھا تو یقیناً ”وہ اسے ترکی میں نہیں دیکھے گا۔ اس لیے یہ ملاقات اہم اور ضروری تھی۔“

وہیں بستر پہ لیٹے لیٹے اس نے اپنے لینڈ لائن سے اس کا نمبر ملایا۔ کافی گھنٹیوں بعد اس نے فون اٹھالیا اور چھوٹے ہی ملنے کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ نیند سے بیدار ہوئی ہو اور اس کے انداز سے یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر ملنے آئے گی۔ پتا نہیں اس نے ان سفید پھولوں کے بارے میں اپنے گھر میں کیا بتایا ہو گا۔ شاید اس نے کوئی بہانہ کر دیا ہو۔ شاید پھول چھپا دیے ہوں۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ کل اپنے ابا کو ساتھ لے آئے۔ ویسے اسے امید نہیں تھی کہ وہ گھر والوں کو درمیان میں لائے گی۔ جو بھی تھا، وہ لڑکی کافی پامت اور اپنے مسائل خود حل کرنے والی لڑکی لگتی تھی۔

اس سے ملنے کے لیے ایک جعلی سیف ہاؤس کا انتظام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سب انتظام اس نے خود ذاتی طور پہ کیا تھا۔ البتہ یہ طے تھا کہ وہ اس سے اسکرین کے پیچھے سے بات کرے گا۔ جیسے بعض اوقات کچھ لوگوں کو تفتیش یا پوچھ گچھ کے لیے ہلا کر بات کی جاتی تھی۔ اس نے اپنا درست نام، مگر احمد تاکر البتہ غلطی کی تھی، ہو سکتا ہے فرقان ماموں کی وہ بات کہ سکندر کا بیٹا لاہور میں پوسٹڈ ہے اس نے سن رکھی

ہو اور وہ اس بارے میں شبہات کا شکار ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے دادا کا نام بھی معلوم ہو اور اب اگر ایک مہجر احمد اس کے سامنے خود کو چھپاتا ہے تو وہ دو جمع دو کر کے یہ جان سکتی تھی کہ وہ کون ہے۔

وہ اتنی ذہین تھی یا نہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ خود ایک کامیلت پسند تھا۔ اس کی کور اسٹوری میں کوئی خامی، کوئی جھول نہیں ہونا چاہیے، یہ اس نے اپنی جانب کے دوران سیکھا تھا۔ اس کے پاس حیا کو دینے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ کیوں اس سے اسکرین کے پیچھے بات کر رہا ہے اور وجہ بہت سادہ سی تھی۔

وہ اسے یہ تاثر دے گا کہ اس کا چہرہ جھلسا ہوا ہے۔ اسکرین چونکہ فروسٹڈ گلاس کی تھی تو اس کے پیچھے اگر وہ احمد کا آدھا جھلسا چہرہ دیکھتی تو جھلسا ہوا حصہ نمایاں نہ ہوتا، دھندلے شیشے کے باعث اسے کافی گہرے رنگ کا برن بنانا تھا۔ وہ یہی قیاس کرے گی کہ وہ اپنے احساس کمتری کا شکار ہے اور اسی لیے ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے آنے سے خائف ہے۔ ایک کامل اور ٹھوس وجہ۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اگر وہ اس کی بات نہیں سمجھتی اور اسکا لرشپ سے پیچھے نہیں ہتی تو وہ ایک آخری کوشش کے طور پہ حماد کو اس سے بات کرنے کو کہے گا اور حماد کے نزدیک اس مسئلے کا سب سے بہترین حل یہی تھا کہ وہ خود کو مہجر احمد ظاہر کر کے اس سے مل لے اور کسی بھی طرح اسے سمجھا دے کہ اس کے شوہر کے لیے یہ درست نہیں ہو گا کہ وہ وہاں جائے اور یہ کہ اس کا شوہر کہیں اس کی وجہ سے مصیبت میں نہ پڑے جائے ابھی اس گفتگو کا پورا متن طے ہونا باقی تھا، مگر یہ طے تھا کہ وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ اس کا کوئی رشتہ دار ان کے قریب استنبول میں رہے۔ یہ اس کے لیے کوئی خوش آئند بات نہیں تھی۔

”مجھے لگتا ہے تم اپنی مسز کے آنے سے خائف اس لیے ہو کہ تم کہیں ان کی محبت میں جھٹلانہ ہو جاؤ۔“

کہیں تم ان سے متاثر نہ ہونے لگو اور کہیں تمہارے پاس ان کو اپنی زندگی سے نکالنے کی وجہ ختم نہ ہو جائے۔ ”حماد اس کا مکمل ساتھ دے رہا تھا، مگر ساتھ میں وہ مسکرا کر ایسا بصرہ بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیتا۔

جب وہ میجر احمد کے اس خود ساختہ آفس آئی تو چیکنگ کے بہانے اس کا موبائل اس سے لے لیا گیا اور اس میں ایک بہت وسیع رینج کا حامل جی بی ایس ٹرننگ ڈیوائس ڈال کر واپس کر دیا گیا۔ اگر وہ ترکی چلی جائے تب یہ ڈیوائس اس کے بہت کام آئے گا۔

جب وہ اندر آئی اور جہان اس سے مخاطب ہوا تو سب سے پہلے اس نے اسے یقین دلایا کہ اس ویڈیو کو وہ شہر کے ایک ایک بندے سے نکلوا چکا ہے۔ یہ سچ تھا۔ کم از کم شادی کے فنکشن کی مووی بنانے والے جس مووی میکر کی یہ حرکت تھی، اس نے پوچھ گچھ یہ ہر اس شخص تک ان کو رسائی دے دی تھی جس کو اس نے یہ ویڈیو دی تھی، پھر بھی وہ جانتا تھا کہ اگر ان لوگوں نے ویڈیو مزید آگے کی ہو یا لوگوں نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر لی ہو یا کسی بھی دوسری صورت میں کہیں نہ کہیں وہ ویڈیو ضرور کسی کے کمپیوٹر میں پڑی ہوگی۔

لیکن بعض باتیں انسان غیر ارادی طور پر کہہ دیتا ہے۔ جیسے جب اس نے بتایا کہ اس نے صرف صبر نہ کر سکنے کے باعث ملاقات کا بہانہ بنایا تھا تو لمحے بھر کو وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ ان پچھلے چند دنوں میں دیکھے جانے والے ناقابل برواشت مناظر کے باوجود وہ اس لڑکی سے بغیر کسی وجہ کے ملنا چاہتا تھا؟ یا پھر جو وہاں اس کے پاس تھیں وہ محض اس کے قریب رہنے کا جواز تھا؟ شاید حماد ٹھیک کہتا ہے۔ پھر بھی وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں دو بہت مختلف سے لوگ کبھی بھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔

اس ملاقات میں اس نے اس لڑکی سے چند ایک سوال پوچھے جن پر حسب عادت وہ تپ اٹھی۔ یہاں تک کہ جب وہ اسے نصیحت کرنا چاہ رہا تھا اس نے

ٹھیک سے جواب بھی نہیں دیا، نہ ہی اس کی بات میں دلچسپی لی۔ تب اس نے وہ سوال کیا جس سے وہ شادی کے بارے میں اس کی ترجیحات جان سکے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ فوراً انکار کر دے گی، مگر کس وجہ کی بنا پر؟ اور جب اس نے وجہ بتائی تو لمحے بھر کو وہ خود بھی چونک کر رہ گیا۔ وہ جتنے یقین اور استحقاق سے ”میرا شوہر“ میرا شوہر“ کہہ رہی تھی۔ وہ پھر سے اپنے بارے میں بے یقین ہونے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے فرقان ماموں کے وہ الفاظ دہرائے جو انہوں نے مٹی کہا اور اس کی پاکستان واپسی کے بارے میں کہے تھے۔ وہ صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ اس کے ابا کے بارے میں کتنا جانتی ہے؟ مگر وہ حسب عادت بھڑک کر اٹھ گئی۔

تب اس نے اپنے قریب رکھے سرخ گلابوں کے بجے میں (کہ آج اسے واقعتاً ”سفید گلاب“ نہیں ملے تھے نہ اس نے تک و دو کی تھی) ایک ننھا سا کارڈ لکھ کر ڈالا۔

”آئے کا شکریہ۔ اے آر پی۔“
کارڈ اس نے پھولوں کے اندر رکھ دیا۔ اس کے ساتھی نے بعد میں باہر جا کر حیا کو پھول دینے چاہے، مگر اس نے تو ان کو دیکھا تک نہیں اور چلی گئی۔ وہ جیسے بہت غصے میں تھی۔

ان تمام دنوں میں یہ وہ پہلا دن تھا جب جہان نے اس سے بہت وقت صرف کیا تھا۔ گو کہ وہ بنیادی طور پر اتنا چوکس آدمی تھا کہ اسے وقت نکالنا آتا تھا، مگر ابھی تک جو وہ خود سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ صرف اسے اسکا ر شب لینے سے روکنے کے لیے کر رہا ہے۔ خود بھی نہیں سمجھ پایا کہ اگر وہ اس کے سامنے آئی بیٹھی تھی تو اس نے ہر بات کہہ دی، سوائے اسکا ر شب نہ لینے کے۔ وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ ان کی گفتگو جس رخ موڑے آ رہی تھی اس کے بعد اس کو کسی کام سے منع کرنے کا مطلب تھا کہ وہ جان بوجھ کر وہی کام کرے گی۔

مگر وہ ایک دفعہ پھر سے کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دو دن وہ اپنے کام پیک اپ کرتا رہا۔ اس کا کام ٹھیک

سے نہیں ہو پایا تھا کیونکہ میڈم سیکنڈ سیکریٹری واپس جا رہی تھیں کسی میٹنگ کے سلسلے میں۔ اس کے پیشے میں اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ بہت دن بہت صبر و تحمل سے کسی معلومات کے ملنے کے انتظار کے بعد ایک دم سے ہٹا کر کام نہ دیکھنا پڑتا تھا۔

تیسرے روز وہ رات میں پھر جناح سپر مارکیٹ کے ایک ویران سے چوتھے پہ اسے ملا تھا۔ دنیا کے ہر حساس ادارے میں سب سے زیادہ قدیم اور کسی حد تک گھسا پٹا طریقہ جو کسی بھی شخص کا احسان و اعتماد جیتنے کا بتایا جاتا تھا۔ وہ یہی تھا کہ پہلے آپ اپنے مطلوبہ شخص کو کسی مصیبت میں گرفتار کروائیں، پھر عین وقت پر پہنچ کر خود کو ہیرو ثابت کریں۔ اگر اگلا شخص عقل مند ہو تو آپ کی حرکت جان جائے گا اور کبھی بھی آپ کا احسان مند نہیں ہوگا۔ اسے انہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی عقل مند ہے۔ البتہ وہ یہ نہیں جان پائی کہ لڑکے اسے کس کے کہنے پر ستارے تھے اسے اس روز وہ ذرا غائب داغ لگی تھی۔ جیسے کسی بات پر ابھی ہوئی ہو۔ وہ اپنے شوہر کو ڈھونڈنا چاہ رہی تھی۔ آج پھر اس کی گفتگو میں شوہر کا تذکرہ تھا۔ وہ اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کا انتظار کیوں کر رہی ہے؟ تاکہ رشتہ ختم کر سکے؟ یا پھر رشتہ نبھاسکے؟

جو بھی تھا وہ میجر احمد کا امپریشن اس پر بہت اچھا ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے شک بھی پڑے کہ وہ بی ڈولی دراصل میجر احمد ہے۔ چوتھے پہ جانے سے قبل اس نے چند ایک رسمی فقرے ریکارڈ کر کے اس ریکارڈنگ کا ٹائم لگا دیا تھا۔ عین وقت ہونے پر حیا کا فون بج اٹھا۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میجر احمد کی احسان مند ہے بھی یا نہیں، مگر اس نے عادت کے مطابق پوری بات سننے بغیر ہی جھڑک کر فون رکھ دیا۔ وہ میجر احمد کو پسند نہیں کرتی، وہ جان گیا تھا۔

پھر اسے وہ گاڑی والا لڑکا یاد آتا تو لگتا کہ وہ واقعی جہان سے رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ شاید میجر احمد کے سامنے وہ اپنے شوہر کا ذکر صرف دھمکی کے طور پر کر رہی تھی تاکہ وہ اسے ٹھک نہ کر سکے۔

جب وہ جانے لگی تو اس نے وہی کہا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی بددعا سن کر وہ رک جائے۔ پھر وہ چوتھے پہ کی دیوار کے عقب میں جا کھڑا ہوا تھا۔ تب بھی اسے امید تھی کہ وہ مڑ کر ضرور آئے گی۔ یہ دیکھنے کہ وہ کون ہے اور کیوں ہے؟ مگر وہ ذرا سی رکی، مڑ کر دیکھا اور پھر واپس آگے بڑھ گئی۔ اس کا ذہن واضح طور پر کہیں اور الجھا تھا۔

جہان کا کام نہیں ہو سکا تھا۔ اب مزید یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ اس کو اب واپس جانا تھا۔ پندرہ جنوری کو اس کی فلائٹ تھی۔ اس کے پاس اب صرف ایک دن تھا۔ صرف اور صرف اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

”میں صرف تمہاری تسلی کے لیے ان سے بات کر لوں گا، ورنہ مجھے یقین ہے کہ تم اب خود نہیں چاہتے کہ وہ رک جائیں۔ اگر ایسا ہو تا تو تم اس کے لیے کوئی مؤثر طریقہ اپناتے۔ ان کے پیروں میں مسئلہ کرواتے۔ ان کے والدین کو کسی طرح اپروچ کر کے انہیں باز رکھنے کا کہتے۔ مگر تم جو بھی کر رہے ہو، وہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کو روک سکو، بلکہ اس لیے ہے تاکہ تم ہر دوسرے دن ان سے ملنے یا ان کو دیکھنے کا موقع پیدا کر لو۔ تمہارا دل کہتا ہے کہ تم یہ رشتہ نبھاؤ اور یہ کہ وہ ضرور ترکی آئیں تاکہ تم ان کو بہتر طور پر جان سکو مگر تمہارے داغ میں تمہارے ماموں کے خلاف جو عناد بھرا ہے۔ وہ تمہیں یہ رشتہ توڑنے پر اکساتا ہے۔ تم خود بھی کنفیوژڈ ہو جہان! کہ تمہیں کیا کرنا ہے مگر کبھی کبھی انسان کو خود سے بچ بول لینا چاہیے۔ اس سے بہت سی کنفیوژن ختم ہو جاتی ہے۔“

مگر وہ حماد کی ایسی ساری باتیں نظر انداز کر رہا تھا۔ اب بھی وہ اسی بات پر قائم تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے قریب ترکی میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ چونکہ اب اس کو یوانگ کا حکم مل چکا تھا اور کل دوپہر میں اس کی فلائٹ تھی۔ سو وہ ایک آخری کوشش آج کے دن کرنا چاہتا تھا۔

حماد کو آج اپنی امی اور بہن عینی کے ساتھ شاپنگ پر

جانا تھا۔ وہ لوگ اس کی شادی کی شاپنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف جہان اپنے لپارٹمنٹ میں پینٹنگ کر رہا تھا۔ ساتھ میں وہ اپنے ٹریسر کا اسٹیشن ضرور چیک کرتا تھا۔ صبح وہ ڈپلومٹک انکلیو میں تھی، پھر ہنڈی چلی گئی شاید۔

اس نے وہاں سے کچھ اٹھانا ہو، کیونکہ پھر وہ واپس ڈپلومٹک انکلیو چلی گئی تھی۔ ابھی دوپہر پوری طرح سے نہیں چھائی تھی، جب جہان نے اسے ایف سیون کی طرف جاتے دیکھا۔ کل رات بھی وہ جناح سپر میں تھی سو آج بھی شاید وہیں جا رہی ہو۔ اس لڑکی کو شاپنگ کا بہت شوق تھا۔ بہر حال اس نے حماد سے بات کی۔ وہ لوگ ایف میں جا رہے تھے، مگر چونکہ وہ حیا سے بات کرنے کے لیے راضی تھا، اس لیے وہ جناح سپر چلا آیا۔

حماد اس سب کو ایک اتفاقیہ ملاقات کی طرح پلان کرنا چاہ رہا تھا چونکہ یہ طے تھا کہ وہ اسے اپنے میجر احمد ہونے کا تاثر دے گا۔ اس لیے یہ غلط لگتا کہ جو شخص اپنی بد صورتی کے باعث پہلے اس کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اب بالمشافہ ملاقات یہ راضی ہو گیا تھا۔ اپنی جانب میں وہ اکثر ایسے اتفاقیہ مواقع پیدا کرتے رہتے تھے ان کے نزدیک وہ لوگ احمق تھے جو موقع ملنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ مواقع ڈھونڈنے نہیں پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب ایک بہت معصوم سے اتفاق میں وہ ایک ہی دکان میں اس سے ٹکرا جاتا۔ وہ یقیناً اس کا آدھا جھلسا چہرہ دیکھ کر چونکتی، اسی بل یعنی اسے احمد بھائی کہہ کر پکارتی۔ یعنی کو وہ پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ آج وہ اسے مارکیٹ میں احمد بھائی کہہ کر پکارے گی۔ کیونکہ وہ کسی کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کا نام حماد نہیں احمد ہے۔ یعنی اپنے بھائی کی ان مشکوک حرکتوں کی عادی تھی۔ وہ شانے اچکا کر راضی ہو گئی۔ جو بھی تھا۔ اپنے بھائی کی مدد کر کے اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔

”میں فیملی کے ساتھ مارکیٹ میں ہوں، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس شاپ میں جائیں گی؟“ حماد نے وہیں سے اسے فون کیا تھا۔ وہ اس وقت اپنا بیگ پیک

کر رہا تھا۔

”وہ جو سعید بک بینک والا پلانہ ہے اس میں جہاں ایک خالی چوترا سا بنا ہے۔“

”ہاں، مگر پھر کوئی بک فیئر لگا ہوا ہے۔ وہ خالی نہیں ہے۔“

”اس کے آس پاس کوئی کپڑوں یا جوتوں کی ایسی شاپ ہے جس پہ سیل لگی ہو؟“ وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ اس نے اتنے دنوں میں ایک چیز کا اندازہ کر لیا تھا کہ وہ لڑکی کپڑوں، جوتوں کی بہت شوقین تھی۔

”ہاں۔ آگے ایک جگہ سیل لگی ہوئی ہے۔“

”تم وہاں جاؤ، وہ ادھر ضرور آئے گی۔“ وہ بہت وثوق سے بولا تھا۔

”اوکے“ حماد نے فون بند کر دیا۔ وہ کپڑے تہہ کرتے ہوئے پھر اسی بج پہ سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی چاہتا تھا کہ وہ نہ جائے یا پھر بس اس کی ہر بل خبر رکھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا؟ ”جہان! تم کنفیوژڈ ہو۔“ اس نے خود کو سرزنش کی۔

پورا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا جب حماد کا دوبارہ فون آیا۔ وہ لپٹاپ سامنے رکھے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ حماد کا نمبر فون پہ دیکھ کر ایک دم اس کا دل بہت اداس ہوا۔ یقیناً حماد نے اس سے بات کر لی ہوگی اور اب وہ ترکی نہیں آرہی ہوگی۔ اس نے کال موصول کی۔

”چھی بے عزتی کروائی آج تم نے میری۔“ حماد ایک دم شروع ہوا۔ جہان سیدھا ہو بیٹھا وہ سخت غصے میں اس کو ملامت کیے جا رہا تھا۔

”میرے بھائی! ہوا کیا ہے؟“

”بھابھی نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے پوری شاپ میں سب کے سامنے اعلان کیا کہ میں چنگی بنا سڑک پہ گداگری کر رہا تھا۔ لعنت ہے مجھ پہ اور لعنت ہے اس دن پہ جب میں نے تمہاری مدد کرنے کا سوچا۔“

”اس نے۔ اس نے کیسے پہچانا؟“ جب اس کے منہ پہ مٹکس گرا تھا۔ تب بھی اسے جھٹکا لگا تھا اور اب بھی ایسا ہی جھٹکا لگا تھا۔

”میرے ہاتھ پہ جو نشان ہے اور انگلیوں پہ جو انہوں نے اس دن زخم دیے تھے ان ہی سے انہوں نے پہچان لیا اور میری فیملی کے سامنے اچھی خاصی میری بے عزتی کر دی۔“

”تم نے اس سے بات نہیں کی؟“

”میں اس سارے ہنگامے کے بعد کیا بات کرتا؟ میں تو جلدی سے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ شاپ کیپر آ گیا۔ اس دن ثانیہ اور میں نے یہیں سے شاپنگ کی تھی۔ وہ ہمیں جانتا تھا۔ بس شکر تھا کہ اس نے میرا نام نہیں لیا۔ مگر۔“ غصے سے بولتے بولتے وہ ایک دم رکا۔ ”تم جو چاہ رہے تھے کہ میجر احمد کا امپریشن اچھا پڑے، اب نہیں ہو سکے گا، کیونکہ میں نے عینی سے کہا تھا کہ وہ مجھے احمد کہہ کر پکارے گی اور اس نے تمہاری مسز سے لڑتے ہوئے بھی میری ہدایت یاد رکھی۔“

”اس سے بہتر تھا میں تمہیں کام نہ ہی کہتا۔“

”جہان! ایک منٹ، مجھ سے بول لو، خیر ہے، مگر خود سے جھوٹ مت بولو۔ سچے دل سے تسلیم کر لو کہ تم کبھی ان کو روکنا نہیں چاہتے تھے۔ تم اب بھی چاہتے ہو کہ وہ تمہارے استنبول ضرور آئیں۔ اس لیے اس بارے میں پریشان مت ہو اور جانے کی تیاری کرو۔ ویسے اچھی خاصی خوش اخلاق بیگم ہیں آپ کی۔“

اس کی آخری بات پہ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔ حماد ٹھیک کہتا تھا۔ اسے اپنے اندر کی کنفیوژن ختم کر دینی چاہیے۔ وہ اس کے ترکی آنے سے پریشان تھا مگر ناخوش نہیں۔ اس نے بالآخر خود سے سچ بول ہی لیا۔ وہ کسی لڑکی کے اپنے اعصاب پہ حاوی ہو جانے سے ڈرتا تھا۔ لڑکی بھی وہ جو سلیمان ماموں کی بیٹی تھی۔ مگر اسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ جب اسے ماموں سے انتقام لینا ہی نہیں ہے تو پھر ان کے خلاف دل میں عناد کیوں رکھے؟ اور شاید وہ خود بھی یہ رشتہ نہ چاہتی ہو۔ جہان کو اس کا اس لڑکے کی گاڑی میں بیٹھنا یاد تھا۔ ”چلو ٹھیک ہے، وہ آجائے گی تو کبھی نہ کبھی وہ اس سے یہ بات کلیئر کر لے گا۔“

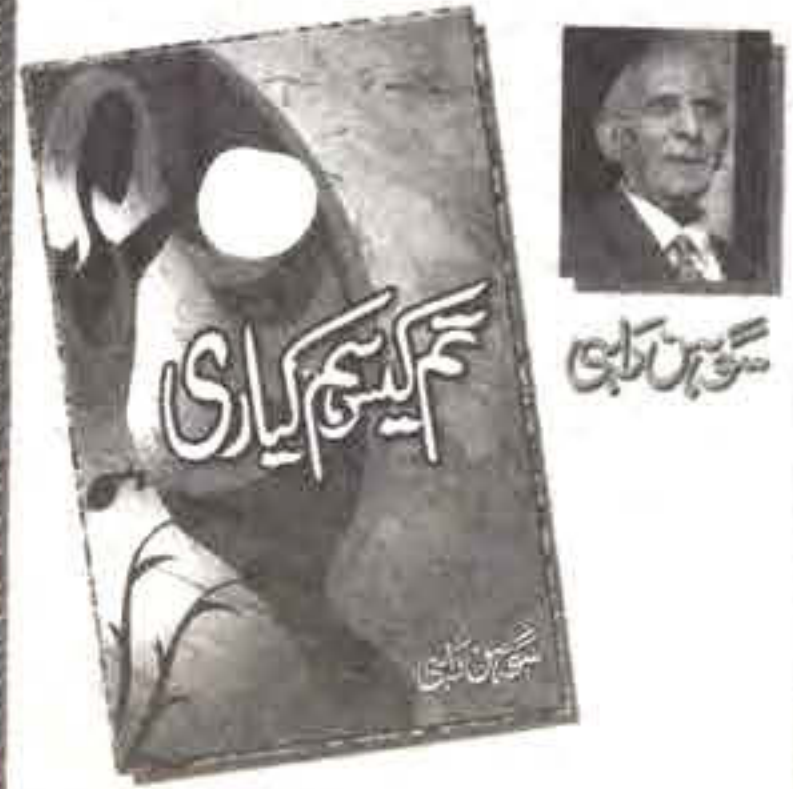
اب وہ مطمئن تھا۔

آفس میں نیم اندھیرا پھیلا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر شام اتر آئی تھی۔ وہ ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھی ایک ٹک لپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک لڑھک کر اب سوکھ چکے تھے۔ کہیں پس منظر میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی مگر وہ اس جانب متوجہ نہیں تھی۔ وہ صرف اس ایک شخص کو دیکھ رہی تھی جو اس سے ہم کلام تھا۔ بہت مختصر الفاظ میں اپنی کہانی سناتے ہوئے بھی درمیان میں اٹھ کر وہ کافی بنا لیا تھا۔ فارغ تو وہ بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ مگر آج جب اس نے ویڈیو کے کھلتے ہی جہان کو بیوک ادا کے سفید محل میں موجود عبدالرحمن پاشا کے کمرے کی کمپیوٹر چیئر پہ بیٹھنے دیکھا تھا تو اسے لگا تھا وہ اس شخص کو نہیں جانتی، نہیں پہچانتی۔ وہ اس ویڈیو میں اور اسے آر پی کے کمرے میں کیا کر رہا تھا؟ مگر پھر جیسے جیسے وہ سنتی گئی، اس کے اعصاب سن پڑ گئے۔

پہلے اسے شاک لگا، پھر غصہ چڑھا، مگر ایسا غصہ جو شطرنج میں اپنے ذہین مقابل کی چال پہ مات کھا جانے سے چڑھتا ہے اور پھر اس کی جگہ دکھانے لے لی۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا نہ ہو، اسے پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔

فون کی گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی۔ اس نے ہاتھ برہا کر ویڈیو کو وہیں روکا۔ ابھی وہ آدھی بھی نہیں ہوئی تھی اور ابھی تک جہان نے اس آدھی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ جس کے چہرے پہ حیا نے کافی الٹی تھی۔ اگر اس کا وہ غریب ساریسٹورنٹ اوئر جہان ہی عبدالرحمن پاشا تھا۔ عائشہ اور بہارے کا عبدالرحمن پاشا۔ تو پھر بے چارہ وہ کون تھا جس پہ اس نے کافی الٹی تھی؟ اور وہ جس کو اس نے جہان کے ساتھ پیشی میں دیکھا تھا۔ مگر ایک منٹ۔ اس نے دونوں کمپیوٹوں کو انگلیوں

برطانیہ میں مقیم سات شعری مجموعوں کے خالق محبتوں کے خوش نوا شاعر



سویہن راہی

کے شہر دہلی، بدھ مت کے بانی کا تارو، محمد شاہی اور گیتا ہے۔

سویہن راہی گیت نگاری میں ایک بڑا نام ہیں، انہوں نے گیت کے کیوس کو بڑی وسعت اور کشادگی عطا کی ہے، انہوں نے سرنگیت کے سوتوں سے گیت کی نئی دنیا میں تخلیق کی ہیں۔
افتخار عارف

گیتوں کی قدیمی روایت میں پوش نظر گیتوں کے دل کی دھڑکن اور معاشرتی شعور کا نرم و نازک اسلوب سویہن راہی کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فاخر حسین

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

Idara-e-Adab London
63 - Hamilton Avenue Surbiton,
Surrey, KT67PW. U.K.
Phone: 0044-0208-397-0974

ہوں کہ اس ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ پلان میں آپ کے آرکیٹیکٹ نے گڑبڑ کی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس کمپنی کو وہ پروجیکٹ مل گیا تھا۔ ان کے کان میں آپ کے گھر کے روابط ہیں۔ یہ ساری آپ کی اپنی کمپنی ہیں۔ میرے پاس ثبوت ہے۔ وہ سہمی ہوئی تھی۔ ولید کے لب بچھنج گئے اور ابو تن

”تو پوچھی چیز کا ثبوت کبھی نہیں ہو سکتا مادام!“
”مجھے کورٹ میں کسی کو کچھ نہیں دکھانا۔ مجھے صرف اپنے ابا کو یہ سب بتانا ہے۔ ویسے بھی وہ اب ٹیک ہو رہے ہیں۔ اسی ہفتے دوبارہ جوائن کر لیں گے۔ آج جب گھر جا کر میں ان کو آپ کی اصلیت بتاؤں گی تو وہ اپنی بیٹی کی ہر بات فوراً مان لیں گے۔ ہماری کمپنی لاء کے مطابق اگر ایسا ٹریڈ ثابت ہو جائے تو نہ صرف آپ کے شیئرز فریز ہو سکتے ہیں بلکہ ابا کو آپ جانتے ہی ہیں وہ اپنے ساتھ دعا کرنے والوں کو یوں ہی نہیں چھوڑتے ہیں۔ سڑک پہ لے آئیں گے وہ آپ کو۔“
ولید کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔“ وہ غصے سے فریاد کرتا تھا۔
”میں نے کمپنی کے ساتھ کوئی دعا نہیں کیا۔ اگر تم نے اپنے ابا کو کوئی الٹی سیدھی بات بتانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“
اس نے مسکرا کر سر اٹھا کر ولید کو دیکھا۔ کسی سے تو وہ بھی ڈرتا تھا۔

”میں دیکھ لوں گا تمہیں۔“ ایک شعلہ بار نگاہ اس پر ڈال کر وہ مڑا اور تیز تیز چلتا باہر نکل گیا۔
اس آدمی کو وہ سمجھانے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کی اس ایک حرکت نے اسے جہان کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تھا۔ جب جہان اس سے ملے گا تو وہ سب سے پہلے یہی بات کلیئر کرے گی۔
جہان؟ وہ ایک دم چونکی۔ یہ ویڈیو تو اس نے لا کر سے ایک ماہ قبل نکال تھی یہ ساری باتیں تو پرانی اور نکس۔ وہ ابھی کہاں تھا؟

کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے وہ بولا۔
”آپ بتائیں کیا کام تھا؟“ وہ خشک لہجے میں بولا۔
وہ رات پھر سے تازہ ہو گئی تھی۔ کیا سوچتا ہو گا جہان اس کے بارے میں؟

”کل بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں ہم آپ کے خلاف قرارداد لارہے ہیں۔“ وہ تپا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے اس کی میز سے پیپر وٹ اٹھا کر انگلیوں میں گھمانے لگا۔

”کیسی قرارداد؟“ اس نے حتی الامکان لہجے کو نارمل رکھنے کی سعی کی۔

”آپ جانتی ہیں کہ تمام ڈائریکٹرز اگر مل کر ایم ڈی کے خلاف قرارداد لائیں۔۔۔ عدم اعتماد کی قرارداد تو ایم ڈی کو ہٹایا جاسکتا ہے۔“

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ شاید ولید نے تازہ تازہ کمپنی لاء پڑھا تھا۔ ورنہ اسے یہ خیال پہلے دن آجانا چاہیے تھا۔ ”کل آپ اس آفس سے باہر ہوں گی۔“ بچھنج۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے مگر ہم نے بہت برداشت کر لیا آپ کو۔ آپ جیسی عورتوں کی جگہ گھر میں ہوتی ہے یا درہے میں گھر نہیں۔
وہ اب بھی لب بچھنجے اسے دیکھتی رہی۔

”آپ یوں کریں اپنی ضروری اشیا سمیٹ لیں۔ آخر کل آپ کو یہ جگہ چھوٹی جو پڑے گی۔ میں یہی بتانے آیا تھا ادھر۔“ وہ فاتحانہ انداز میں کتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹھیں!“ اس نے انگلی سے ایک دم اتنے تحکم سے اشارہ کیا کہ وہ بے اختیار اگلے ہی بل واپس بیٹھا۔
”اب میری بات سنیں۔“ حیا دونوں مٹھیاں میز پر رکھے کرسی پر ذرا آگے ہوئی۔

”میں نے منگل والے روز ہیڈ آرکیٹیکٹ اور آپ کی گفتگوری کارڈ کی تھی منسنا چاہیں گے؟“

ولید کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم ہو گئے۔ اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

”کون سی گفتگو؟“
”نجان بننا آپ کو فائدہ نہیں دے گا۔ میں جانتی

سے دباتے ہوئے سوچنا چاہا۔ اس کو کس نے کہا تھا کہ وہ عبدالرحمن ہے؟ کسی نے نہیں۔ اس نے آنے کے ساتھ اس کی تصاویر دیکھ کر از خود یہ فرض کر لیا تھا کہ وہی عبدالرحمن ہو گا۔ تب وہ نہیں جانتی تھی کہ آنے کا ایک دو سرا بیٹا بھی ہے۔ ان کا اصلی بیٹا، گمشدہ بیٹا، جو عرصہ پہلے اولاد پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہاں وہی تو تھا ان کا گمشدہ بیٹا۔ تب ہی تو اس کی تصاویر گھر میں ہر جگہ لگی ہوئی تھیں۔ پاشا بے (مسٹر پاشا) اسی نام سے جہان اسے ریٹورنٹ میں پکار رہا تھا، جب اس نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ عبدالرحمن پاشا اور پاشا بے دو الگ الگ لوگ تھے۔

فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔ اس نے آکٹا کر میز پر رکھے فون کو دیکھا۔ ایسا کی سیکریٹری کو کہا بھی تھا کہ اسے مت ڈسٹرب کرے، مگر کوئی سنے تو۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔
”جی؟“

”میم۔ ولید صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اصرار کر رہے ہیں۔ میں۔۔۔“

”میں بھیج دیں!“ اس نے ناگواری کی اٹھتی لہر کو دبا کر کہا اور فون رکھا۔ صرف اس فضول آدمی کی وجہ سے اس کا کردار جہان کی نظروں میں مشکوک ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں، وہ کمپنی کے ساتھ بھی وفادار نہیں تھا۔ آج تو وہ اچھی طرح نپٹے گی اس سے۔

اس نے آفس کا لاک کھولا اور نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھ لی۔ پھر لپ ٹاپ بند کر کے فلیش ڈرائیو ڈبی میں واپس ڈال دی۔ باقی ویڈیو وہ گھر جا کر دیکھے گی۔ ویسے بھی شام ہونے کو آئی تھی۔ وقت کا کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ابھی تک اس کے اعصاب شل تھے۔

دروازہ کھلا اور ولید لمبے لمبے ڈگ اٹھا تا اندر داخل ہوا۔ اس کے لبوں پہ ہمیشہ کی طرح استہزائیہ مسکراہٹ بکھری تھی۔

وہ کرسی پہ ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں پہ کمنیاں جمائے اسے دیکھتی رہی۔

”کیسی ہیں آپ میڈم ایم ڈی؟“ اس کے سامنے

نے؟ روش پہ چلتے ہوئے اس نے ذہن پہ زور ڈالنے کی کوشش کی۔
 کہیں دور اسے کوئی پکار رہا تھا۔ اس کے نام کی پکار بار بار پڑ رہی تھی۔ وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ سن نہیں پائی۔ تیز روشنی سی اس کے پیچھے سے آرہی تھی۔ ساتھ میں ٹائرز کی آواز۔

ایک دم جیسے کسی خواب سے جاگ کر وہ چونک کر پلٹی۔ وہ ولید کی گاڑی تھی اور وہ تیز رفتاری سے اسے روش پہ چلاتا آرہا تھا اس کے اوپر چڑھانے کے لیے "ولید رکو!" اس کے لبوں سے کراہ تک نہ نکل سکی۔ سانس رکا اور ساتھ میں پورا وجود شل ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ تیز ہیڈ لائٹس اتنے قریب تھیں کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے صرف چہرے کے آگے دونوں ہاتھ کیے۔
 دوسرے ہی لمحے بہت زور کی ٹکر نے اسے سڑک کے دوسری جانب لڑھکا دیا۔
 گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔
 (بانی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

خواب خواہش اور زندگی

رابعہ رزاق



قیمت - 500 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

بار بار؟
 لفٹ گر اوپنڈ فلور پر رکی تو اس نے پیچھے ہٹ کر تیا کو راستہ دیا، وہ نکل گئے تو وہ ست روی سے الجھی الجھی سی چلتی باہر آئی۔
 جہان نے کب بتایا؟ جھوٹے یہ اس رات؟ یا ہسپتال میں جب وہ دونوں ابا کے ساتھ تھے؟ یا۔۔۔
 "بات سنو میری!" ولید بتا نہیں کہاں سے سامنے آیا تھا۔ حیا بے اختیار ایک قدم پیچھے ہوئی۔ لابی خالی تھی۔ سوائے شیشے کے دروازے کے ساتھ کھڑے گارڈ کے جو ان کو ہی دیکھ رہا تھا۔
 "کیا ہے؟"

"مگر تم نے سلیمان انکل سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ساتھ بہت برا کروں گا۔" انگلی اٹھا کر چبا چبا کر بولتا وہ اسے تنبیہ کر رہا تھا۔ حیا نے کوفت سے اسے دیکھا۔
 "یہ دھمکیاں کسی اور کو دو۔ میں جا رہی ہوں گھر اور میں لیا تو سب صاف صاف بتا دوں گی۔ کرلو جو تم کو کرنا ہے!" اپنی ساری فرسٹریشن باہر نکال کر وہ اس کے ایک طرف سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ ولید کچھ کہے بنا تیز قدموں سے چلتا اس کے دائیں طرف سے گزر کر باہر نکل گیا۔

وہ گارڈ کو معمول کی ہدایات دینے کے بعد باہر کی میڑھیاں اترنے لگی۔ باہر آسمان نیلا ہٹ بھری سیاہی سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی جہان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے کب بتایا تھا اسے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟
 وہ میڑھیاں اتر کر اب ایک طرف بے پار کنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی گاڑی دوسری جانب کھڑی تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے اسے چند قدم اس لمبی پوڑی سی روش پہ چل کر جانا تھا۔ وہ بہت غائب دماغی سے قدم اٹھا رہی تھی۔

اگر جہان کہہ رہا تھا کہ اس نے حیا کو بتایا تھا تو اس نے بتایا ہو گا۔ وہ سیدھی طرح کوئی بھی بات نہیں کہتا تھا۔ اس کی ہر بات پسلی ہوتی تھی۔ آخر کب بتایا اس نے؟

وہ گارڈ کو معمول کی ہدایات دینے کے بعد باہر کی میڑھیاں اترنے لگی۔ باہر آسمان نیلا ہٹ بھری سیاہی سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی جہان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے کب بتایا تھا اسے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟
 وہ میڑھیاں اتر کر اب ایک طرف بے پار کنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی گاڑی دوسری جانب کھڑی تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے اسے چند قدم اس لمبی پوڑی سی روش پہ چل کر جانا تھا۔ وہ بہت غائب دماغی سے قدم اٹھا رہی تھی۔

اگر جہان کہہ رہا تھا کہ اس نے حیا کو بتایا تھا تو اس نے بتایا ہو گا۔ وہ سیدھی طرح کوئی بھی بات نہیں کہتا تھا۔ اس کی ہر بات پسلی ہوتی تھی۔ آخر کب بتایا اس نے؟

نہیں آئے گا۔"
 "کدھر۔۔۔ کدھر گیا ہے وہ؟" ایک دم بہت سے آنسو اس کی پلکوں پہ آ کر کے تھے۔
 "مجھے نہیں پتا مگر۔۔۔" وہ جیسے ذرا ٹھہری۔ "اس نے کہا تھا کہ اس نے تمہیں آنے سے کچھ دن پہلے بتا دیا تھا کہ وہ کدھر جائے گا۔ تمہیں پتا ہے حیا؟"
 "نہیں۔" وہ حیران ہوئی۔ "اس نے تو مجھے نہیں بتایا۔" آنکھیں اس نے ہاتھ سے رگڑ کر صاف کیں۔
 "مگر تم فکر مت کرو ہمارے! میں اگلے ہفتے ترکی آؤں گی نا، مجھے اپنی کلینر بس کروانی ہے، تب میں اور تم مل کر اسے ڈھونڈیں گے۔ ہم اسے ڈھونڈ لیں گے، تم میرے آنے تک وہاں ہو گی نا؟"

"مجھے نہیں پتا۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔" وہ جیسے سارے زمانے سے خفا ہو رہی تھی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ کتنی ہی دیر وہ سڑسک پہ رکھ کر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن صرف ایک بات پہ مرکوز تھا۔ جہان نے اسے جانے سے قبل نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، پھر اس نے ہمارے کو ایسا کیوں کہا؟ یہ ویڈیو تو پرانی تھی جبکہ ہمارے نے جانے سے کچھ دن قبل کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ کب بتایا جہان نے اسے؟

جب وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھی تو بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ سب جا چکے تھے۔ وہ شاید اکیلی رہ گئی تھی۔ جب وہ لفٹ میں داخل ہونے لگی تو تیار فرقان بھی ساتھ ہی داخل ہوئے۔

"آپ ابھی تک یہیں ہیں؟" وہ ان کو دیکھ کر ذرا حیران ہوئی تھی۔

"ہوں! کچھ کلنڈرات لینے آیا تھا۔" وہ اسی سرد مہر لمحے میں بولے۔ تاؤ اور برف کی دیوار ابھی تک بچ میں حائل تھی۔ اسے پھر سے اماں پہ غصہ آیا کہ کیا ضرورت تھی ظفر کو بلوانے کی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر چلا جاتا۔ وہ خود ڈرائیو کر کے آجاتی۔ ان کا احسان لینا ضروری تھا؟ اور جہان اس نے کب بتایا تھا کہ وہ کدھر

پتلی نے پزل باکس اسے تھماتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک وہ اسے کھول پائے گی تب تک وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔ نہیں وہ یوں ہی کہہ رہا ہو گا۔ اس نے سر جھٹکا۔ وہ جہان کو ڈھونڈ لے گی۔ وہ اسے کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔

اس نے موبائل نکالا۔ صبح سے وہ سائلنٹ پہ تھا اور اماں کی کئی مسسڈ کالز اور میسج آئے پڑے تھے۔ اس نے میسج کھولا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں ابا کی گاڑی اور ڈرائیو چاہیے تھے۔ اس لیے انہوں نے آفس فون کر کے دونوں کو منگوایا تھا۔ ایک اور پیغام میں انہوں نے بتایا کہ وہ ظفر کو اس کی گاڑی کے ساتھ بھیج رہی ہیں، وہ اسے گھر لے آئے گا۔

بس کار بھیج کر ظفر کو واپس جانے کا کہہ دیتیں، ضروری تھا کہ تیا ابا کا ملازم بھی اودھار لینے کا احسان لیا جائے؟ اسے خواہ مخواہ کوفت ہوئی۔ بہر حال اس نے سر جھٹک کر فون بک میں سے عائشے کے گھر کا نمبر ڈھونڈ کر ملایا۔ کوئی جواب نہیں۔ پھر اس نے حلیمہ آئی کا نمبر ملایا۔ وہ یقیناً "ان سے ہو ٹل گرینڈ کا نمبر لے سکتی تھی جہان بیٹی ہو گا۔"

"آلو؟" وہ اداس، مگر باریک سی آواز، اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔

"ہمارے! میں حیا بول رہی ہوں۔"

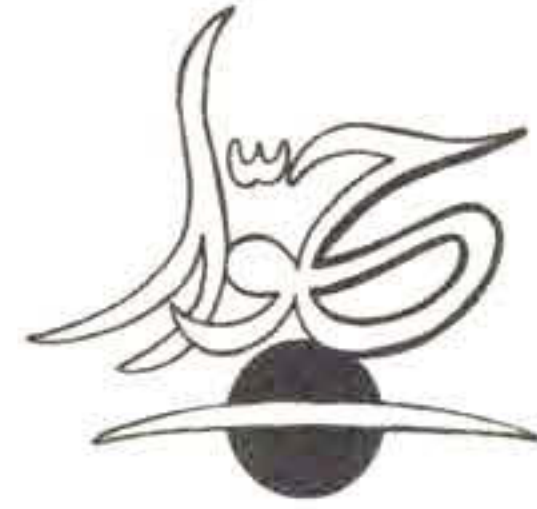
"اوہ حیا۔۔۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟" وہ جیسے بہت اداس سی لگ رہی تھی۔

"میں گھر آ گئی تھی مگر تم۔۔۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تم لوگ ملک چھوڑ کر چلے گئے ہو۔"

"سب چلے گئے ہیں، میں نہیں گئی، میں اکیلی رہ گئی ہوں۔" وہ جیسے آنسو پیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"عائشے بھی نہیں ہے، آنے بھی نہیں ہے، سب چلے گئے۔"

"عجب۔۔۔ عبدالرحمن؟ وہ کہاں ہے؟" اس کی آواز میں لرزش در آئی تھی۔
 "وہ صبح آیا تھا۔ مجھے اتنا سارا ڈانٹ کر گیا ہے، اس نے کہا وہ جا رہا ہے اور یہ بھی کہ وہ اب مجھ سے ملنے



اماں! بابا کا بہت خیال رکھیے گا۔ ڈاکٹر نے انہیں سفر کرنے سے منع کیا تھا مگر ان کی ضد سے آپ اچھی طرح واقف ہیں، میرے بے حد روکنے کے باوجود اکیلے پاکستان چلے آئے۔ دراصل آنا تو میں بھی ان کے ساتھ چاہتا تھا مگر۔

ابھی وہ اپنے نہ آنے کا معقول جواب دینے ہی والا تھا کہ فراست علی خان نے جولاؤڈ اسپیکر کا بٹن کھلا ہونے کی وجہ سے اپنے اکلوتے بیٹے مہران علی خان اور حوالی بی کی ساری گفتگو سن رہے تھے ہاتھ بڑھا کر کریڈل دبا دیا۔

حوا بہت انہماک سے بیٹے کی بات سن رہی تھی۔ اس طرح رابطہ منقطع کر دیے جانے پر چونکی۔ حیرت بس ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں جھلکائی اگلے ہی بل ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں میں صبر و سکون اتر آیا تھا۔

”خان جی! آپ کی دوائی کا وقت ہو گیا ہے میں لاتی ہوں۔“ بغیر کوئی شکوہ کیے، اپنی انہی نرم مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ اٹھ گئی۔ فراست علی خان ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔ انہیں تو ساری زندگی یہ حسرت ہی رہی تھی کہ وہ ان سے کوئی شکوہ کرتی۔ گریبان کے اوپری دو بٹن کھول کر دل کو مسلتے ہوئے وہ بے اختیار حوا کو ہی سوچنے لگے۔

”خان جی! آپ کی دوائی۔“ حوا کے آواز دینے پر وہ چونکے۔

”تم ہی پلاؤ۔“ اسے اپنی گہری نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے فرمائش کی۔ اس کی سنگت میں ہمیشہ اک بے نام سا جذبہ ان کے دل میں ہمکتا تھا جسے پہلے تو ناقابل توجہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ تھک کر سلا دیتے تھے مگر آج نہ جانے کیوں وہ ایسا نہیں کر رہے تھے شاید چند ماہ قبل ہونے والے ہارٹ اٹیک نے ان کے سارے کس بل نکال دیے تھے انہیں مزاحمت نہ کرتا پا کر وہ جذبہ فوراً سے پیشتر جاگا اور پلک جھپکتے میں سارے لمحوں میں گردش کرتا ہوا آنکھوں میں پوں سمٹ آیا گویا صدیوں سے ان آنکھوں کا مکین ہو چکا تھا اس وقت باہر جاتی حوا نے اچانک پلٹ کر دیکھا۔ دونوں کی نظر ٹکرائی اور خان جی کی آنکھوں میں مچلتے بے نام جذبے کو ”محبت“ کا عنوان مل گیا۔ وہی پاکیزہ اور سچی محبت جس کی تلاش میں وہ نصف صدی سے بھٹکتے پھر رہے تھے۔



کچھ لوگ محبت کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، کچھ محبت پانے کے لیے، ان میں ایک تیسری قسم ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو محبت تلاش کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ فراست علی خان کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ ”سچی محبت“ کی تلاش میں انہوں نے روہی کے صحرا سے لے کر سوئٹزرلینڈ کی برف پوش وادیاں چھان ماری تھیں مگر نہ سلونی ٹیاریں ان



کرنے میں ناکام رہے تھے۔ کیونکہ وہ سچی محبت کے متلاشی تھے۔ حسن پرست یا عیاش نہیں۔ وہ اسی تلاش میں سرگرداں تھے جب پندرہ سالہ حوا جرگے کے فیصلے کے تحت ان کے نکاح میں دیے وئی گئی۔ ایک تو یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف تھی، دوسرا حوا

کے دل میں محبت کا جذبہ جگا نہیں اور نہ ہی سمندر سی کی آنکھوں والی حسیناؤں کے غینوں میں ڈوب سکے تھے محبت کی تلاش میں بازار حسن کے چکر بھی بے سود ثابت ہوئے تھے۔ ٹھنکھروں کی چھنکار اور کھجورے غینوں کے وار بھی ان کے قدموں کو زنجیر

اتنی چھوٹی تھی کہ وہ اس کی طرف مائل ہی نہیں ہو سکے، ویسے بھی وہ فطرتاً "سیاح تھے" محبت کی تلاش میں نگری نگری گھومنا ان کا مشغلہ و مقصد زیست ٹھہرا تھا۔ مہینوں بعد جب کبھی گھر لوٹتے تو جاگیر کا حساب کتاب سر اٹھا کر ارد گرد دیکھنے کی فرصت نہیں دیتا تھا۔ ادھر فارغ ہوئے، ادھر نئے سفر کا آغاز۔

اور اب جب وہ اپنی تلاش میں ناکام ہو کر چونسٹھ سال کی عمر پوری کر کے "اپنی مٹی" میں دفن ہونے کی چاہ میں واپس لوٹے تھے تو پینسٹھ ویں سال کی پہلی صبح ہی انہیں حوا سے محبت ہو گئی تھی۔ وہی سچی محبت جس کی تلاش میں وہ نصف صدی سے بھٹک رہے تھے۔ اس وقت ان کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو لمبی مسافت اور برسوں کی ریاضت کے بعد عمر کی نقدی لٹا کر بھی منزل کے حصول میں ناکام ہو کر امید کی ہر جوت بجھا کر مایوسی کا پیرا ہن اوڑھے شکستہ قدموں سے اپنے آشیانے کو لوٹے، جہاں سے اس نے پہلی اڑان بھری تھی تو اسی منزل کو بائیں پھیلائے اپنا منتظر پائے۔

ایسے میں مسافر کے پاس صرف دو راستے ہوتے ہیں کہ یا تو غیر متوقع طور پر مل جانے والی منزل پر بیٹھ کر اپنی کوتاہ بینی کا غم منائے اور عمر کی نقدی ختم ہو جانے کا بین کرے یا پھر سو دویاں کے حساب کو پس پشت ڈال کر کسی فالج کی سی شان سے آگے بڑھ کر منزل و مقصد پالے۔

بہت سوچ بچار کے بعد فراست علی خان نے دو سرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور اطمینان سے آنکھیں موند لیں۔ یہ شاید فیصلے کی تاثیر تھی یا برسوں کی مسافت کی تھکن جو پاکستان آتے وقت وہ اپنے روم روم میں محسوس کر رہے تھے ایک دم یوں غائب ہو گئی جیسے سرے سے تھی ہی نہیں۔

حوا سوپ لے کر آئی۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے نیم دراز اسی کا انتظار کر رہے تھے وہ تیائی پر پالہ رکھ کر مڑنے لگی، انہوں نے آہستہ سے

آنکھیں کھول کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ تیرے بنا جو عمر بتائی، بیت گئی اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام اپنے جھریوں زدہ ہاتھ اس کے نازک شانوں پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے بے ساختہ شعر پڑھا۔ حوا ان کی آنکھوں میں اپنے لیے بے پایاں محبت دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ ماہ و سال کے انتظار کی تھکن آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔ گویا آج پچیس سال کی دن رات کی دعائیں قبولیت یا چکی تھیں۔ بہت نرمی سے اس کی پلکوں سے موتی چن کر اپنی محبت کی شدتوں میں اسے بھگونے لگے۔ پھر محبت گواہ ہے۔ انہوں نے پینسٹھ ویں سال کا پہلا دن (عمر کا باقی حصہ) پوری سچائی سے حوا کے نام کر کے اگلی صبح کی پہلی اذان کے ساتھ ہی مطمئن ہو کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

ان کے قبیلے کا رواج تھا کہ پچاس سال سے کم عمر عورت خواہ کتنے ہی جوان بچوں کی ماں کیوں نہ ہوتی، عدت کے فوراً بعد اس کا نکاح ثانی دیور سے کر دیا جاتا تھا۔ حوا فقط چالیس سال کی تھی مگر اس نے عقد ثانی سے انکار کر دیا۔ بیٹے مہران کے منانے پر بھی نہیں مانی۔

اس نے اپنی آدمی زندگی خان جی کی محبت کی چاہ میں کالی تھی اور باقی کی زندگی محبت کے اس ایک دن کی یادوں کو سینے سے لگائے خان جی کے نام پر خوشی خوشی بتادی۔

آخر کو حوا تھی نا۔

29/2

رشتہ کا دل ہے تیرا دل ہے

”تیاری بڑی خاص لگ رہی ہے۔ کیسے جانے کا ارادہ ہے یا ہو آئی ہو۔“

عائشہ میگزین کی ورق گردانی کرتی ہوئی شفق کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ جس کی رنگت معمول سے کہیں زیادہ چمک رہی تھی۔ وہ میگزین بند کر کے مسکرائی۔

”بس یوں ہی۔ آج اس نے بلایا ہے۔“

عائشہ نے بے ساختہ لمبی سانس بھری اور ہاتھ میں اٹھائے کپڑوں کو واپس فرش پہ ڈال کے اس کے پاس آ بیٹھی۔

”شفق۔ ایسا کب تک چلے گا؟“

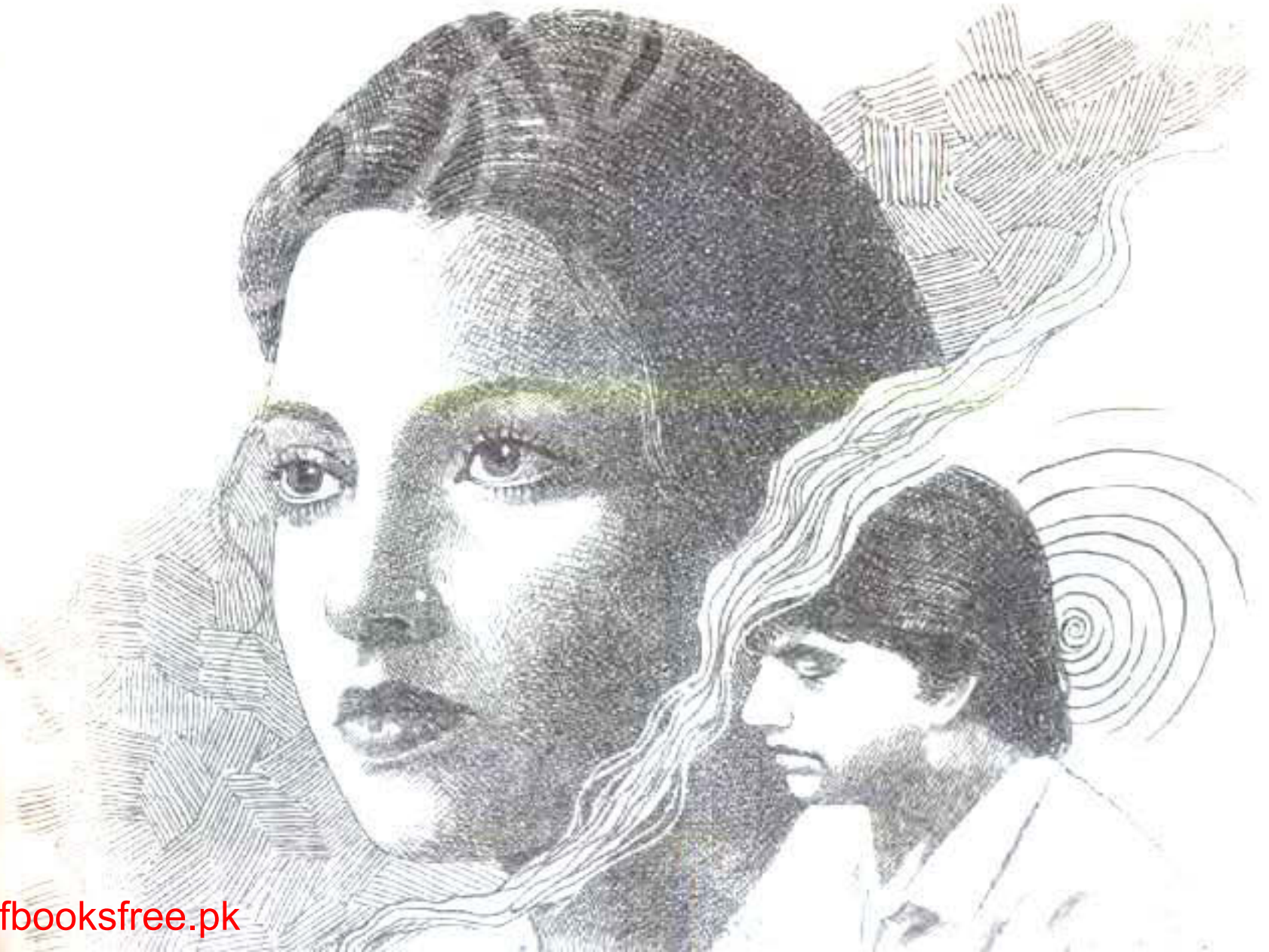
”کیا مطلب۔ کیا؟“ وہ سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”دیکھو شفق۔! تم دونوں کی دوستی کو پانچ سال ہونے لگے ہیں۔ اس کا تم سے شادی کرنے کا ارادہ بھی ہے یا محض دل لگی۔“

”وہ ایسا نہیں ہے۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ تیزی سے بولی۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے عائشہ کی بات بہت بری لگی تھی۔

”تم میری اکلوتی دوست ہو شفق! اور مجھے بہنوں

مکہ کا تارون



سے بڑھ کر عزیز ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کسی مصیبت یا پریشانی کا شکار ہو۔ بہتر ہو گا تم اپنی امی سے جلد از جلد اس بارے میں بات کرو۔ تاکہ اگر انہوں نے تمہارے لیے کہیں اور سوچا بھی ہوا ہے تو اسے ختم کریں۔

وہ سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے بولی۔
”ہی تو مسئلہ ہے عاشی! وہ اسے پیار سے عاشی کہتی تھی۔“

”امی! ابو نے اپنی اولاد میں اتنا فاصلہ رکھا ہوا ہے۔ اور اسے پائنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔“ انگلیاں چٹختے ہوئے وہ خاصی فکر مندی سے بولی۔

”اوکے۔ ریلیکس۔“ عائشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”مگر جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ تمہارا اٹھایا ہوا ایک قدم تمہارے مستقبل کے لیے خوش آئند بھی ہو سکتا ہے اور خطرناک بھی۔“

شفق نے پر تفکر نظروں سے عائشہ کو دیکھا۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جس راہ پر وہ قدم رکھ چکی تھی۔ اس میں واپس پلٹنا دشوار تھا۔



تعلیمی مدارج طے کرتے یہ اس کا چھٹا سال تھا۔ وہ ٹھیک سے شعور کی عمر میں بھی نہیں پہنچی تھی جب خلیل رضا سے اس کی دوستی ہوئی۔

خلیل رضا، شفق کا پریمی نہیں تھا۔ لیکن اس کی رہائش اتنی دور بھی نہیں تھی۔ شفق سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ نادان بھی تھی۔

اسکول سے گھر گھر سے اسکول، یہی اس کی زندگی کا کل محور تھا۔ دوسری طرف خلیل رضا تھا۔ اس سے پانچ سال بڑا۔ ایف ایس سی کا طالب علم، آگے پڑھنے کا وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ اسکول جاتے ہوئے اس نے بارہا خلیل رضا کو دیکھا تھا۔ کسرتی جسم کے ساتھ اپنے مسلز کی نمائش کرتے ہوئے کچی پکی

گلیوں میں آگے پیچھے دائیں بائیں۔ ان جگہوں کو جاگنگ ٹریک سمجھتے ہوئے اپنے سینے وہ جاگنگ ہی کرنے آتا تھا۔

راستے میں ہر کسی پر تبصہ کرتی اس کی ہم عمر سہیلیاں۔ وہ بس ان کے ساتھ ٹھنکتی تھی۔ اس کی سوچوں میں بس اس کی ذاتی زندگی کی گنجائش تھی۔

اس کا بیشتر وقت غائب دماغی کی سی کیفیت میں گزرتا تھا۔ اس کی وجہ اس کے گھر کا ماحول تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے ماں باپ کو لڑتے جھگڑتے ہی دیکھا تھا۔ کبھی عید، تموار پر بھی وہ ایک دوسرے سے خوش نظر نہیں آتے تھے۔ خود وہ متضاد سی کیفیت میں ہمہ وقت چکراتی رہتی۔ کوئی کچھ پوچھ بھی لیتا تو اس کا جواب ”ہاں یا نہ“ سے آگے نہیں ہوتا تھا۔

ایسے میں عائشہ ایسی لڑکی تھی جس نے پہلی دفعہ اس ساکت ندی میں ہلچل پیدا کی۔ اس کے سامنے والے گھر میں یہ لوگ کرائے دار کے طور پر آئے تھے۔ دوستی کرنے میں پہل بھی عائشہ ہی کی تھی۔

عائشہ کی صورت میں اسے دوست مل گیا تھا۔ عائشہ ہی تھی جو ہر مشکل میں اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیتی تھی۔

گرمیوں، سردیوں کی تعطیلات اس کی ہمیشہ بے کیف گزرتیں۔ اسکول بند ہونے سے لے کر اسکول کھلنے تک۔ اس مسکن کے علاوہ اور کوئی ٹھکانہ زندگی نہ تھا۔ صبح سے شام۔ پھر رات۔ چڑھتا سورج۔ اترتا سورج۔ یہ شب و روز ہوتے۔ اس کی کچی سی عمر سوچنے میں ہی گزر جاتی۔

اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد ہونے کے نالے اوپر کی تمام ذمہ داریاں اسی پر عائد ہوتی تھیں۔ اس کے بعد عروس سال کا۔ پھر مہر یاں اور سارا جڑواں بہنیں۔ مہو اور سارا تیسری جماعت میں جبکہ عمر جو بھی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔

مُلل اسٹیج پر گرمیوں کی چھٹیوں کے بجائے گرمیوں کی اضالی کلاسز کا شیڈول بنایا ہی تھا۔ اس کے لیے یہ سر کلاسز نعمت مرقہ سے کم تھیں۔ بے شک اب

اسے بہت پہلے اٹھنا پڑتا۔ تمام افراد خانہ کے لیے صبح کا ہشتابناک اسکول جانے کے لیے وقت نکال پاتی۔ عائشہ کچھ ہی دن بعد ساہووال اپنی نانی کے گھر چلی گئی تھی۔ چلتا ہی گرمیوں کی ایک دوپہر میں وہ باقی رزکوں سے اٹھ کر سب سے چھوٹے راستے کا انتخاب کرتے ہوئے دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ یہاں سے اس کا گھر نزدیک پڑتا تھا۔ چلتے چلتے اس نے امرود کے پتے پر نگاہ دوڑائی جو راستے میں آتا تھا۔ درخت پہ بھل ابھی کافی کچا تھا۔ مایوسی سے اس کے قدم سست پڑے۔ جب ہی بے دھیانی میں اس کا پاؤں کسی چیز سے اڑکا۔ اسے زور کا دھکا لگا اور وہ منہ کے بل آگے کو لڑھک گئی۔

”آہ۔“ ایک کراہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی مگر اس وقت دو مضبوط آہنی ہاتھوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کی کہناں چھل گئی تھیں اور ان میں سے خون بھی رس رہا تھا۔

”کیا کر رہی ہو تم یہاں۔ زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟“

بھاری مردانہ آواز پر اس نے تکلیف دہ تاثرات کے ساتھ ڈبڈباتی نظروں سے مقابل کو دیکھا۔ وہ پشت اس کی طرف کر کے اپنی سائیکل اٹھا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہینڈل پکڑے وہ اس کی طرف آیا۔ شفق گھبرا کے دور ہوئی۔ وہ قاسم انگل کا بیٹا خلیل رضا تھا۔

”مم۔ میں اپنے گھر جا رہی تھی۔“ اس نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔

خلیل نے ٹھٹک کے اس گڑیا سی لڑکی کو دیکھا۔ سفید اسکارف سے احاطہ شدہ بیضوی چہرے پر ایک شرارتی سی لٹ پھر بھی بالوں سے نکل کر اس کے چہرے سے آ لپٹی تھی۔ سرخ ہوتی ہرنی سی خوابیدہ آنکھیں اور گلابی نیم والرزتے ہونٹوں کے ساتھ جھکتے ہوئے وہ اپنا بیگ جھاڑ رہی تھی جو مٹی میں گرنے کی وجہ سے گرو سے اٹ گیا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اس نے آپ جناب کا

تکلف نہیں کیا تھا۔

”شفق۔“ وہ اضطراری انداز میں انگلیاں چٹختے ہوئے وہاں سے جانے کے لیے پرتول رہی تھی۔

”بڑا پیارا نام ہے۔“ وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے ستائشی انداز میں بولا تھا۔ شفق اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”میں خلیل ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے تعارف کرایا۔

”آؤ! تمہیں چھوڑ آؤں۔“ اس نے اپنی سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔ شفق نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کیا۔ ”میں چلی جاؤں گی۔“

”دوبارہ ملو گی؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ مسکرا کر کہتے ہوئے مڑی اور تیزی سے اپنی گلی کی طرف مڑ گئی۔ خلیل کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔

یہ اس کا خلیل رضا سے تعارف کا پہلا دن تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

تمہاری آپنی لکھی ہو

فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

199 جنوری 2013

198 جنوری 2013

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے لپے ذہن میں خلیل نام کے لڑکے کی کہانی کا آغاز ہو گیا تھا اور اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ ایسا راستہ چن چکی تھی جس کی منزل کا علم اسے خود بھی نہیں تھا۔ جب گھروں میں توجہ اور پیار کی کمی ہو جائے وہاں عموماً لڑکیاں باہر کے چور راستے چن لیتی ہیں۔ خلیل رضا سے دوستی اس کے لیے ان ہی چور راستوں میں سے ایک تھی۔

”آرام سے بیٹھو گھبرا کیوں رہی ہو۔“ خلیل نے محفوظ ہوتے ہوئے اس انارسی کلی کو دیکھا جو ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”اب میں جاؤں؟“ وہ تھوڑا سا سرک کر کھڑی ہو گئی۔ خلیل نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اسکول یونیفارم میں وہ معصوم سی ہی لگتی تھی۔

”کہاں۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔۔۔ کھا نہیں جاؤں گا تمہیں۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔ اس کا ہاتھ زور سے جھٹکنے۔ وہ بری طرح اس سے ٹکرائی تھی۔ خلیل کو تو کوئی فرق نہیں پڑا، لیکن وہ خفت سے سرخ ہو گئی تھی۔

اسکول سے نکلتے ہی اس کی نگاہ بایک پہ بیٹھے خلیل پہ پڑی جو اس کے دیکھنے سے اشارے سے اسے بلانے لگا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ یہاں آجائے گا۔ اپنی ہم جماعتوں سے نظر بچا کے وہ چپکے سے اس کی طرف آگئی۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ ”تمہیں دیکھنے!“ کمال اطمینان سے کہہ کر اب وہ اسے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ وہ تھوڑا جھجکی، لیکن پھر آرام سے بایک پہ چڑھ گئی۔

”آپ کہاں لے جائیں گے۔“ بایک ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے دل۔۔۔ میں تھوڑا تھوڑا ڈر بھی تھا۔

”دور۔ بہت دور۔“ وہ شگفتہ سے لہجے میں کہہ کر خود ہی ہنس۔ کچھ دیر بعد وہ ایک قریبی پارک میں موجود

تھے۔ وہ پارک کی اختتامی حدود میں کونے میں موجود ایک ٹوٹے ہوئے سنگی بیچ پر بیٹھ گئے۔ شفق کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ آج سے پہلے وہ کبھی اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہی تھی۔ پریشانی سے اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو چلا تھا۔ وہ گھبرا کر پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ خلیل نے اسے کندھے سے بیگ ڈال کر اس کا رخ اوڑھتے دیکھا اور مڑتی ہوئی شفق کا ہاتھ پھر سے تھام لیا۔ وہ مڑ کر بدحواسی سے اس کے چوڑے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

”دور کیوں رہی ہو۔۔۔ میں ہوں نا۔ چھوڑ آؤں گا۔“ ”لیکن۔۔۔“ کچھ دیر سوچ کی پرچھائیں نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ پھر پریشان تاثرات سمٹ گئے۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرائی۔ خلیل کا دل سمٹ کر پہلو سے آگیا۔ اسی مسکراہٹ کا تاو اسیر ہوا تھا وہ۔

”تم نے بتایا نہیں۔“ وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”کیا؟“ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ یوں ہی اس کا رخ کے سروں کو کھول اور باندھ رہی تھی۔ ”میں کیسا لگا؟“ یہ کیسا سوال تھا۔ اس نے ایک پل سوچا۔

”پتا نہیں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”اب کب ملو گی؟“ شفق خاموش رہی۔ ”شفق۔۔۔!“ وہ منتظر تھا۔

”میں بغیر کسی وجہ کے گھر سے باہر نہیں نکل سکتی۔ مجھے اجازت نہیں ہے۔“ اس کا انداز مجرمانہ سا تھا۔ ”اچھا چلو۔۔۔ اسی وقت۔ ٹھیک ہے روزانہ۔۔۔!“ اس نے پوچھا۔

”نہیں روزانہ نہیں۔ میری دوستوں کو شک ہو سکتا ہے۔ میں ان کے ساتھ جاتی ہوں۔ وہ میرے گھر شکایت لگا سکتی ہیں۔“ اب وہ اضطرابی انداز میں انگلیاں چٹا رہی تھی۔ اس کے لیے خلیل سے یوں چوری چھپے ملنا پریشانی کا باعث تھا۔

”شفق۔۔۔! یہ کیا کیا یا تم نے؟“ اس کی بات سن کر

عائشہ گویا لرنٹ لھا رہی تھی۔ ”اس میں برائی کیا ہے؟“ وہ الناسی سے پوچھنے لگی۔ ”ایک ہفتے سے روزانہ اس خلیل سے ملتی رہی ہو، دوستی بھی کر لی اور مجھے اب بتا رہی ہو؟“ اسے حد درجہ افسوس ہوا تھا۔ اس کی بہت اچھی دوست نے آج پہلی مرتبہ اسے اتنے دن ایک بات سے بے خبر رکھا۔

”کیوں۔۔۔؟ تمہیں دکھ ہو رہا ہے؟“ وہ جھپٹے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ آج اسے عائشہ کا خود کے لیے اتنا غصہ کرنا بالکل بھی نہیں بھایا تھا۔ ”تم جانتی ہو۔۔۔ کتنا غلط کیا تم نے۔۔۔ اپنے ماں باپ کو دھوکا دے رہی ہو۔ یوں مردوں سے دوستی کرنا گھومنا پھرنا یہ سب۔۔۔ شفق! تم ابھی چھوٹی ہو۔ یہ عمر نہیں ہے ایسے کاموں کی۔“ عائشہ کے لہجے میں اس کے لیے حد درجہ پریشانی جھلک رہی تھی۔

”اچھا تم کتنی بڑی ہو گئی ہو۔۔۔ جوبی اماں بن کے مجھے نصیحتیں بھاتا رہی ہو۔“ شفق کو غصہ آگیا۔ ”مجھے زندگی میں سوائے محرومیوں کے اور ملا ہی کیا ہے۔ ماں باپ مجھ سے پیار نہیں کرتے۔ بہن بھائی خود ابھی چھوٹے ہیں۔ میرے رشتہ داروں کو مجھ سے کوئی سروکار نہیں اور اب اگر کہیں سے تھوڑی سی خوشی کا آسرا مل گیا ہے تو تم کیوں چاہتی ہو کہ وہ بھی مجھ سے چھین جائے۔“ اس کے لہجے میں ٹوٹے ارمانوں کی کرچیاں تھیں۔ وہ اب دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے رونے لگی تھی۔

”اتنے سے دنوں میں وہ تمہاری خوشی بھی ہو گیا شفق۔۔۔!“ وہ شدید تھی۔

شفق نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں چھائی حیرت اور تشویش کو دیکھا اور لب بلیچ کر چہرہ موڑ لیا۔ عائشہ کچھ پل اسے دیکھتی رہی۔

”ٹھیک ہے جو تمہاری خوشی و مرضی۔“ کافی دیر بعد نہ بولی بھی تو اس کی توقع کے برخلاف۔ اس نے جھٹکے سے اپنا چہرہ اس کی طرف موڑا۔

”عائشہ!“ اس کے چہرے پہ بے پایاں خوشی کا احساس اُبھ آیا تھا۔ گویا ایک عائشہ کے مان جانے سے اس کے سارے مسائل حل ہو گئے ہوں۔ ”لیکن۔۔۔ دیکھو پلیز۔۔۔ اپنی حد کا خیال رکھنا۔ یہ دوستی صرف دوستی تک محدود رہنی چاہیے۔ جو کہ مجھے معلوم ہے۔ نہیں رہے گی۔ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کے دوست ہو ہی نہیں سکتے۔“ وہ پریشانی سے بھرپور بولی تھی۔

”کیوں نہیں ہو سکتے؟“ وہ استفسار کرنے لگی۔ ”بس نہیں ہو سکتے۔ یہ تم خود جان جاؤ گی۔“ عائشہ گم صم سی تھی۔

خلیل رضا ایک سرکاری اسٹینو گرافر کا بیٹا تھا۔ وہ تین بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔ عقیل اس سے بڑا جبکہ حمیرا سب سے چھوٹی تھی۔ عقیل شادی شدہ تھا اور حمیرا ایک عام سی شکل صورت کی لڑکی تھی۔ مڈل کے بعد پڑھائی کو خیر یاد کہہ چکی تھی اور اب پارلر کا کورس کر رہی تھی۔ اس کے خیال میں پڑھنا وقت کا ضیاع تھا۔ خود خلیل بھی پڑھائی میں بالکل گورا تھا۔ روپیٹ کروہ ایف ایس سی تک پڑھا تھا۔ اس کا واحد مشغلہ گھومنا پھرنا تھا۔ آگے پڑھنے سے وہ بھی انکار کر چکا تھا۔

قاسم رضا گاؤں میں موجود اپنی آبائی زمین بیچ کر شہر آئے تھے۔ یہاں ان کا ذاتی گھر تھا۔ قاسم صاحب نے بقیہ رقم سے شہر میں ایک کپڑوں کی دکان ڈال لی تھی۔ شام میں کاروبار اچھا چلتا تھا۔ خلیل اب دکان پر بیٹھتا تھا۔ یوں اس کے پاس وقت کی کوئی قید نہیں تھی۔ اس کا جب دل کرتا اپنی دکان کھول لیتا اور جب آکٹا جاتا تو سب بند کر کے ادھر ادھر نکل جاتا۔

شفق سے اس کی دوستی محض اتفاق تھا۔ لڑکیاں کبھی اس کی فرینڈ شپ میں شامل نہیں رہی تھیں۔ بس وہ پہلی ہی تھی جو نہ جانے کیوں دل و دماغ کو بھاگتی تھی۔ دونوں کی دوستی کو سال سے اوپر ہو گیا تھا۔

”میں کل نہیں آسکوں گی خلیل!“ برگد کے

درخت پہ لٹکتی اس کی داڑھی نما جڑوں کو یوں ہی بے خیالی میں نوچتے ہوئے وہ اداس لہجے میں بولی۔
”کیوں؟“ وہ پریشان ہو کر اس کی طرف مڑا۔
”خلیل! روزانہ ملنا اب کہاں ممکن رہا ہے۔ پہلے کی بات اور تھی، لیکن اب۔۔۔ نہ اب میں کوئی بچی رہی ہوں اور نہ اب وہ بے فکری کا دور۔ امی تو اب کڑی جرح کرنے لگی ہیں۔ میں کیا کروں۔“

وہ بے بسی سے گویا ہوئی۔ خلیل نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ وہ معصومیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چہرے پہ اداسی رقصاں تھیں۔ کچھ مسکرا کر وہ اس کے قریب آیا۔
”میں بھی تو تم پہ اصل روپ آیا۔ میرا پھول ہو تم، اپنے بھنورے سے اتنی جلدی جدا ہو جاؤ گی۔ رگل!“ وہ اس کی شرارتی سی لٹ کو شرارت سے کھینچتے ہوئے بولا۔
”شفق اس کی وارفتگی سے گھبرا کر اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولی۔
”پاگل ہو تم۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن تمہارے پیار میں۔“ وہ برجستگی سے بولا۔ ”ویسے گھبراتے ہوئے تم بالکل میری دلہن لگتی ہو۔ سنو کب بنو گی میری دلہن؟“
شفق حیا سے سرخ ہو گئی۔ اس کے گال تھما اٹھے اور دل کی دھڑکنوں نے الگ اودھم مچا رکھا تھا۔ خلیل نے پہلی مرتبہ یوں کھلم کھلا اظہار کیا تھا۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب آیا۔

”میں محبت کرنے لگا ہوں تم سے۔ ایک دن بھی تم نہ ملو تو دل یوں اداس ہو جاتا ہے جیسے پت جھڑ میں درخت۔“ عجب سی تشبیہ دے کر اب وہ اسے بے بس سی نظروں سے دیکھنے لگا۔
”تم کیا جانو خلیل۔ میرا تو پل پل تمہیں سوچتے گزرتا ہے اور تم آج اتنے عرصے بعد یہ اقرار کر رہے ہو۔“ وہ کہہ کر رہی تھی۔

”اب تو کر دینا!“ وہ دونوں ہی ہنس دیے۔ ان کی ہنسی میں خوشی کی کھنک محسوس کی جاسکتی تھی۔
اب وہ دونوں کچھ محتاط ہو گئے تھے۔ دونوں کے گھر

والے ان کے لیے ظالم سماج سے کم تو نہ تھے۔ شغل کے ویسے بھی میٹرک کے امتحانات شروع ہو گئے تھے اور وہ مکمل یکسوئی چاہتی تھی۔ اگرچہ خلیل کے اقرار کے بعد اس کی سوچوں کی رد و عجب انداز میں بسنے لگی تھی۔ لیکن اب امتحانوں کے اختتام تک اس نے نہ ملنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆
آج اس کی پھوپھو بمعہ اہل و عیال کے ان کے گھر تشریف لا رہی تھیں۔ اس نے دوپٹے میں چھپا گفٹ الماری میں لاکے چھپایا۔ اور بے دلی سے پچن میں آگئی۔

رشتہ دار بہت کم ہی ان کے ہاں سرخ کرتے تھے اور آج خاص طور پر ان لوگوں کی تشریف آوری اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

ایک تو بدن جھلساتی گرمی میں بچن میں حاضری دینا ایک آزمائش ہی تھی۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ گھر کی سب سے بڑی بیٹی جو ٹھہری۔ اس نے سچی سے سوچا۔ اس کی تمام سوچیں بدگمانی کی حدود سے جا ملتی تھیں۔ تمام ذمہ داریاں بچپن ہی سے اس کے ناتواں کاندھوں پہ اٹھ رہی تھیں۔ مہو اب برتن دھو لیتی، بھاڑ ڈو لگاتی تھی۔ اس سے زیادہ کرنا اس سے زیادتی تھی شاید کہ یہ تو ابھی اس کے کھینے کے دن تھے۔ امی کا حکم تھا یہ۔

”اس سارے قصبے میں۔ میرا کردار کہاں ہے امی؟“

بے آواز اس کے لبوں سے شکوہ پھسلا۔ ”میں۔۔۔ تو اس سے بھی چھوٹی عمر میں گھر داری سنبھال لی۔ کچر میں جج جج کا ماحول، ہر وقت بے سکونی کا رونا، ابو کی پیچم دھاڑ، بہن، بھائیوں کی الگ تکرار اور ایک میں بے وقعت، بے مول، جانے کیوں خوشیاں میرے نصیب میں نہیں۔“

پھوپھو کی آمد پر اس نے سرخ رنگ کا جوڑا زیب تن کیا تھا۔ یہ امی کی ہدایت تھی۔ اسے اچھا تو ہوا

لیکن تھوڑی دیر آئینے کے پاس کھڑی ہوئی تو خود ہی بھول گئی۔

خلیل کا پسندیدہ رنگ تھا۔ وہ اسے اگر اس وقت دیکھ لیتا تو پاگل ہو جاتا شاید۔

شانوں سے پھسلتے، گم رنگ آتے اس کے ریشمی پل، براؤن آنکھیں، نیم وا ہونٹ، نچلے ہونٹ پہ ہلکا سا بھنور تھا۔ جو ہنستے ہوئے ہموار ہو جاتا تھا۔ ہاتھوں میں حنا کا سرخ رنگ۔ وہ شفق تھی۔ اپنے نام کی طرح۔ اسم با مسمیٰ۔ کیا تھا اس میں جو خلیل کو پسند نہ تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرائے گئی۔

جہاں زیب کو پھوپھو کے ساتھ آنا دیکھ کر وہ ہکا بکارہ گئی۔ اچھا تو یہ وجہ تھی امی کی ہدایت کی۔ اسے کیا معلوم تھا پھوپھو اپنے سپوت اول کے ساتھ تشریف لانے والی ہیں۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ اکیلی ہی آتی تھیں۔ آج کیا کوئی خاص مقصد تھا۔ اس کا دل برا ہوا۔ ”کیا ضرورت تھی اتنا تیار ہونے کی؟“ وہ خود سے الجھی۔

فریدہ پھوپھو اب اسے ساتھ لگا کے پیار کر رہی تھیں۔ لیکن ان کے انداز میں وہ والہانہ پن مفقود تھا جو رشتہ دار مہمانوں میں ہونا چاہیے۔ بس رسمی سا پیار کر کے وہ تو نشست سنبھال کے بیٹھ گئیں۔ نہ یہاں خاص استقبال تھا، نہ وہاں کوئی گرمجوشی۔ کبھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ امی اور پھوپھو میں ایک سرد جنگ سی کیوں رہتی ہے۔ اس کی ایک بظاہر وجہ تو یہ بھی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی نند اور بھاؤ جیں تھیں۔ یعنی وہ سٹہ تھا۔ بیک وقت وہ پھوپھو اور ممانی کے عہدے پہ فائز تھیں۔

وہ سر جھٹک کے بچن میں چلی آئی۔ اس نے جہاں زیب کو جان کر نظر انداز کر دیا۔ جو پر شوق نظروں سے اسے مسلسل اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ نہ سلام، نہ دعا۔ اسے مقابل کے رد عمل کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ تو خود اپنی تیاری پہ جھنجھلا رہی تھی۔

ایک رات وہ رہے۔ اگلی صبح روانہ ہو گئے۔ لیکن شفق نے دوبارہ نظر آنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ جہاں زیب مایوسی سے واپس پلٹ گیا تو اس نے سکھ کا سانس

لے کر شکر ادا کیا۔

☆ ☆ ☆

اس نے کمرے سے جھانک کر دیکھا۔ عاشری کی امی آئی تھیں۔ اور اس کی امی آداب یزیدی نبھار رہی تھیں۔ وہ بھی سلام کرنے کی غرض سے باہر نکل آئی۔ ”السلام علیکم آئی!“ جھٹ سلام جھاڑا۔

”وعلیکم السلام بیٹا! یہ لو تمہارا دو بیٹا۔! تم نے رنگوانے کو دیا تھا نا۔“ انہوں نے خاکی رنگ کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے بلا تکلف تھام لیا۔ ”رنگوانا عاشری نے۔۔۔ شکریہ آئی۔“ وہ ممنونیت سے بولی۔

”ارے کوئی بات نہیں بیٹا! اچھا ہمارے گھر میلاد ہے کل، ضرور آئیے گا آپ لوگ۔“ وہ میلاد کی دعوت دینے آئی تھیں۔

”اچھا۔۔۔ کس سلسلے میں کروا رہی ہیں آپ۔“ وہ انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔
کافی دن ہو گئے تھے خلیل سے ملے ہوئے اس نے بھی تو خبر نہیں لی تھی۔

خود فراموشی کے عالم میں وہ اس کے تصور میں کھونے لگی۔ آج آخری پیر بھی ختم ہوا۔ لیکن خلیل نے کوئی اشارہ، کوئی پیغام نہیں دیا۔ وہ لو اس ہوئی۔

”ارے۔۔۔ ہاں۔۔۔!“ وہ چونکی۔ اس نے دوپٹا جھپٹ کر اچھی طرح دیکھا۔ ایک سرے پہ بندھی گرہ دیکھ کے اس کے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ در آئی اور عاشری پہ ڈھیروں پیار آیا۔

”آج پارک میں آجاؤ۔“
ہمیشہ کی طرح اس ایک جملے نے ایک میٹھی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھیر دی۔ سب کام چھوڑ کر وہ شام کے لیے کپڑے منتخب کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

”فریدہ نے جہاں زیب کا رشتہ دیا ہے اپنی شفق کے لیے! آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں۔“ برجیں

”مہوں۔ دیکھ لو!“ وہ بے توجہی سے گویا ہوئے۔
برجیس بیگم کو مزید زبان ملی۔ رجوشی سے گویا ہوئیں۔
”عمران بھائی کو تو ویسے بھی شفق سے بہت پیار ہے۔ ان کی تو دلی خواہش ہے شفو کو بہو بنانے کی۔
دونوں کی جوڑی بھی تو خوب جتنی ہے نا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں دیواروں کو نہیں۔“ وہ خود ہی بولے جارہی تھیں۔ اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو انہیں ٹوک بیٹھیں۔

”کیا کہوں۔ کیا بولوں میں ہاں۔ ہمیشہ تمہارے بھائی کی مرضی ہی تو چلی ہے آج تک۔ ہم تو جیسے ان کے اشاروں پہ ناپنے کو پیدا ہوئے ہیں۔“
وہ کٹ کھانے کو دوڑے تھے۔ برجیس چپ ہو گئیں اور شفق خاموشی سے پلٹ گئی۔ دل گرفتہ سی اپنے بستر پہ گری۔ وہ کچھ دیر ٹھنڈی ہوا کھانے باہر نکلی تھی۔ لیکن امی ابو کی باتیں سن کر تو اندر کی گھٹن مزید بڑھ گئی تھی۔

یہ کیا ہونے لگا ہے سب کیا وہ نازک گھڑیاں آن پہنچی تھیں جو ہر داستان کا مرکزی حصہ ہوا کرتی ہیں۔ خلیل کی منگنی اس کی چچا زاد کزن اقرا سے ہو گئی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ شفق کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ امتحانوں کے بعد اس کی چھٹیاں تھیں جب ہی پھپھو شگن کے لیے آنا چاہ رہی تھیں یہ بھی اسے امی نے ہی بتایا تھا۔ اب تو وہ ہر ملاقات میں خلیل کے سر ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے گھروالوں کو راضی کرے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت کہاں تھی وہ ان سے اس سلسلے میں کچھ بھی کہہ پاتا وہ سب اس سے خار کھاتے تھے۔ اس کی بات کو گھر میں چنداں اہمیت نہ دی جاتی تھی کجا کہ وہ اپنی پسند بتا کر ان کے غصے کو ہوا دیتا۔

وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے ہمدرد وہم نواتھے کہ ان کا ہر مسئلہ ایک سا ہوتا تھا۔
ایک ہفتے بعد منگنی رکھی گئی۔ اور وہ آج خلیل سے ملنے بوڑھے برگد تلے کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسے شکستہ پاچتا ہوا اپنی طرف آتا دیکھ رہی تھی۔

”میں تم احقر لیا رہے ہو؟ میری منگنی ہو رہی ہے۔“ اس کے قریب آتے ہی وہ اسے جھجھوڑ کر بے تاب سے بولی تھی۔
”ہاں تو کرلو۔“ وہ بے تاثر سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔ شفق کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی وہ بے یقینی سے اسے دیکھے جارہی تھی۔
”خلیل یہ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔“ وہ روہانی ہونے لگی۔ آنسوؤں کا گولہ حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔
”اب میں کیا کروں شفو۔ منگنی ہی ہو رہی ہے شادی تو نہیں نا۔ میں نے بھی کر لی تم بھی کرلو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“
اس کے لیے یہ سب کچھ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ ایک وہی تھی جس کی جان پہ بن رہی تھی۔ اس نے بہت دفعہ ہمت کی کہ امی کو سب کچھ بتا دے لیکن ان کے حد کردہ فاصلے اور گریز بھی اسے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہٹنے نہیں دیتے تھے وہ اندر اندر رہی کھل رہی تھی۔

تب ہی لاہور سے رہائی کا سند یہ آگیا۔ منگنی فی الحال ملتوی کر دی گئی۔ وجہ جاننے کی اس نے کوشش نہیں کی۔ بے ساختہ سکون کا سانس خارج کیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں اس کا عارضی سکون بھی غارت ہو گیا۔ جہانزیب نکاح پہ زور دے رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ رسمی رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔ دن گزر رہے تھے اور اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔
دروازے پہ دستک ہو رہی تھی۔ وہ آکسی سے اٹھ کر دروازے تک آئی۔ عاشری کا چھوٹا بھائی حمزہ کھڑا تھا۔ وہ اسے ایک چٹ دے کر بھاگ گیا۔ خلیل نے اسے بلایا تھا۔

گھر کی اسے کبھی پرواہ نہیں رہی تھی، سو ابھی بھی بنا بتائے نکل پڑی تھی۔ خلیل جلے پیر کی ملی بنایاں سے وہاں چکر لگا رہا تھا۔ آہستہ لپک کے اس کی سمت آیا۔ پتا نہیں وہ کب سے منتظر تھا وہ مرکزی گیٹ کے بجائے راہداری کی طرف سے آئی تھی۔ کیونکہ یہاں سے لوگوں کا گزر کم ہوتا تھا، دوسرے راستے سے تو کبھی

کسی کو بھی شک یا ہنک پڑ سکتی تھی۔
”تنہی دیر لگادی تم نے شفو۔!“ وہ جھنجلا کر بولا تھا۔
”عائشہ بتا رہی تھی تمہارے گھروالے تمہارا نکاح کر رہے ہیں؟“ وہ مطلب کی بات پہ آیا۔
”ہاں۔!“ اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھٹکایا۔
”تو۔ تم نے زحمت بھی نہ کی مجھے بتانے کی۔ آتا جی ہوا اتنی جلدی۔ بس۔!“

اسے منہ کھولتا دیکھ کر وہ وہیں اسے روک کر بولا۔
”یہ یاد رکھنا شفق! تم میرے علاوہ کسی اور کی ہو سکتی ہو اور نہ میں ہونے دوں گا۔ سمجھیں تم۔“ وہ کچھ غصے سے اٹل لہجے میں بولا۔
”کب نہیں بتایا میں نے۔“ وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”مجھے الزام دیتے ہو۔ تمہیں بتا دیتی تو کیا کر لیتا تھا تم نے۔ آتا ہی کیا ہے تمہیں صرف بدھکیاں مارنے کے۔“

وہ پھٹ پڑی۔ کافی دنوں کا غبار آج نکل گیا۔ خلیل نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے خود سے قریب کیا۔
”چپ چاپ کر رہی ہو۔!“ کبجی کی گھپیر تا اور چہرے پہ بڑنے والی اس کی گرم سانسیں اسے نظریں چرانے پہ مجبور کر گئیں۔

”اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ شفق بھی کٹھ پتلی کی مانند اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔
”بیٹھو۔“

اس نے بائیک اشارت کی۔ وہ چپ چاپ اس کے احکام کی تعمیل کیے گئی۔ تمام راستہ وہ خاموش رہے۔ ایک خستہ حال مکاں تھا جہاں اس نے بائیک ملا کے روٹی تھی۔
”یہاں کیوں لائے ہو؟“ اس نے الجھن بھرے انداز میں پہلی بار زبان کھولی۔
”کچھ خاص نہیں۔“ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ

کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔
”خلیل! تم کیا کر رہے ہو۔“ اب اس پر گھبراہٹ طاری ہو چکی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی۔
”پتا چل جائے گا۔“ وہ معنی خیزی سے بولا۔ شفق نے ایک نظر اسے دیکھا پھر۔ سر سراتے لہجے میں گویا ہوئی۔
”میں تم پہ بے پناہ اعتبار کرتی ہوں خلیل!“
”تمہارا اعتبار بے کار نہیں ہے۔“ وہ اعتماد سے بولا تھا۔

”تو پھر۔!“
”تو پھر یہ کہ مجھ سے شادی کرو گی؟“ اس نے اچانک ہی حملہ کر دیا۔ شفق بو کھلا کر رہ گئی۔
”ت۔ تم۔ تم یہ پوچھنے کے لیے مجھے یہاں لائے ہو۔ یہ تو تم وہاں بھی پوچھ سکتے تھے۔“
”تو کیا تم انکار کر دیتیں۔“

وہ لا جواب ہو گئی۔ خلیل کو کوئی پکار رہا تھا۔ تب اس نے ہوش میں آ کے دیکھا وہاں کچھ چل پھل تھی۔ کسی چیز کا انتظام ہو رہا تھا۔ یا شاید خلیل نے کروایا ہو۔ وہ غائب دماغی سے سوچنے لگی۔ وہ اسے لیے اندر آگیا تھا۔ اب وہ اتنی نادان مجھی نہیں تھی کہ کچھ سمجھ نہ پاتی۔

”خلیل! یہ کیا طریقہ ہے۔“ وہ اس کا بازو دوپے گھبراہٹ میں بولی۔
”اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ شفو۔ اگر تمہیں اعتراض ہے تو ابھی بتا دو۔ وقت ہے ابھی۔“ وہ مسخرانہ لہجے میں بولا۔ شفق بے کسی کی انتہا کو پہنچ گئی۔

”خلیل! یہ ٹھیک نہیں ہے سب۔“
”ہاں یا نہ۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر دو ٹوک لہجے میں بولا۔ اور وہ بل میں ہار گئی۔
”ایک دفعہ ہم ایک ہو جائیں تو پھر کوئی بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔“
وہ اس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے بہت پار سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زندگی

میں کبھی یہ چوری بھی کرنا ہو گا یہ تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ جانتی تھی اس کے ماں باپ کسی بھی قیمت پر اس کی بات نہ مانتے اور اگر ابوجی کو معلوم ہو جاتا تو وہ اسے زندہ زمین میں گاڑ دیتے، کجا اتنا بڑا قدم اٹھانا۔

کب نکاح کے بول پڑھائے گئے، کب اس کے جملہ حقوق خلیل کے نام ہو گئے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ تو بس بے یقینی و خواب کی سی کیفیت میں گھری رہی۔ باپ اس کی زندگی میں پہلے بھی کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا۔ آج اس کے نام کو بھی اپنے نام سے الگ کر کے اسے اپنی زندگی سے بھی بے دخل کر دیا تھا۔

ایک پل کو شرمندگی نے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اس کی نیم رضامندی ہی سہی لیکن برخلاف کچھ نہیں ہوا تھا۔

خلیل نے اچھا خاصا انتظام کروایا تھا۔ اس کے دس بارہ دوستوں نے اس کے نکاح میں شرکت کی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ سب کچھ کتنی آسانی سے ہو گیا۔ اب شاید خلیل کے گھر والے اسے قبول کر لیں۔ اپنے گھر والوں کی اسے خبر نہیں تھی۔ وہ تو اگر خلیل اسے بھاگنے کو کہتا تو شاید عمل کر جاتی اس پر بھی۔

فی الحال اسے دیر ہو رہی تھی اور وہ خلیل کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی جو اپنے دوستوں کو نبٹا رہا تھا۔ یہ گھر بھی شاید اس کے کسی دوست کا تھا۔

”خلیل! بہت دیر ہو گئی ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔“ وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔

”نہیں آج تم میری مرضی سے جاؤ گی۔“

خلیل نے بھاری آواز میں کہتے ہوئے پاس آکر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ شفق کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔ خلیل اس کی محبت کی طرح اس کے وجود کی دلکشی میں کھوتا چلا گیا۔ زماں و مکاں کھو گئے۔ اور وقت بھی پابندی کی قید سے نکل کر آزاد پنچھی بن گیا۔

☆ ☆ ☆

”پی! شفق باجی آگئی ہیں۔“

اس نے جیسے ہی اندر قدم رکھا۔ مہمانوں نے فوراً اسی کو آواز دی تھی۔ اس کا سانس ایک لمحے کو رک سا گیا۔ تو کیا آج وہ نازک گھڑی آئی گئی۔ جس سے وہ ہمیشہ بچتی آئی تھی۔ دروازہ بند کر کے دل کڑا کرتے ہوئے وہ اندر آگئی۔

”کہاں سے آرہی ہے۔؟“ امی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی استفسار کر رہی تھیں۔ آج جرح کا انداز بدلا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک نامعلوم خوف تھا آنکھوں کی سرخی سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی سے کتنی پریشان رہی ہوں گی۔

”میں وہ عاشی کے گھر تھی۔“ اس نے جان بوجھ کے جھوٹ بولا تھا کہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا اس بات کا، پہلی فرصت میں عائشہ کی ہی طرف چینگنگ ہوئی ہوگی۔ شاید وہ اس معاملے کو طول دینا چاہ رہی تھی۔

”جب میں نے منع کر دیا تھا تو کیوں گئی تو باہر؟ ہیں اور کہاں گئی تھی عائشہ کے ہاں؟ جھوٹی۔“

غصے اور پریشانی سے ان کی آنکھیں متورم تھیں وہ نہایت اضطرابی کیفیت میں گھری وہ اس کی طرف بوہمی تھیں۔ شفق بے ساختہ ہی پیچھے ہٹی تھی۔

”کیوں۔! میں کوئی قیدی ہوں جو باہر نہیں جاسکتی۔“ اس نے پہلی دفعہ ہمت کر کے زبان کھول دی۔ لی۔ برجیس بیگم جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔ یہ ہمت اور بے باکی۔ کون دے گیا تھا اسے۔ انہیں اشتعال آگیا۔

”منجوس اب تو زبان بھی چلائے گی مجھ سے۔ بتا کہ ہر گئی تھی؟“

انہوں نے جھپٹ کر بغیر توقف کے یکے بعد دیگرے دو چار دھمو کے اس کی پیٹھ پر جڑ دیے۔

”صبر کر! بھی تیرے ماموں کو فون کرتی ہوں۔ کل کے بیاتے آج لے جائیں۔ عذاب مسلط ہو گیا ہم پر تو۔“

”خبردار۔“ وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی۔ ”خبردار اگر آپ لوگوں نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی

کوشش کی تو درنہ۔“

اس کے سارے بال کھینچنے کی وجہ سے بکھر گئے تھے اور وہ لال سرخ چہرہ لیے۔ ”بیہبا“ انگشت شہادت اٹھائے دانت پر دانت جمائے انہیں وارننگ دے رہی تھی۔ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ آج سے پہلے ایسا کبھی ہوا نہیں تھا۔ جیسے آج ہو رہا تھا۔ انہوں نے اسے اس سے بھی بری طرح مارا پیٹا تھا لیکن وہ اف تک نہیں کرتی تھی۔ کچھ تو تھا جو غلط ہو رہا تھا۔

ان کی چھٹی حس کا الارم بجاتا تھا۔

”ورنہ۔! بتا کیا کرے گی تو۔“ وہ اس کے مد مقابل آنکھری ہوئیں۔

”میں بھاگ جاؤں گی خلیل کے ساتھ۔ ہاں۔ کوئی نہیں ہے یہاں میرا۔ صرف خلیل ہے۔ وہی مجھے سمجھتا ہے۔ سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور تم خود تو ساری زندگی جہنم میں جلتی رہیں، ہمیں بھی جلاتی رہیں اور اب میرا مقدر بھی جہنم ہی بنانا چاہتی ہو۔ کتنی ظالم ہو تم۔ تم تو ماں کہلانے کے بھی لائق نہیں ہو۔“

زارو قطار روتے، سسکتے اور مسلسل مظلومیت کی دہائی دیتے ہوئے وہ ہر رشتہ و تمیز بھول بیٹھی تھی بس یاد تھے تو اپنے اوپر ڈھائے گئے مظالم جنہیں وہ آج زبان دے چکی تھی سب جیسے سے ایک انچ بھی آگے نہیں ہلا گیا۔

خلیل۔ اس ایک نام کی بازگشت تھی دل و دماغ پر۔

”کون ہے یہ خلیل۔“ وہ بے جان سی سرگوشی میں بولیں۔ شفق نے ان پر کیا فرد جرم عائد کی۔ کیا الزام دیا، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا بس یاد تھا تو صرف ایک نام ابھی جسے اپنی بیٹی کے منہ سے سن چکی تھیں۔

یہ کون تھا جس نے ان کی بیٹی کو باغی بنا ڈالا تھا اگر اس کے باپ کو پتا چل گیا تو۔ وہ انسان جس نے ساری زندگی انہیں کبھی اعتبار کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ کیا وہ اسے اتنی بڑی کوتاہی پر معاف کر دے گا انہوں نے بچے کی طرح لرزتے اپنے دل کو قابو کرنے کی ناکام سی

کوشش کی اور ایک بار پھر تنفر سے سکڑی سٹی شفق کی طرف نظر کی جو مسلسل سسک رہی تھی۔

”کون ہے یہ بیذات؟“ ان کے لہجے میں نفرت کی اتنی شدید کٹ تھی کہ وہ لرز کر رہ گئی۔

”دیکھ جو بھی ہے یہ۔ آئندہ میں اس کا نام تیری زبان سے نہ سنوں۔ بس ہم تیری شادی زیب سے کروں گے جو بھی ہے بھول جاسب کچھ۔ میں تیرے باپ سے اس کا ذکر بھی نہیں کروں گی۔“ دوسرے ہی پل وہ پینتر ابدل کر اسے سمجھاتے ہوئے لجاجت سے بولیں۔ وہ بہت بزدل تھی اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔

”پی! میں جہاں زیب سے شادی نہیں کر سکتی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”کیوں۔؟“ وہ ہذیبانی انداز میں چلا کر بولیں۔

”کیونکہ میں خلیل سے نکاح کر چکی ہوں۔“

یہ وقت تمام کہتے ہوئے وہ ان کے حواسوں پر بم گرا چکی تھی۔ اس کے الفاظ تھے کہ بچھو کاؤنک۔ وہ اچھل کر دوڑ رہیں۔

”ہائے اللہ! یہ کیا کیا تو نے۔“ وہ بے جان سے انداز میں کارپٹ پر گر پڑیں۔

”یا اللہ! یہ کیا غضب ہو گیا۔“ جب ہی دھڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ ان دونوں نے ہی بے حد سہم کر اس طرف دیکھا تھا۔

حماد صاحب خون آشام نظروں سے شفق کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ شک باقی نہیں رہا تھا کہ انہوں نے سب کچھ سن لیا تھا۔ شفق کی کھٹی کھٹی چیخ نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

”اس لڑکے نے ہماری ناک کٹوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔“ قاسم رضا آج ایک بار پھر اس پر برس رہے تھے۔ وہ ہاتھ باندھے مؤدب سا کھڑا اپنی عزت افزائی کروا رہا تھا۔

”کب سے چکر چل رہا تھا؟“ وہ سرد مہری سے کہتے

ہوئے بالکل اس کے پاس آکر کھڑے ہوئے۔ اس نے ایک لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھا جن میں مکمل سرد مہری اور اجنبیت تھی۔ اس نے گہرا کر نظریں نیچی کر لیں۔

اس کے پاس ان سب کے سوالوں کا ایک بھی تسلی بخش جواب موجود نہیں تھا، سرد مہر سادہ کے خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی۔

”اللہ مجھے معاف کرے۔ میں بھی بیٹی والا ہوں بہت دکھ ہوا مجھے اس بے وقوف لڑکی کا باپ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے اپنی عزت کی بھیک مانگ رہا تھا صرف اس۔ اس بے غیرت کی وجہ سے۔ کیا ضرورت تھی اسے یہ ڈھونگ رچانے کی۔ شادی ہی کرنی تھی نا، اتنا ہی مر جا رہا تھا تو ہم مر گئے تھے کیا؟“

غم سے انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اسے دھکیلا تھا۔ خلیل نے بمشکل سنبھل کر پیچھے صوفے کی انتہی کو پکڑا۔

”بس بھی کریں نا۔“ اس کی ماں تڑپ کر آگے بڑھیں۔

”سارا الزام ایک میرے ہی بیٹے کے سر ہے کیا؟ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اگر اس نے غلطی کی ہے تو اس لڑکی نے کوئی گل نہیں کھلایا ہوگا۔ تو بے کیسی بے دید ہو گئی ہیں آج کل کی لڑکیاں۔ جانے کیسی مامیں ہوتی ہیں جو بیٹیوں کو بے لگام چھوڑ دیتی ہیں۔“

”آپ جیسی ہوتی ہیں۔“ قاسم رضا بھڑک کر بولے۔ انہوں نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”یہ۔ یہ بھی تو اولاد سے ناہنجار بے لگام۔ آپ کہاں تھیں اس وقت آمنہ بیگم! فرد جرم عورتوں پر ہی نہیں مردوں پر بھی عائد ہوتی ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے، شروعات اسی بے لگام نے کی ہوں گی۔ شکل دیکھو اس کی۔“ وہ نئے سرے سے تپنے لگے۔

عقیل نے عظمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خلیل کو منظر سے گم ہو جانے کا اشارہ کیا وہ بے بس سی مسکین شکل بناتا کرے سے نکل گیا۔ آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ نکاح کے بعد سے اس کا رابطہ شفق سے ختم ہو کر رہ گیا

تھا۔ اس کے باہر نکلنے پر بھی پابندی عائد ہو گئی تھی۔ ذلیل تو وہ سب کی نظروں میں ایک ہفتے سے ہو رہا تھا۔ رہی سہی عزت کا جنازہ آج نکل گیا۔ خود اس کا یہ حال تھا اور شفق وہ بے چاری کیسے سہہ رہی ہوگی۔ ایک دم اسے اس کا خیال آیا تھا اور خود بخود ہی سوچوں کو جیسے رستہ مل گیا۔

”تم سے ایک دن بھی صبر نہیں ہو سکا شفو۔“

تصور میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کتنی مشکل میں ہوگی۔ ابو جی تو اس کی شکل دیکھتے ہی چلانے لگتے تھے۔ حمیرا بھی منہ موڑ کر چلی جاتی تھی۔ عقیل بھائی پہلے بھی زیادہ بات نہیں کرتے تھے پیچھے اس کی حمایت میں امی ہی رہ جاتی تھیں اس واقعے کے بعد وہ جب بھی اس سے بات کرتیں ان کے لمحے کی واضح سرد مہری اسے خود سے بھی شرمندہ کر دیتی تھی۔

”امی! باجی کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے کھانا نہیں کھانا۔ پانی کا گلاس بھی دور پھینک دیا ہے۔“ سارا نے شفق کے کمرے سے نکل کر منہ بسورتے ہوئے کہا تو انہیں مزید تاؤ آگیا۔

”تو اس سے کہو مر جائے جان بخش دے ہماری پتا نہیں اللہ نے کس غلطی کا عذاب ہمارے سر مونڈ دیا ہے بیماری دنیا کے سامنے ماں باپ کو اس نے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔ کبجنت پیدا ہو گئی میرے ہی گھر میں۔“

اسے کوسے کوسے ان کا سانس پھول گیا اور اب زمین پر بیٹھ کے وہ رونے لگی تھیں۔

”امی! کیا ہے چھوڑیں نا۔“ وہ تینوں انہیں روتا دیکھ کر بوکھلا کر رہ گئیں۔

ہر دوسرے دن شفق کھانا واپس کر دیتی تھی وہ کمزوری ہونے کی وجہ سے دن بدن تڑھال ہوئی جا رہی تھی۔

رات بہت جلد زہ تھی۔ سانس لینا بھی دشوار تھا

وہ کھڑکی کے پاس آکر سانس لینے لگی۔ تصور میں اسی دشمن جاں کا خاکہ ابھرتے دیر نہیں لگی تھی۔ جسے ملے ہوئے بھی دو ہفتے گزر گئے تھے۔ اس نے اپنے سپید ہاتھوں کو دیکھا اندھیرے میں تو وہ خود ہی ولہ سی لگ رہی تھی۔ کتنے دن ہوئے اس نے تو اپنی صورت ہی آئینے میں دیکھنا چھوڑ دی تھی صرف ایک وہ شخص تھا جسے سوچتے سوچتے وہ خود کو فراموش کر بیٹھی تھی۔

”خلیل۔ پلیز! ایسے نہ چھوڑو مجھے۔ میں مر جاؤں گی۔“ اس کے تخیل کو مخاطب کر کے وہ بے بسی کے احساس سے سکنے لگی تھی۔

”باجی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ مہو اس کی پشت پر کھڑی استفسار کر رہی تھی۔ نیند سے بو جھل لہجہ وہ شاید اس کے رونے کی وجہ سے جاگی تھی۔ شفق نے آنسو پونچھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے ہی بٹھالیا۔

”آزیت کا احساس ہو رہا ہے مجھے اس لیے رو رہی ہوں۔“ کچھ توقف کے بعد وہ بولی تو لہجے میں بدستور آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

”آپ خود کو کیوں تکلیف دے رہی ہیں باجی!“ مہو نے رحم بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ شفق نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف نگاہ کی۔ بے پناہ معصومیت، بھولہ پن، بچپن کیا نہیں تھا اس کے چہرے پر۔ اس پل اس نے مہربانو میں خود کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی معصوم تھی بھولی سی عس کی معصوم جوانی کے سارے ارمان ملیا میٹ ہو کر رہ گئے تھے ابھی تو وہ عمر کے اس دور میں داخل ہوئی تھی جب دل کی دھرتی خوابوں کی دنیا میں قدم رکھتی ہے۔ خلیل نے پہلی بار اس کی طرف سے غفلت کی تھی۔ ورنہ تو وہ اس کے والہانہ انداز کی عادی تھی۔ وہ اسے بھول گیا ہے۔ خلیل اس سے بے وفائی کر سکتا ہے۔ یہ سوچ ہی اسے مار ڈالنے کو کافی تھی۔

اس نے وحشت زدہ ہو کر مہربانو کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”مہو۔ تم۔ تم۔ وعدہ کرو۔ تم کبھی میری طرح

نہیں بنو گی۔ کسی کے بہکاوے میں نہیں آؤ گی۔ میں جانتی ہوں تمہارا کردار میرے کردار کی طرح کمزور نہیں ہے لیکن پھر بھی میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ کبھی اس راہ کی مسافر مت بناؤ ورنہ وحشتیں تمہارا مقدر بن جائیں گی اور تم میری طرح برباد ہو جاؤ گی مجھے دیکھو۔“

وہ خود کو جیسے نوج نوج کر اپنی بربادی پر ماتم کنناں تھی۔ برجیس بیگم نے دروازے کی اوٹ سے خاموشی سے یہ منظر دیکھا اور واپس پلٹ گئیں۔

اپنے کمرے میں آتے ہوئے ان کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ انہوں نے بستر پر لیٹے اس شخص کے منحنی سے وجود کو دیکھا جو رشتے میں ان کا شوہر اور بچوں کا باپ تھا۔ ان کچھ دنوں میں وہ گویا زندہ لاش کی صورت رہ گیا تھا۔ آپس کی تلخ کلامی تو خواب ہو چکی تھی۔ مسلسل رات جگکوں سے ان کی آنکھوں کے گرد حلقے بڑھ گئے تھے۔

”مکافات عمل۔“ ان کے ذہن پر جیسے ماضی کی کوئی فلم گردش کرنے لگی شفق کا یہ عمل ان کے رویے یا ماحول کا رد عمل تھا اس گھر کا ماحول بچوں کے لیے کبھی بھی سازگار نہیں رہا تھا۔ انہوں نے ماں کے رونے اور باپ کے خوف کو خود پر اس حد تک طاری کر لیا تھا کہ وہ لاکھ ان کی برسن واشنگ کرتیں سب بے سود۔ انہوں نے بچوں کو بر سکون ماحول اور نارمل زندگی فراہم کرنے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن حماد سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیتے تھے، انہیں برجیس سے تو کیا اپنی اولاد سے بھی محبت نہیں تھی۔ یہ تو شاید ان کے لیے کمزور لمحوں کی یادگار ثابت ہوئے تھے۔

راشد ماموں امی کے اکلوتے بھائی تھے۔ مامی غیر خاندان سے تھیں۔ حماد اور فریدہ جڑواں تھے۔ مامی کی زندگی نے وفانہ کی تھی۔ حماد اور فریدہ آٹھ سال کے تھے جب وہ سلطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ماموں نے مامی کی یادوں میں تن تنہا ہی دونوں بچوں کو پالا تھا۔ عمران اور برجیس اپنے ماں باپ کی دو ہی اولادیں تھیں۔ عمران کا انجینئرنگ کا

آخری سال تھا جب فریدہ کو شریک سفر بنانے کی خواہش اس کے ہونٹوں پر محلی تھی۔ جانے کب سے اس نے اپنی اس نک چڑھی گزن کو دل میں جگہ دے رکھی تھی۔ امی کی تو دلی مراد بر آئی چنانچہ بیویوں میں فیصلہ ہو گیا۔ وٹہ سٹہ قرار پایا تھا۔ حماد کو اپنے جیون ساتھی کے روپ میں دیکھنا برجیس کی خوش قسمتی تھی اور وہ اپنی قسمت پر نازاں ہی تو تھیں لیکن حماد نے وہ طوفان مچایا کہ اللہ ان کتنے دن وہ اپنے حق کی جنگ لڑتے رہے۔ وہ اپنی کسی کلاس فیلو کو پسند کرتے تھے۔

ان کے ذہن میں وٹے سٹے کا غلط تصور قائم تھا۔ ان کے خیال سے ایسی شادیاں انسان کو غلام بنا دیتی ہیں جب ہی شادی کی پہلی رات انہوں نے برجیس کو باور کروا دیا تھا کہ وہ ان سے کسی اچھائی کی امید ہرگز نہ رکھیں ان کا دل تو جب ہی ٹوٹ گیا تھا وہ سر جھکا کر ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتی رہیں ان کی ہر جائز و ناجائز بات کو ہنس کر سہہ جاتیں۔ بہت بے بسی کے عالم میں بھی انہوں نے کبھی مایوسی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ ان کی ہمت ہی تو تھی یا شاید وہ ان سے محبت کرتی تھیں۔ بے پناہ محبت۔

جب ہی سرکاری تباولے کے بعد جب وہ گورنمنٹ ہاؤس میں آئے تو حماد کو جیسے آزادی مل گئی۔ بات بے بات وہ انہیں پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

”آپ دو سری شادی کر لیں حماد۔ جسے آپ چاہتے ہیں۔“ ایک دن وہ اسے کہہ اٹھی تھیں شاید اس طرح سے ان کی مشتعل فطرت کو قرار آجائے۔ ”یوں خود کو اذیت تو مت دیں آپ۔“

وہ ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں تو حماد نے نفرت سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”میری محبت اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے دو سرا درجہ حاصل ہو۔ مجھے کسی کو بھی اپنانا ہوا تو تم سے اجازت درکار نہیں ہوگی مجھے اور اس طرح کی قربانیاں دے کر تم سمجھتی ہو کہ میرے نزدیک اونچی ہو جاؤ گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میری آنکھوں میں تمہارے

لے محبت تو کجارجم کا تاثر بھی نہیں آسکتا۔ تم میرے لیے قابل نفرت ہو۔ قابل نفرت تھیں اور ہمیشہ ہی قابل نفرت رہو گی۔ سمجھیں تم۔“

وہ گویا پھنکار کر بولے۔ حالانکہ جس اذیت سے بچتے کا وہ انہیں مشورہ دے رہی تھی وہ تو کہیں بھی نہیں تھی۔ اذیت تو ان کی اپنی ذات سے عبارت تھی۔ ہر لمحہ ہر بل ٹھکرائے جانے کی اذیت لفظوں کی مار سننے کی اذیت ان کے دے گئے زخموں کی اذیت حماد تو اپنی جھوٹی انا کی تسکین کرتے تھے۔ برجیس کبھی بھی انہیں شکایت کا موقع نہیں دیتی تھیں لیکن وہ کہیں نہ کہیں کسی بات کو ایٹھ بنا کر جھگڑا شروع کر دیتے تو وہ سوائے رونے کے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

معلوم نہیں پھر اتنا وقت کیسے بیتا کب ان کی شفق بڑی ہوئی اور اس نے گھرداری سینھال کر گھر کے ماحول کو بدلنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ انہیں کچھ پتا ہی نہ چلا تھا۔ دل جیسے پتھر ہو گیا تھا۔ اب تو حماد کی دہشت بھی معنی کھو چکی تھی اب وہ زیادہ پروا نہیں کرتی تھیں کہ حماد کیوں چلا رہا ہے۔ جوں جوں بچے بڑے ہو رہے تھے وہ مزید اپنے ہی بنائے گئے گنبد بے در میں مقید ہو رہی تھیں۔ کبھی زیادہ جھنجھلاہٹ سوار ہوتی تو شفق بے چاری ان کے زیر عتاب آجاتی۔ کب اسے شعور آیا اور اس نے گھر کے ماحول سے تنگ آکر باہر مصروفیت ڈھونڈی۔ انہیں کبھی معلوم ہی نہیں ہوا شفق خوبصورت تھی، بیضوی چہرہ اور بال ماں کی طرح لمبے اور گھنے تھے۔ خاص طور پر ہونٹ اس نے برجیس کے ہی چرائے تھے۔ بھرے بھرے گلابی ہونٹ جو اس کے تیکھے نقوش کے ساتھ بڑے بھلے لگتے تھے۔ آج سے پہلے انہوں نے شفق کو دیکھا ہی کب تھا۔

رات کا آخری پھر چل رہا تھا اور وہ نیند سے کوسوں دور ماضی کے دھند لکوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آنکھیں رگڑیں اور دیوار پہ لگی گھڑی کو دیکھتے ہوئے وقت کا تعین کیا۔ کتنی عجیب بات تھی سالوں پہ

محیط ان کا ماضی کتنی جلدی سمٹ گیا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر بستر پر لیٹے اس وجود کو دیکھا جس نے زندگی بھر سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں جینے دیا تھا۔ وہ عزت احترام کبھی نہیں بخشا جو ان کا حق تھا۔ تو آج ان کی اپنی اولاد نے کیسے انہیں دو کوڑی کا کرچھوڑا تھا۔ ساری انا ایک مشت خاک ہو گئی تھی۔ انہوں نے شکست خوردہ حماد کی معافی قبول کر لی تھی۔ لیکن دل پھر نہیں پلٹا۔ ندامت نے انہیں آگھیرا تھا تو کب جب وقت کا پنچھی اپنی اڑان بھر چکا تھا۔ ان کے ابھی بہت سے کھاتے حماد صاحب کی طرف کھلتے تھے۔ فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ سو وہ اٹھ کر دل جمعی سے وضو کرنے چل دیں۔



”جی بھائی! آپ نے بلایا تھا۔“ خلیل دروازے پر کھڑا اجازت مانگ رہا تھا۔ عقیل نے ایک نظر اس کے مجنوں جیسے بکھرے چلے پر ڈالی اور سر ہلا کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں! وہ تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی۔ بیٹھو۔“

خلیل نا سمجھی سے انہیں دیکھتے ہوئے پاس بڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لا کر سے کچھ پیپر ز نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے حیرانی سے پیپر ز تھامے۔ ”ڈائیرس پیپر ز ہیں۔ ان پہ سگنچہ چڑھ کر دو۔“ وہ آرام سے بولے اور خلیل کے ہاتھوں میں پیپر ز لرز کر رہ گئے۔

”طلاق۔۔۔ ل۔۔۔ لیکن۔۔۔ کیوں۔۔۔؟“ وہ احتجاجاً بولا۔

”کیوں کا کیا مطلب ہے؟ اتنے نادان تو نہیں ہو تم۔“ ان کے ماتھے پہ دو شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔ خلیل کا چہرہ بل بھر میں متغیر ہوا۔

”یہ زیادتی ہے۔ میں نے شفق سے نکاح کیا ہے کوئی گناہ نہیں کیا جو معافی کے قابل نہ ہو۔“ اس نے

زخمی لہجے میں کہا۔

عقیل نے اس کے ٹوٹے لہجے سے اس کی اس لڑکی سے محبت کا اندازہ لگایا تھا اس کے چہرے پہ غور کیا تو وہاں وحشتوں کا اک جہاں آباد نظر آیا۔ انہوں نے افسوس بھری نظر اپنے جوان بھائی پہ ڈالی۔ گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

”یہ ہمارا نہیں دو سری پارٹی کا مطالبہ ہے۔ اگرچہ ہمیں تمہارے اس اقدام سے تکلیف ضرور ہوئی تھی لیکن مجبوری سے ہی سہی قبول کر چکے تھے۔“ وہ بے لچک انداز میں بولے۔ خلیل کے تنے ہوئے تاثرات یکدم ڈھیلے پڑے تھے۔ وہ بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”شفو۔۔۔ شفق نے طلاق کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ کیوں کرے گی۔“

”معلوم نہیں۔ لیکن اس کے باپ کی یہی تکرار ہے۔“ عقیل نے اس کے بکھرتے اعصاب سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”تو بس پھر بڑھے کی خواہش کبھی پوری نہیں ہونے والی۔ شفق میری محبت ہے اور اسے چھوڑنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ وہ اٹل لہجے میں کہتا ہوا ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ عقیل نے دونوں ہاتھ اس کے کاندھوں پہ رکھ دیے۔

”میری مانو گے؟“ وہ کہہ کر کچھ دیر اس کی مضطرب نظروں سے الجھتا رہا پھر بولا۔

”ہاں! اس نادانی کو بھول جاؤ ہمیشہ کے لیے۔“ ”بھائی! آپ بھی۔“ وہ صدمے سے گنگ ہو گیا۔ ”ہاں! میں تمہیں ایک اچھا مشورہ دے رہا ہوں۔“

”اچھا مشورہ ہے یہ۔ میری زندگی چھیننے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ سب لوگ آخر کیوں۔۔۔؟“ وہ پھر کر بولا۔

”دیکھو خلیل! تمہارے پاس اس وقت دو راستے ہیں۔ ایک ٹھن ہے۔ ایک سل۔ اختیار تمہارے پاس ہے۔ ابو جی نے دو شرطیں رکھی ہیں تمہارے

آگے۔ اگر تم کہتے ہو تو ہم شفق کو باقاعدہ سونا کر لے آئیں گے۔ لیکن پھر تمہیں اس گھر اپنے حصے کی متوقع جائیداد سے اور گھر والوں سے بھی شاید ہاتھ دھونے پڑیں۔ جہاں مرضی ٹھکانا ڈھونڈو رہو اور جیو۔ ہمارا کوئی ختم ہوگا۔“ خلیل کم صم سا ہو گیا۔

”اور دوسری شرط یہی ہے طلاق والی۔ شفق معصوم ہے، کم عمر ہے۔ اسے کوئی اور اچھا انسان مل جائے گا تمہاری شادی اقرار کے علاوہ اور کسی سے نہیں ہو سکتی۔ یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ اس سے حمیرا کے رشتے پہ آج آسکتی ہے۔ اولے پدلے کے رشتے یہی وصف لیے ہوتے ہیں اور ابوجی کو تم جانتے ہو۔ کچھ بھی ہو جائے لیکن حمیرا کے لیے وہ شروع سے ہی بہت پوزیور ہے ہیں اسے کچھ رنج پہنچے۔ وہ برداشت نہیں کریں گے۔“

”چاہے میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں۔“ خلیل نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔

”ابھی تو وقت ہے میرے بھائی! خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو کہ تمہیں کچھ بتاوانہ ہو۔ چچا جی اپنی چیتنی بیٹی کو جینز میں کئی ایکڑ اراضی بھی دے رہے ہیں۔“ عقیل نے لالچ کا ٹکڑا لگایا۔ وہ خاموش رہا۔

”دیکھو یار! تمہاری کوئی خاص تعلیم نہیں ہے جس سے تم ایک خاطر خواہ جاب حاصل کر سکو۔ تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے جب بھوک بھوت بن کر تمہارے سروں پہ نالچے گی تو ساری محبت اڑن چھو ہو جائے گی تب واپس بھی آنا چاہو گے تو سارے راستے مسدود ہو جائیں گے۔ یا۔۔۔ یہ آج کی دنیا تو محبت سے ہی عاری ہو گئی ہے تم کس دنیا کے باسی ہو۔ یہاں اب دو ہی چیزیں اہم ہیں بس۔“ پیٹ اور پیسہ۔“ پیسہ کماؤ اور پیٹ بھرو۔ پیٹ بھرو پھر پیسہ کماؤ۔ مت کرو اپنی زندگی عذاب۔“ عقیل اسے تفصیلاً سمجھاتے ہوئے بولے۔

”مجھے کچھ وقت چاہیے۔“ کافی دیر بعد وہ پست سے لہجے میں بولا تھا۔ عقیل نے سکون کی سانس لی اونٹ پہاڑ کے نیچے آ رہا تھا اب آہستہ آہستہ۔

”اوکے! لیکن ذرا جلدی۔“ خلیل ان کی پوری بات سنے بغیر کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

رات وہ ایک بل کے لیے بھی سکون سے نہیں سو سکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شفق کا مسکراتا چہرہ بار بار آتا اور چھن سے غائب ہو جاتا۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جو اس نے ان پانچ سالوں کے دوران اس کے ہمراہ گزارا تھا۔ وہ نازک سی گڑیا۔ جسے وہ ڈر کے مارے یوں نہیں چھوٹا تھا کہ کہیں کانچ کی مانند ٹوٹ نہ جائے۔ اس کی کھنکھاتی ہنسی، جس کے سحر میں وہ مبہوت ہو کے رہ جاتا تھا۔ اس کے بال۔ اس کی ساحر آنکھیں، گداز لب۔ سب کچھ ہی تو۔ وہ کیا تھی۔ یہ کوئی خلیل رضا سے پوچھتا۔ جسم رعنائی کی صورت۔ جسے شرعی رشتے کی ڈور میں باندھ کر اپنا استحقاق بھرا حق وصول کر چکا تھا۔

اس وقت اس کی حالت اس بچے کی مانند ہو رہی تھی جسے اس کا من پسند کھلونا دے کر واپس چھین لیا ہو۔

”جس دن تم نے مجھ سے بے وفائی کی وہ دن تمہاری اور میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

اسے اپنے ہی لفظوں کی بازگشت کہیں قریب سے سنائی دی تھی۔ سو وہ کسے دوش دیتا۔ بے وفا تو وہ خود نکلا تھا۔ اتنی سی عمر میں اسے ایسا کر مہرہ داغ لگ جائے گا۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں پہ تیلیوں کے رنگ بھی نہ ہٹے ہوں گے اس نے بے بسی سے اپنے بال نوچے۔

”شفق۔“ اس کا دل رو رہا تھا۔

غندوگی میں جاتے بار بار اس کی آنکھوں کے آگے ایک بچی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کا دامن تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجائیں کرتی آتی۔ وہ اس کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئی تھی۔ اس کی سسکیوں پہ اس کا ذہن فٹ سے بیدار ہو جاتا۔

”شفق۔ میں بہت برا ہوں شفق۔ تمہارا خلیل بے وفانکا۔ میری جان اسے معاف کر دینا۔ میں کچھ

نہیں دے پاؤں گا تمہیں۔ تمہاری آنکھوں میں خواب سجانے کا قصور وار ہوں میں۔ مجھے معاف کرو شفق میں۔ خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

آدھی رات کو وہ اپنے حواسوں پہ اس کی اتنی جاندار موجودگی پہ گہرا کر بلک پڑا تھا۔ وہ چھ فٹ کا اونچا لمبا مرد اپنی بے بسی پہ رو رہا تھا۔ اس کے ذہن و دل نے بس ایک فیصلے پہ مرثبت کر دی تھی جسے چارو ناچار اسے قبول کرنا ہی تھا۔ کیونکہ یہ واقعی ایک رنج حقیقت تھی کہ۔

محبت کے گھاؤ وقت کے مرہم سے بھر سکتے تھے۔ لیکن پیٹ کا شکول محبت کے سکون سے نہیں بھر سکتا تھا۔

اس دن اس کا بخار مغتدل تھا۔ اب وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ رضائی میں دبکے وہ کھڑکی سے باہر کچھ دیکھ رہی تھی۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ لیکن اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پہ جیسے ٹک سی گئی تھیں جب ہی کسی نے اس کی طرف کچھ اچھالا تھا۔ وہ چونک کے مڑی اس کے تکیے کے پاس کوئی رجسٹری تھی اس نے پھینکنے والے کو دیکھا بر جیس سپاٹ چہرہ لیے دروازے کے بیچ کھڑی تھیں۔

”یہ۔۔۔ کیا ہے۔۔۔؟“ رجسٹری کھولنے کے بعد ان کاغذات پر نظر پڑتے ہی وہ انہیں دور پھینکتے ہوئے بولی تھی۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور وہ ان کو وحشت زدہ نظروں سے گھورے جا رہی تھی۔ اسے جیسے سکتے ہو گیا تھا۔ برجیس آگے بڑھیں۔

”شفق۔!“

”مت مجھے ہاتھ لگائیں۔ اب آپ لوگ خوش ہیں۔“ وہ چلا کر بولی۔

”کیا ملا مجھے برباد کر کے۔ آپ کو۔ خلیل میرے ساتھ ایسے نہیں کر سکتا۔“ وہ پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچ رہی تھی۔

”آپ لوگوں نے اسے مجبور کیا ہے۔“ وہ چلا رہی تھی۔

”تم نے ہمیں ذلیل کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی شفق۔!“ تمہیں سینے پہ سجانے کا ہمیں کیا شوق ہے بھلا۔ تمہارے ابو نے ان لوگوں سے بہت کہا کہ وہ لوگ باقاعدہ شادی کروالیں۔ لیکن اس لڑکے نے تمہیں طلاق بھجوا دی کہ اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں یا واسطہ نہیں ہے۔“

انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے باور کروایا تھا۔ انہیں شفق کی معصوم جوانی پہ بہت ترس آیا تھا۔ بہت دکھ ہوا تھا۔ بیٹی کی خوشیوں کو دیکھنے کے ارمان ان کے دل میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ لیکن وہ بے بس تھیں کچھ بھی کرنا ان کے کنٹرول سے باہر تھا۔ شفق بے یقینی سے ان کے چہرے کو دیکھ کر رہ گئی۔

”خلیل نے مجھے چھوڑ دیا ہے؟“

اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں کو آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے خود سے پوچھا تھا۔ جن کی لکیوں میں اس کی بدنصیبی کی داستان رقم تھی۔

”وہ ایسے نہیں کر سکتا میرے ساتھ۔“ ایک دم ہی وہ چلا کر بولی اور پھر بیٹھتی چلی گئی۔

”تم تو کہتے تھے کہ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ پھر کس نے یہ جرات کی؟ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو میرے ساتھ؟ میرا کیا قصور تھا؟“

بے یقینی کی سی کیفیت میں اس کا دل مسلسل رو رہا تھا۔ اس دن وہ اتنا روئی تھی کہ ایک بار اسے لگا تھا کہ اس کے بعد شاید اس کے آنسو ختم ہو جائیں گے۔ لیکن جب بھی وہ اس دشمن جان کو سوچتی نجائے کہاں سے آنسوؤں کا سیلابی ریل اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتا۔ گزرنے والا ہر بل اس کی یادے شکووں سے عبارت ہوتا۔ اس کے لیے تو جیسے ہر دن اذیت اور ہر رات سزا تھی۔ عائنہ آتی تو وہ اس سے بھی کوئی بات نہ کرتی۔ اسی تو بس اسے کھانا کھلانے کے لیے بلواتی تھیں کہ اس نے اپنی ضد سے خود کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

خلیل تو جیسے لاپتا ہو گیا۔ اس دن کے بعد ان کی فیملی نہ جلنے کہاں روپوش ہو گئی تھی۔

شفق نے دیوانہ وار کتنے ہی چکر اس کے گھر اور دکان کے لگا لیے تھے لیکن وہ ہوتا تو نظر آتا۔ اسی ادھیڑ بن میں جانے کتنے دن گزر گئے۔ عائشہ اس کے پاس آئی۔ شفق نے حالات سے شاید سمجھوتا کر لیا تھا یا شاید صبر۔ اب وہ خود ساختہ ہڑتال نہیں کرتی تھی گھر کے کاموں میں بھی تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی تھی۔ اس کے انداز سے تو لگتا تھا کہ وہ تمام انہونیاں قبول کر چکی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر نامعلوم سا کرب، انجانا سا دکھ ہمہ وقت نظر آتا رہتا۔ عائشہ کافی دن بعد اس سے ملنے آئی تھی۔

”او عائشی! کافی دیر بعد یہ دو لفظ بولی تھی۔“

”میں کچھ بتانے آئی ہوں۔“ وہ بلا توقف جلدی جلدی بولی۔ اس کے لہجے میں اضطراب چھلک رہا تھا۔ شفق نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ سرعت سے نظریں چرا گئی۔

”خلیل واپس آگیا ہے۔ میں نے اسے مارکیٹ میں دیکھا تھا۔“ شفق سے ہلا نہیں گیا۔

”کیا...؟“ اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا تھا۔ ”آنا“ ”فانا“ آنسوؤں نے اس کی خوبصورت آنکھوں کا محاصرہ کیا تھا۔

”وہ شادی بھی کر چکا ہے۔“ عائشی نے تیزی سے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا تھا۔

”شفق۔“ وہ اس کی طرف بڑھی۔ وہ کھلی آنکھوں اور بے جان چہرے سے عائشی کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کو دھوکا دینا، دھوکا دے کر اپنا دل بسالینا کہاں کا انصاف ہے۔ اور اس کی زندگی میں تو لاتعداد دھوکے ہوئے تھے۔ تو کیا یہ بھی سہی۔ اس نے کس اذیت میں خود کو سمیٹا تھا۔ عائشی اس کا ہاتھ تھمتھتا رہی تھی اور دھواں اس کی آنکھوں کے آگے چھا گیا تھا۔ جب ہی بے ساختہ اس نے اٹھ آنے والی ابکائی کو روکا تھا اور واش روم جاتے ہوئے دو دفعہ وہ جھٹکالے کر رہی تھی۔

”تم ٹھیک تو ہو شفق۔“ وہ واپس آئی تو عائشی اسی کی منتظر تھی۔ اس کے چہرے پر فکر مندی چھائی ہوئی تھی۔ شفق تڑھال ہو کر بستر پر گر سی گئی۔

”تمہیں ابھی بھی لگتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔؟“ اس نے شکوہ کنناں نظروں سے عائشی کو دیکھا۔ بات کتنی بڑھ چکی تھی یہ کوئی اس سے پوچھتا۔

”اب تو خلیل سے ملنا ناگزیر ہے۔“ اس نے لمحوں میں فیصلہ کر لیا۔ دل کا نقصان تو ہو ہی گیا تھا تو کیا اس بے درد کو آزاد چھوڑ دیتی اس سے حساب ہونا چاہیے تھا۔ کیا قصور تھا اس کا۔ کس جرم کی پاداش میں ایسی سزا مقدر ٹھہری تھی اور اگر دھوکہ ہی دینا تھا تو نکاح کرنا کیا ضروری تھا۔ یونہی چھوڑ دیتا تو وہ رودھو کر صبر کر رہی لیتی۔



اس نے دور ہی سے اندازہ کیا تھا کہ دکان میں رش بہت کم تھا۔ وہ ایسے ہی وقت پر نکلی تھی جب گاؤں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھی اس کے اشتعال میں بے پناہ شدت آتی جا رہی تھی۔ شدت گریہ سے آنکھیں سرخ انگارہ ہو چکی تھیں۔ اس نے بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر کی ٹھنڈی فضا میں قدم رکھا اور وحشت زدہ رہی کی مانند اسے کھوجا۔ ہمیشہ کی طرح وہ سائیڈ کاؤنٹر پر بیٹھا حساب کتاب میں مصروف تھا۔ چہرے پر از حد سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ تیر کی مانند جھپٹ کر اس تک پہنچی تھی اور جھٹکے سے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی ساکت ہو گیا اس حملے کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔

”تم۔۔۔ ایک پل کو اس کی آنکھوں میں تڑپ، حیرت، شناسائی کی رمت جاگی تھی۔ جبکہ اگلے ہی پل معدوم ہو گئی تھی اور زمانے بھر کی اجنبیت چہرے پر سجائے وہ خود کو اس کے ہاتھوں سے چھڑانے لگا۔“

”تم نے مجھے برباد کر دیا۔ خلیل۔! تم سمجھتے کیا ہو کہ بچ جاؤ گے۔“

آنسو ایک تو اترے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ خلیل نے بمشکل خود کو اس کے شکنجے سے آزاد کروایا اور جب بولا تو۔ اس کے لہجے کی کٹ سے ہی

شفق مرنے والی ہو گئی۔

”آتم سوری۔ میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ بہتر ہو گا تم بھی یہ سب بھول جاؤ۔“

ا وہ میرے خدا کیا مشورہ تھا یہ۔ زندگی کوئی کھیل تو نہیں کہ بندہ ہار پے صبر کر لے۔

”تم نے میری زندگی کو کھلونا سمجھ رکھا ہے؟ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی خلیل۔ میں نے اپنے ماں باپ کو دکھ دیا۔ میں اجڑ گئی۔ تو تم کیسے مجھے برباد کر کے خوش رہ سکتے ہو۔“ خلیل نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”مجھے معاف کر دینا شفق! میں مجبور ہو گیا تھا۔“ وہ بدقت تمام خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ سامنے اس کی زندگی مجسم دھڑک رہی تھی۔ جسے اپنے ہی ہاتھوں بھر ممنوعہ قرار دے چکا تھا۔

اتنے اجڑے حیلے میں بھی اس کی تمام تر رعنائیاں اجاگر ہو رہی تھیں۔ اسے افسوس کے ساتھ پچھتاوا ہوا۔ کاش وہ سب مجبوریاں اس کی راہ میں حائل نہ ہوتیں تو آج۔ وقت کے بھی عجیب کھیل ہیں۔ پانچ سالوں کی ریاضت میں اس نے شفق کو کچھ لمحوں کی ہمرانی بخشی تھی۔ اور اپنا اسیر ہونے تک وہ اس سے زندگی چھین چکا تھا۔

”جاؤ یہاں سے۔ لوگ دیکھ لیں گے۔“ اس سے برداشت ہی نہ ہو پارہا تھا۔ ”میں تم سے تمام تعلق توڑ چکا ہوں۔“ بے رخی کا خول پھر چڑھ گیا تھا اس نے شفق کو باہر کا رستہ دکھایا تو وہ مزید بھڑکی۔

”تم کیسے مجھ سے تعلق توڑ سکتے ہو؟ کہاں گئی تمہاری نام نہاد محبت۔ تم لاکھ چاہو مجھ سے اپنا تعلق توڑ ہی نہیں سکتے۔ اور اب تو بالکل بھی نہیں۔ کیونکہ تمہاری جھوٹی محبت کی نشانی میرے وجود میں پل رہی ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔“ بے بسی کے احساس سے وہ رو پڑی۔

”جھوٹ۔ تم درغلا رہی ہو مجھے۔“ اس نے شفق کو پرے دھکیلا۔

”خلیل پلیز۔ ایسا نہ کرو میرے ساتھ۔ پلیز۔“

خلیل۔۔۔ وہ اب دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اس سے اپنی محبت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ خلیل دیکھو۔

”میں کچھ دیکھنا سنتا نہیں چاہتا۔ تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو۔ لیکن میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ اور ویسے بھی میں شادی کر چکا ہوں۔“

اس نے رکھائی سے کتے ہوئے شفق کو بازو سے پکڑ کر باہر کر دیا اور ساتھ ہی دروازہ مقفل کر دیا۔ وہ شیشے کے اس پار اس بے حس انسان کی چوڑی پشت کو دیکھ سکتی تھی۔

”درغلا یا تو تم نے مجھے تھا۔“ جانے وہ کتنی دیر دروازے کی ٹاب پے ہاتھ رکھے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ مڑ ضرور گیا تھا لیکن خود پر جی اس کی نظریں وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ کتنا کڑا امتحان تھا۔ وہ ضبط کر رہا تھا۔ شیشے کے اس پار اس کی موی گڑیا کھڑی تھی۔ جو اس کی بے توجہی پر بری طرح پکھل کر پانی بن رہی تھی۔ جانے کتنی دیر وہ اسے دیوانہ وار دیکھتے ہوئے مسلسل کھٹکھٹاتی رہی تھی۔ اس کی آہوں سے سسکیوں سے شیشہ بھی دھندلا چکا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے شفق کو مایوسی سے واپس مڑتے دیکھا۔ وہیں اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا تھا۔ ایک دم ہی اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا اور وہ کاؤنٹر پر سر رکھے اگلے ہی پل بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

اتنے دنوں سے جیسے وہ بے جان وجود کے ساتھ پھر رہا تھا۔ آج خود کو محسوس ہوا تھا اپنا آپ۔ اسے یاد آیا۔ دل تو آج سے چھ سال پہلے وہ کسی پر پچھاور کر چکا تھا۔ سو وہ اس کے پاس تھا ہی کہاں۔ آج اور اک ہوا تھا۔



دن پر لگا کر رخصت ہو رہے تھے۔ جہاں زیب جاب کے سلسلے میں اسلام آباد چلا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے پھوپھو کی آمد ملتوی ہو گئی تھی۔ جہاں زیب روز ہی

اس سے بات کرتا تھا۔ البتہ شفق نے کبھی بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ ہر بار اس کا لازمی پوچھتا تھا۔

”شفق! تمہاری پھوپھو آرہی ہیں۔“ امی اندر آئی تھیں۔ اس نے دعا کے لیے اٹھائے گئے ہاتھوں کو اپنے چہرے پہ پھیرا اور آہستگی سے آنسو صاف کر کے کھڑی ہو گئی۔ جائے نماز سمیٹ کر اس نے دوپٹا کھولتے ہوئے پوچھا۔ ”کب آرہی ہیں۔“

”اس اتوار کو۔“ جواب ملا۔ دفععتاً اس کی نظریں پر پڑی تو ان کی نظروں کو خود پہ مرکوز پایا۔ وہ اسے اوپر سے نیچے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ شاید انہیں اس کے وجود میں ہونے والی ظاہری تبدیلیوں کا ادراک ہو گیا تھا۔ شفق نے قدرے گھبرا کر رخ بدلا۔

”شفق۔“ ان کی سرسراتی سی آواز نے اس کے گرد طواف کیا۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ اس کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔ ایک انہونی سی ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

”جو میں سوچ رہی ہوں وہ غلط ہے نا۔“ انہوں نے اسے جھنجھوڑ کر تصدیق چاہی۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کا اشارہ کس سمت تھا۔ اس نے بدقت تمام نفی میں سر ہلایا۔ وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر جانے کہاں سے ان میں بجلی بھری اور وہ دیوانہ وار اس پہ جھپٹ پڑیں۔

”کھینی! تو مری کیوں نہیں اور کتنا خون چوسے گی تو ہمارا۔“ کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تو نے بے غیرت۔ یا اللہ! اسے اٹھالے کسی طرح۔“ وہ اسے مار مار کے ندھال ہو گئیں۔ شفق کا بٹ پہ گول میول سی ہوئی خود کو بچانے کی کوشش میں اور سمٹ رہی تھی۔

”چتا نہیں کیا گناہ سرزد ہو گیا میرے خدا جو سزا میں اس منجوس کو پیدا کر دیا تو نے۔“ ان کی دہائی جارہی تھی۔ شفق نے بلبل کر کہاں کو دیکھا۔

”بار۔ بار گناہ کہہ کر تو بہن مت کریں میری۔“ روتے ہوئے اس نے ایک ایک لفظ پچکیوں میں ادا کیا تھا۔

”اٹھ۔! چل میرے ساتھ۔“ وہ منہ گھٹنوں میں چھپا کے رونے لگی تھی۔ جب امی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا تھا۔

”مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔“ وہ ان کا ارادہ بھانپ کر تیزی سے دور ہوتے ہوئے بولی۔

”شفق۔ ہم تیری شادی کروں گے بیٹا۔ کسی کو کیا خبر ہوگی۔ جو بھی قصہ ہے ابھی تمام ہو جائے تو بہتر ہے۔“ وہ پینتر ایدل کے پھر اسے سمجھانے لگیں۔

”نہیں امی! کچھ بھی ہو جائے۔ میں یہ گناہ نہیں کروں گی۔“ وہ اٹے قدموں پیچھے سرکتے ہوئے واش روم میں قید ہو گئی۔

”یا اللہ۔ رحم کر ہم پر۔! اب اور بدنامی نہیں سہہ سکتے۔“ وہ آج ایک دفعہ پھر تقدیر کی سفاکی پہ نوحہ کنال تھیں کہ سکون ان کے نصیب کا حصہ کبھی بھی نہیں رہا تھا۔



”جہاں زیب! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ پھوپھو دون سے آئی ہوئی تھیں اور وہ ایک بار بھی کھل کر ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ آج جہاں زیب بھی چلا آیا تو وہ کچھ دیر کو اسے تنہا کر اس تمام قصبے کو پنپانا چاہ رہی تھی جو ابھی ہونا باقی تھا۔ اسے کسی بھی صورت گوارا نہیں تھا کہ جہاں زیب اس کا ہم سفر بنتا۔ وہ کچھ حیرت سے اور مسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ دفععتاً اس کا موبائل بجاتا تھا۔

”اوم۔ بیڈ لک یا۔!“ وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے موبائل نکالنے لگا۔

”ہیلو۔ جی بیلا! نہیں کچھ بھی نہیں، بس آپ کی ہونے والی بہو سے کپ شپ ہونے لگی تھی کہ آپ کباب میں ہڈی بن گئے۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

شفق کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ جہاں زیب بات کرنے کے دوران وقتاً فوقتاً ”ایک والہانہ نظر اس پر بھی ڈال رہا تھا۔ پھر شاید کوئی اہم بات تھی کہ وہ چلتے ہوئے کیلری میں چلا گیا۔ شفق ست قدموں سے چلتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آئی۔ دروازہ بند کر کے ایک گہرا سانس لے کر اپنی تنہائی کو وجود میں جذب کیا۔

”کتنا خوش تھا جہاں زیب، خلیل سے زیادہ خوب صورت، تعلیم یافتہ اور برسر روزگار تھا۔ لیکن اس نے خلیل کو چاہا تھا۔ اس سے ہی عشق کیا تھا اور اس نے کیا کیا اس کے ساتھ۔“ ہونٹ بچھینچ کر اس نے اپنی سسکی کا گلا گھونٹا تھا۔

”کاش! مجھے خلیل نہ ملا ہوتا۔ یا پھر میں نے اس سے محبت نہ کی ہوئی یا پھر اتنا بڑا قدم نہ اٹھایا ہوتا۔ اے کاش! امی! ابو نے مجھ پر نظر رکھی ہوئی۔ مجھے روک لیا ہوتا۔“

وہ رورہی تھی۔ اپنے کیے پہ پچھتا رہی تھی۔ جس کا کوئی حاصل نہیں تھا۔ غلطیوں کے بعد پچھتاوا ہی مقدر بنتا ہے اور اب تو کئی لا حاصل کاش اس کی تقدیر بن گئے تھے۔

”میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تمہیں بہت اچھی لڑکی مل جائے گی جہاں زیب! خدا کرے تمہیں کوئی بہت اچھا ملے۔ میں بہت بری ہوں۔“ وہ مسلسل گریہ کر رہی تھی۔ اس نے تصور میں کہتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔ وہ بد نصیب ٹھہری تھی۔

وہ ایک دم جیسے سوتے سے چوٹی تھی۔ باہر غیر معمولی شور سنا دیا تھا۔ وہ جانے کی غرض سے باہر نکلنے لگی تھی کہ باہر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم جامد کر دیے۔

”مین دن سے میں آئی بیٹھی ہوں اور اب تم بیٹی کے کرتوت گنوا رہی ہو۔ کیسے ہو گئی شفق کی شادی ہمیں تو نہیں پتا۔“ اتنی کرخت آواز تھی۔ اس نے بلا ارادہ ہی دروازہ مضبوطی سے پکڑا۔

اس کی ماں کس ضبط سے اس کا مقدمہ لڑنے پر تیار ہوئی ہوگی۔ اس پل سوچتے ہوئے اس نے جانے کی کوشش کی۔

بار خود کو ملامت کیا تھا۔ ان کا کیا قصور تھا۔ وہ چاہتیں تو اس کی خواہش کا گلا گھونٹ کر آرام سے چلتا کر سکتی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ لیکن انہوں نے یہاں بھی اس کی خوشی کو مقدم رکھ کر ماں ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

اسے وہ دن یاد آیا جب اس نے پانچ سالوں کی محبت پہ اٹھارہ سالوں کی محبت قربان کر دی تھی اور آج ماں کی محبت سامنے آئی تھی کہ اس نے اتنے اہم رشتوں پہ اس کی خوشی کو ترجیح دی تھی۔ اسے خود پہ رونا آیا۔ اپنی قسمت پہ رونا آیا۔ جس نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

کتنے ہی لمحے گزر گئے جب جہاں زیب چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس نے ایسی نظروں سے شفق کو دیکھا کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔ اس پل اس کا دل چاہا کہ زمین بھٹ جاتی اور وہ اس میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتی۔ لیکن ایسا ناممکن تھا۔ جہاں زیب نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

مڑتے وقت اسے لگا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ جسے چھپانے کے لیے وہ تیزی سے مڑ گیا تھا۔ لیکن وہ دیکھ چکی تھی۔ اسے زندگی میں بے شمار رشتے ملے تھے۔ جن کی اس نے کبھی قدر نہیں کی تھی اور جس کی قدر کی وہ اسے مٹی میں رول کر چلا گیا تھا۔ یہ اس کی بدنصیبی ہی تو تھی کہ وہ کبھی اچھے برے کی پہچان نہیں کر پائی تھی۔ اس نے پھر ہونی آنکھوں سے اس کے قدموں کے نشان ڈھونڈنا چاہے تھے۔ لیکن آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا۔



”شفق! تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو۔“ عاشی جو کب سے خود ہی بولے جارہی تھی۔ اس کا دھیان کہیں اور دیکھ کر بے زاری سے بولی۔

”ہاں۔ کیا؟“ اس نے اپنا اجڑا چہرہ اس کے آگے کیا۔ عاشی نے ترجمہ آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے آج؟ کیا نہیں ہوتا روز۔ جو آج ہوگا۔“ اس کے لہجے میں دنیا جہان کی ٹھکن در آئی تھی۔ عاشی نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ خلیل کی معیت میں کبھی بھی حنا کا رنگ اس کے خوب صورت ہاتھوں سے نہیں اترتا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا تھا کہ وہ من چاہی بیاہتا ہو کر اجاڑی گئی تھی۔ اس کی کیفیت اس کی حالت سب ہی رحم اور ہمدردی کا تقاضا کرتے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ اس پورے علاقے میں خلیل کی فیملی کے بعد عاشی کے علاوہ اور کسی بھی آس پاس کے فرد کو اس قصے کی بھٹک تک نہیں پڑی تھی۔ کچھ حماد صاحب کے اپنے رویے نے مدد کر دی تھی کہ سرورویے کی وجہ سے کوئی بھی ان سے زیادہ میل جول نہیں رکھتا تھا۔ خلیل کے باپ نے اپنی فیملی سمیت قسم کھا کر یقین دلایا تھا کہ قیامت تک اس بات کا ذکر باہر نہیں نکلے گا اور وہ گئی عاشی تو۔ یہ اس کا شفق پہ احسان عظیم تھا کہ اس نے حقیقی معنوں میں دوستی نبھائی تھی۔

”امی نے پھوپھو کو سب بتا دیا ہے۔“ وہ آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

”وہ نو۔ آنٹی نے کیوں یہ سب؟“ وہ حد درجہ حیران ہوئی۔

”کیا مطلب؟ ایک نہ ایک دن تو انہیں معلوم ہونا ہی تھا۔ تو پھر! روز روز کے مرنے سے بہتر ہے ایک دفعہ ہی عذاب سہہ لیا جائے اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں امی کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ یقین کرو عاشی! آج میں بہت شرمند ہوں خود سے اپنے خدا سے اپنی ماں سے بھی میں نے بہت غلط کیا۔ جانے خدا مجھے معافی بھی دے گا یا نہیں۔“

فرط جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی۔ آنسوینے کی کوشش میں وہ تڑھال ہو رہی تھی۔ عاشی نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی اور پیار سے اسے ساتھ لگایا۔

”بس کرو شفو۔ میں تو ہر مل تمہارے لیے سکون کی دعا مانگتی ہوں۔ صبر اور تمہاری دائمی خوشیوں کی

دعا کرتی ہوں۔ مایوس مت ہو اگر وہ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔“ وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔

گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن اب برسات کی وجہ سے جس اور سیلن کی بہتات تھی۔ آسمان بھی جیسے خفا ہو گیا تھا۔ چپ چاپ ویران سا امی باہر گیلیری سے کپڑے اتار رہی تھیں۔

شفق گم صم۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں کام کرتا دیکھ رہی تھی۔ باہر ہلکا سا شور اٹھا۔ اس نے امی کو ٹھٹکتے اور پھر سارے کپڑے چارپائی پہ ڈال کر باہر کی جانب لپکتے دیکھا۔ وہ اندازہ نہ کر پائی کہ کون ہو سکتا ہے۔ کوئی مہمان؟ یا کوئی واقف کار۔ یا پھر خدا انخوار سے کوئی بری خبر۔ اس کا دل معمول سے تیز دھڑکنے لگا۔ وہ باہر جا کر دیکھ سکتی تھی، لیکن جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باہر جو بھی ہے اس کے سامنے اس کی ماں اسے دیکھ کر دگر فرستے ہو اور کسی کے معمولی سے استفسار پہ اس کی ذات کا پینڈورا بکس کھلے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر یوں ہی الماری کے پاس آگئی۔ الماری کیا کھولی پرانا جہاں لوٹ آیا تھا۔ وہ جھوٹی سی الماری اس کی زیست کے قیمتی سامان سے بھری پڑی تھی۔

”سرخ گلابی، نارنجی، آسمانی، دھانی، گولڈن سوٹ“ کتنے ہی رنگ پنہاں تھے یہاں جو کسی کی یادداشت سے دلاتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں تھیں جنہیں دیکھ کر نئے سرے سے زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ سب سے اوپر والی دراز میں بالکل کونے پر پول تھن میں بیک وہ تین چار شوتھے۔ جن میں ان دنوں نے بیٹے کھوں، دنوں کے کچھ لمحے قید کیے تھے۔ ہر سال ویلنٹائن پہ خلیل نشو پہ اپنا اور اس کا نام لکھ کر اسے گفٹ کے ساتھ کارڈ کے طور پر دیتا تھا۔

”ابھی ویلنٹائن۔ یا۔ سوٹ فرینڈ۔ مائی گرٹ لو۔“ جیسے پیار بھرے الفاظ کے ساتھ اور کبھی اپنے نام کے ساتھ اس کا نام جوڑ لیتا۔ شفق خلیل۔

اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگیں۔ ہر چیز ہی جیسے قیمتی متاع تھی۔ ان میں کیسی چاہت بھری خوشبو آتی تھی۔ لیکن جس سے یہ سب کچھ عبارت تھا۔ جب وہ ہی بے گانہ ہوا تو۔ یہ سب بھی اب بے کار ہی تھا۔ یہ سب اب اس کے لیے اذیت کا باعث تھے۔ اس نے سرخ کالج کی چوڑیاں نکالیں جو اس کا آخری تحفہ ثابت ہوئی تھیں۔

کچھ دیر غم پلکوں سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے لب بھیج کر پوری قوت سے دیوار پہ دے ماریں۔ بلاٹک میں نفاست سے جی چوڑیوں کا چورا ہو گیا تھا۔ اکثر ایک ایک چوڑی توڑ کے اس کے ریڈیم میں اپنی محبت کو تولا کرتی تھی وہ۔

”شفق۔ تم پر سرخ رنگ اور گلابی رنگ بہت چتا ہے۔ تمہاری بری کے سارے جوڑے میں سرخ ہی بنواؤں گا اور پلیریز چوڑیاں مت اتار کرو۔“ اس نے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا چورا اپنی ہتھیلی پہ پھیلا لیا۔

”یہ تتلی کتنی پیاری ہے نا خلیل۔“ اس کے ہاتھوں میں ایک رنگ برنگی تتلی آزاد ہونے کی کوشش میں اس کی انگلیوں میں پھل رہی تھی۔

”لیکن تم سے زیادہ نہیں ہے۔“ خلیل نے اس کے ہاتھوں سے تتلی کو آزاد کروایا اور اسے اپنی طرف گھمایا۔

اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں کہ اب ان میں ہلکا ہلکا چھین کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسی کتنی یادیں تھیں جو عفریت بن کے روز اس کے دل و دماغ پہ حاوی ہو جاتی تھیں۔

اس نے ایک نظر اپنی ہتھیلی پہ پھیلے کالج کے ذرات کو دیکھا، پھر ایک جھٹکنے سے دونوں ہاتھ۔ تختی سے آپس میں مسل دیے۔

اس کے کمرے میں دستک ہوئی۔ پھر کوئی اندر بھی آیا تھا۔ لیکن وہ بستر پہ یوں ہی پڑی رہی۔ آنے والے نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا۔ کھلی

ہوئی الماری چابجا بکھرے ہوئے کپڑے، کچھ کاغذ جنہیں چھوٹے چھوٹے برزوں میں پھاڑ دیا گیا تھا۔ ریفریوم کی ٹوٹی ہوئی شیشیاں، بار جس کا ہک توڑ دیا گیا تھا۔ جھٹکے، انگوٹھیاں، دیوار کے کناروں پہ مختلف رنگ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے انبار، کمرے کی سب سے تریمی اس میں رہنے والے کے ذہنی انتشار کی عکاسی کرتی تھی۔

انہوں نے بے ساختہ لمبا سانس کھینچا اور آہستہ سے چلتے ہوئے اس کے پلنگ کی پلانٹی پہ بیٹھ گئے۔

”شفق۔! وہ نیم غنودگی میں تھی۔ اسے کوئی اپنا نام پکارتا محسوس ہوا۔ لیکن وہ بدستور لیٹی رہی۔

”شفق۔“ اب کے آنکھ ذرا سی کھولی تو منظر کچھ واضح ہوا، ایک ہولہ سا نظر آیا۔ اس نے پوری قوت سے آنکھیں کھولیں۔ اور پھر کھولے ہی رہ گئیں۔

”عمران ماموں۔“ لمبوں سے سرگوشی میں نکلا۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری بیٹا۔“ اب کی بار ان کے لہجے میں اتنی نرمی و حلاوت تھی کہ شفق نے سرے سے کٹنے لگی۔ اس نے بے پناہ شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ بار بار ان محبتوں کا سامنا کیسے کر سکتی تھی۔

”یہ کیا ہوا دونوں ہاتھوں کو!“ انہوں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ ہاتھوں کی لکیریں چھپ گئی تھیں۔ اس نے ایک نظر اپنے ہاتھوں کو اور پھر ماموں کو دیکھا اور دوبارہ سر جھکا لیا۔

”میں تم سے ملنے آیا ہوں شفق۔“ انہوں نے اس کے دائیں گال کے نیچے ہاتھ رکھ کے اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی مجھے برا بھلا کہنے آئے ہوں یہ احساس دلانے کہ میں کتنی بری ہوں۔ اس نے اپنے چہرے سے ان کا ہاتھ نرمی سے ہٹایا۔

”نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔“ انہوں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

”ہاں۔ میں بہت بری ہوں۔ پتا ہے مجھے، پھر کیوں سب میرا تماشا دیکھنے آ جاتے ہیں۔“ وہ جھٹکے

سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس پر پھر فرسٹریشن طاری ہو گئی تھی۔

عمران ماموں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ منہ موڑ کر کھڑکی کی جانب چلی گئی کچھ بل کمرے میں خاموشی در آئی۔

”بھئی کبھار ہماری زندگی میں وہ سب ہوتا ہے جو ہم نہیں چاہتے اور جو ہم چاہتے ہیں وہ ہمیں ملتا نہیں ہے۔ شفق! میں مانتا ہوں بیٹا! کہ تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ لیکن تم نے بھی غور کیا ہے۔ تمہارے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوا۔ سوچا ہے کبھی؟ نہیں نا۔“ وہ چلتے ہوئے اس کے مقابل آگئے۔

”اپنی خوشیوں کے لیے تم خود غرض ہو گئی تھیں، اس لیے۔ تم اپنے پیدا کرنے والے کو بھول گئی تھیں، اس لیے تم اس خدا کو بھول گئی تھیں۔ جس کے بغیر تم سانس بھی نہیں لے سکتیں۔ اب بولو، قصور کس کا ہوا۔“ وہ چپ رہی۔ وہ مزید بولے۔

”پتا ہے، جب تم چھوٹی سی تھیں تو میں نے برہمن سے کہا تھا۔ اسے مجھے دے دو، معلوم نہیں کیوں؟“ وہ دھیمے سے مسکرا کے اسے دیکھنے لگے۔ شفق نے پہلی بار نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پہ محبت و شفقت کے تمام رنگ تھے۔ اس کے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے۔

”تم ہو، ہوتا ہو، قصور ہو۔ اسی کی طرح ضدی، غلطی کر کے نہ ماننے والی۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنی بیٹی سے بہت محبت کی ہے۔ حالانکہ میری عزیز از جان بہن ساری زندگی تڑپی ہے۔ سسک سسک کے گزری ہے اس کی زندگی اور تم حماد کی بیٹی ہو، لیکن پرورش تو تم نے برہمن کے ہاتھوں پائی ہے نا! میں چاہتا تھا کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی بنالوں، لیکن کیا کروں، تمہاری ماں کی طرح میری بھی بہت سی خواہشیں تشنہ رہ جاتی ہیں۔“

وہ بولتے بولتے تھوڑے سے دھیمے پڑے۔ شفق بے تاثر چہرے کے ساتھ۔ فرش پہ جانے کون سے ان مٹ نقوش گھور رہی تھی۔ خاموشی ایک بار پھر۔

اس کمرے کے دروازے میں اتر آئی تھی۔

”لیکن ماموں میں۔۔۔“ الفاظ حلق میں گویا انگ کر رہ گئے تھے۔ اس سے آگے بولا ہی نہیں گیا۔

”فی الحال تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں، تم میرے ساتھ لاہور چل رہی ہو۔ اپنا سامان پیک کر لو، ہم تھوڑی دیر میں نکل رہے ہیں۔“

وہ ارادہ کر کے آئے تھے اور اسے صرف اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ اس نے حیرت سے گنگ ہو کر اپنے کمرے سے جاتے عمران ماموں کی پشت کی جانب دیکھا۔

”میں وہاں کیسے جاسکتی ہوں؟“ وہ جھنجھلا کر کھڑی ہو گئی۔ عجیب سی بے چینی تن من میں سما گئی تھی۔ ”وہاں جہاں زیب بھی ہو گا اور میں مامی کا سامنا کیسے کروں گی؟“ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ آہٹ پہ مڑ کے دیکھا۔ امی دروازے کے پتھوں بیچ کھڑی تھیں۔ بے تاثر، سیاٹ چہرے کے ساتھ۔

”تمہارے ماموں انتظار کر رہے ہیں۔ جلدی سے تیاری کرو۔“ وہ کہہ کر واپس مڑ گئیں اور اس پر گویا کسی نے منتر پھونک دیا۔ ٹرانس کی سی کیفیت میں اٹھ کر الماری کے نچلے حصے میں ٹھونسے ہوئے شاپنگ بیگ نکال کر استعمال کے دو تین جوڑے ڈالے، پیروں میں جلدی سے چپل ڈالی اور واش روم جا کر منہ اچھی طرح دھونے لگی۔ وہ باہر نکلی تو ماموں سر لبا انتظار تھے۔

اس کے سارے بہن بھائی ایک جگہ کھڑے اسے الوداع کرنے کو تیار تھے۔ امی کا چہرہ تمام جذبات سے عاری تھا اور وہ دھیمے سے انداز میں ماموں سے باتیں کر رہی تھیں۔

”اچھا خدا حافظ، اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا، پریشان بالکل مت ہوتا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اب امی کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے تسلی دے رہے تھے۔

”چلو بیٹا۔“ وہ اسے اشارہ کرتے ہوئے بڑھ گئے۔ اس نے ایک نظرای کو دیکھا۔

”امی۔۔۔“

”جاؤ اللہ کی امان میں دیا۔“ وہ مڑ کر اندر چلی گئیں۔

”کاش۔۔۔“ اس نے بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا اور مسکراتے ہوئے اپنے بہن بھائیوں کی طرف مڑی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار سب سے ہاتھ ملایا تھا۔ پیار کیا تھا سب کو۔ اسے رونا تھا اور ضبط کی شدت سے آنکھیں سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔ مہراناو دروازے تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔

”میرے ماں باپ کو وہ خوشیاں لوٹا دینا مہو! جو میری ذات نے کشید کر لی ہیں ان سے۔ تم انہیں وہ سب بھلا دینا۔ اپنی حفاظت کرنا اور خود کو کبھی زمانے کے ہاتھوں نیلا نہ ہونے دینا، سمجھ رہی ہونا۔“

وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھرتے ہوئے بولی۔ مہو نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ دھول اڑاتی گاڑی میں کہیں دور شفق کی زندگی کا باب یہاں کی فضا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوا تھا اور پیچھے دھول کے چھٹنے سے ہر منظر صاف و شفاف ہو گیا تھا۔



”تخلیق کا مرحلہ کتنا دشوار ہوتا ہے۔“

وہ یہاں رہتے ہوئے اس تمام عرصے کے دوران جان پائی تھی۔ حمل سے لے کر پیدائش تک وہ کن آزمائشوں سے گزرتی آئی تھی۔ یہ بھلا اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ اس سب کے بعد تو ماں اور شدت سے یاد آئی تھی۔ اسے اس گھر میں رہتے ہوئے مامی کی کھلی اور نفرت بھری نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے کبھی ان کو دھیمے لہجے میں بولتے سنا ہوا کبھی کوئی بات پیار سے کی ہو۔ اپنے باپ کے گھر میں رہتے ہوئے وہ اس کے لیے پھوپھو ہی تھیں اور اب اس وقت جبکہ ماموں اس کے لیے مضبوط سہارا تھے تو وہ صرف مامی تھیں بس۔

”ہونہ گندگی کی پونہ۔ ہمارے گھر میں لے کر دھر لیا۔“ وہ جہاں جہاں سے گزرتی۔ مامی اگر قریب میں ہوتیں تو اسے کچھ اسی قسم کی بڑبڑاہٹیں سننے کو ملتیں۔

زندگی اس کے لیے اجیرن ہو گئی تھی یا خود اس کی

دلچسپی جینے میں ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تو بس مشینی انداز میں اپنے وجود میں پنپنے والی جان کو سانس دے رہی تھی۔ ان نو مہینوں میں کون سا ایسا لمحہ تھا۔ جس میں اس نے اس دشمن جاں کو نہ سوچا ہو۔ حیرت سے، نفرت سے، بے بسی سے، اکثر راتوں کو وہ اس کے تصور سے شکوے کرتے تھک جاتی تو ہار کر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

اس گھر میں صرف ماموں ہی ایسی شخصیت تھے جنہیں اس کی بے پناہ فکر تھی۔ وہ اس کا حال احوال باقاعدگی سے پوچھتے، اسے لے کر باہر واک پہ نکل جاتے اور اس کی خاطر مامی کی جلی کٹی بھی سن لیتے۔

”بیٹا بڑی ہیں۔ تم انور کر دیا کرو۔“ وہ ماموں ہی تھے جو اس کی جمود زدہ زندگی میں کچھ ہلچل کا سبب بنے تھے۔ ورنہ جہاں زیب تو کب کا اس کی آمد کا سن کر کہیں نکل گیا تھا۔ اتنا عرصہ کسی بھی سزا کو کاٹنے کے لیے کم نہیں ہوتا۔ ہاں اس نے غلطی کی تھی۔ جس کا خیال اب انہوں کی بے رخی کی صورت میں بھگت رہی تھی۔

آج اسپتال میں اسے ایڈمٹ ہوئے تیسرا دن تھا۔ مٹے لمحوں کو گزرتے دنوں کو وہ لمحوں میں سوچ سکتی تھی۔ سب ایک سے گزرے تھے اس کے لیے پر خار، پر پیچ، مثل عذاب، آنسو ایک تو اتر سے بہتے ہوئے اس کا تکیہ بھگورے تھے۔

بچے کی رونے کی آواز اسے واپس حال میں کھینچ لائی تھی۔ اس نے سرعت سے اپنے پہلو کی جانب دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ اس نے بے چینی سے اوپر نگاہ اٹھائی تو دھک سے رہ گئی۔

جہاں زیب، حسن کو بازوؤں میں لیے ہوئے تھا۔ ”یہ کب آیا اور یہاں۔“ وہ اضطراب سے نظریں جھکا کر رہ گئی۔

”یہ کب سے رو رہا تھا، تم شاید ہوش میں نہیں تھیں۔“ آہستگی سے کہتے ہوئے اس نے حسن کو اس کی طرف برہمایا جسے اس نے احتیاط سے تھام لیا۔

شفق نے غور کیا۔ اس کے لفظوں میں طنز کا کوئی

شائبہ تک نہ تھا۔ لیکن وہ اس سے بالکل یار مل رویہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ بات حیرت کی متقاضی تھی۔
 ”تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔“ پرائیویٹ اسپتالز میں اکثر بے بیز کڈ نیپ (اغوا) ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر ”میل بیل“ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ اس نے حسن کے ننھے سے ہاتھ میں اپنی انگلی ڈالی۔ جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ ہولے سے مسکرا کر رہ گئی۔ جہاں زیب نے مڑ کر اس بھرپور منظر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پہ ایک ملال سا آکے گزر گیا۔

”ہیشنٹ نمبر 25۔!“ آپ اپنا سامان پیک کر لیں۔ آپ کو ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔ کون لینے آ رہا ہے آپ کو؟“ دروازے پہ ایک کرخت چہرے والی نرس بلا تکان اطلاع بول رہی تھی۔ جب ہی اس کی نظر سائیڈ پہ کھڑے جہاں زیب پہ پڑی۔ وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

”آپ ہرینڈ ہیں ان کے؟“ اچانک اس سوال پہ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ شفق نے گہرا اسے دیکھا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھ کر واپس نرس کی طرف مڑ چکا تھا۔
 ”جی میں ہی ہوں۔“ شفق کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ نہ معلوم اس نے ایسا کیوں کہا تھا۔
 ”آئیں آپ ڈسچارجنگ شیٹ پر دستخط کر دیں اپنے۔“

وہ واپس پلٹ گئی۔ جبکہ جہاں زیب ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شفق کو دیکھا۔ حسن کو سینے سے لگائے ہوئے بھیجے ہوئے ہونٹ، سخت شرمندگی سے سرخ ہوتا چہرہ یہ زندگی اس کے لیے کیسی آزمائش بن گئی تھی۔
 جہاں زیب کے جانے کے بعد اس نے حسن کو بیڈ پہ لٹا کے کچھ فاصلے پہ موجود کات پر پڑی اپنی چادر کو اٹھایا اور آستلی سے اسے اپنے گرد پھیلانے لگی۔ وہ اپنے ساتھ کوئی سامان نہیں لائی تھی۔ حسن جب پیدا ہوا تھا تو عمران ماموں کے علاوہ کوئی اپنا اس کے پاس موجود نہیں تھا۔
 کتنی دیر گم صم سی ہو کر حسن کا معصوم سا چہرہ دیکھتی

رہی۔ وہ ہو ہو خلیل کے جیسا تھا۔ آنکھ، کان، ہونٹ، ناک، غرض کیا چیز تھی جو خلیل سے مشابہ نہیں تھی؟ صرف اسے جنم اس نے دیا تھا اور وہ خلیل کا بیٹا تھا۔ بس اس کا نام ماموں نے اپنی پسند سے رکھا تھا حسن۔
 ”تم تیار ہو تو چلیں۔“

وہ سوئے ہوئے حسن کے چہرے کو دیکھنے میں اتنی مگن تھی کہ اسے جہاں زیب کی آمد کی بھی خبر نہیں ہوئی۔

”جی۔۔۔؟ اس نے خفت سے سر جھکایا اور حسن کو گود میں بھر لیا۔ اس پر نقاہت سی طاری تھی اور اتنی جلدی وہ چل نہیں سکتی تھی۔ جہاں زیب نے اس کے چہرے پہ پھیلے تکلیف دہ تاثرات کو دیکھا اور حسن کو اس کی گود سے لے لیا۔
 ”میں اٹھالیتی ہوں۔“ وہ کمزور سی نحیف آواز میں بولی۔

”اٹس اوکے۔۔۔ تم ایزی ہو جاؤ۔“ سیدھے ہاتھ کے حلقے میں حسن کو لیے اور دوسرے ہاتھ سے شفق کو پارکنگ ایریا تک لاتے اس منظر میں صرف دیکھنے کی حد تک رعنائی تھی۔ حقیقت میں دونوں کے درمیان کتنے فاصلے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔

وہ گھر آگئی تھی۔ لیکن ماما ابھی تک مروتا بھی اسے پوچھنے نہیں آئی تھیں۔ دکھ تو اسے اس بات کا تھا کہ اس کے اپنے بھی اسے پوچھنے نہیں آئے تھے۔ خیریت تو دور کناس۔ امی کو تو کم از کم آنا چاہیے تھا۔ اس کے دل میں ملال آکے ٹھہر گیا۔ وہ جوں جوں سوچتی بوجھ بڑھتا جاتا۔ اسے شدت سے وہ سب پرانی باتیں یاد آتی تھیں جو اب قصہ پارینہ ہو چکی تھیں۔ واحد ماموں ہی اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس کے پاس ضرورت کی ہر چیز موجود تھی تو ان کی شفقت اور مہربانی کی وجہ سے۔

جہاں زیب اس دن کے بعد نظر نہیں آیا تھا۔ یا وہ ہی کمرے سے باہر نہیں جاتی تھی۔ اس دن ماموں کے ساتھ واک کرتے ہوئے اس نے واکر میں سوئے

حسن کو دیکھا۔ اس معصوم کا مستقبل کیا تھا؟ خود اپنے بارے میں بھی وہ لاعلم تھی۔ جانے قدرت اب اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنے والی تھی۔ ماموں نے اس کی عدم توجہی محسوس کر لی تھی۔ انہوں نے گہرا ماس فضا میں خارج کیا۔

”شفق۔“ اپنے نام کی پکار پہ وہ چونکی۔
 ”جی ماموں۔“
 ”کہاں ہو بیٹا۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔
 ”ہیں ہوں۔“

”میں کہہ رہا تھا، جہاں زیب چھٹیوں پہ آیا ہوا ہے۔ کوئی دن مقرر کر کے سادگی سے تم دونوں کا نکاح ہو جائے تو مجھے بھی کچھ سکون میسر ہو۔“
 شفق کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑکنے لگا۔
 ”ماموں! آپ کو اتنی جلدی کیا ہے۔“ وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

”جلدی۔۔۔! میں نے کب جلدی کی ہے۔ ابتاعصرہ تمہارے سوچنے کو کافی نہیں تھا کیا۔“ وہ پریشانی سے گویا ہوئے۔
 ”وہ سب ٹھیک ہے ماموں۔۔۔ لیکن میں۔۔۔“ وہ سننائی۔

”بس شفق! یہ تمہاری بے وجہ کی ضدوں کا نتیجہ ہے کہ تم آج اس حال تک پہنچی ہو۔ برہمیں سے وعدہ کر کے آیا تھا۔ وہ تمہیں پھر سے آباد دیکھنا چاہتی ہے۔ تمہیں میں نے ہمیشہ اپنی بیٹی ہی سمجھا ہے اور تم جہاں زیب کی بھی خوشی تھیں۔“
 آخری جملہ سرگوشی میں ادا کیا گیا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی۔

”جہاں زیب کی تم فکر مت کرو، وہ تم سے شادی پر راضی ہے، تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے اسے مجبور کیا ہے۔ وہ اب بھی خوشی خوشی یہ رشتہ نبھانے کو تیار ہے۔ اب جتنا سوچنا ہے بس آج کل میں سوچ لو۔ میں جتنے کو شادی کر رہا ہوں تم دونوں کی۔“

وہ کہہ کر کے نہیں اور وہ پھر سے جیسے اکیلی ہو گئی۔ شادی کر رہا ہوں۔ انہوں نے کتنے آرام سے کہہ

دیا۔ یہ کوئی آسان ہے، کتنی مشکل سے وہ سنبھلی تھی۔ لیکن یہ ایک اور دھچکا لگنا ضروری تھا کیا اور وہ بھی جہاں زیب نہیں، نہیں۔۔۔ میں اتنے پیارے اور اچھے انسان کے قابل نہیں ہوں۔ اسے بھی خوشیوں کا حق ہے۔

”ماموں! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“ وہ بے بسی سے سوچ کر رہ گئی۔

”تم جہاں زیب کی خوشی تھیں۔“ انہوں نے ماضی القریب کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ یعنی اب وہ! وہ اچھی طرح اپنی نئی آنے والی زندگی جان سکتی تھی۔ اس نے تھک کر واکر میں لیٹے ننھے حسن کو دیکھا۔ وہ بے فکری سے محو خواب تھا۔ اس کے مرمیں ہونٹوں پہ پھیک سی مسکراہٹ آٹھری۔

”تمہارا کیا قصور؟ جو سزا بھگتنے کو ماں کے سنگ آگئے ہو۔ تم کیا جانو، تمہاری زندگی کتنی بے کیف گزرنے والی ہے۔“ وہ اس کے ننھے منے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

زندگی میں کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے اور حالات دوسروں کے رحم و کرم پہ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس کیفیت سے بارہا گزری تھی اور گزر رہی تھی۔
 پچھتاوے سے بڑھ کر کوئی آباد نہیں جب دل لگاتے ہیں تو رویا نہیں کرتے اس نے لرزتے ہاتھوں سے نکاح نامے پہ سائن کیے اور بے ترتیب ہوتی دل کی دھڑکنوں پہ قابو پانے لگی۔

وہ اس اجنبی کمرے میں اکیلی تھی۔ شادی پہ سوائے امی اور اس کے بہن، بھائیوں اور چند ایک مہمانوں کے کوئی نہیں تھا۔ کوئی بارات اس کے لیے نہیں اتری تھی۔ نہ مہندی، نہ مایوں، اسے بس ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں شفٹ ہونا پڑا تھا۔

اپنی پہلی شادی کی طرح اسے دوسری شادی پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ دونوں بار کتنی مماثلت تھی۔ اس وقت بھی اس نے ہاتھوں پہ مہندی نہیں لگائی تھی اور

اب بھی وہ سلیٹ کی مانند کورے تھے۔ اس نے اپنی سفید ہتھیلیوں کو دکھا۔

اب کی بار بھی وہ باپ کے دست شفقت سے محروم رہی تھی۔ حماد نہیں آئے تھے۔ انہوں نے تو اسی روز شفق سے ہرنا تا توڑ لیا تھا۔

”آخر میرے مقدر میں محرومیاں ہی کیوں درج ہیں؟“ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند چھانے لگی۔

پہلی شادی پر وہ ان چھوٹے جذبوں کی مانند کنواری تھی اور دوسری دفعہ وہ ایک بچے کی طلاق یافتہ ماں تھی۔

اس نے سوچا دونوں پیرا تنی مشابہت بھی نہیں تھی۔ پہلی بار وہ بہت خوش تھی اور دوسری بار۔۔۔

”یا اللہ!“ کھٹکے کی آواز پہ اس نے گہرا کڑوونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ قدموں کی چاپ اس کے قریب آکر رک گئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چہرے سے ہاتھوں کو ہٹا کے سامنے دیکھا۔ پھولوں کا ہار نیچے کارپٹ پہ ٹوٹا پڑا تھا اور وہ اب شیروانی اتار رہا تھا۔ ایک نگاہ غلط اس پہ ڈالی۔

بے پناہ خوب صورتی و حسن کا وہ مجسمہ اس کے لیے سجایا گیا تھا۔ معصومیت اس پہ ختم تھی۔ لیکن کیا فائدہ وہ یہ معصومیت کسی اور کو دان کر آئی تھی۔ اب تو بس عکس ہی رہ گیا تھا۔ خود وہ کون سا دل سے راضی ہوا تھا۔

اگر وہ مکمل اس کی بن کے آتی تو وہ کتنا شان دار استقبال کرتا اس لڑکی کا جو نہ جانے کتنے برس سے اس کے دل میں بستی تھی۔ اس نے نامعلوم حسرت سے اس کی جانب دیکھا جو شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”اب کس کے انتظار میں بیٹھی ہو۔“ مجھے لہجے میں کہتے ہوئے وہ بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں لینا۔ یوں کہ اگر وہ ہاتھ برہا کر اسے چھو تا تو اسے کوئی دقت نہ ہوتی۔ لیکن وہ اپنا بایاں بازو آنکھوں پہ رکھ چکا تھا۔ شفق کے اندر امید کا آخری دیا بھی مدھم ہوا۔ وہ

آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی سپاؤں نیچے نکالتے ہی پائل کے گھنگرو مدھرتان سے بج اٹھے۔ جہاں زیب نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ خجالت سے جھک کر پائل اتارنے لگی۔

”آپ فارغ ہو جاؤ تو پلیز کمرے کی لائٹ بھی آف کر دینا۔ میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔“

اس کی سرد سپاٹ آواز گونجی اور اس کی ذات کے گرد اداسی کا گھیرا ہوا گیا۔ اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ یہ سب تو ہوتا تھا مسلسل ہمیشہ، وہ ان سب رویوں کی عادی ہو گئی تھی۔

”بس کرو جی۔۔۔ ہمارا ہی گھر رہ گیا تھا اس بوجھ کو ڈھونڈنے کے لیے۔“ وہ باہر آرہی تھی کہ ٹھٹھک کر رکنا پڑا۔ فریدہ مامی ماموں پہ برس رہی تھیں۔

”بس خاموش! اب وہ ہماری عزت ہے، میں کب سے تمہاری یہ بکو اس سن رہا ہوں، اب مزید نہیں سنوں گا۔“ ماموں دلی آواز میں غرائے۔

”ہونہ! بد کردار لڑکی، ماں، باپ کی عزت لٹا کے اب ہمیں نوپنے کو تیار ہے ڈائن، میرے بیٹے کی خوشیاں کھا گئی۔ کم بخت۔“ وہ بدستور شعلے اگل رہی تھیں۔

”وہ میری ہی بھانجی نہیں، تمہاری بھی بھتیجی ہے۔“ تف ہے تم لوگوں پر۔۔۔ آج تک رشتوں کی قدر نہیں کی تم دونوں بہن بھائیوں نے۔ دنیا جہان کے خود غرض انسان ہو تم لوگ۔“

ماموں کی سرد سپاٹ آواز آئی اور وہ ساتھ ہی باہر نکلے۔ شفق بچن کے دروازے پہ کھڑی تھی۔ ناخنوں کو کھرچتی ہوئی۔ عرق ندامت سے سر جھکائے۔ غیر مرئی نقطوں کو گھورتے ہوئے انہوں نے ایک تاسف بھری نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔

جہانزیب سے چھوٹا ارب ہاسٹل سے چھٹیوں پہ گھر آیا ہوا تھا اور وہ اس سارے قصے سے قطعی لاعلم تھا۔ شفق حسن کو لٹا رہی تھی جب وہ اس کے پاس

”ہیلوشفو آئی۔! آپ کب آئیں۔“ وہ خوشگوار لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کے خیال سے شفق کی موجودگی محض چند دنوں کے لیے رہنے کی غرض سے تھی جبکہ وہ جانتا تھا کہ شفق بچپن میں کبھی ایک دفعہ بھی ان کے دولت کدے پہ نہیں آئی تھی ہر موقع پر تہوار انہیں ہی جانا پڑتا تھا۔

وہ کچھ الجھا ہوا سالک رہا تھا شاید اس قصے کی توڑی بہت بھٹک اسے بھی پڑی تھی لیکن مفصل نہیں۔

”بیٹا اب یہ بیس رہیں گی۔ تمہاری بھابھی جو بن گئی ہیں۔“ اس سے پہلے کہ وہ وضاحت کرتی۔ ماموں نے پیچ میں آکر دخل دیا۔

”واٹ۔! ارب نا سمجھی سے ان کی شکل دیکھنے لگا۔

”یو مین ہا۔! بھیا کی شادی وادی۔“ وہ اٹک اٹک کر بولا تو وہ مسکرائے لگے۔

”ٹس ناٹ فی رپا۔ بھیا کی شادی اور مجھے بلانا تو کیا بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا آپ نے۔“

وہ سمجھ آنے پہ کچھ حیرت اور پھر صدمے سے گنگ ہوتے ہوئے بولا۔

شفق باری باری دونوں کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔ جب ہی اس کی نظر حسن پر پڑی ایک بار بے دھیانی سے دیکھنے پر دوسری بار وہ چونک کے مڑا۔

”واؤ۔ کول ہو از دس۔“ وہ چلایا۔ اب وہ ننھے حسن کو کٹ میں سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہانزیب کی طرح وہ بھی بچوں کا دیوانہ تھا۔

”تمہارا بھتیجا۔“ ماموں سکون سے بولے جبکہ ارب کا سکون اڑ چھو ہو گیا۔ وہ دوبارہ ہونق بن گیا۔

”ہا! آپ کو میں ہی بے وقوف نظر آ رہا ہوں جو کوئی گسوٹی تھیل رہے ہیں۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

”بھتیجا۔ واٹ آجوک۔؟“ وہ ہنسنے لگا۔

”ہاں ارب۔! بھتیجا۔ بونس میں ملا ہے تمہارے بھائی کو بیوی کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی جینز میں

مل گیا۔ ہمیں کا ہے کو فکر۔ دونوں باپ بیٹا لاوارث اولاد کو گلے لگاتے پھریں یا یتیم خانہ کھولیں۔ چلو تم ادھر کیا کر رہے ہو بے کام میں۔“ فریدہ مامی بچن سے بولتی ہوئی پاس آریں۔ اسکاوش کا گلاس ارب کو تھمایا وہ اب بھی اپنے شفق کی جانب دیکھ رہا تھا اور وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے سرمایہ سی نظریں چراری تھی۔

ارب دوبارہ تو اسے پوچھنے نہیں آیا تھا۔ یقیناً یہ سب مامی ہی کی عنایات تھیں۔ شادی کے دو چار دن بعد ہی جہانزیب واپس اسلام آباد چلا گیا تھا۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ارب بھی واپس ہاسٹل چلا گیا تھا۔ رہ گئے ماموں وہ صبح ہی اپنے دفتر نکل جاتے تھے۔ مامی سے اسے کسی مہربانی کی امید نہیں تھی۔

آہستہ آہستہ انہوں نے کام والی مامی، باورچن یہاں تک کہ دھوبی کی چھٹی کردی تھی وہ آہستہ آہستہ گھر کے تمام امور انتظام اپنے ہاتھ میں لیتی گئی۔ تین بندوں کا کتنا کام ہو سکتا تھا پھر رات کو وہ ہوتی اور ننھا حسن یا پھر اس کی سکوت بھری تنہائی۔ حسن کو دیکھ کر اس کے زخم روز ہی ادھر اڑتے تھے۔

اسے شفق جہانزیب ہوئے بھی سال بیت گیا۔ ارب اس دوران دو دفعہ آیا تھا لیکن اس کی سرد مہری کسی بھی فاصلے کو پانٹنے میں رکاوٹ بن جاتی تھی سو ایک اور رشتے کی کمی بے مول زندگی میں۔ وہ دکھ سے سوچے جاتی۔

اس دن وہ حسب معمول آٹھ بجے ہی اٹھی تھی، صبح سویرے نماز قرآن پڑھ کر وہ ناشتا وغیرہ بنا کے سو جاتی تھی پھر آٹھ بجے ہی اٹھتی تھی۔ باہر غیر معمولی سا شور اٹھا تھا۔ مامی زور زور سے بولتی ہوئی کسی بات پہ استفسار کرتے ماموں۔

”یا اللہ خیر۔! وہ دہل کر اٹھی۔ دوپٹا اپنے گرد لپیٹا اور باہر کی جانب لپکی دروازے تک پہنچے۔ وہ کسی سے ٹکراتے پچی تھی۔ آنے والے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ سال ہو گیا تھا اسے دیکھے بھی وہ جہانزیب ہی تھا چہرے پہ سفر کی تکان لیے

ایک کاندھے پہ سفری بیگ دروازے پہ کھڑی حیران
 شفق کو یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ غیند سے سرخ ہوئی
 آنکھیں پو جھل پن کے باعث سوچ جانے والے
 پونے ارد گرد بکھری اس کی وہی ازلی شرارتی لٹیں جسے
 اس نے آپٹل کی صورت ڈیٹ کر سمیٹنے کی کوشش کی
 تھی۔ مگر وہ پھر بھی چہرے کے اطراف میں بکھری
 ہوئی تھیں۔ چند لمحے تو وہ شفق کی اس من موہنی
 صورت میں کھویا رہا۔

”کیا سکتہ ہو گیا ہے مجھے دیکھ کر“ اس نے ذہن
 جھٹک کر شفق کے آگے ہاتھ ہلایا۔
 شفق ہوش میں آئی دونوں کا سحر ٹوٹ گیا۔ شفق
 جیسے ادھورے خواب سے پلٹ آئی تھی اس کے لب
 نیم وا ہوئے لیکن کچھ سوچ کر وہ چپ ہو رہی اور راستہ
 دے کر پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ دیر پہلے کا طلسم جیسے ٹوٹ
 سا گیا تھا۔ جہانزیب نے نظر چراتے ہوئے اس کے
 ترشے ہوئے یا قوتی لبوں کو دیکھا جو کچھ کہنے کی حسرت
 میں نامعلوم تنبیہ کے باعث باہم پیوست ہو گئے
 تھے۔

الماری سے کپڑے نکال کر وہ واش روم میں گھس
 گیا تھا وہ واپس آیا تو شفق تولیہ لیے اسی کی منتظر تھی۔
 ”کیسی ہو۔“ مختصر پوچھا۔
 ”ٹھیک۔“ مختصر ہی جواب آیا۔

وہ باہر نکل آئی ساری آج خود کچن میں تھکی ہوئی
 تھیں اور مسلسل اسے سنائے جا رہی تھیں۔ ایک
 سال میں کچن کو اس نے اپنے مطابق سنوارا تھا اور
 اب مامی کا اس پر غصہ بجاتا تھا انہیں کسی بھی چیز کو لینے
 کے لیے سارے کیمینٹس ٹھکا ٹھک کئی بار کھولنے اور
 بند کرنے پڑتے تھے۔ اس سے وہ سخت الجھن محسوس
 کر رہی تھیں۔

ناشتے کے بعد جہانزیب کسی ضروری کام سے نکل
 گیا تھا اسے افسوس ہوا کہ وہ دوبارہ اسے پوچھنے تک
 نہیں آیا اور ماموں کہتے ہیں کہ وہ بخوشی یہ رشتہ نبھارہا
 ہے۔ کچھ دیر وہ پونہی آگلی سے پھرتی رہی۔ اسے
 حیرت ہوئی کہ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود جہانزیب سے

توقع کیے ہوئے تھی جبکہ یہ سوچ تو اس کی اپنی ہی تھی
 کہ اس نہایت اچھے انسان کو بھی اپنے حصے کی خوشی
 پانے کا حق ہے۔ کیا معلوم اس نے کہیں شادی کر
 رکھی ہو؟ اس سوچ کے آتے ہی وہ کتنی دیر گم صم
 رہی۔ چلو اچھا ہی ہو گا۔ میری اذیت کچھ کم ہوئی اس
 کی شرافت ہی ہے کہ مجھے نام دے کر عزت کی بچت
 بھی دے دی۔

اس کا ضروری کام پھر سے طویل ہو گیا تھا اور
 لاشعوری طور پر شفق کی سماعتیں اس کی آنکھوں کی
 منتظر رہنے لگیں۔ حیرت انگیز طور پر وہ اب پرسکون
 رہنے لگی تھی۔ اب نہ تو اسے بچھتاوے ستاتے تھے
 اور نہ خلیل کی وفائی سلگاتی تھی وہ اسے بھول کر انجان
 بن جانا چاہتی تھی۔ شاید اس سب کی وجہ حسن تھا۔ وہ
 نیا نیا چلنا سیکھا تھا سارا دن اس کے پیچھے بھاگتا پڑتا۔
 کوئی چیز اس کے ہاتھ آجاتی تو اس کی درگت بننا لازمی
 تھی اسے مامی کی باتیں بھی ناگوار نہ گزرتیں اور بھی
 کتنی باتیں تھیں جنہوں نے اسے ایک الگ دنیا میں
 لا کھڑا کیا تھا۔

جہانزیب صبح کا گیا شام یا اکثر رات کو آیا۔ کھانا
 بھی جانے کہاں کھا کے آتا تھا۔ اسے تو وہ ہمیشہ نفی میں
 ہی جواب ملا کرتا۔ مامی کو بیٹھے بٹھائے اکثر اس پر تاؤ
 آجاتا تو وہ، ہسٹیا کے مریض کی طرح چلا چلا کر اس کے
 قصور گنوائے جاتیں اور پھر اسی کی بنائی ہوئی چائے
 گھونٹ گھونٹ مٹے ہوئے اپنے ہی شروع کیے ٹھے کا
 سدباب کیا جاتا۔ شفق چابی لگی گڑیا کی طرح یہاں سے
 وہاں سب کام سمیٹتے ہوئے حسن کو بہلاتے ہوئے
 ماموں کا انتظار کرتی۔ جہانزیب کا انتظار تو بے سو تھا وہ
 اسے پوچھتا بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ خود کو انجان اور
 غیر مرنی مخلوق محسوس کرتی۔ گھر میں سوائے ماموں کے
 کسی کو اس کی موجودگی سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دن
 ماموں نے اسے جالیا۔

”ایسا کب تک چلے گا بیٹا۔“
 ”کیا ماموں جان؟“ وہ ناگجھی سے بولی۔
 ”تم اس سے اجنبی وہ تم سے انجان۔ کہاں سے

آتا ہے کہ تم دونوں میں سرے سے کوئی رشتہ ہے۔
 اگر وہ کتنا رہا ہے بیٹا تو تم اپنے درمیان موجود اس رشتے
 کو بحال کرو۔“ شفق خفت سے ہونٹ کاٹنے لگی۔
 ”دیکھو شفق! میاں بیوی کے رشتے میں تو ایسی
 سا جھجھکاری ہوتی ہے جو دنیا کے کسی رشتے میں نہیں
 ہوتی۔ ہمارا مذہب یونہی تو میاں بیوی کو ایک دوسرے
 کا لباس نہیں کہتا۔ لیکن کبھی کبھار دو دماغ ایک جیسا
 سوچنے لگتے ہیں تو مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اب تم
 دونوں ہی ایک دوسرے کی پہل کے منتظر ہو اور میں
 کہتا ہوں کہ پہل کرنا تمہارا فرض ہے بیٹا۔ کیونکہ اس
 قصے کا مرکزی کردار تو تم ہی ہو۔ اب تم اپنے کردار سے
 کیسے انصاف کرتی ہو؟ یہ تم پر منحصر ہے۔“ وہ خاموشی
 سے سنتی رہی۔

ماموں اکثر ویشتر ایسی نصیحتیں کرتے رہتے تھے
 لیکن اب اس کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ دیریوں کو
 سمیٹنے میں صرف ایک قدم درکار تھا چاہے وہ اس کا ہویا
 جہانزیب کا۔

رات میں جب وہ واپس آیا تو اس نے مسکراتے
 ہوئے سلام کیا۔ اسے اچنبھا تو ہوا لیکن خاموش رہا۔

”کھانا کھا میں گے؟“ روزانہ کا سوال۔ جہانزیب
 نے ایک گہرا سانس لیا۔

”میں نے کہا تھا شفق! تم تکلیف نہ کیا کرو۔ میں
 کھانا کھا کر آتا ہوں۔“ وہ سادگی سے بولا۔ شفق اسے
 دیکھ کر رہ گئی۔

”لیکن میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ کچھ توقف
 کر کے وہ آہستگی سے کہتے ہوئے نظریں جھکا گئی۔ اب
 حیرت کا زبردست جھکا لگا۔ وہ بغور اس کی طرف دیکھ کر
 بولا۔

”میرا۔“ انگلی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ ”لیکن
 کیوں۔۔۔؟“

”مجھے کچھ کہنا تھا۔“ جہانزیب اس کے بولنے کا
 انتظار کرنے لگا۔

”جہانزیب! آپ کو معلوم ہے کہ میں یہ شادی
 نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی امی اور ماموں کے

اصرار کی وجہ سے مجبور ہو گئی۔ لیکن میں قطعی نہیں
 چاہتی تھی کہ آپ کی دل آزاری ہو۔ آپ آزاد ہیں
 جہانزیب! آپ چاہیں تو اپنی پسند سے دوسری شادی
 کر لیں۔ میں۔۔۔“

”ایک منٹ۔۔۔!“ وہ بے ساختہ ٹوک بیٹھا۔ اسے
 حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کتنا الٹا سیدھا سوچ رہی تھی
 اس کے بارے میں۔ اب اسے بہت غصہ آ رہا تھا۔

”تم سے کس نے کہا کہ یہ شادی میں نے مجبوراً کیا
 کسی کے کہنے سے؟ کی ہے اور آزاد کرنے والی مجھے۔ تم
 ہوتی کون ہو؟ شفق بی بی! یہ میری زندگی ہے۔ اسے
 اپنی مرضی سے گزارنے کا پورا حق ہے مجھے۔ مجھے کیا
 پسند کرنا چاہیے کیا نہیں؟ اس کے لیے میں تمہارا پابند
 نہیں ہوں اور دوسری شادی کرنے کے لیے مجھے تم
 سے اجازت درکار نہیں ہوگی۔ میں اپنے ہر معاملے
 میں آزاد ہوں۔! رہ گئیں تم۔ ہاں مجھے دکھ ضرور
 ہوا تھا جو کچھ تم نے کیا اس پر۔ میں اس وقت سے
 تمہارا نام اپنے نام کے ساتھ سن رہا ہوں جب میں نے
 ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ لیکن تم میری قسمت نہیں
 تھیں شاید۔ اور اب کی تم بات کرتی ہو تو۔۔۔ تم سے
 میں نے ہمدردی میں شادی نہیں کی ہے اپنی مرضی
 سے شادی کی ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولتا چلا گیا۔

”کیونکہ تم میری دعا رہی ہو۔ دعاؤں کو بے قدر
 نہیں کیا جاتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ میری ذات سے
 تمہیں کوئی سکھ نہیں پہنچا۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میں
 نے تمہیں کوئی دکھ بھی نہیں دیا شفق۔!“ کچھ لمحوں
 کی خاموشی کے بعد اپنے لہجے کو نارمل کرتے ہوئے وہ
 نرمی سے بولا تھا۔

شفق کا سارا وجود جیسے بے جان ہو گیا۔ وہ بغیر پلک
 جھپکے اسے دیکھ رہی تھی جسے اس کا نصیب بنا دیا گیا تھا
 اور جسے اس نے نصیب بنانا چاہا تھا وہ سراسر اب نکلا۔ آنسو
 بے اختیار ہی اٹھ آئے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ کس
 بات سے اسے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ کوئی بچھتاوا نکل
 آیا تھا یا کوئی دکھ ابھر آیا تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا۔ یہ
 وہ آج جان چکی تھی اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ وہ

اسے چاہتا بھی نہیں تھا شاید یہی کرب اسے توڑ دینے کو کافی تھا کہ وہ اب اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ اسے رام کرنا چاہتی تھی۔ معافی مانگنا چاہتی تھی خود پر سے ایک دم اختیار کھو بیٹھی تو اس کے قدموں میں بیٹھتی چلی گئی۔

”مجھے معاف کر دیں جہانزیب! میں نے بہت برا کیا اپنے ساتھ اور آپ کے حق میں بھی۔ مجھے ساری زندگی یہ افسوس رہے گا کہ میں ہیرے اور پتھر میں تمیز نہیں کر پائی۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آج ایک بار پھر اس نے اپنی بربادی پر صف ماتم بچھائی تھی۔ ایک بار وہ خلیل سے پھڑنے پہ یوں روئی تھی اور آج وہ اسے کھو دینے کے ڈر سے رو رہی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم۔!“ وہ کرنٹ کھا کے دور ہٹا۔ شفق نے اس کے پیروں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے پاؤں ہٹا لینے سے وہ اس سہارے سے بھی محروم ہو گئی۔ ”پاگل ہو گئی ہو شفق۔“ وہ جو اس باختہ سال سے زار و قطار روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شفق نے بے ساختہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”میں بہت بے مایہ ہوں۔ اپنی ماں کا نصیب لے کر دنیا میں آئی ہوں۔ انہوں نے مجھی کبھی خوشیاں نہیں دیکھیں تو میں کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ لیکن جہانزیب میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ یوں نہ اذیت دو مجھے ایسے بے آسرامت کرو۔ میں نے جو نادانی کی ہے تم اس کی سزا نہ دو مجھے۔ پلیز جہانزیب۔!“

اب وہ دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھے ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے اس لمحے اس پھول سی لڑکی کو بے انتہا ندامت میں ڈوبا پایا۔ وہ اس کے پاؤں پکڑ کر ہاتھ جوڑ کر اس سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ یہ وہ چہرہ تھا جسے وہ بارہا تصور میں اپنے پاس دیکھ چکا تھا۔ آج وہ مجسم حقیقت بن گئی تھی۔ اس نے خود سے کتنا دور کر دیا اسے۔ تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔

وہ جھٹکنے سے اٹھ کر باہر نکلتا چلا گیا۔ شفق نے بھیگی

آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

دوسری بار بھی مماثلت۔ وہ جاچکا تھا۔ اور وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں سے وہ گیا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔! تمہیں یہاں کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔“

شفق کو معلوم تھا کہ ماموں اس کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد جو فیصلہ کیا، وہ اس کے لحاظ سے نہایت موزوں تھا۔ سب سے پہلے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنا، پھر جاب کا حصول اور آئندہ آنے والے دنوں میں اپنا بار خود اٹھانے کا فیصلہ تھا۔ جہاں ماموں نے اتنے احسانات کیے وہاں یہ چند سال اور احسان کر دینے سے ان پہ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آخر کار اس نے خود غرضی سے سوچا تھا۔

ماموں اب اس کے لیے اب واحد سائیاں رہ گئے تھے۔ جہانزیب سے مزید کوئی توقع رکھنا بے وقوفی تھی۔ اس نے جتنا سوچنا تھا ان چند دنوں میں سوچ چکی تھی۔ بہر حال وہ جہانزیب کو مزید مشکلات میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی وجہ سے جہانزیب کی ذات پہ جو خاموشی کے ویز سائے چھا گئے تھے وہ اسے ان سب سے دور کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن یہاں آکے وہ مات کھا گئی کہ ماموں کو اس کا ایسا کوئی فیصلہ منظور نہیں تھا۔ وہ تو اس کی سوچ پہ ہی اچھا خاصا برہم ہو گئے۔

”تم نے یہ سوچا بھی کیسے۔ اگر تم سے مشقت ہی کروانی ہوتی تو یہاں کیوں لے کر آتا۔ وہیں ٹھیک تھیں۔“

وہ طنزیہ بولے۔ ان کی خطگی بجا تھی لیکن وہ بھی مجبور تھی۔ ایسے کسی رشتے کو نبھانا نہیں چاہتی تھی جس سے کسی پہ بوجھ پڑے۔

”ماموں جان! آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ آپ مجھ پر زبردستی کرنے کا اختیار نہیں

رکھتے۔“ وہ حتمی انداز میں کہتے ہوئے رخ موڑ گئی۔ عمران صاحب حیرت و بے یقینی کے ملے جلے تاثرات سے منہ کھولے اسے دیکھتے رہے۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ تمہارے خون میں ہی خود غرضی اور احسان فراموشی شامل ہے۔ جاؤ بیٹا! جو دل چاہتا ہے کرو۔ میرا تو کوئی اختیار نہیں۔ کہو اپنے شوہر سے وہ تمہیں پڑھائے تمہیں اپنے طور پر اسٹیبلش ہونے میں تمہاری بھرپور مدد کرے۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولے تو ان کے لہجے میں اجنبیت بھری قطعیت تھی۔

شفق شرمندگی سے نظریں جھکا گئی۔ اس نے حساب لگایا سو آج سے اس کی نہ ختم ہونے والی سزا شروع ہو گئی تھی۔

جہانزیب ہمیشہ کی طرح جانے کہاں غائب ہو گیا تھا وہ کبھی کبھار اپنی بے وقوفی کے بارے میں سوچنے لگ جاتی تھی۔

”آخر کیا ضرورت تھی اس کے سامنے اتنا بے اختیار ہونے کی۔ اس کی مرضی وہ جو کرے مجھے اس سے کیا۔ رات کافی دیر تک وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ جب وہ اس کا خیال اپنے دماغ سے نکلنے میں ناکام ہو گئی تو تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ بھاڑ میں جائے جہانزیب اور میری ہمدردی۔! وہ جھنجھلا کر کہتے ہوئے کروش بدل گئی۔

بہت عرصہ گزرا اس نے شفق کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد پڑتا تھا کہ ایک وقت ایسا تھا جب اس کا کوئی دن شفق کو یاد کرتے اور کوئی رات اسے سوچے بغیر نہ گزرتی تھی۔ پایا نے بچپن سے ہی ازیر کروا دیا تھا۔

”بیٹا! یہ تمہاری کزن ہے اور فیانی بھی۔“ وہ اس وقت پانچویں کلاس میں تھا۔ اور پایا کے مراسم اپنی اولاد سے ہمیشہ دوستانہ رہے تھے۔ وہ اس عمر میں تو بالکل بابرلی ڈول ہی لگتی تھی۔ جہانزیب اکثر اسے

دیکھنے لگتا تو ارد گرد سے بھی بیگانہ ہو جاتا تھا۔ بعد میں اپنی اس کیفیت پہ خوب جھنجھلا تا تب اس نے دانستہ وہاں جانا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی بابرلی ڈول اس سے دور ہو گئی۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اپارٹمنٹ کی ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ آج کی شام بھی اس کے من کی طرح اداس تھی۔ آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے اپنے گھر سے آئے ہوئے۔ لیکن شفق کا عکس اس کی جان چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

”شفق! یہ تم نے کیا کیا۔!“ وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں تقریباً ”نوپتے ہوئے“ بڑبڑایا۔ شام کا سایہ پھیلا۔ شفق کی سرخی بھی معدوم ہو گئی اور رات اپنے پر پھیلائے چہار سو گشت کرنے لگی۔ تب وہ اپنے شل ہوتے بازوؤں اور ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا اندر کی جانب بڑھا۔ یہاں تنہائی کا بہت شدت سے احساس ہوتا تھا اور آج کل تو کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔

یہ بات تو طے تھی۔ شفق کے بغیر وہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ آج بھی اس کے دل و دماغ پہ روزاؤں کی طرح قابض تھی۔ اس کی پشیمانی نے مزید داغ دھو ڈالے تھے وہ اس سے اپنی تیام نادانیوں کی معافی بھی مانگ چکی تھی۔ پھر کیا بات تھی جو اسے پریشان کیے دے رہی تھی۔ شاید اسے یوں بغیر بتائے واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے وہ ایک حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔

اس دفعہ وہ بہت جلدی آگیا تھا۔ اریب بھی اس کے ساتھ تھا وہ اپنی چند روزہ چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ ”السلام علیکم بھابھی۔!“ اس نے گرم جوشی سے سلام جھاڑا۔ شفق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ لیکن اگلے ہی پل اس کے سلام کا جواب بھرپور مسکراہٹ سے دیا۔ جہانزیب نے کچھ چونک کر اس کی جانب نگاہ کی۔ وہ اسے پہلے کی نسبت کمزور سی لگتی تھی۔ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔

”یسی ہو۔؟“ ہمیشہ کا جملہ۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
 ”باہر گرمی ہے۔ اندر آ جاؤ۔“ اس کے جواب نہ دینے کا جہانزیب نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ شاید وہ اس سے یہی توقع کر رہا تھا۔ اس نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔

مائی کمرے سے بولتے ہوئے باہر آرہی تھیں انہیں اربب نے امین شن کروا دیا تھا۔ راہداری تک آتے ہی وہ ٹھنک کر رک گئیں۔

جہانزیب مسکراتے ہوئے شفق سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ان سے آگے نہیں بڑھا گیا۔

”آنکھیں سرخ ہیں تمہاری۔ سوئی نہیں ہو یا روتی رہی ہو۔“ کن آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم کب آئے جہانزیب! مجھے بتایا تک نہیں۔“ وہ ان کے قریب پہنچ گئیں۔

نہ سلام نہ دعا بلا تمہید خفگی کا اظہار سوجہ وہ اچھی طرح جان رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنے ساتھ کھڑی شفق پر ڈالی جواب کچن میں واپس جا رہی تھی اس نے دوبارہ اپنی ماں کو دیکھا۔

”بس ای! وہ یاد ہی نہیں رہا۔ ایک چوٹی اربب کے ہاسٹل سے فون آ گیا تھا یہ آنا چاہ رہا تھا پھر سفر ایسے کٹا کہ یہاں آ کر دم لیا۔“ وہ فریش کچے میں بول رہا تھا۔ مائی نے اس کے چہرے پر کچھ تلاشنا چاہا۔

”کیا بات ہے امی!“ اسے ان کی ایکسرے کرتی نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔! تم فریش ہو جاؤ“ میں کھانا لگو رہی ہوں۔“ وہ سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”یہ تمہارے لیے۔!“

جہانزیب نے ایک پکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے حیرانی سے جہانزیب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے لینے میں تامل کر رہی تھی۔

”تمہارے لیے لایا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے پکٹ مزید کچھ اور کئے بغیر اس کے پاس رکھ دیا۔
 سب کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ وہ تمام امور گھر داری سمیٹ کر آخر میں اپنے اور اس کے مشترکہ کمرے میں آئی تھی۔ اس کی رات دیر سے شروع ہوتی تھی۔ اس وقت حسن جاگا ہوا تھا۔ وہ اسے فیزر سے دودھ پلانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی جسے وہ پی کم اور گرا زیادہ رہا تھا۔ آج اپنے علاوہ جہانزیب کو بھی جاگنا دیکھ کر وہ الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔

وہ ہمیشہ ہی تھکا ہارا ہوتا تھا اور آتے ہی سو جاتا تھا۔ لیکن آج شاید کوئی بات تھی جو اسے کھٹک رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر پکٹ کھول لیا۔ اندر بہت خوبصورت سوٹ تھا۔ نی پینک کلر یہ فیروز کی کلر میں کڑھائی سوٹ کی خوب صورتی کو اجاگر کر رہی تھی۔

”میرے لیے۔ لیکن کیوں؟“ وہ بدستور الجھن کا شکار تھی۔ جہانزیب جھنجھلا کے رہ گیا۔

”میرے خیال میں تم میری بیوی ہو۔ کیا میں تمہارے لیے کچھ لا نہیں سکتا؟“ شفق لا جواب ہو گئی لیکن بے شمار سوالات تھے جو اس کے دل و دماغ میں پھیل چارے تھے۔ جہانزیب نے ایک نظر اس کے اچھے ہوئے خلیے پر ڈالی۔ وہ اب اسے نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اس کی ساری توجہ حسن پر مرکوز تھی۔ جانے کیوں وہ خواہ مخواہ ہی رونے لگا تھا۔ شفق مزید جھنجھلا گئی۔ جہانزیب بھی راستے میں رکاوٹ کی طرح کھڑا تھا۔ وہ زور زور سے اسے تھکنے لگی۔

”لاؤ مجھے دو۔ میں چپ کروانا ہوں۔“ جہانزیب نے کہتے ساتھ ہی حسن کو اس کی باتوں سے نکال لیا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے رہ گئی۔ واقعی ایک دوبار بھٹکنے پر حسن جہانزیب کی گود میں آرام سے سو گیا تھا۔ شفق ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی جو بیڈ کے وسط میں حسن کو سلا کر اس پہ کمر باندھ کر اڑھا رہا تھا۔ گویا اس کی جگہ متعین کی گئی تھی وہ ہمیشہ اس سے پہلے کاٹ میں سوتا تھا۔

جہانزیب کا رویہ اس کی سمجھ سے تو بالا تر تھا۔ کبھی جب کبھی چھاؤں سا۔ آخری دفعہ جب وہ گیا تھا تو اس نے اسے باور کرا دیا تھا کہ وہ اپنی ذات سے اسے شاید کوئی سکھ نہ دے سکے۔ تو پھر یہ نام نہاد ہمدردی؟
 ”خدا کے لیے میں سمجھا چکی ہوں اپنے ناتواں دل کہ میں کر چکی ہوں سمجھوتہ۔ پھر کیوں تم یہ سب کر رہے ہو کہ میں پلٹ کر سوچنے پر مجبور ہو جاؤں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے شکستہ دل سے یہ سب سوچے گئی۔ جب وہ اس کے پاس آیا تو وہ بالکل بھی اپنے دھیان میں نہیں تھی۔ جہانزیب نے کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ شفق چونک کر اس کی طرف مڑی۔ کب سے ایک جگہ کھری آنکھوں میں حرکت کے باعث چھین در آئی اور ڈھیر سا راپانی آنکھوں میں سمٹ آیا۔

”شفق۔“ وہ اسے پکار رہا تھا لیکن اسے اپنی بے وقعتی و بد نصیبی پر شدت سے رونا آ رہا تھا۔

”آنسو بہانے کی بھی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ کیوں۔ کیا وجہ ہے جو یوں رو رہی ہو۔“ وہ بہت آہستگی سے کہتا ہوا اب اس کے آنسو بہت نرمی سے صاف کر رہا تھا۔

”جی۔۔!“ فقط اتنا کہہ کر اس نے بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے رخسار صاف کیے اور نظریں جھکا لیں۔
 ”میں جب بھی تمہاری طرف پلٹا۔ تم مجھ سے دور ہو جاتی ہو۔“ وہ عجیب سی حسرت لہجے میں سموئے کہہ رہا تھا۔

”تو ہے۔ جب تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں اپنی زندگی کی نادانی کا بہت کچھ بتا دیا ہے اور یہ کہ تم سب بھول چکی ہو۔ شفق! کیا بھولنا تمہارے۔ تمہارے اختیار میں ہے؟“ وہ اسے یک دم کاندھوں سے تھام کر بولا تھا۔

”ہاں۔! ہے۔ میرے اختیار میں ہے اسے بھول جانا۔ بے شک وہ تلخ ایام یاد کرنا اذیت ہیں میرے لیے لیکن میں اس سب کو پہلے جیسا کیسے سمجھ سکتی ہوں۔ اب گزری باتوں سے میرا کیا ناتا ہے

جہانزیب۔! جبکہ میری کشتیاں جل چکی ہیں۔“ وہ غم لہجے میں کہتے ہوئے چہرہ جھکائے ہی بولی تھی۔ وہ چہرہ نہ بھی اٹھائی تو جہانزیب جانتا تھا کہ کہ آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو رہا ہوگا۔

”شفق۔“ وہ نرمی سے پہلی بار اسے اس نام سے پکار رہا تھا۔

”میری طرف پلٹی ہو تو خود کو کیوں بے مایہ سمجھتی ہو میرے حوالے سے بد نصیب کہتی ہو خود کو۔ کیوں میں تمہاری بد نصیبی ہوں کیا؟“

جہانزیب نے دھیرے سے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے اس کا چہرہ اٹھایا۔ رونے سے اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

”آتم سوری۔!“ وہ شرمندگی سے گویا ہوئی۔ جہانزیب نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”نہیں شفق! معافی تو مجھے مانگنی چاہیے جو اس مقدس رشتے سے مکمل ہی لا تعلق ہو گیا۔ میں اتنا درست انسان ہر گز نہیں ہوں۔ لیکن معلوم نہیں کیا ہوا تھا مجھے۔ میری بے رخی ہی تمہیں بدگمانی کی سبب پر لے گئی تھی۔ میں نے تمہیں اپنے نام پہ روتے دیکھا ہے۔ تمہیں اپنی نادانیوں پہ پچھتاتے دیکھا ہے۔ شفق! میں نے تمہیں بے مایہ کرنے کے لیے تو نہیں اپنایا تھا۔ انیت ہے تم سے مجھے محبت کرتا ہوں میں تم سے۔“

وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا تھا۔ شفق نے بے یقینی سے جہانزیب کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ ضبط الفت کے وہ تمام رنگ تھے۔ اس نے کب ایسا سوچا تھا کہ کبھی جہانزیب بھی لوٹ کر آ سکے گا۔

”ایسا ممکن ہے؟“ کا سوال اس کی زبانت کے عنوان میں سے کب کامٹ چکا تھا۔

”جہانزیب۔!“ اس نے یک دم ہی اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے دل سے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سرکا تھا۔

”ہاں۔!“ اس نے شفق کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرہ میں محفوظ کر لیا۔

”جہانزیب۔!“ وہ فرط مسرت سے ہنسی۔ آنکھوں کی ریم جھم کے ساتھ خوبصورت ہنسی و مسکراہٹ کی جھنکار۔ جہانزیب نے بے خودی کے عالم میں اس منظر کو دیکھا۔ ہر حال وہ اپنا اجڑا گلشن پھر سے آباد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”میں تم سے ناراض ہوں۔ تم نے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔“ وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔ شفق مسکرا کر سر جھکا گئی۔ ”شکرا الہی۔!“

اپنائیت کے مرحلے طے ہو رہے تھے۔ شکوہ شکایات کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سراپا تشکر بن گئی۔

”میرا انتظار کرتی تھیں تم؟“ وہ مسکراتے ہوئے اس پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھا۔ شفق نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔

”شفق۔!“ آج ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے لگے ہیں تو میں کچھ ادھار چکانا فرض سمجھتا ہوں۔“ جہانزیب نے تمہید باندھی۔

”میں بات نہیں کروں گا تمہاری گزری زندگی کے بارے میں۔ میں زندگی بھر تمہیں کسی بھی حوالے سے شرمندہ نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ اور میں تم سے بھی وفا کی توقع کروں گا۔ ہم بھول جائیں گے کہ ہماری زندگی میں ایسا کوئی رخ موڑ بھی آیا تھا اور حسن کو۔“ وہ سانس لینے کو رکا۔

شفق نے سرعت سے سر اٹھایا تھا۔ جہانزیب کو اس کی آنکھوں میں التجا نظر آئی۔ وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

”آج سے میں اسے اپنا نام دیتا ہوں۔“ شفق کے تاثرات ڈھیلے پڑے۔ آج اس پہ سجدے کرنا واجب ہو گیا تھا۔ اس کی سزا آسان ہو گئی تھی۔ بے ساختہ ہی دل بھر آیا تھا۔

”یہ میرے نام سے بڑا ہو گا۔ اور سدا میرا ہی بیٹا کھلائے گا۔“

”جہانزیب۔“ شفق نے روتے ہوئے اس کے ہاتھوں پہ سر ٹکا دیا۔

”اتنا کرم مت کرو میری ذات پہ میں اس کی اہل نہیں ہوں۔“

”تم کس کرم کی مستحق ہو یہ تم میرے دل سے پوچھو۔ جو اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی تم سے بدظن نہ ہو سکا۔ آج بھی اس دل میں تمہیں اسی استحقاق سے پر اجماع پاتا ہوں۔ جیسے اول روز سے۔ میرا ساتھ دو گی شفق۔!“ وہ اس سے وفا مانگ رہا تھا۔ شفق نے ہنسی آنکھوں سے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

”محبت کرو گی مجھ سے۔؟“ وہ اب محبت کی ہر ای بخش رہا تھا۔

”میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں جہانزیب۔!“ اس کے رونے میں یک دم ہی شدت آگئی تھی۔ جہانزیب کے ہاتھ آپوں آپ ہی ڈھیلے پڑے۔ وہ شدید رہ گیا واقعی اس کے جذبول میں تفتنی صداقت تھی۔ شفق کے ہاتھ رہائی پاتے ہی چہرے کے گرد حصار بن گئے تھے اس کے آنسو گواہی دے رہے تھے اس کی ہچکیاں اس کی بے چین و بے خواب راتیں گواہ تھیں اس کی اذیت کی۔ اب شاید مشکلیں آسان ہو جائیں۔ اس کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی تھی۔



ماضی گزر جاتا ہے۔ لیکن یادیں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ لیکن شفق تو جیسے اپنی زندگی کے اس بھیانک باب کو دفن کر چکی تھی۔ اس نے کبھی بھول کر بھی پرانی باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہا تھا۔ جہانزیب نے پرانی جانب سے استغنیٰ دے دیا تھا اور کچھ تلاش بسیار کے بعد زبردست مراعات کے ساتھ وہ نئی جانب حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ اسے کمپنی کی طرف سے گھر بھی مل گیا تھا اور اس خوش قسمتی کو وہ شفق کی ذات سے عبارت کرتا تھا۔

حسن اب ڈھائی سال کا ہو چکا تھا اور جہانزیب کی اس سے دن بدن بڑھتی ہوئی محبت اسے ہمیشہ کی طرح اس کا ممنون کر دیتی تھی۔ وہ کبھی کبھار سوچتی وہ اس

قابل کہاں تھی کہ اسے اتنی محبت ملتی۔ جب وہ یہاں آ رہی تھی تو مامی نے کتنا داویلا کیا تھا۔ اب یہ تو جہانزیب ہی جانتا تھا کہ اس نے ماں کو کس انداز میں سمجھایا تھا۔ ہر حال اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ بس ایک پھانس آج نامعلوم جگہ چھپی تھی۔ حسن کو دیکھ کر وہ کبھی کبھار الجھن کا شکار ہو جاتی تھی۔ وہ اس بے وفا انسان کا خون تھا جو بیس گھنٹے اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ بیٹے سے ماں والی فطری محبت ہونے کے باوجود یہ کڑی کہیں اور جالمتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر ہر خیال رد کر دیتی۔ جہانزیب کو آج جلدی آتا تھا کچھ دنوں سے وہ اکتاہٹ و طبیعت میں کسل مندی سی محسوس کر رہی تھی۔ دو دن سے نمپر پچر بھی تھا۔

جہانزیب کی پسندیدہ بریانی دم کرتے ہوئے وہ حسن کی آواز پہ پیچھے مڑی۔

”ماما۔۔۔ بے دیکھو۔“ (یہ دیکھو) اس کے ہاتھ میں کرٹل کا وہ گلداں تھا جو سینٹرل ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ ”اوئے میرا بیٹا یہ کیسے اٹھالیا تم نے۔“ اس نے ٹیبل کی طرف دیکھا اس میں لگے کاغذی پھول وہیں بکھرے پڑے تھے اور یقیناً ”وہ کرسی یہ چڑھ کے یہ معرکہ سر انجام دے کے آیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اب الٹی پڑی تھی۔

”شریر۔“ وہ اسے پیار کرتے ہوئے ہنس پڑی شام میں جہانزیب اسے لینے آیا اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے انگشتوں میں چابی گھما ڈالی۔ ساتھ ساتھ وہ زرب لب مسکرا بھی رہا تھا۔

”ایسے کیوں مسکرا رہے ہیں؟“ شفق نے سادگی سے پوچھا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھ کر دوبارہ ڈرائیونگ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ مسکراہٹ شدید ستور قائم تھی۔

”سوچ رہا ہوں تمہاری نظرات والوں آخر تمہیں میری نظر بھی تو لگ سکتی ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ شفق جھینپ گئی۔ اس نے چہرہ باہر کی طرف موڑ لیا ایک دم ہی وہ ٹھکی۔ یہ راستے انجانے نہ تھے ایک عجیب سے احساس سے اس کا بدن جلنے لگا۔ وہ کچھ

گھبرائے ہوئے انداز میں اس کی جانب مڑی۔

”آپ کہاں جا رہے۔“ مختصر جواب آیا اس کی رنگت کچھ بحال ہوئی۔ جہانزیب نے بغور اس کا متغیر ہوتا چہرہ دیکھا۔ ریسپشن پہ کھڑا شخص کوئی اور نہیں تھا نہ وہ کوئی الوژن تھا۔ نہ ہی اس کی آنکھوں کو کوئی دھوکا ہوا تھا۔ صحیح معنوں میں وہ پتھر کے رہ گئی تھی۔

اس کی حالت دیکھنے میں کافی ناگفتہ بہ تھی۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ رنگ بھی قدرے سانولا ہو چلا تھا کاش یہ سب اس کی نظروں کا دھوکا ہی ہوتا۔ یا ضروری تھا کہ زندگی میں دوبارہ اس کا سامنا اس سنگدل شخص سے ہوتا۔ اپنی غیر ہوتی حالت کو مجتمع کرتے ہوئے اسے بہت ہمت لانی پڑی تھی۔ جہانزیب نے یک دم ہی اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ کو واضح محسوس کیا۔

”تم ٹھیک ہو شفق؟“ بے اختیار شانوں سے تھام کر ساتھ لگاتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ شفق نے ایک نظر جہانزیب کے بریشان چہرے پہ ڈالی ریسپشن پہ موجود شخص جاچکا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھا۔ ”مم۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے جھوٹ بولا حالانکہ وہ ٹھیک نہیں تھی۔

اس نے ظلیل رضا کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹھیک کیسے رہ سکتی تھی۔ کتنا عرصہ گزرا تھا اسے خود کو یہ باور کرواتے کہ وہ سب کچھ بھول چکی ہے۔ لیکن آج۔۔۔ کیسے جھپاک سے سب کچھ دل و دماغ کی کھڑکیوں پہ آن وارڈ ہوا تھا۔ نرس سے کہلو کر جہانزیب نے اسے ایمر جنسی ہی ڈاکٹر روم میں بھجوا دیا وہاں پہلے ہی سے ایک ہیشنٹ بہت مغموم انداز میں بیٹھی اپنی تکلیف بیان کر رہی تھی۔ اس کی سائیڈ شفق کی طرف تھی اسے لگا وہ رو بھی رہی تھی۔

”معجزے تو اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اگر مجھے ذرا سی بھی امید ہوتی تو میں کیوں مایوس کرتی آپ کو۔ میری بیٹی جیسی ہیں آپ“ ڈاکٹر اسے تسلی دینے کے انداز میں تھپک رہی تھی۔ مریضہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔

”بہت شکریہ۔ آپ کا۔“ وہ بدقت بول کر کھڑی ہو گئی۔ اب اس کا رخ شفقت کی جانب تھا۔ جانے کیوں وہ اسے کچھ شناسا سی لگی لیکن زیادہ دھیان نہیں دے سکی۔ نرس ڈاکٹر صاحبہ کے لیے کافی لے کر اندر آئی تھی۔

”ڈاکٹر صاحبہ! یہ جو آپ کی پیمینٹ باہر گئی ہے بہت رو رہی تھیں۔“ نرس نے پیشہ ورانہ بے تکلفی سے تبصرہ کرتے ہوئے اطلاع مہیا کی۔ ڈاکٹر کا سر افسوس سے ہلا۔

”اللہ صبر دے اس بچی کو۔ بے چاری ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔“

کمپیوٹر پر اس کی میڈیکل رپورٹ چیک کرتے ہوئے وہ خود ہی سے مخاطب تھیں۔ شفقت نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہوئی اس کی طبیعت پوچھتے ہوئے انہوں نے نرس کو بلڈ پریشر چیک کرنے کو کہا۔

سکڑ نرسین۔! تم یہ اقرا خلیل کی میڈیکل رپورٹ لے جاؤ اور ڈاکٹر ثناء سے سکنچر۔ کروا کے ریسپشن پر سمیٹ کروا دینا ان کا بلڈ پریشر میں چیک کر لیتی ہوں۔“

وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ شفقت ایک نام پر ہی اٹک کر رہ گئی۔

”اقرا خلیل۔“ اتفاق اتنا گہرا نہیں ہو سکتا اسے یکدم ہی اس مریضہ کو دیکھ کر اپنا ٹھکانا یاد آیا تھا تو گویا اس کی دھڑکن رک سی گئی۔

”اوما کی گاڈ! اتنا لو ہو رہا ہے بی بی تمہارا۔ خیال نہیں رکھتیں تم اپنا۔“ ڈاکٹر غنیمین کے لہجے میں اپنائیت بھری ڈانٹ تھی۔

”میں ڈانٹ چارٹ تیار کر رہی ہوں آپ کا اب دوہری ذمہ داری ہے لا پرواہی نہیں برتنا۔ اللہ کی نعمتوں کی قدر کرنا چاہیے۔“

اس کا مکمل چیک اپ کرتے ہوئے وہ بولی تھیں۔ شفقت نے الجھن آمیز نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ ”مطلب۔۔۔؟“

”ماں بننے والی ہیں آپ۔ اللہ خوشی دے رہا ہے۔ شکر ادا کریں۔ صدقہ و خیرات کریں۔ بہت سے لوگ تو اس انمول نعمت سے محروم ہوتے ہیں۔“ آخر میں وہ بہت اداسی سے بولی تھیں۔ شفقت دل سے ڈاکٹر صاحبہ کی ہمدرد فطرت کی قائل ہو گئی۔ وہ باہر آئی تو دل عجیب اچھل پھل کا شکار ہو رہا تھا۔ ساری سستی یک دم ہوا ہو گئی۔ اسے حیرانی ہوئی کہ وہ کیوں نہ جان سکی تھی کہ اسے کیا مسئلہ درپیش تھا۔ جہانزیب اسے گاڑی میں بٹھا گیا تھا اس کی کچھ میڈیسن تھیں جو وہ اسٹور تک لینے گیا تھا۔ شفقت نے اطمینان سے سر سیٹ کی پشت سے نکالیا حسن اچھل اچھل کر اسٹیرنگ گھمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

احاطے کی سیڑھیوں سے اس نے پھر اس شخص کو دیکھا تھا اتنا اس ”مغموم“ بلاشبہ اس کے ساتھ وہ اقرا ہی تھی۔ اس نے بے اختیار ہی اس شخص کو دیکھا۔ جس نے ماضی میں کبھی اس کے جذبات کو بے دردی سے پامال کیا تھا۔ آج کتنا ہی دامن تھا وہ کیا سزا دیتی۔ قدرت نے دنیا میں اسے سب دکھا دیا تھا۔ روٹی ہوئی اقرا تقریباً اس کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔

”خلیل۔۔۔“ اس کے لبوں نے بے نام سی جنبش کی۔ کاش وہ اسے بھول سکتی۔ اس چہرے کو اس نے ہمیشہ خوشیوں سے لبریز دیکھا تھا۔ آج گہرے دکھ و ملال سے دوچار تھا۔ احساس محرومی اس کی پرچھائیوں تک سے جھلک رہا تھا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے حسن کو دیکھا وہ کھلکھلا رہا تھا۔

روشنی اس کے بے پناہ معصوم چہرے سے پھولی پڑ رہی تھی۔ بے اختیار ہی اس نے حسن کو کھینچ کر اپنی بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔

”میرا بیٹا۔“ حسن اس کی شدتوں سے گھبرا کر رونے لگا۔ وہ سنبھل کر اسے تھپتھپانے لگی۔ آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

”شفقت اگر خدا نخواستہ کبھی تم مجھ سے جدا بھی ہو میں نا تو دیکھنا تمہارا خلیل کھوکھلا ہو جائے گا۔“ اس سے وثوق سے کہنے والا شخص آج اپنے کپے

صادق نظر آتا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے آنسو پونچھے۔ حسن اب اوں اوں کی تان لگاتے ہوئے سونے کی پوزیشن میں لگ رہا تھا اس نے مامتا سے بھرپور بوسہ اس کی گھٹی سی پیشانی پر ثبت کیا اور نرمی سے اسے سینے میں بچھ لیا۔ وہ نجانے کب تک سو دو زیاں کے حساب شمار کرتی رہتی۔ جہانزیب کے جھنجھوڑنے پر ہڑبڑا کے اسے دیکھا۔

”کہاں کھوئی ہوئی ہو یا ر! اب سے پکار رہا ہوں تمہیں۔“ وہی نرم لودیتا لہجہ آج مزید ٹون لیے ہوئے تھا اتنا ترش تھا وہاں وہ اسے نجانے کیا کہہ رہا تھا۔ شفقت نے تھوک نگل کر بے توجہی سے اس کی باتیں سنتے ہوئے اب تک کی سوچی ہوئی باتوں کو دہرایا جو اسے جہانزیب سے کہنا تھیں۔

”تم ٹھیک تو ہو۔“ انگلیشن میں چالی گھماتے ہوئے وہ اس کے چہرے پر پھیلے تذبذب کے آثار دیکھ چکا تھا۔ اب فکر مندی سے استفسار بھی کر رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ وہ غائب دماغی سے بولی۔

”یہ کیا جواب ہوا۔“ جہانزیب نے ہنستے ہوئے اس کے چہرے کو اپنی نظروں کے حصار میں لیا۔

”وہ۔۔۔ آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ اتنی آہستگی سے بولی کہ اگر وہ ہمہ تن گوش نہ ہوتا تو کبھی نہ سن پاتا۔

”حسن۔۔۔! اٹک کر حسن کا نام لیتے ہوئے اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس کے نرم دماغ بالوں میں انگلیاں پھنسا لی تھیں۔

”کیا ہوا حسن کو۔۔۔؟“ جہانزیب نے اس کی گود میں سکون سے سوئے ہوئے حسن کو دیکھا۔

”حسن اس شہر میں کسی کی امانت ہے جہانزیب۔۔۔! آنکھوں میں آنی نمی کو روکنے کے لیے اس نے تیزی سے رخ بدلا تھا۔ وہ نا سمجھی سے اسے تنگنے لگا۔

”مجھے لے چلو گے وہاں۔۔۔“ وہ آنسو پونچھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی آس سے پوچھ رہی تھی۔

جہانزیب نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی اس سے اس بات کی۔ ایک

ٹرانس کی سی کیفیت میں وہ وہاں تک آیا تھا اسے لے کر۔ یہ جگہ یہ دنیا کتنے عرصے بعد دیکھی تھی اس نے جہاں اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت اور سب سے تلخ دور گزرا تھا۔ جہانزیب کے چہرے پر اب بھی بے یقینی کی سی کیفیت رقم تھی۔

”شفقت! تم کیا کرو گی۔“ مطلوبہ جگہ آچکی تھی اور جہانزیب اس کا ارادہ بھی بھانپ چکا تھا۔

”امانت لوٹا دوں گی۔“ شفقت نے سابقہ سکون سے جواب دیا۔

”حسن ہمارا بیٹا ہے شفقت۔! اس نے کمزور سے لہجے میں اسے اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہا۔

”اب نہیں ہو گا۔“ وہ دکھ بھری سرگوشی میں بولی تھی۔

وہ کیسے بھول سکتا تھا یہ چند ماہ و سال وہ ننھا فرشتہ جیسے اس کی زندگی میں شامل ہو گیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے اس کی گود میں ہی تو آنکھیں کھولی تھیں۔ اور شفقت وہ اتنی کھشور کیسے ہو سکتی ہے ماں ہو کر وہ بے بسی سے اسٹیرنگ پر ہاتھ مار کے رہ گیا۔

کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جن کے انجام کی چھین ساری زندگی امتحان کی صورت سامنے کھڑی رہتی ہے۔ وہ آخری دن تھا اس کے سکون کا جب اس نے شفقت کو ہر دکھ سننے کو آزاد کر دیا تھا۔ اس بے گناہ کی آہ آج تک اس کا دامن چھلتی کر رہی تھی۔ ہر دن اس کی یاد سے شروع ہو کر رات اس کی سوچ پہ ختم ہو جاتی تھی۔ وہ آج تک اس کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوئی تھی۔ ایک دفعہ اس نے محبت کی تھی اور آج تک اس کی اقساط نہیں بھر پایا تھا۔

”کاش وہ وقت واپس آجاتا۔ میں نے اپنے دل کو کیوں اجاڑ دیا۔“ خلیل نے آسمان کی وسعتوں میں نجانے کیا کھوجتے ہوئے سوچا۔ عقل کے سمجھانے پہ واقعی ایک چالی لگے روٹ کی مانند سمجھ چکا تھا۔

”مجھے منظور ہے۔“ ان کے درمیان کچھ پل کی

خاموشی در آئی تھی۔ پھر کچھ توقف کے بعد خلیل نے سناٹے کو توڑا تھا۔

”کیا۔۔۔؟“

”یہی کہ میں۔۔۔ شفق کو طلاق دے دوں گا!“ اس کا دل کر لایا تھا اس معصوم کی بربادی پر لیکن اس نے ڈپٹ کر چپ کر دیا اور پین لے کر اس کی موت کے پروانے بردستخط کر ڈالے۔

”مجھے معاف کر دینا شفق۔“ اس نے تصور جان سے دل ہی دل میں معافی مانگی اور سرعت سے کمرے سے نکل گیا۔

اسے بے وفا ہونا منظور تھا۔ بھوکا رہنا نہیں۔ کتنے گھائے کا سودا کیا تھا۔ وہ جان کر بھی انجان ہو گیا تھا کہ کسی کے لیے عذاب کا سامان کر کے کیسی خود غرضی سے وہ آرام و زندگی کا انتخاب کر بیٹھا تھا۔

”ٹھک ٹھک“ اس کی سوچوں کی رودستک کی آواز پہ ٹوٹی تھی۔ یہ وہی پرانا بوسیدہ سا دروازہ تھا جس کی سائیڈ دیوار پہ ہر سال نئی گھنٹی لگتی تھی لیکن وہ ایک مہینے کے اندر بد تمیز بچوں کے مارے گئے کبجوں کے نشانوں سے ٹوٹ کر بے کار ہو جاتی تھی۔ لہذا اب وہ گھنٹی سے بے نیاز گھر تھا۔ خلیل نے گہری سانس کھینچی اور نیچے اتر آیا۔ اقرام کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ غم تو اسے بھی اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ دستک کی آواز پہ وہ دوبارہ دروازے کی سمت مڑا۔

سامنے موجود ہستی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ یوں ایک دم مجسم آکھڑی ہوگی۔ اس کی یادوں میں طاقت بھی یا محبت میں۔ اسے دیکھ کر کیا کچھ نہیں یاد آگیا تھا۔ اپنا گناہ زیادتی، حالیہ آزمائش اور بس عرق ندامت۔ نہایت پشیمانی سے سر جھکا لیا۔ وہ بھول گیا تھا شاید کہ کسی کی زندگی برباد کرنے جیسے گناہ کا مرتکب ٹھہرا تھا۔

”اندر نہیں بلاؤ گے۔ یا بالکل ہی بھول گئے؟“ طنز میں ڈوبا نثر سیدھا اس کے دل میں پوچھتا ہو گیا۔ اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر اپنی ماضی کی

محبت کو دیکھا۔

وہ آج پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی آنکھوں میں اجنبیت کا ایسا پردہ حائل تھا کہ وہ سانس بھر کے رہ گیا اس نے گود میں ڈھائی سال کا بچہ لیا ہوا تھا۔ وہ سو رہا تھا اسے راستہ دے کر پھر دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے کیا کچھ نہیں سوچ لیا تھا۔

”اور یہ بچہ۔“ ایک سوچ آتے ہی وہ تڑپ کر اس کی طرف مڑا لیکن وہ اب اندرونی طرف مڑ گئی تھی۔ لاؤنج میں آکر وہ رک گئی۔ خلیل نے نظریں چرا کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اس نے راحیلہ بیگم کو کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شفق کو بیٹھنے کی دعوت دیتا، وہ تیزی سے اس کی طرف آئی تھیں۔

”تم۔۔۔؟“ ان کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ بے ساختہ وہ ان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔

”جی میں۔ شفق جہانزیب۔۔۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ”ویسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی بھول جائیں گے آپ لوگ مجھے۔ خیر مجھے بھی آپ لوگوں کو یاد رکھنے کا کوئی شوق نہیں! بس کچھ ادھار رہتے تھے آپ کے میری طرف، وہی چکانے ہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی تھی ”اور تم۔“

وہ خلیل کی طرف مڑی۔

”تمہیں میں کیا کہوں۔ اللہ نے تمہیں دنیا میں ہی دکھا دیا ہے کہ کرنی کیا ہوتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ تم کبھی پچھتائے ہو گے اپنے کیے پہ۔ لیکن دیکھو، سخت سے سخت اذیت میں بھی میں نے تمہیں کبھی بدعا نہیں دی خلیل۔“

اتنے عرصے میں اس نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا۔ خلیل نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ اس کی آنکھیں یکدم ہی جلنے لگی تھیں۔

”تم نے تو کبھی یہ بھی نہیں بتایا کہ میرا کیا قصور تھا؟ لیکن اب ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ معاف تو میں تمہیں مرتے دم تک نہیں کروں گی لیکن جانے کیوں میں تمہیں اذیت میں بھی نہیں دیکھ سکتی

اس کا لہجہ دھیمہ پڑا۔ خلیل نے اس کے لہجے کی نمی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کا اپنا دل کتنا رو رہا تھا، وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ راحیلہ بیگم نے خاموشی سے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔

”تو اب کیا لینے آئی ہو یہاں۔۔۔؟“

”امی پلیز۔۔۔! جائیں آپ یہاں سے۔۔۔“ اس کا ضبط یکدم ہی چھلکا تھا وہ غصے سے واک آؤٹ کر گئیں۔

”شفق!“ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔

”تمہاری امانت لوٹانے آئی ہوں خلیل۔۔۔!“ اس نے ماتا بھری نگاہوں سے حسن کو دیکھا۔ وہ ننھی جان بے خبر سو رہی تھی۔ اقرام معلوم نہیں کب دروازے پہ آکھڑی ہوئی تھی۔ شفق آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس آئی اور حسن کو اس کی گود میں دے دیا۔ وہ حیران اور پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی شفق اور کبھی حسن کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ خلیل اور میرا بیٹا ہے۔ لیکن آج سے تمہارا اور خلیل کا۔“ وہ بھیگی آواز میں بولی ”اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ خدا کرے تم خوش رہو۔ حالانکہ تمہارا حوالہ میرے لیے کبھی خوشی کا باعث نہیں رہا۔ تمہاری یاد اذیت ہے میرے لیے۔“

”شفق! مجھے معاف کر دو۔“ اس کے قدموں میں گرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ ”میں نے، میں نے بہت برا کیا تمہارے ساتھ۔ دیکھو خدا نے مجھے بھی خوش نہیں ہونے دیا۔ میں نے تمہیں برباد کیا تھا، دکھ دیا تھا تمہیں۔ پلیز شفق پلیز مجھے معاف کر دو، خدا کے لیے وہ اس کے قدموں میں جھکا معافی طلب کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے قدموں کو چھو رہے تھے وہ اتنی مضبوط نہیں تھی کہ اپنے کپے پہ قائم رہتی۔ جب وہ پھر دل ہو کر حسن کو اس کے حوالے کر سکتی تھی تو موم کی مانند پکھل کر اسے معاف بھی کر سکتی تھی۔

”میں نے تمہاری محبت سود سمیت لوٹا دی ہے

خلیل۔۔۔!“ اس نے بدقت تمام خود کو کمزور ہونے سے باز رکھا۔

”لیکن میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔“ وہ مسلسل رو رہا تھا شفق آہستگی سے اپنے پیر چھڑا کر پیچھے ہوئی۔

”اقرام!“ اس نے اقرام کو دیکھا۔ جس کا چہرہ آنسوؤں سے بھگا ہوا تھا۔ حسن کا بہت خیال رکھنا۔ میں نے اپنا جگر کا ٹکڑا تمہارے حوالے کیا ہے۔ پلیز اسے ماں بن کر پالنا۔“ وہ چپ ہو گئی اقرام جانتی تھی کہ اب وہ رو رہی تھی۔ لرزے تہا تھوں سے اس کا ہاتھ تھا۔

”میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ شفق! مجھے تو اپنی ذات کے ادھورے پن کا ماتم کرنے سے فرصت ہی نہیں ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم

قیمت 250 روپے مریم عزیز

ٹنگے پاؤں

قیمت 250 روپے نگہت سیما

منگھانے کا بندہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

تمہارے حوالے سے کیا غم مناؤں ہم تو فرشتہ ہو
میرے لیے۔۔۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے۔۔۔ اتنا
آسان تو نہیں ہے اپنا بچہ کسی کے حوالے کرنا۔۔۔“
شفق نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔۔۔ خدا حافظ کہا اور
دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

باہر نکلتے ہوئے اس نے مڑ کے نہیں دیکھا تھا۔۔۔
مدا وہ پتھر کی نہ ہو جائے۔ اس کے دل میں کسی کے
لیے بھی کوئی شکوہ نہ تھا۔۔۔ لیکن خلیل کی ندامت،
پشیمانی، اس کا شفق سے گزرنا کے معافی مانگنا اس کے
قدموں کو زنجیر کر لے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے کوئی
خوش فہمی ہو۔ اس نے خلیل کو معافی نہیں دی تھی
لیکن وہ اسے دل سے معاف کر چکی تھی۔۔۔ نہ وہ اس
کی طرح بزدل تھی اور نہ ہی اسے دوبارہ یاد کرنا چاہتی
تھی۔

شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے گاڑی کی طرف آتے
۔۔۔ اس نے اپنی پچھلی تمام زندگی کو ان ہی جگہوں پہ
دفن کر دیا تھا۔۔۔ جہانزیب سیٹ کی پشت سے سر
نکائے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔
”تم نے اچھا نہیں کیا شفق۔۔۔!“ وہ چونک کر اس
کی طرف پلٹی۔

”ہم حسن کو پا ل سکتے تھے۔۔۔ وہ ہم پہ بوجھ تو نہیں
تھا۔“ وہ بو جھل کبجے میں بولا۔

”بات پالنے کی نہیں ہے۔ اس کی شناخت کی ہے
۔۔۔ آپ کتنا ہی اس کے سکے بن جائیں لیکن وہ بیٹا اسی
شخص کا رہے گا۔“ وہ دانستہ اس کے نام سے کترائی۔
”اور کسی کی محرومی کو ختم کر کے میں نے کوئی غلط
کام تو نہیں کیا؟“ جہانزیب چونک کر سیدھا ہوا۔۔۔ ان
چند جملوں میں اس نے کیا باور کروانا چاہا تھا وہ جان گیا تھا۔

”اور وپے بھی جہانزیب! اب میں آپ کو مزید
امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ اس لیے پوری ایمان
داری سے باقی کی زندگی آپ کے ساتھ بتانا چاہوں گی۔“

جہانزیب نے ایک پل اسے دیکھا اور بھرپور انداز
میں مسکرا دیا۔۔۔ اسے شفق کے خلوص پہ ذرا بھی
شک نہیں تھا بس وہ تھوڑی سی بیوقوف تھی۔ اس نے
گہری نظروں سے اس کو دیکھا اور اپنا گرم بھاری ہاتھ
اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ شفق کی پلکیں بارحیا سے جھک
گئیں اس نے جھینپ کر رخ موڑ لیا۔۔۔ جہانزیب نے
مطمئن ہو کر گاڑی اشارت کر دی اور شفق نے گہری
سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر نکا دیا گاڑی میں
ریڈیو آن ہو گیا تھا اور ان دونوں کی تنہائی تقریباً ”سمٹ
گئی تھی۔“

”اب میں اپنے اللہ سے سکون ہی مانگوں گی، بے
شک اللہ کہتا ہے کہ میں تمہارے بیچ کے دنوں کو ایسے
نکال دوں گا کہ جیسے وہ کبھی آئے ہی نہ ہوں۔“
”کبھی سوئی صبح میں گھومنا، کبھی اجڑی شام کو دیکھنا
کبھی بھیگی آنکھوں سے جاگنا
کبھی بیتے لمحوں کو سوچنا
مگر ایک پل ہے امید کا
بے مجھے خدا کا جو آسرا
نہیں میں نے دی ہیں وہائیاں۔“

راحت کی آواز چار سو جاو جگا رہی تھی۔۔۔
جہانزیب نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ آنکھیں بند کیں۔
دھیمی سی مسکان اس کے ہونٹوں پہ موجود تھی۔ اس
نے مسکراتے ہوئے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔





دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا گلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے، جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی ”جنت“ کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کا دن رات نوکری کی چکی میں تپے گزر رہا ہے۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا۔ ہر دم ”اس“ کی یاد اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت لی بی ان کی حراست میں ہے، جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیرو فریڈ کی مریض ہے۔ جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمنہ 14 سال بعد اپنی بیٹی مادی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بنائے گئے بنگلے کو تلاش کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور مجتبیٰ خاتون ہیں۔ ولی چولید اور ایما ان کے بچے ہیں۔ مادی کی پہلی ملاقات میں ایما سے دوستی



ہو جاتی ہے۔
شبیبہ العباس طبعاً سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزر آتا ہے۔ وہ چھپی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیبہ تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیبہ تنوی کا منگیتر ہے وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہے۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

دین محمد بی ہمن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی۔

ثروت دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر سکے چلی جاتی ہیں۔ انبیا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق بٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیبہ العباس ماوی کے رشتہ داری اور یہ کہ ماوی کے باپ رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیبہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسپڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھبراہٹ میں دیکھتی ہے کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیبہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں ہے۔ جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔

انبیادیل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے بھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار بار پڑے اس لیے ثمینہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، ہمن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حلقہ رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پر ہمن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو ہمن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں روز کر اسے اس فیصلے سے باز رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو جاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پھنسنے والی منفی شخصیت تندرست ہو رہی ہے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتی۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی فیاض سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی

مغذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایبیبی حرکت میں آجائے گی۔ ثمینہ نے ماوی سے کہا کہ وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جاسکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہرہ سے شادی کر سکے۔ شہرہ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔

ماوی بالآخر ثمینہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور ثمینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیبہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہو گیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کر دی۔ انہوں نے ماوی کے سامنے شبیبہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے ثمینہ کی انیکسی پیچھے۔ انبیا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ مگر ثمینہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔

ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پر سرایت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ تنسیم سے دوستی کر لی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے منتظر تھی جب ہی ایک صبح اسے شبیبہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔

جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماوی کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماوی کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھٹی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنائی میں ماوی سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔ جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حرم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔

فیضان ماوی کی پراسرار گمشدگی سے پریشان ہیں۔ ثمینہ ان سے کہتی ہیں کہ ماوی پاکستان میں ہی ہے لیکن انبیا انہیں بتاتی ہے کہ ثمینہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔

رات کے وقت جلال ماوی سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیبہ نے اسے وہاں سے نکلنے کو دیکھ لیا۔

شبیبہ نے جلال سے باز پرس کی تو جلال نے اسے بتا دیا کہ وہ ماوی سے نکاح کر چکا ہے۔ جب وہ شبیبہ کو یہ بات بتا رہا تھا تو تنوی نے سب کچھ سن لیا۔ اس نے حرم اور نمل کو بھی بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ فیضان کو پتا چل گیا کہ ماوی حویلی میں ہے۔ فیضان، ثمینہ پر بے حد ناراض ہوئے۔

ماوی نے حویلی کی ملازمہ تنسیم کو آمادہ کر لیا کہ وہ اسے حویلی کے تمام رازوں سے آگاہ کرے گی۔ حرم کی مہندی کی تقریب ہو رہی تھی۔ سب لوگ اس میں مصروف تھے جب تنسیم نے ماوی کو ملنے کا اشارہ کیا۔ ماوی حویلی کے عقبی حصے میں گئی تو وہاں اسے تنسیم کے بجائے ایک لاغر سا ڈھانچہ نما شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

وہ تنسیم کا باپ ہوتا ہے۔ تنسیم بتاتی ہے کہ جنت بی بی نے کئی سالوں سے اسے اس کال کو ٹھری میں بند کر رکھا ہے۔

برابر والے گاؤں کے چوہدری فیاض نے جنت بی بی کی زمینوں کا پانی بند کر دیا۔ یہ قضیہ نمٹانے کے لیے جنت بی بی رجب علی اور رب نواز کو بھیجتی ہے۔ وہاں طیش میں آکر رب نواز پستول نکال لیتا ہے۔ رجب علی منع کرتا ہے اور اس سے پستول چھینتا ہے۔ اس چھینا چھنی میں گولی چل جاتی ہے اور چوہدری فیاض کا آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ رب نواز

یہ الزام رجب علی لگاتا ہے مگر ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنت بی بی کے سامنے جرم کر لیتا ہے۔ جنت بی بی اسے زبان بند رکھنے کا حکم دیتی ہے اور دونوں کو بچا لیتی ہے تاہم رجب کے سر پر احسان ڈال دیتی ہے۔

ایسا دانیال حسن سے ماں کو واپس لانے کو کہتی ہے۔ وہ سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ثروت بھی مصالحت سے کام لیتی ہے۔

تسلیم کے باپ نے ماوی کو رجب علی کا خط دیا۔ ماوی نے اپنے کمرے میں جا کر ابھی خط کھولا ہی تھا کہ جنت بیگم اور دیگر لوگ ادھر آ گئے۔ ماوی نے سب کے سامنے جنت بیگم کو اپنے باپ کا قاتل کہا اور ثبوت کے طور پر وہ خط پیش کیا۔ تاہم اس خط میں رجب علی نے لکھا تھا کہ میں خود کشی کر رہا ہوں۔ جنت بیگم نے کہا کہ میں اسے یہ الزام لگانے پر سزا دوں گی۔ دانیال حسن نے ولید اور انبیاء کی گتہ گتہ سنی تو انہیں پتا چل گیا کہ ولید نے فیضان اور انبیاء کے تعلق کے بارے میں دانیال حسن سے جھوٹ بولا تھا کیونکہ انبیاء نے بھی ان سے ولید کی شکایت لگائی تھی۔

دانیال حسن نے اشتعال میں ولید کو مارا تو وہ گھر چھوڑ کے چلا گیا۔

شبیبہ ایک کام کے سلسلے میں شہر آیا ہوا تھا۔ اس نے ولید کو تین مشکوک لڑکوں کے ساتھ دیکھا۔ اس نے رات کا پیچھا کیا تو دیکھا کہ وہ لڑکے ولید کو زخمی حالت میں ایک سنان جگہ پر ڈال گئے تھے۔ وہ اسے اسپتال لے گیا۔

فیضان نے دانیال حسن سے ملے بغیر انیکسی چھوڑ دی اور ایک اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئے۔ وہاں جانے کے بعد انہیں پتا چلا کہ ولید اسپتال میں ہے۔

ماوی حویلی چھوڑنے سے پہلے تسلیم اور اس کے باپ سے ملنے گئی تو باہر سے کسی نے دروازہ بند کر دیا۔

۲۹ رُتیسویں قسط

”فیضان کا پروپوزل میرے لیے۔۔۔“ انبیاء دم بخود ثروت کو دیکھ رہی تھی۔ ولید گھر آچکا تھا۔ حالات بظاہر ٹھیک معلوم ہونے لگے، لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا ان کے ماں باپ کس بج پر سوچ رہے ہیں۔ ایسے میں اچانک فیضان کا پروپوزل آجانا بہر حال ایک تعجب آمیز بات تھی۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ جانتی تھی فیضان کے اس کے متعلق کیا خیالات ہیں۔

”اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔“ ثروت نے مسکرا کر پیار سے اسے دیکھا تھا۔ ”میں تو بلکہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی ہوں۔ فیضان اچھا لڑکا ہے۔“

انبیاء خاموش رہی اسے ان گنت خیالوں نے گھیر رکھا تھا۔ ان خیالات میں ایک انجانی سی خوشی بھی تھی جو ہر دوسرے خیال پر بھاری تھی۔ اس خوشی کو ثروت کے اگلے چند جملوں نے غارت کیا تھا۔

”میں تو فیضان کے پروپوزل پر بہت خوش ہوں۔ ایک تو یہ کہ ولید نے اپنی نا سبھی میں جو حماقت کی بات کی تھی اس پر لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع ملنے سے پہلے ہی ان کی زبان بند کرنے کا طریقہ مل گیا۔ دوسرے جنتی جلدی تمہارے فرض سے فارغ ہو جاؤں اتنا اچھا۔ ولید اور بی بی کی مجھے اتنی فکر نہیں ہے۔ لڑکے ماؤں کے بغیر سنبھل جاتے ہیں۔ مسائل لڑکیوں کے لیے ہوتے ہیں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھیں۔

انبیاء کے دل پر بوجھ سا آن رکا۔ ثروت کا مافی الضمیر سمجھنا اس کے لیے مشکل ہرگز نہ تھا۔

”میں سمجھ رہی ہوں، مہی!۔۔۔ سب سمجھ رہی ہوں۔ میرا خیال تھا آپ کے خیالات بدل گئے ہوں گے۔۔۔“

لیکن ڈیڈی نے تو کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ ”اس کا لہجہ تاسف سے بھرپور تھا۔“

”مرد گنجائش چھوڑتے بھی نہیں ہیں انبیاء! ثروت نے سامنے دیکھتے ہوئے سادہ سے لہجے میں کہا تھا۔“

”کیا ڈیڈی نے آپ سے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں۔۔۔ (وہ کچھ کہتے کب ہیں صرف نشتر چھوڑتے ہیں)“

”پھر آپ ان سے۔۔۔“

”نہیں انبیاء!۔۔۔ میں اب دانیال کے سامنے خود کو مزید ڈی گریڈ نہیں کروں گی۔“ ثروت نے سرعت سے کہا تھا۔ ”اس رشتے کو نبھانے کی جتنی کوشش کر سکتی تھی میں نے کی۔ اب ہمت نہیں ہے مجھ میں بیٹے!“

ان کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی اور چہرہ برداشت سے سرخ ہو رہا تھا۔ انبیاء نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ اسے اپنی ماں پر ترس گیا تھا۔



”تم پنا گل تو نہیں ہو ماوی! تم کس طرح اس حویلی سے نکل آئیں؟“ شمیمہ کو تو سنتے ہی پتنگے لگ گئے۔

”اس بات کا کیا مطلب ہے مہی؟“ ماوی نے انہیں سے پوچھا۔ ”آپ کیا چاہتی ہیں جنت بیگم دھکے مار کر مجھے حویلی سے نکالتی تب مجھے آنا چاہیے تھا؟“

”تم کو وہیں رہنا تھا ماوی! ہر حال میں۔۔۔ کم سے کم تب تک۔۔۔ جب تک تم ثبوت حاصل نہ کر لیتیں۔“ ماوی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”ثبوت ثبوت ثبوت۔۔۔ آخر آپ کب سمجھیں گی کہ ثبوت نام کی کوئی چیز سرے سے وہاں ہے ہی نہیں۔“

بابا نے خود کشی کی تھی۔ آپ اس حقیقت کو مان کیوں نہیں لیتیں؟“ وہ جیسے پھٹ ہی پڑی تھی۔

جلال جو نیم وادروازے پر دستک دینے کے ہاتھ اٹھا رہا تھا رک گیا۔ اس کی جیب میں رکھا موبائل ارتعاش کرنے لگا تھا۔ شبیبہ نے اسے رکتے دیکھ کر اشارے سے وجہ پوچھی تھی۔ جلال اسے رکنے کا اشارہ کر کے موبائل دیکھنے لگا۔ اس دوران کمرے سے ماوی کی جھنجھلائی ہوئی آواز مسلسل آرہی تھی۔

”یہ جھوٹ ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔“

”آپ کے نہ ماننے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔ اپنی بے جا ضد کے ہاتھوں آپ نے مجھے کہاں کہاں خوار کروا دیا ہے مہی! جنت بیگم نے صرف مجھے دھکے دے کر نکال دیا ہوتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا کہ کسی پر بھی انگلی اٹھائی جائے تو اس سے یہی توقع کی جا سکتی ہے۔ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ میرے ساتھ ساتھ جلال اور شبیبہ کو بھی حویلی سے نکلنا پڑا۔“

”کیا جلال بھی؟“ شمیمہ کے لیے یہ بات مزید صدمے کا باعث بنی۔

”تو آپ کا کیا خیال ہے یہ پتا چلنے کے بعد کہ جلال مجھ سے نکاح کر چکا ہے وہ بھی جنت بیگم کی مرضی کے بغیر۔ تو جنت بیگم اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی۔ میں تو اب تک یہ ہی نہیں سمجھ پارہی کہ آپ نے جھوٹ بول کر میرا نکاح جلال سے کروایا ہی کیوں تھا۔۔۔ آخر ایسی کون سی منطق تھی جواب تک میں سمجھ نہیں پارہی۔“

”حویلی میں جنت بیگم تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی تو جلال تمہیں بچا سکتا تھا۔ میرا خیال تھا ایک نہ ایک وقت ضرور آئے گا جب وہ عورت تمہیں حویلی سے نکالنے کی کوشش کرے گی ایسے میں صرف جلال ہو گا جو تمہیں بچا سکے گا۔“

”واہ۔۔۔ کیا کمال کی پلاننگ تھی آپ کی۔“ ماوی نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”ہاں! میں نہیں جانتی تھی کہ وہ بے وقوف لڑکا اتنا ناکارہ ثابت ہوگا۔“

”آئی ایم سوری نو سے می! لیکن آپ کو جلال کے لیے اتنے فضول الفاظ استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، جسے آپ ناکارہ کہہ رہی ہیں بے وقوف کہہ رہی ہیں! اسی سے جھوٹ بول کر آپ نے مجھے بھی اسے دھوکا دینے پر مجبور کیا۔ آپ جانتی تھیں میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ لیکن آپ نے اس سے جھوٹ بولا کہ میں اس کے عشق میں پاگل ہوں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جلال جیسا شخص کبھی میرے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ آپ نے اسے مجھے حویلی تک پہنچنے کا مہو بنایا جسکے۔“

”معا“ اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر پلٹی اور ٹھٹھک گئی۔ دروازے کے قریب جلال کھڑا تھا اور دکھ اور بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں شبیہ تھا اور وہ خوں خوار نظروں سے ماوی کو گھور رہا تھا۔

”جلال!۔۔۔“ ماوی کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔ جلال تیزی سے پلٹ گیا۔

”تم عورتیں۔۔۔“ شبیہ نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا تھا۔ ماوی کو اس کی پروا نہیں تھی جس کی پروا تھی وہ جاچکا تھا اور ماوی کے پاس صرف کچھ تارے رہ گئے تھے فون پر شینہ کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

”انیبا! تم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا؟“ ثروت نے اس سے اگلے ہی دن پوچھا تھا۔

”کس بارے میں می؟“ انیبا سمجھ تو گئی تھی، لیکن اس نے بن کر پوچھا۔

”فیضان کے پروپوزل کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“

”اوہ اچھا۔۔۔ آپ انہیں انکار کر دیں گی! میں فیضان سے شادی نہیں کروں گی۔“ اس نے جتنے آرام سے جواب دیا تھا، ثروت کے لیے اس کا جواب اتنا ہی غیر متوقع تھا۔

”کیا کہہ رہی ہو انیبا! تم نے اچھی طرح سے سوچا بھی ہے؟“

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا ہے می! آپ ڈیڈی کو بھی بتادیں، میرا بھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں مزید پڑھنا چاہتی ہوں اور اگلے پانچ چھ سال تک آپ لوگ میری شادی کے متعلق سوچے گا بھی نہیں۔ ہاں! آپ ڈیڈی سے علیحدگی چاہتی ہیں تو اس فیصلے میں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ صرف میں ہی نہیں ولید اور ولی بھی آپ کا ساتھ دیں گے۔ ویسے بھی اس روز اسپتال میں ڈیڈی آپ کو چھوڑنے کا فیصلہ آدھا اور ابھی سہی، لیکن سنا چکے ہیں۔ آپ نے ہماری خاطر بہت ٹف ٹائم گزارا ہے۔ اب آپ کا وقت ہے۔ اپنی زندگی گزار لیں۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ آپ کو خود کو مزید ڈی گریڈ نہیں کروانا چاہیے۔“

اس نے اطمینان سے کہا اور بیڑھیاں چڑھ گئی۔ رک کر یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی کہ ثروت کے تاثرات کیا ہیں۔

رات کی تاریکی میں وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ مایوس، ناامید۔ اس جواری کی طرح جو نہ صرف زندگی کی بازی ہار گیا ہو، بلکہ اس کی زندگی کا کل اثاثہ بھی چھین لیا گیا ہو۔

اس نے وہاں سے دھوکا کھایا تھا، جہاں سے ہرگز امید نہ تھی۔ اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا لیکن اب کیا کرتا۔

تھک ہار کر فٹ پاتھ پر گر گیا۔ اس کے دماغ میں جیسے طوفان سا مچا ہوا تھا۔ دکھ یہ نہیں تھا کہ محبت نہیں ملی دکھ یہ تھا کہ اسے اتنا رزاں سمجھا گیا کہ اس کے جذبات سے کھیلے ہوئے بھی ایک لمحہ نہ سوچا۔ کیا وہ اتنا بے کار تھا کہ اس سے محبت نہ کی جائے؟ اسے صرف استعمال کیا جائے؟

وہ فائر العقل نہیں تھا، بے وقوف بھی نہیں تھا۔ صرف سادہ دل تھا سادہ مزاج تھا اور یہی سادگی اس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ ایک وحشی جانور بن کر اس کی ہر خوشی کو نگل گئی تھی۔ سڑک پر ایک گاڑی زن سے گزری۔ اس کا ملبوس پھر پھڑانے لگا۔

ماوی کی محبت نے اس کی پُر سکون زندگی میں بھی ایسے ہی ہلچل مچا دی تھی۔ اسے وہ نئی نئی خوشی اچھی لگتی تھی۔ اپنا آپ معتبر لگنے لگا تھا، لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی ہی ختم ہو گئی ہو۔

ذلت کے احساس سے آنکھوں میں مرچیں سی چبنے لگی تھیں۔ ”معا“ اس کا سارا وجود کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں نہا گیا۔ آنکھیں بری طرح چندھیا گئیں۔ اس نے سرعت سے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ رگ جاں کو کاٹی اور آنکھوں میں تیرتی نمی آستین میں جذب ہوئی۔

گاڑی کے ٹائر اس سے کچھ فاصلے پر چرچرائے تھے۔

”جلال۔۔۔“ اس نے شبیہ کی پریشانی میں ڈوبی آواز سنی تھی۔ پھر بوکھلائے ہوئے قدم اس کی طرف بڑھتے چلے آئے۔

”میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کچھ احساس بھی ہے میں کتنا پریشان ہو گیا تھا۔“

وہ اس کا بھائی تھا۔ اس کے لیے فکر مند تھا۔ جلال خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، لیکن ایسی ویرانی تھی جیسے وہ بہت دیر تک روتا رہا ہو۔

”جلال! کچھ بولو پلیز۔“ شبیہ نے اس کی حالت کے پیش نظر گھبرا کر کہا۔

”کیا بولوں۔۔۔؟ کچھ نہیں ہے بولنے کو۔“ جلال نے آستین سے کہا۔

”تو کیا اس گھٹیا لڑکی کے لیے۔۔۔“ شبیہ نے غصے سے کہنا چاہا لیکن جلال نے تیزی سے اسے ٹوک دیا۔

”ماوی کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال مت کرو۔“

”میرا دل چاہ رہا ہے میں اس سے بھی زیادہ برے لفظ استعمال کروں۔“

”نہیں! ہرگز نہیں۔۔۔“ جلال کے کنبے میں تڑپ تھی۔ شبیہ کا دل چاہا اکیسویں صدی کے اس مجنوں کو ایک زوردار پھپر رسید کرے۔

”اچھا! اٹھو گھر چلتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر جلال کو اٹھانا چاہا، لیکن جلال ٹس سے مس نہ ہوا۔

”تم جاؤ شبیہ! میں اچھی بیس بیٹھنا چاہتا ہوں۔“

”یا گل مت بنو جلال! آخر کب تک اس لڑکی کے لیے اس طرح سڑکوں پر پھوگے؟ محبت تو وہ تم سے پھر بھی نہیں کرے گی۔“ شبیہ نے ڈیڑھ کر کہا تھا۔

”نہ کرے۔ محبت چاہیے بھی نہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس نے میری ذات سے اعتماد بھی چھین لیا۔“

اس کا لہجہ اس کے غم کا نماز تھا۔

”پھر بھی تم اس کے لیے یہاں بیٹھے ٹوے بہا رہے ہو؟ تف ہے تم پر۔“ شبیہ کو زیادہ دیر کسی کا دکھ باشتا نہیں آتا تھا۔

”ہاں! تف ہے مجھ پر۔“ جلال نے سادگی سے کہا اور حتمی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو! گھر چلتے ہیں۔“ وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شبیہ نے دیکھا دھوکا کھانے کے بعد وہ غم سے بڑھال تھا۔

اس کے طیش میں اضافہ ہوا تھا۔
 ”عورت ہوتی ہی ناقابل بھروسہ ہے۔ چاہے وہ بی جان ہو، میری ماں ہو، ماوی ہو یا تنوی ہو۔“ وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔



”تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیوں کیا؟“
 فیضان نے اسے راستے میں جالیا تھا۔ انیبا جتنا بھی حیران ہوتی، کم تھا۔ یہ فیضان کی شخصیت کا کون سا رنگ تھا، وہ قطعی ناواقف تھی۔

”تھی کوئی وجہ۔ اور وہ وجہ میں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“
 فیضان اس جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ ذرا سا حیران ہوئے۔
 ”تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ میری فیلنگز کے ساتھ کھیلو۔“

”فیلنگز۔۔۔ کون سی فیلنگز؟“ وہ چڑ کر بولی۔ ”وہ فیلنگز جن کا اظہار کر کے میں نے آپ سے تھپڑ کھایا تھا۔؟ یا وہ فیلنگز جن کا احساس دلانے پر آپ نے ماوی سے جھگڑا کیا تھا۔ جب تک میں آپ کے پیچھے بھاگتی رہی۔ آپ کو میری ذرا پروا نہیں تھی اور اب آپ کو اچانک میرا خیال آگیا۔“ وہ آج بغیر کسی لحاظ کے اگلے پچھلے حساب برابر کرنے پر تلی جیٹھی تھی۔

”غلط بات۔۔۔ مجھے پہلے بھی تمہارا خیال تھا۔ اسی لیے کبھی تمہاری حوصلہ افزائی نہیں کر سکا۔ مرد کے لیے کبھی مشکل نہیں ہوتا کہ وہ عورت کے جذبات سے کھیلے۔“

”بہت شکریہ آپ کا“ آپ نے نہیں کھیلایا، لیکن جو کیا، وہ بھی بہت برا تھا۔“
 ”تو اب تم اس بات کا بدلہ لوگی؟“ فیضان نے ہنس کر پوچھا۔ انہیں اس کا رویہ بچپنا لگ رہا تھا۔
 انیبا نے کسی قدر خفگی سے انہیں دیکھا اور ناراضی سے بولی۔

”آپ جو بھی سمجھیں۔“

”سمجھنا مجھے نہیں، آپ کو ہے۔“ فیضان کے لہجے میں ایسا کچھ خاص تھا کہ انیبا کا دل تیزی سے دھڑکا۔
 ”میں اپنے ہر رویے کے لیے شرمندہ ہوں انیبا! تم سے نہیں میں دراصل اپنے دل سے بھاگ رہا تھا۔ اس دل کی خوشی سے بھاگ رہا تھا۔ تم مجھے کب اچھی لگیں۔ یہ تو پتا نہیں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک بار اچھی لگنے کے بعد تم مجھے بری نہیں لگیں۔ مجھے ڈر تھا ایک بار تمہاری حوصلہ افزائی کر دی تو کہیں تم راستے سے بھٹک نہ جاؤ۔ زریں میری پہلی پسند ضرور تھی، محبت نہیں، لیکن اسے پسند کر کے بھی میں نے الزام سہا تھا۔ ڈر تھا تم سے محبت کا اعتراف تم کو کسی مشکل میں نہ ڈال دے۔ جنہوں نے ساری زندگی کسی الزام کے بوجھ تلے گھٹ گھٹ کر سانس لیتے گزار دی ہو، وہ غیر ضروری حد تک پھونک کر قدم رکھنا سیکھ لیتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں جیسے میں اٹھانے والا تھا۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں ایک اچھی زندگی گزاریں؟“
 انہوں نے لاشعوری طور پر انیبا کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹا آواز زور سے تھی۔

وہ حق دہی رہ گئے۔

”کیا ہو گیا، بھئی۔ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کر دی۔ میں تو تمہیں۔۔۔“

”آپ نے غلط بات نہیں کی۔ لیکن اتنا وقت کیوں لگایا؟“ اس نے روتے ہوئے چڑ کر کہا۔ فیضان ایک لمبے کو ٹھٹکے، پھر ہنس دیے۔

”اچھا! غلطی ہو گئی۔ اس بار معاف کر دو۔ اگلی بار کے لیے وعدہ ہے، صحیح بات، ہمیشہ صحیح وقت پر کروں گا اور میرا خیال ہے تم سے یہ کہنے کا اس سے مناسب وقت اور کوئی نہ ہو گا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“
 انیبا کے چہرے پر دھنک پھیل گئی۔ محبوب کا اظہار اسے ہوا میں اڑانے کے لیے کافی تھا۔



جنت بیگم نے تنوی کو اپنی خاص ملازمہ سلیمہ کے ساتھ قریبی شہر جانے کی اجازت دی تھی، تاکہ وہ اپنی پسند کی خریداری کر سکے۔ ایسا موقع حویلی کی لڑکیوں کو کبھی کبھار ہی نصیب ہوتا تھا، کیونکہ جنت بیگم کو لڑکیوں کا بازاروں میں گھومنا پھرنا کچھ خاص پسند نہ تھا۔ تنوی کو کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی، لیکن جنت بیگم کے اصرار پر جانے کے لیے راضی ہو گئی۔

”ممل کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں بی جان! مجھے اکیلے اتنا مزہ نہیں آئے گا۔“ اس نے کہا تو جنت بیگم نے کچھ دیر سوچا، پھر ممل کو بھی اجازت دے دی۔

”سلیمہ! دھیان رکھنا۔ میں تنوی کو صرف اس لیے گھومنے پھرنے کی اجازت دے رہی ہوں، تاکہ اس کا ذہن بٹا رہے اور وہ شبیہ کے بارے میں زیادہ نہ سوچ سکے۔ اور ہاں! ممل اور تنوی کو تنہا نہیں چھوڑنا۔“
 جنت بیگم نے بطور خاص سلیمہ کو تاکید کی تھی۔

خدا معلوم، اس کے کون سے خدشات تھے، جو اسے اس طرح کی احتیاط برتنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔
 تنوی اور ممل کو لطف آ رہا تھا۔ یوں ہی ادھر ادھر گھومتے ہوئے انہوں نے ڈھیروں باتیں کر ڈالی تھیں۔ تب ہی تنوی کو عبیر نظر آ گئی۔

اتنے دن بعد یوں اتفاقاً ملاقات ہو رہی تھی۔ تنوی کو بڑا اچھا لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اسے اسی مقصد کے لیے بی جان نے بھیجا ہو۔

عبیر نے اسے خوب دیر تک گلے لگائے رکھا۔

”تمہارے بغیر تو کالج میں مزہ ہی نہیں آتا۔ میں تمہیں بہت مس کرتی ہوں۔“

”نمرہ کیا کر رہی ہے آج کل؟“ تنوی نے کچھ خیال آنے پر پوچھا تھا۔

”وہی جو پڑھائی سے دل چرانے والی لڑکیاں عموماً کیا کرتی ہیں۔ یعنی گھرداری۔“ عبیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”توبہ ہے بھئی۔۔۔ تم تو اب تک ویسے کی ویسی ہو۔ یعنی نالا لوق۔“ عبیر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”بھئی! اس کی شادی ہو چکی ہے، سو آج کل وہ اپنی کہتی ساس کو چاروں شانے چت کرنے کے لیے نت نئے طریقے سوچتی ہے اور شوہر کے گندے پاؤں دھو کر پیتی ہے۔ بتاؤ! یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے؟“

”ارے! واقعی نمرہ کی شادی ہو گئی کیا؟ وہ خوش تو ہے؟“ تنوی نے خوشگوار ست سے پوچھا۔

”خوش کیوں نہیں ہوگی۔ ماشاء اللہ اتنی اچھی سرال ملی ہے کہ بس۔ اور شوہر تو اتنا گڈ لکنگ ہے کہ نمرہ کو ہر وقت نظر کی دعا میں پڑھ کر پھونکنے کی فکر رہتی ہے۔“

”چلو! اچھی بات ہے۔ لیکن عبیر! وہ عروش۔۔۔“

”بھئی! وہ تو یا گل بین تھا۔ اسے بھول ہی جاؤ۔“

”لیکن نمرہ تو کہتی تھی۔۔۔“

”نمرہ جو بھی کہتی تھی وہ اس کا پاگل پن تھا اور تمہارا پاگل پن یہ ہے کہ ہر ایک کی باتوں پر فوراً یقین کر لیتی ہو بھی! دماغ کے اندر بھی ایک چیز ہوتی ہے جسے عقل کہتے ہیں اسے بھی استعمال کرنا سیکھو۔ یہ نہیں کہ جس نے جو کہا اس پر بھروسہ کر کے اسی کی مرضی کرنے لگے۔ میں تمہیں اس کا ایک قصہ بتاؤں؟“ عبیر نے نمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کالج میں اس کا ہاتھ دیکھ کر ہماری ایک سینئر نے کہہ دیا کہ عنقریب تم کسی مشکل کا شکار ہونے والی ہو۔ اور تمہیں پتا ہے اس عقلمند نے فوراً اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔“ تنوی نے چونک کر عبیر کو دیکھا۔

”تو کیا ثمامہ نے غلط کہا تھا؟“

”یار! اس کی اکثر باتیں تو درست ہی ہوتی تھیں۔ یہ تو میری آزمائی ہوئی بات ہے۔“

”لیکن عبیر! تم نے اور نمرہ نے تو مجھے کہا تھا کہ تم دونوں نے ثمامہ سے مجھے تنگ کرنے کے لیے جھوٹ بلوایا تھا۔“

”اوہ! ہم نے ایسا کہا تھا؟“ عبیر نے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ کیا واقعی انہوں نے ایسا کچھ کہا تھا یا نہیں۔

”یار تنوی! تم اس وقت اتنی پریشان ہو گئی تھیں کہ ہمیں اور کچھ سوچا ہی نہیں۔“ عبیر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”اس کا مطلب ثمامہ کی باتیں درست تھیں؟“ تنوی کو فکر لاحق ہوئی۔

”یار! اب تو اس بات کو اتنا وقت گزر چکا ہے کہ تمہیں ویسے ہی بھول جانا چاہیے تھا۔ خیر! چھوڑو اس بات کو۔۔۔ یہ بتاؤ! تمہارا مسٹر اکڑو کیا ہے؟“

”اس۔۔۔؟“ اس نے نا سمجھی سے عبیر کو دیکھا۔

”شبہہ کی بات کر رہی ہوں۔“

”وہ ٹھیک ہیں۔“ اس کے بجائے کب سے خاموش کھڑی نمل نے جواب دیا تھا۔

”کچھ پروگریس بھی ہوئی یا ابھی تک وہی اٹھارہویں صدی کا ڈھکا چھپا روائس چل رہا ہے؟“

عبیر اور اس کے سوال پر تنوی کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ساتھ ہی بے اختیار مادی یاد آئی تھی۔۔۔ مادی سے مل کر اسے عبیر یاد آئی تھی اور آج مادی یاد آرہی تھی۔

”اچھا عبیر! اب ہم چلتے ہیں۔“ اچانک نمل نے تنوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا تھا۔ تنوی کو عبیر کو صحیح طریقے سے خدا حافظ کہنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ الثانیہ بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ ہو گیا تھا۔

”کیا کر رہی ہو نمل! مجھے عبیر سے بات تو کر لینے دو۔“

”سبیلوں سے باتیں کرنے کے لیے عمر بڑی ہے۔ یہ موقع نکل گیا تو دوبارہ نہیں ملے گا۔“ نمل نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے ولی آواز میں کہا تھا۔

ایک دکان کے سامنے اس نے تنوی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”تنوی! تم اسٹور لینا چاہ رہی تھی ناں۔ اس شاپ سے دیکھو۔ میں ذرا وہ سامنے والی شاپ سے کچھ گرم کپڑے دیکھ لوں۔ میرے ساتھ آؤ سلیمہ! اس دکان پر بڑا رش ہے۔“ سلیمہ کے ٹال منول کرنے کے باوجود نمل اسے زبردستی ساتھ لے گئی تھی۔ تنوی حیران کہ یہ کیا ہوا پھر کندھے اچکا کر وہ اسٹور کی طرف متوجہ ہو گئی۔

چند منٹ بعد اس نے اپنے ساتھ کسی کو آکر کھڑے ہوئے محسوس کیا تھا۔ سرسری سی گردن موڑ کر اس نے دیکھا اور دھک سی رہی۔

”کیسی ہو؟“ وہ شبہہ تھا۔

تنوی نے جلدی سے نمل اور سلیمہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں ڈرائیور تو خیر ان کے ساتھ ساتھ تھا ہی نہیں۔

”ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“ شبہہ نے حسب عادت ڈپٹ کر کہا۔

”مم۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔ بی جان نے منع کیا ہے آپ سے بات کرنے سے۔۔۔“

”کسی دن بی جان کہیں گی کہنوں میں چھلانگ لگا دو تو بھی ایک لمحے کی تاخیر نہ کرنا۔ تم جیسے بزدلوں کو یہ ہی کرنا چاہیے۔“

”اور آپ جیسے احسان فراموشوں کو کیا کرنا چاہیے؟“

”اوہو۔۔۔ تنوی کا اس طرح بولنا بہر حال تعجب چیز بات تھی، لیکن شبہہ کو خوشی ہوئی۔

”اچھی بات ہے کہ تم بولنا سیکھ رہی ہو۔ اب تمہیں بی جان کے سامنے بھی اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی ہے۔“

”آپ مجھے بھڑکانے کی کوشش نہ کریں۔ میں بی جان کے خلاف جانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”تم انتہائی احمق ہو۔ اپنے فائدے نقصان کا تو تمہیں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ بی جان انتہائی خود غرض ہیں۔“

”آپ کو ان کے بارے میں اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے۔“

”کیوں نہ کروں ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے میرا۔“

”کہہ دینے سے رشتے ٹوٹ تو نہیں جاتے۔“ تنوی نے تیزی سے کہا۔

شبہہ کے لبوں پر دل فریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اگر ایسی بات ہے تو بی جان کے کہنے سے ہمارا رشتہ بھی نہیں ٹوٹا۔ یہ سن کر اچھا لگا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ جھینپ گئی۔

”تمہارا مطلب تو بھی تھا، میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تمہاری شادی صرف مجھ ہی سے ہوگی۔ بی جان کچھ بھی کہیں، لیکن اگر تم نے کسی اور کے بارے میں سوچا تو یاد رکھنا! میں تمہیں اور اسے۔۔۔ دونوں کو قتل کر دوں گا۔

اپنی چیزوں سے دستبردار ہونا میں نے کبھی نہیں سیکھا اور تم تو پیدا ہوتے ہی میری ہو گئی تھیں۔ کل یا پرسوں میں حویلی آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تیاری کر لینا۔“ وہ جاتے جاتے رکا۔

”نمل کا شکریہ ادا کر دینا۔ وہ بروقت اطلاع نہ دیتی تو تم سے ملاقات نہ ہو سکتی تھی۔“

تنوی حیران پریشان اسے جاتا دیکھتی رہی۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے تم نے شبہہ بھائی کو انکار کیوں کیا؟“ نمل نے کہا تھا۔

”تو تمہارے خیال میں مجھے اور کیا کہنا چاہیے تھا؟“ تنوی نے چڑ کر پوچھا تھا۔ وہ یوں بھی اس سے خفا تھی۔

”ان کو انکار نہ کرنی تو بی جان خفا ہو جاتیں۔ اور میں بی جان کو خفا نہیں کر سکتی۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔“

”پاگل مت بنو تنوی! بی جان کو خوش رکھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو کبھی خوش نہیں ہوتے۔ اپنی خوشی سے کیوں دستبردار ہوتی ہو؟“

”خوشی کیسی؟ بی جان نے رشتہ طے کیا۔ انہوں نے ہی ختم بھی کر دیا۔ نہ میں نے پہلے کوئی اعتراض کیا تھا نہ۔“

اب کروں گی۔“

”ہاں! کاٹھ کے الو کی طرح زندگی گزارتی رہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔“
نمل نے چڑکر کہا تھا۔ تنوی خاموش رہی اسے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اس کے خیال تھا کہ بی جان بڑی ہیں۔
وہ زیادہ سمجھتی ہیں اور اسے خود تو کوئی عقل نہیں ہے۔ آج تک انہوں نے اس کے لیے درست فیصلے کئے
ہیں سو یہ فیصلہ بھی درست ہوگا۔ تب ہی اس نے واپس آتے ہی انہیں اپنی اور شبیہ کی ملاقات کا بتا دیا تھا۔
جنت بیگم نے بے دریغ نمل کو ڈانٹا۔ اس ڈانٹ کی نمل کو تو ہرگز پروا نہیں تھی البتہ تنوی کھڑی کانپتی رہی۔
”تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے تنوی! وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ جنت بیگم نے کہا۔ ”شبیہ نے
دوبارہ ایسی کوئی حرکت کی تو میں اسے خود سمجھ لوں گی۔“
ان کا لہجہ کسی سوچ کا غماز تھا۔ تنوی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”میں تنوی کو ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“ شبیہ اگلے ہی روز جنت بیگم کے سامنے کھڑا تھا۔
”آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ ذرا سی بات پر اس کا اور میرا رشتہ ختم کر دیں۔“
”میں اس کی بولی ہوں۔ میں جو مناسب سمجھوں اس کے حق میں فیصلہ کر سکتی ہوں۔“ جنت بیگم کا لہجہ تیز تھا۔
”ولی تو پتا نہیں آپ بس اس کی گارجین ہیں۔ میرا اور اس کا رشتہ زریں پھپھو کے ایما پر طے ہوا تھا۔ اگر رشتہ
ختم ہونا ہے تو بھی ان ہی کو فیصلہ کرنا چاہیے۔“ اس نے بڑی عیاری سے کہا تھا۔ جنت بیگم استہزائیہ ہنس دیں۔
”پاگل پن کی باتیں مت کرو شبیہ! زریں کے بعد میں ہی تنوی کی ماں ہوں۔ اس کے بارے میں ہر فیصلے کا
اختیار مجھے ہی ہے۔“
”تو پھر آپ کے کہہ دینے سے رشتہ بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تنوی میری عزت ہے اور میں اس سے کسی بھی
قیمت پر دستبردار نہیں ہوں گا۔“ شبیہ نے اٹل لہجے میں کہا۔
”تم تو اس طرح اکثر رہے جیسے وہ تمہاری منگیتر نہیں منکوحہ ہو۔“

”آپ بھول رہی ہیں بی جان! ہم غیرت اور عزت پر جان دینے اور لینے والے لوگ ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”بات
صرف یہ ہے کہ تنوی میری عزت ہے۔ لیکن اگر پھر بھی آپ بضد ہیں تو میں بتا دوں میں ہوا میں تیر نہیں چلا رہا۔
میرے پاس نکاح نامہ ہے۔“

”کیا؟“ وہاں موجود سب لوگوں کو گویا جھٹکا لگا تھا۔
”اور نکلی ہے۔“ شبیہ نے پھر اطمینان سے کہا تھا۔ ”لیکن اس نکاح نامے کی رو سے جنت بی بی عرف تنوی
میری منکوحہ ہے۔ میں اسے آپ کی اجازت کے بغیر بھی یہاں سے لے جانے کا مجاز ہوں اور آپ کو کوئی اختیار
نہیں کہ مجھے ایسا کرنے سے روکیں۔“

”تم نے نکاح نامہ تیار کروایا؟“ جنت بیگم کی حیرانی کی حد نہ تھی۔ ”مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی
شبیہ!“

”امید تو مجھے بھی نہیں تھی کہ آپ نے مجھے میری ماں کے خلاف بھڑکایا ہوگا۔“
”تو اب تم اس بات کا بدلہ لینے کے لیے تنوی کو لے جانا چاہتے ہو؟ تنوی! اس کے عزائم کی داستان اس کی
زبان سے ہی سن لو۔“ جنت بیگم نے شبیہ کے عقب میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
شبیہ قدرے سٹپا کر پلٹا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تنوی وہاں موجود ہوگی۔ وہ پریشان سی کھڑی
تھی۔

”میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا تنوی نے تیزی سے کہا تھا۔
”ناگل مت۔ تنوی! صرف میں ہوں جو تمہیں ایک سیکور لائف دے سکتا ہوں۔“ شبیہ نے کہا۔
”مجھے بی جان کے پاس رہنا ہے۔ میں۔۔۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ وہ ہر اسال بھی اور بضد بھی۔
”ان کے ساتھ رہو گی تو یہ تمہیں بھی اپنے جیسا بنا دے گا۔“ ضدی اور خود غرض۔
”اور تمہارے ساتھ رہی تو تم اسے اپنے جیسا بنا دے گے۔ ظالم اور بے حس۔ پوچھو تنوی سے وہ تمہیں کتنا
نا پسند کرتی ہے۔“ جنت بیگم نے استہزائیہ کہا تھا۔
شبیہ نے نا پسندیدگی سے انہیں دیکھا۔
”فیصلہ تمہیں کرنا ہے تنوی! اپنے ساتھ دشمنی مت کرو۔“ شبیہ کا انداز سمجھانے والا تھا۔
”دشمنی تب ہوگی جب وہ تمہارے ساتھ جائے گی۔“ جنت بیگم نے کہا۔
”مجھے تنوی سے بات کرنے دیں۔“

”تم نے تنوی! اس کا لہجہ کتنا گستاخ ہو چکا ہے۔ یہ وہی شبیہ ہے جو کسی کو مجھ سے اونچی آواز میں بات بھی
کرنے نہیں دیتا تھا اور اب کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہا ہے۔ اس سے بھلا اب کسی اچھائی کی توقع کی جاسکتی
ہے؟“

جنت بیگم نے ایک اور پتا پھینکا۔ شبیہ کے غصے میں اضافہ ہوا گیا۔
”نہ کریں اچھائی کی توقع۔۔۔ لیکن یہ طے ہے کہ تنوی کو میں آپ کے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔ زبردستی بھی
لے جانا پڑا تو لے جاؤں گا۔“ اس نے حتمی انداز میں کہا تھا۔ ”چلو! تم میرے ساتھ۔“
”مم۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ کانپنے لگی۔

”تمہاری اجازت نہیں مانگ رہا۔ تم سے چلنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ شبیہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑنا
چاہا۔ اسی وقت تنوی کے ہاتھ میں کہیں سے ایک چھوٹا سا ریو الور آ گیا تھا۔
”مم۔۔۔ میں۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی اور آپ زبردستی بھی نہیں کر سکتے۔“ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریو الور

اس پر تان رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں کی لرزش شبیہ سے مخفی بھی نہیں رہی تھی۔
”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے تم مجھ پر گولی چلاؤ گی؟“ وہ طیش سے بولا۔

”میں چلا سکتی ہوں لیکن آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ وہ ابھی تک کپکپا رہی تھی۔
”میں دیکھتا ہوں تم کیسے چلاتی ہو۔“ وہ طیش کے عالم میں آگے بڑھا۔ خوف کے عالم میں تنوی نے ٹریگر پر دباؤ
بڑھا دیا۔ معا“ فضا میں ایک زوردار آواز گونجی اور سارے میں سکوت پھیل گیا تھا۔

شبیہ کے قدم ٹھم گئے۔ اس نے اپنے سینے میں کوئی گرم سلاح گڑتی محسوس کی تھی۔ اس کے کانوں میں ایسی
آوازیں کا شور تھا جیسے ویرانوں میں ہوتا ہے۔ عجیب سا شور۔ موت کا شور۔

اس کے سامنے کھڑی تنوی کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔ جنت بیگم کا چہرہ بھی۔ پھر اسے اپنی ماں کی شکل دکھائی دی
متنوں چہرے مدھم ہو کر اس کی بصارت میں گم ہو رہے تھے۔ شبیہ نے زبردستی بند ہوتی آنکھیں کھولنے کی
کوشش کی لیکن ہر منظر اس کی بصارت سے یکدم ڈوب گیا۔

اس رات ماویٰ جلال کی واپسی کا انتظار کرتی رہی اور انتظار کرتے ہوئے لاؤنج میں ہی سو گئی۔ اگلی صبح اس کی
آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر سرعت سے

کچن کی طرف لپکی۔
جلال چولہے کے قریب کھڑا تھا اور اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔
”جلال! ماوی کے قدم جیسے دہلیز نے جکڑ لیے تھے۔
جلال نے مڑ کر دیکھا پھر سرخ چولہے کی طرف موڑ لیا۔ ہلکی آنچ پر چائے کا پانی ابل رہا تھا۔
”میں جانتی ہوں تم مجھ سے خفا ہو لیکن پلیز! مجھے ایک بار اپنی پوزیشن کلیئر کر لینے دو۔“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔

”میں خفا نہیں ہوں ماوی! تم جاؤ یہاں سے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔
”وہ ساری ممی کی پلاننگ تھی۔ میں نے انہیں منع بھی کیا تھا۔“
”میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔“
”تمہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں مجھ سے لڑنا چاہیے۔“

”چائے پیو گی؟“
”مجھے یا ممی کو کوئی حق نہیں تھا کہ تمہاری فیلنگز سے کھیلتے۔“
”میں فردٹ کیک بھی لایا ہوں۔ چائے کے ساتھ کھانا چاہو تو فریج سے نکال لو۔“
”ممی نے تمہیں مہو بنایا تاکہ حویلی میں تم مجھے کسی بھی قسم کے نقصان سے بچا سکو۔“
”ہلے میں کلمہ چوک سے حلوہ پوری کا ناشتا لانے لگا تھا۔ بہت لذیذ حلوہ پوری ملتی ہے۔“
”آئی ایم سوری جلال۔!“

”پھر میں نے سوچا شاید تم نہ کھاؤ۔“
”مجھے معاف کرو۔ میں ممی کی باتوں سے مجبور ہو گئی تھی۔“
”لو کیاں ڈائنٹ کانٹینس بہت ہوتی ہیں نا۔“
”اس طرح جی ہو مت کرو پلیز!“

”چائے میں کتنی چینی لوگی؟“ وہ چائے کپ میں نکالنے لگا تھا۔
ماوی نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
”اس طرح تم مجھے ہرٹ کر رہے ہو جلال۔!“

”میں ہرٹ کر رہا ہوں۔ میں۔۔۔؟“ جلال نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔ اس کا خول جیسے چمک گیا تھا اور چہرہ ضبط سے لال ہو رہا تھا ماوی چپ کی چپ رہ گئی۔
”تمہاری ماں نے تمہیں مجبور کیا تھا لیکن تم دودھ پیتی ہو تو نہیں تھیں۔ میری زندگی سے تم نے کھیلا۔ تم نے مجھے بے وقوف بنایا۔ مجھے تم نے استعمال کیا اپنے مقصد کے لیے۔ میں شو پیپر نہیں تھا ماوی! کہہ استعمال کر کے پھینک دیا جاتا، لیکن تم نے میری ذات کو شو پیپر بنا دیا۔ مجھے اس وقت کا افسوس ہوتا ہے جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا۔ کاش! وہ لمحہ میری زندگی میں آیا ہی نہیں ہوتا۔ صرف اور صرف تمہاری وجہ سے اب میں کسی عورت پر اعتبار نہیں کر سکوں گا۔“

اس نے یکدم اتنی بری طرح رد عمل ظاہر کیا تھا کہ ماوی صم صم رہ گئی۔ یہ کوئی اور جلال تھا۔ وہ نہیں تھا جسے اب تک ماوی جانتی تھی۔ جلال کو چند منٹ لگے تھے اپنی کیفیت پر قابو پانے میں۔ اس نے گہرے سانس لیے اور چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔
”آج ہم وایڈ اٹاؤن چلے جائیں گے۔“ اس نے بس اتنا کہا اور اپنا کپ لے کر کچن سے نکل گیا۔ اس کے

موبائل کی بیل بج رہی تھی۔
ماوی وہیں کھڑی رہی اور شیلف پر رکھے کپ سے نکلتی بھاپ کو دیکھتی رہی۔
باہر جلال کے لیے ایک پریشان کن خبر اس کی منتظر تھی۔
”شبیبہ کو گولی لگی ہے۔ ہم اسے لے کر لاہور آ رہے ہیں۔“

”ایک کپ کافی مل سکتی ہے؟“
ثروت اپنے لیے چائے بنا رہی تھیں جب انہوں نے اپنے عقب میں دانیال حسن کی آواز سنی۔ ذرا سا چونک کر پلیٹس، پھر اثبات میں سر ہلادیا۔ دودھ گرم کرنے کے لیے ہلکی آنچ پر رکھا اور خود کافی پھینٹنے لگیں۔ کچن کی خاموش فضا میں کافی پھینٹنے کی آواز بہت گونج رہی تھی۔

دانیال حسن کچھ دیر خاموشی سے ثروت کی پشت کو گھورتے رہے۔ وہ تمہید کا کوئی پہلو تلاش کر رہے تھے۔
”میں نے انیہا سے بات کی تھی۔“ معا“ ثروت نے ہی خاموشی کو توڑا۔
”کس بارے میں؟“ دانیال حسن چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

”فیضان کے پروپوزل کے بارے میں۔“ ثروت نے کہا۔

”انیہا ابھی شادی نہیں کرنا چاہ رہی۔ وہ ابھی مزید پرہیز چاہتی ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بیٹی پر بھائی میں دلچسپی لے رہی ہے۔ تمہیں یاد ہے تم بھی چاہتی تھیں کہ ولید اور ولی کے ساتھ ساتھ انیہا بھی اعلا تعلیم حاصل کرے۔“ دانیال حسن نے یاد دلایا۔

”میں تو بہت کچھ چاہتی تھی۔“ ثروت نے سادگی سے کہتے ہوئے کافی کا گمک دانیال کے سامنے شیلف پر رکھ دیا۔

”اچھا! مثلاً۔۔۔؟“ دانیال حسن کے لہجے میں دلچسپی تھی۔ ثروت ذرا ساجیران ہوئیں پھر معتدل لہجے میں بولیں۔

”اس بات کو رہنے دیں۔ اچھا ہوا“ آپ کو فرصت مل گئی۔ میں آپ سے بات کرنے آپ کی اسٹڈی میں آنے کا سوچ رہی تھی۔“

”تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔ آجائیں۔۔۔ مجھے فرصت نہ بھی ہوتی تو تمہارے لیے ٹائم نکالنا کیا مشکل تھا۔“ ایسا خوش گوار لہجہ۔ ثروت حیران رہ گئیں۔

”اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟“ دانیال حسن ان کی حیرانی بھانپ کر ہنس دیے۔ پھر انہوں نے مک شیلف پر رکھا اور چند قدموں کا مختصر سا فاصلہ عبور کر کے ثروت کا ہاتھ آہستگی سے تھام لیا۔

”آؤ! ایک نئی شروعات کرتے ہیں۔ سب کچھ بھول کر ہر تلخی کو ذہن سے نکال کر۔ مجھے معاف کرو ثروت! میری ہر چھوٹی بڑی غلطی کے لیے۔ جنت بیگم نے وقتاً فوقتاً“ میرے ذہن میں تمہارے لیے اتنا زہر بھردیا تھا کہ میں کسی بھی طرح تمہاری طرف سے اپنا دل صاف ہی نہیں کر سکا۔ تمہاری خدمت گزار کی تمہاری محبت۔ مجھے سب بتا دینی لگتا تھا۔ غلطی میری ہے۔ مجھے پہلے ہی تم سے کلیئر کرنا چاہیے تھی۔ تاکہ اتنے سال بدگمانی کی نذر نہ ہوتے۔ کچھ روز پہلے میری مستقیم بھئی سے بات ہوئی تو اس نے میری غلط فہمی دور کی۔“

”پہلے جنت بیگم نے کچھ کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔ اب مستقیم بھئی نے کہا تو آپ کو اس کی بات کا بھی اعتبار آگیا۔ کل کو کوئی اور اگر میرے بارے میں کچھ کہہ دے گا تو آپ اس پر بھی یقین کر لیں گے۔ ان سب باتوں کے

درمیان میری ذات کہاں ہے؟ کیا میں اتنی ناقابل بھروسہ ہوں کہ کوئی بھی کچھ کہتا رہے اور آپ مجھے دو کوڑی کا کرتے رہیں گے؟“

ثروت نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی باقاعدہ ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ دانیال حسن نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھ ڈالے۔

”میں جانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے گزرے ہوئے قیمتی سال تمہاری تمام تر خوشیوں کے ساتھ میں تمہیں واپس نہیں کر سکتا۔ لیکن میں آنے والے سالوں کے قیمتی پلوں کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ اس عمر میں گو کہ ایسی باتیں کرنا کچھ نامعقول سی بات لگتی ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ مستقیم سے جب تم نے شادی کی تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے دل پر کیا گزری تھی۔ مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ تمہاری اور اس کی طلاق میری بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ہمارے گھر میں قربانی کا جانور کاٹنے والی ایک بڑی چھری ہوا کرتی تھی۔ تمہاری شادی کے بعد میں نے ایک مرتبہ وہ چھری نکالی کہ مستقیم کو ذبح کروں، لیکن پھر دماغ نے سمجھایا کہ یہ تو نری بے وقوفی ہوگی۔ مستقیم کو قتل کر کے مجھے جیل جانا پڑے گا اور اس دوران تمہاری شادی کسی اور سے ہوگئی تو میں کیا کروں گا۔ بس اسی خیال نے مجھے مستقیم کو قتل کرنے نہیں دیا۔“

اب کی بار ثروت کو بے یقینی کے باوجود ہنسی آگئی۔ دانیال پختہ عمر کے آدمی کم اور نوجوان لڑکے زیادہ لگ رہے تھے۔

”میری محبت کی اس سے بڑی نشانی اور کیا ہوگی کہ میری بدگمانی اسی لیے شدید تھی کہ میری محبت بھی شدید تھی۔ مجھے معاف کرو ثروت! میری ہر غلطی معاف کرو۔ میں نے تمہیں بہت مایوس کیا۔ مجھے اپنی ہر غلطی کا احساس ہے۔ میں شبیہ سے بھی معافی مانگ لوں گا، لیکن پہلے تمہیں مجھے معاف کرنا ہوگا۔ یہ دیکھو! میں تمہارے سامنے ہاتھ بٹھائی جوڑ رہا ہوں۔“

دانیال حسن نے سچ سچ ان کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ثروت نے جھنجھلا کر ان کے ہاتھ کھول دیے پھر انہی ہاتھوں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ دانیال حسن نے ان کے کندھوں پر بازو پھیلا کر انہیں خود سے قریب کر لیا۔ وہ جانتے تھے اس جل تھل کے بعد جب خوشیوں کا سورج نکلے گا تو ہر منظر نکھر چکا ہوگا اور ان کی عائلی زندگی خوش گوار سی روشنی میں نما چکی ہوگی۔ بہت سال برباد ہوئے۔ اب انہیں خوشیاں چاہیے تھیں۔ اب انہیں زندگی سے ان خوشیوں کو کشید کرنا تھا۔



قیامت سی قیامت تھی، جو حویلی کے مینوں پر ٹوٹی تھی۔

سب حواس باختہ تھے۔ شبیہ کی حالت خراب تھی۔ ڈاکٹر کچھ بھی واضح الفاظ میں نہیں بتا رہے تھے۔ گولی دل کے قریب لگی تھی۔ فوری طور پر آپریشن کیا گیا۔ شکر ہے کہ دل کو نقصان نہیں پہنچا تھا، لیکن وہ بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اگلے چھتیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔

سب کا متفقہ فیصلہ تھا وہ حویلی چھوڑ دیں گے۔ کسی کو بھی اب جنت بیگم کی حکمرانی منظور نہ تھی، لیکن تنوی۔ بارے میں کوئی بھی فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اسے جنت بیگم نے بالا تھا۔ جنت بیگم اس کے متعلق فیصلہ کر سکتی تھی یا تنوی خود۔ اور سب جانتے تھے وہ جنت بیگم کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔ ابھی تو خیر معاملہ بھی اور تھا۔ سب کو فکر تھی اس سارے معاملے میں تنوی کو پولیس سے کس طرح بچایا جائے۔ تعلقات اور پہنچ کا وسیع سلسلہ تھا، جو انہوں نے استعمال کر لیا، لیکن بڑی کوشش کے باوجود وہ معاملہ پولیس تک پہنچنے سے نہیں بچا سکے۔

تھ۔ اسپتال کی انتظامیہ نے طبی امداد دینے سے پہلے ہر حال میں پولیس کو خبر کرنا ضروری سمجھا تھا۔

”میں تنوی کو لینے جا رہا ہوں۔“ جلال نے کہا۔

”تمہارے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اماں اسے تمہارے ساتھ نہیں آنے دیں گی۔“ مستقیم بھٹی نے کہا۔

”لیکن میں اسے ہر قیمت پر لے کر آؤں گا۔ بی جان واقعی اسے پاگل کر دیں گی۔ اب اتنا رہے تھے جس وقت آپ لوگ شبیہ کو اسپتال لے کر آ رہے تھے، انہوں نے تنوی کو مارنا شروع کر دیا تھا کہ اس نے شبیہ پر گولی چلائی۔“

سب کے ذہنوں میں بہت سے خدشات و اعتراضات تھے، لیکن کسی نے بھی مزید کچھ نہ کہا۔ جلال حویلی آیا تو نمل نے فوراً بتا دیا۔

”بی جان نے تنوی کو پہلے مارا پٹا اور پھر کمرے میں بند کر دیا ہے۔ جلال بھائی! اس کی حالت بہت خراب تھی، مگر بی جان کو اس پر ذرا رحم نہیں آیا۔“

جلال کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ جنت بیگم سے کوئی اچھی امید تو خیر تھی نہیں، اس پر حویلی کے درو دیوار سے لپٹی ویرانی اس کی پریشانی اور خدشات میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

دوسری طرف جنت بیگم غم سے نڈھال تھی۔ اس نے رورو کر برا حال کر رکھا تھا۔ عزیز پوتے کو خون میں لت پت دیکھا تھا۔ اب خراب حالت کے خیال ہی سے بے دم ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا سارا طغیان نکل گیا ہو۔

”میرا شبیہ کیسا ہے۔ وہ ٹھیک تو ہو جائے گا ناں؟“

”پہلے آپ مجھے بتائیں! تنوی کو کمرے میں کیوں بند کیا ہے۔ مجھے لاک کی چابی دیں۔“

”ہرگز نہیں۔“ جنت بیگم بری طرح بدکی۔ ”میں مرجاؤں گی، لیکن کمرے کی چابی ہرگز نہیں دوں گی۔ اس نے میرے شبیہ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ میں اسے قتل کروں گی۔“ اس کا انداز عجیب، جتنی ساتھ۔

”بی جان! اس طرح نہ کریں۔ پولیس کسی بھی وقت تنوی کو گرفتار کرنے پہنچ سکتی ہے۔ اس سے پہلے مجھے اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا ہے۔“ اس نے منت آمیز لہجے میں کہا۔

”چھاپے، آنے دو پولیس کو۔ میں خود اسے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“

جلال نے عاجز ہو کر اس سے سر کھپانے کا ارادہ ترک کر دیا اور تنوی کے کمرے تک پہنچا۔ اس نے ملازم کو ساتھ لگا کر لاک با آسانی توڑ لیا تھا۔

”تنوی! وہ کہیں دکھائی نہ دی تو اس نے زور سے پکارا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں ہراساں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر لپک کر آئی اور اس کے گلے لگ کر بری طرح رو دی۔

”میں نے جان بوجھ کر گولی نہیں چلائی جلال بھائی! مجھے بی جان نے کہا تھا۔“ وہ بری طرح کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

”کیا...؟“

”مم۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بی جان نے دیا تھا ریو الوور۔“

”ڈرو مت تنوی! میں آگیا ہوں نا۔ میں اپنی بہن کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ اس نے پیار سے تنوی کے سر کو سہلایا تھا۔

”یہاں بیٹھو اور مجھے بتاؤ! کیا ہوا تھا۔ ایسا کیا ہوا تھا کہ تمہیں گولی چلانا پڑی؟“

”مجھے بی جان نے کہا تھا، شبیہ تمہیں ضد میں ساتھ لے کر جائے گا اور چونکہ شبیہ کا ان سے جھگڑا ہوا ہے، اس لیے وہ مجھے ماریں پیٹیں گے اور قید کر کے رکھیں گے۔ انہوں نے ہی ریو الوور دیا تھا کہ اگر شبیہ زبردستی ساتھ

لے جانے کا کہیں تو میں ریو اور نکال لوں۔ میں ڈر گئی تھی جلال بھائی! لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں مجھے نہیں پتا ریو اور کیسے چل گیا مجھے چلانا نہیں آتا۔ میں تو صرف ان کو ڈرانا چاہتی تھی۔ پتا نہیں کس نے ریو اور کا کلچ بنا دیا تھا۔ وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

جلال نے دیکھا اس کے چہرے پر مار پیٹ کے نشان تھے۔ بلاشبہ جنت بیگم نے اسے بری طرح زد و کوب کیا تھا۔

”لیکن تم نے ریو اور نکالا ہی کیوں؟ کیا تم جانتی نہیں تھیں شبیہ کو سو لاکھ غصہ میں سی، لیکن تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔“

تنوٰی اور شدت سے رونے لگی۔

”میرے ساتھ تو بی جان نے بھی کبھی برا نہیں کیا تھا۔ تو پھر اب۔۔۔ میں کس پہ بھروسہ کرتی۔ مجھے تو دونوں عزیز ہیں۔ لیکن میں نے بی جان کی باتوں میں آکر شبیہ کو مار دیا۔ میں نے مار دیا انہیں۔“ وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ جلال اس کا دکھ سمجھتا تھا۔ اس کے تاسف میں اضافہ ہوا۔

”شبیہ ٹھیک ہے تنوٰی! اور تم گھبراؤ نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو۔ اپنا حلیہ درست کرو اور جو سامان سمیٹنا ہے سمیٹ لو۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔“ جلال نے پیار سے کہا۔

”جلال بھائی۔۔۔ میں۔۔۔“

”میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی جلال! جنت بیگم چیل بن کر تنوٰی پر جھپٹی تھی۔“ قتل کر دیا اس نے میرے شبیہ کو۔ میں مار ڈالوں گی اسے۔“

جلال نے بمشکل جنت بیگم کو تنوٰی سے الگ کیا۔ تنوٰی بے دم ہو کر زمین پر گر گئی تھی۔

”آخر آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟“ جلال نے انہیں جھٹک دیا۔ ”اپنی ضد کے ہاتھوں آپ نے سب برباد کر دیا۔ کتنی زندگیاں ہیں جو آپ نے تباہ کیں۔ ہم سب کو ایک ایسا ریل زندگی گزارنے پر مجبور کرتی رہیں۔ انسان تھیں، لیکن خدا بن کر اپنے ارد گرد رہنے والوں کی زندگیوں کا فیصلہ کرتی رہیں۔ آپ کیوں بھول گئیں بی جان! کہ آسمان پر ایک معبود بھی رہتا ہے۔ آپ کو ڈر نہیں لگا کبھی اس سے۔؟ ہمیں ہمارے ماں باپ کو ایک ڈری سہمی زندگی دی آپ نے۔ اور سب کو چھوڑ دیں۔ شبیہ اور تنوٰی کے ساتھ کیا کیا آپ نے؟ شبیہ کو اس کی ماں کے اتنا خلاف کر دیا کہ وہ ان کی عزت نہیں کر پاتا۔ اپنی ماں کو بد کردار سمجھتا رہا کہ انہوں نے نہ صرف بھاگ کر شادی کی، بلکہ نکاح کرنے کا گناہ بھی سرزد کیا۔ ثروت آنٹی کے شوہر کو غلط غلط باتیں بتا کر ان کی شادی شدہ زندگی برباد کی۔ ان کے شوہر سمجھتے رہے کہ وہ اب بھی مستقیم بھٹی سے ملتی ہیں۔ تنوٰی کا کیا حشر کیا آپ نے؟ ڈری سہمی بے کار شخصیت بنا دیا اسے۔ ماوی نے بے شک آپ پر غلط الزام لگایا، لیکن اس الزام کے پیچھے بھی آپ کا ہاتھ تھا۔ آپ نے اس کے باپ کو اپنے طعنوں سے اتنا چھلٹی کر دیا تھا کہ وہ خود کشی پر مجبور ہو گئے۔ پھر آپ نے سچ کو بھی چھپایا۔ آپ نے کبھی کیوں نہیں سوچا کہ آپ کو ذہنی معذور اولاد دے کر اللہ سدھرنے کا موقع دے رہا ہے۔ آپ غلطیوں پر غلطیاں کرتی رہیں۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ اللہ کو کیا منہ دکھائیں گی۔ اپنی محبت میں مبتلا ہو کر آپ کیوں بھول گئیں کہ آپ کو جو اختیارات ملے ہیں وہ اللہ کے اختیارات سے زیادہ ہر گز نہیں ہیں۔“

جنت بیگم کو کسی نے پہلی بار آئینہ دکھایا تھا۔ وہ خاموش سن رہی تھی۔

جلال نے خود بھی بے دم ہو کر سر پکڑ لیا تھا۔ ”معا“ اس کی نگاہ تنوٰی پر پڑی۔ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ جلال تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



دولت کسی کے ساتھ ہے، طاقت کسی کے ساتھ تیرے ہیں جو، انہیں نہیں نسبت کسی کے ساتھ

کہنے کو سب کے ایک سے نقش و نگار ہیں ملتی نہیں کسی کی بھی صورت کسی کے ساتھ

سورج کا راستہ نہیں رکتا کسی سے بھی کب تک چلے گی رات کی ظلمت کسی کے ساتھ

ہوتی ہے اس کے دل کو کسی اور کی طلب

رکھتی ہے عمر بھر اسے قسمت کسی کے ساتھ

اہل نظر کے بخت میں کس نے یہ لکھ دیا

رہنا کسی کے ساتھ، محبت کسی کے ساتھ

شاہد ہے روز و شب کے صحیفے کا ہر ورق

رہتی نہیں ہے مانگے کی عزت کسی کے ساتھ

ہر شبے ایک دوجے سے امجد جڑی ہوئی

پھر بھی نہیں، کسی کو بھی نسبت کسی کے ساتھ

امجد اسلام امجد

سال نو،

نئی صبحیں، نئی شائیں، نئے طے، نئے ساتھی

مگر اک میں

کہ جو ویسے کا ویسا ہوں

فراتِ وقت پہ بکھرے

گزشتہ سال کی ساری

ادھوری خواہشوں کے

اُن گنت ٹکڑوں کو چنتا ہوں

انہیں اک ایک کر کے جوڑتا ہوں

شکل دیتا ہوں

میں پھر اک خواب بُنتا ہوں ... !!!

امجد بخاری

عاصم کے کلاس ٹیچر نے اس کے والد سے شکایت کی۔
”جناب! اگر میرے بیٹے نے کہا ہے تو یقیناً وہ
بالکل معصوم اور سچا ہے۔ کسی لڑائی جھگڑے سے اس
کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت سیدھا سادہ بچہ ہے۔“
انصاری صاحب نے منات سے کلاس ٹیچر کو
جواب دیا۔ کلاس ٹیچر حیرت سے دونوں باپ بیٹے کو دیکھ
کر رہ گیا۔ انصاری صاحب، عاصم کو لے کر گھر روانہ
ہوئے۔ سرخ بتی پر گاڑی رکی تو انہوں نے عاصم سے
کہا۔

”تمہارے ٹیچر کے سامنے تو میں نے تمہیں بچا لیا
مگر ایک بات کان کھول کر سن لو۔ آئندہ کبھی مجھے پتا
چلا کہ پانی پت کی لڑائی سے تمہارا کوئی تعلق تھا تو میں
تمہاری کھال ادھیڑوں گا۔“
(نسیم حرمی۔ گلشن اقبال)

خواتین

چودہ سال کی عمر تک خواہش رکھتی ہیں اچھی صحت
اور اچھے والدین کی۔
چودہ سے چالیس سال تک خواہش رکھتی ہیں اچھی
شکل و صورت کی۔
چالیس سے ساٹھ سال تک خواہش رکھتی ہیں
اچھی شخصیت کی۔

ساٹھ سال کے بعد۔۔۔ صرف اور صرف دولت۔
(نگہت ذوالفقار۔ بلدیہ)

طالب علم

کتب فروش ”یہ حیرت انگیز کتاب تمہارا آدھا ہوم

محکمہ تعطیلات

”بیٹے! آپ بڑے ہو کے کیا بننا چاہتے ہیں۔ ذرا
اپنے ڈیڈی کو بھی بتائیں۔“
”پرائمری اسکول کا ٹیچر بنوں گا یا ٹریننگ کالج کا
لیکچرار۔“
ڈیڈی کے ہاتھوں میں پیالی تھر تھرانے لگی۔ ”کیا
کہہ رہے ہو منے۔“
”کیوں؟ کیا ٹیچر بننا برا ہے؟“ نہایت معصومیت
سے سوال کیا گیا۔

”نہیں! مگر تم ٹیچر ہی کیوں بننا چاہتے ہو؟“
”کیونکہ اس ملازمت میں کام دوسرے پیشوں کی
نسبت کم ہوتا ہے۔ نہ ہونے کے برابر۔“
”وہ کیسے؟“ ڈیڈی حیران ہو کر بولے۔
”دیکھیے ڈیڈی! سال کے بارہ مہینوں میں سے گرام
میں دو ماہ۔۔۔ سرمایہ ایک ماہ۔۔۔ اور کرسمس میں ایک
ہفتہ کی تعطیلات ہوتی ہیں۔ اس کے بعد باقی بچے دنوں
میں سے سال کے پچاس اتوار نفی کر دیں۔ پھر مختلف
قومی اور مذہبی تہواروں کی چھٹیوں کو نکال دیں تو کتنے
دن بچے؟ میڈیکل اور دوسری چھٹیاں الگ۔“
(ارم آفتاب۔ حسن اسکوائر)

تنبیہ

”انصاری صاحب! آپ کا بیٹا آج کل پڑھنے لکھنے
پر کوئی توجہ نہیں دے رہا۔ کل میں نے اس سے
پوچھا۔ بتاؤ پانی پت کی لڑائی کس کس نے لڑی تھی تو
آپ کے بیٹے نے جواب دیا۔ مجھے نہیں معلوم۔“

کوئی پوچھ لے تو بتاؤں کیا، مرے دل سے کیوں وہ اتر گیا
مرے سامنے کوئی بات کی مرے سامنے ہی مگر گیا

یوں نہ کارِ عشق تمام کر، یوں نہ صبح شوق کی شام کر
وہ جو واقعہ تھا وہ ہو گیا، وہ جو سانحہ تھا گزر گیا

کوئی آنکھ میری طرف نہ ہو، کسی کو ذرا بھی خبر نہ ہو
مجھے جب بکھرنا پڑا کبھی، کہیں دُور دل میں بکھر گیا

مرے روز و شب تھے بندھے ہوئے مڑ مڑوں کے مڑانے سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

مجھے یاد پھر سے دلا گیا مری بھولی بھری محبتیں
یہ نہی دفعتاً کسی موڑ پر مجھے دیکھ کر وہ گزر گیا

بڑی دیر تک جو برس گیا کوئی ابر تھا وہ بہار کا
مرے گھر کے پاس نشیب ہے، تھے پانیوں سے وہ بھر گیا

مرے ساتھ بڑی دُور تک چلا جا رہا تھا جو سیدھ میں
وہی راستہ ذرا گھوم کر کہیں وادیوں میں اتر گیا

جاوید شاہین

خواب تھا دیدہ بیدار تک آگیا تھا
دشت بڑھتا ہوا دیوار تک آگیا تھا

میں نے مجبوری میں تلوار اٹھائی تھی میاں
ہاتھ بڑھتا ہوا دستار تک آگیا تھا

اب میں خاموش اگر رہتا تو عزت جاتی
میرا دشمن میرے کردار تک آگیا تھا

عشق کچھ سوچ کے خاموش رہا تھا ورنہ
خُن بکنا ہوا بازار تک آگیا تھا

میں اُس وقت مقدر نے بغاوت کر دی
جب میں اُس شخص کے معیار تک آگیا تھا

میرے اندر کے کسی ہجر نے روکا ہے مجھے
ورنہ میں عشق کے انکار تک آگیا تھا

رات آنکھوں سے کوئی اشک بغاوت کر کے
مسکراتا ہوا رخسار تک آگیا تھا

میںم علی آغا

ورک کر دے گی۔“
طالب علم: ”ایسی دو کتابیں دے دو۔“
(حنا شاہد۔ کورنگی)

ٹکٹ

”مجھے واپسی کا ٹکٹ چاہیے۔“
”کہاں کے لیے؟“
”میں واپس آنے کے لیے۔“

(نسرین اختر۔ میٹروپول)

تین بہترین نصیحتیں

میں نے ساری زندگی تین نصیحتوں پر عمل کیا ہے اور مرنے سے پہلے اپنی اولاد کو بھی یہی نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی نصیحت یہ ہے کہ سگریٹ نوشی مت کرو۔ میرا مطلب ہے زیادہ سگریٹ نوشی مت کرو۔ میری عمر تتر سال چھ مہینے ہے اور میں پچھلے تتر سال سے سگریٹ نوشی کر رہا ہوں مگر میں نے کبھی زیادہ سگریٹ نہیں پیے۔ ہمیشہ اعتدال سے کام لیا اور ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی سگریٹ پیا۔

دوسری نصیحت یہ ہے کہ عشق مت کرو۔ میرا مطلب ہے زیادہ عشق مت کرو۔ میں نے اپنی تتر سالہ زندگی میں ہمیشہ ایک وقت میں ایک عشق کیا ہے۔

تیسری نصیحت یہ ہے کہ شادی مت کرو۔ میرا مطلب ہے زیادہ شادی مت کرو۔ میں نے اپنی تتر سالہ زندگی میں ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی شادی رکھی ہے۔

(یا سمین ظفر۔ لاہور)

ڈھائی سو الفاظ

کلاس ٹیچر نے بچوں کو کسی سواری پر تقریباً ”ڈھائی سو الفاظ پر مشتمل مضمون لکھنے کو کہا۔ ایک بچی نے لکھا۔

”میرے ابو نے ایک پرانی کار خریدی۔ پہلی رات وہ ہمیں اس میں بٹھا کر سپر ہائی وے پر بہت دور ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ راستے میں کار خراب ہو گئی۔ ہمیں کوئی دوسری سواری بھی نہیں ملی اور کسی نے ہمیں لفٹ بھی نہیں دی۔ ہمیں کئی میل تک پیدل چلنا پڑا۔“

مس! یہ تقریباً ”پچاس الفاظ ہو گئے ہیں۔ تقریباً دو سو الفاظ وہ ہیں جو ابو نے راستے میں بولے۔ مگر وہ لکھنے کے قابل نہیں ہیں۔“

(ترنم اعجاز۔ گلستان جوہر)

پہچان

”آج میں نے تمہاری بیوی کو پارک میں دیکھا۔ بہت اداس اور خاموش تھی۔“ ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا۔

”اچھا۔ پھر وہ میری بیوی نہیں ہوگی۔“ دوسرے دوست نے اطمینان سے جواب دیا۔

(نرین لودھی۔ سرگودھا)

سبب

ایک شخص سوٹ سلوانے کی غرض سے درزی کے پاس گیا۔ درزی نے کپڑا لے کر تپا اور کہا۔ ”کپڑا کم ہے۔ ایک سوٹ نہیں بن سکتا۔“

وہ شخص دوسرے درزی کے پاس گیا۔ اس نے ٹاپنے کے بعد کہا۔

”دس دن بعد سوٹ لے جائیے گا۔“

وقت مقررہ پر وہ درزی کے پاس پہنچا۔ سوٹ اٹھا کر پیسوں کی اوائیگی کر رہا تھا کہ دکان میں درزی کا بچہ داخل ہوا۔ اس شخص کو لگا اس بچے نے اسی کے کپڑے کا سوٹ پہنا ہوا ہے۔ تھوڑی سی بحث و مباحثہ کے بعد درزی نے تسلیم کر لیا کہ اس نے کپڑا بچلایا ہے۔ وہ شخص غصے میں پہلے والے درزی کے پاس گیا اور پھنکارے ہوئے بولا۔

”تم تو کہتے تھے کپڑا کم ہے جبکہ تمہارے مقابل نے اسی کپڑے سے نہ صرف میرا سوٹ بنایا ہے بلکہ اپنے لڑکے کا بھی بنادیا۔“

درزی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔ ”اس لڑکے کی عمر کیا ہے؟“

”پانچ سال۔“ آدمی نے اچنبھے سے جواب دیا۔

”جناب! تو میرے بیٹے کی عمر اٹھارہ سال ہے۔ میں کیسے سی سکتا تھا۔“ درزی نے متانت سے جواب دیا۔

(شگفتہ فیاض۔ مٹی گن امریکا)

ذمہ دار

ایک نوجوان لڑکی نے اچانک سیرو تفریح سے توبہ کر کے مذہب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ سیادری صاحب نے اس کے ذوق و شوق سے متاثر ہو کر لڑکی سے پوچھا۔

”بہٹی! کیا تم پہلے انسان کا نام بتا سکتی ہو؟“

”ہیں۔“ لڑکی نے بگڑ کر جواب دیا۔ ”میں اس ذلیل انسان کا نام بھی اپنے منہ سے لینا گناہ سمجھتی ہوں، جس نے مجھے اس حالت پر پہنچا دیا ہے۔“

(ابنی اسلم۔ ہجرت کالونی)

عام سے لوگ

ساحلی مقام پر بہت سے لوگ پنک منانے آئے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ فاصلے پر دو ٹکٹے، ٹکٹو اور کابل آدمی بھی درخت کے سائے میں لیٹے ہوئے تھے۔

ایک ننھا پنک منانے والوں کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”مجھے یہ لوگ بہت زہر لگتے ہیں، جو یہاں پنک منانے آتے ہیں۔“

”مجھے بھی۔“ دوسرے ٹکٹے نے فوراً تائید کی۔

ان کے سامنے تو ہم بھی بالکل ان ہی جیسے عام سے لوگ لگتے ہیں۔“

(جویریہ وہاب۔ ملتان)

انکار

دو شرابی گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔

”یار! اناس دنیا کی سب سے خشک جگہ ہے۔ وہاں شراب پر سخت پابندی ہے۔ ہزار کوششوں کے باوجود کہیں سے ایک قطرہ شراب بھی نہیں ملتی۔ ہاں اگر سانپ کاٹ لے تو علاج کے لیے جھنی چاہو شراب لے لو مگر مشکل یہ ہے کہ پورے شہر میں صرف ایک سانپ ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے بارہ گھنٹے تک قطار میں کھڑے رہ کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑا۔ بارہ گھنٹے بعد جب میری باری آئی تو وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس نے مجھے کانٹے سے انکار کر دیا۔“

(الماس ثویب۔ ہزارہ)

پریشانی

دو روحیں آسمان پر پرواز کر رہی تھیں۔ ایک روح بار بار ٹھنڈی آہ بھر رہی تھی۔ دوسری روح نے اس کی بے چینی کی وجہ پوچھی۔

”میرے دوست! نیچے زمین پر میری بیوی کی حالت بہت خراب ہے۔“

”ارے! تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ وہ جلد تمہارے پاس آجائے گی۔“ دوسری روح نے اسے جوش دلایا۔

”مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے تو پریشان ہوں۔“ پہلی روح افسردگی سے بولی۔

(سرت جہیں۔ ڈیفنس)

ڈائریکٹری

ایک نوجوان عورت بہت دیر سے ایک چھوٹی سی دکان میں ٹیلی فون ڈائریکٹری دیکھ رہی تھی۔ ایک صاحب اس کے پیچھے ڈائریکٹری خالی ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ خاتون بے نیازی سے ڈائریکٹری کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ کافی دیر بعد جب ان صاحب سے صبر نہ ہو سکا تو خاتون کو مخاطب کر کے بولے۔

”بی بی! اگر آپ کو تکلیف نہ ہو ایک منٹ کے لیے ڈائریکٹری مجھے دے دیں۔ میں اپنا مطلوبہ نمبر دیکھ کر فوراً آپ کو واپس کر دوں گا۔“

”بی بی! اگر آپ کو تکلیف نہ ہو ایک منٹ کے لیے ڈائریکٹری مجھے دے دیں۔ میں اپنا مطلوبہ نمبر دیکھ کر فوراً آپ کو واپس کر دوں گا۔“

”بی بی! اگر آپ کو تکلیف نہ ہو ایک منٹ کے لیے ڈائریکٹری مجھے دے دیں۔ میں اپنا مطلوبہ نمبر دیکھ کر فوراً آپ کو واپس کر دوں گا۔“

اخلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:-
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی آدمی جو کی روٹی اور
بد ذائقہ چربی کی دعوت دیتا تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم
اسے قبول فرمایا کرتے (اور اپنا سب کچھ دوسروں پر
خرچ کرنے کا عالم یہ تھا کہ آپ کی ایک ذرہ ایک یہودی
کے پاس دین رکھی ہوئی تھی اور انتقال تک آپ کے
پاس اتنا مال جمع نہ ہو سکا کہ جسے دے کر آپ اس
ذرہ کو یہودی سے بچھڑا لیتے۔)

قلم کے موجد

امام ابن اسحاق نے کہا ہے کہ حضرت ادریسؑ
ہی نے سب سے پہلے قلم سے لکھا، ان کی پیدائش کے
وقت حضرت آدم علیہ السلام زندہ تھے اور آدم علیہ السلام
کی وفات کے وقت ان کی عمر تین سو آٹھ سال تھی۔

وقت مختلف لوگوں کی نظر میں

وقت کو سمجھنے سے مت پکڑو اسے آگے سے روک
کراس پر قلم پانے کی کوشش کرو۔
(نیوٹن)

وقت عام مسالے کی مانند ہے جس سے آپ جو کچھ
چاہیں بنا سکتے ہیں۔ (امام غزالیؒ)
وقت ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کے
بیسر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر محنت کی جائے تو یہ
زمین پھل دیتی ہے اور بیکار چھوڑ دی جائے تو
اس میں خار و جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔

(افلاطون)

وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت
ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علیؑ
کو بوسہ دیا۔ اس وقت آپ کے پاس اقرع بن حابس
قیسی بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔
”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے تودس لڑکے
ہیں۔ میں نے تو کبھی ایک کو بھی نہ مل جو ماں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا۔
”جو شخص رحم نہ کرے اس پر (اللہ کی طرف سے بھی)
رحم نہیں کیا جائے گا“

محنت کی عظمت

حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا
آٹھ گوندھتیں تو لقا بہت اور بھوک کی وجہ سے ان کے سر
کے بال لٹکن سے ٹکراتے۔
حضرت مطلب بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں
حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو تمام مسلمانوں کے سردار حضرت
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں دہن بن کر آئیں اور
رات کے آخری حصے میں انہیں پینے لگیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ مہربان تھے۔ اللہ کی
قسم محنت سردی کی صبح کو جو بھی غلام یا باندی یا بچہ آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پانی لاتا (تاکہ آپ اسے
استعمال کریں اور پھر وہ اسے برکت کے لیے واپس لے
جائے) تو آپ انکار نہ فرماتے بلکہ (محنت سردی کے
باوجود) اس پانی سے چہرہ اور ہاتھ دھو لیتے۔

ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتے ہوئے ذوالفقار صاحب
نے اپنی بیگم سے کہا۔
”جی! مجھے بھی اخبار دیکھ کر ہی پتا چلا ہے کہ ہم لوگ
اس سے کتنے لطف اندوز ہوئے تھے۔“ بیگم نے تائید
کی۔

(نیرانیس۔ ناظم آباد)

اطمینان

کورٹ میں فیصلہ ہوا کہ 90 فیصد سردار بے وقوف
ہوتے ہیں۔ اس پر سرداروں نے کافی شور مچایا۔ پھر
فیصلہ ہوا کہ 10 فیصد سردار بے وقوف نہیں
ہوتے۔ تب جا کر سردار ٹھنڈے ہوئے۔
(عزیمہ شہزاد۔ لید)

تاکید

ایک خاتون نرسنگ کے پیشے میں پچیس سال مکمل
کر کے ریٹائر ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو بھی
نرسنگ کا کورس کروایا تھا۔ اسے ان کی جگہ پر فوراً
نوکری مل گئی۔ ڈیوٹی پر جانے سے قبل انہوں نے
اپنے بیٹی کو تاکید کی۔
”نرسنگ میں کامیابی کے دو گرہ ہیں۔ پہلا یہ کہ
مریض سے جو بھی وعدہ کرو اسے ضرور پورا کرو۔ چاہے
آندھی آئے یا طوفان۔“
”اور دوسرا ای جان! بیٹی نے پوچھا۔
”کبھی وعدہ نہ کرو۔“ ریٹائر نرس نے فوراً جواب

(صائمہ مصطفیٰ۔ کورنگی)



”برائے مہربانی ذرا جلدی واپس کیجیے گا۔“ خاتون
نے ڈائریکٹری ان صاحب کے حوالے کرتے ہوئے
کہا۔ ”میں اپنے گھر آنے والے ایک نئے مہمان کے
لیے کوئی خوب صورت سا نام تلاش کر رہی تھی۔“
(رشیدہ تول۔ اورنگی ٹاؤن)

امتا

ایک ماں نے اپنے بچے کو اسکول میں داخل
کرواتے ہوئے کہا۔
”میرا بچہ بہت حساس ہے۔ اسے سزا ہرگز نہ دیجیے
گا۔ اگر یہ اتفاق سے شرارت کر بیٹھے تو اس کے برابر
والے بچے کو زور سے پھڑکار دیجیے گا۔ یہ خود بہ خود
سمجھ جائے گا۔“

(بینا صدیقی۔ کورنگی)

فیملی ممبر

فیصل اپنی محبوبہ کے والد سے مل کر آیا تو اس کے
دوست نے پوچھا۔
”کوئی بچہ! کیسی رہی تمہاری ملاقات۔ انہوں نے
تمہیں پسند کر لیا؟“
”یہ تو مجھے اندازہ نہیں ہوا ابھی۔“ فیصل تذبذب
سے بولا۔ ”مگر انہوں نے باتوں کے دوران میرے دو
سگریٹ پی لیے اور مجھ سے دو ہزار روپے ادھار بھی
لے لیے۔“
”ارے سمجھو! بات کی ہو گئی۔“ فیصل کے
دوست نے جوش سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر
کہا۔ ”انہوں نے تو پہلی ملاقات میں ہی تم سے فیملی
ممبر جیسا سلوک شروع کر دیا۔“
(افشاں فرقان۔ نخی حسن)

اندازہ

”رسول والی محفل موسیقی کی رپورٹ اخبار میں پڑھ
کر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ محفل کتنی کامیاب ہوئی
تھی۔“

وقت بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔

(ارسطو)

وقت روٹی کے گالوں کی مانند ہے جس کا اسراف واجب نہیں۔ یاد رکھو تم دولت کما سکتے ہو، وقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ (فرینکلن)

آپ سرور ہوں یا مغنوم، تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔ (پتولین بونا پارٹ)

ارم کمال - فیصل آباد

غور طلب،

کوئی لمحہ دوبارہ نہیں آتا۔ کوئی دن دوبارہ نہیں آسکتا نہ یوم پیدا نش دوبارہ آتا ہے نہ یوم وصال کسی یوم کو مٹانے کا تصور غور طلب ہے۔

دین و دنیا،

جس شخص کے بیوی بچے اس سے راضی ہیں، اس کی دنیا کامیاب ہے اور جس کے مال باپ اس سے خوش ہیں، اس کا دین کامیاب۔ (واصف علی واصف)

خوشامد،

دو انسانوں کے مابین ایسے الفاظ، جو سننے والا سمجھے کہ سچ ہے اور کہنے والا جانتا ہو کہ جھوٹ ہے۔ خوشامد کہلاتے ہیں۔ (واصف علی واصف)

عمل،

شکر و نعت محفوظ ہو جائے گی۔ دسترخوان کشادہ کرو، رزق بڑھ جائے گا۔ سجدہ کرو، تقریب ملے گا، عزت کرو عزت ملے گی۔ صدقہ دو، بلائیں جائے گی۔ توبہ کرو، گناہ معاف ہو جائے گا۔ (واصف علی واصف)

تین آفتوں کا خوف،

ایک بزرگ نے بعض لوگوں کو ایک جنازہ کے پیچھے جلتے دیکھا کہ وہ میت پر بڑا ترس کھا رہے تھے اور مہربانی کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ فرمانے لگے ”تم لوگ اپنے اوپر ترس کھاؤ تو بہتر ہوگا اور یہ شخص تو فوت ہو گیا اور تین آفتوں سے نجات پا چکا۔

- 1- ملک الموت کا منظر۔
- 2- موت کا تلخ ذائقہ۔
- 3- خاتمہ کا خوف۔

مسرت الطاف احمد - کراچی

مال کی دُعا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ جنت میں میرے ساتھ کون ہوگا؟ ارشاد ہوا ”فلاں قصاب ہوگا“ آپ کچھ حیران ہوئے اور اس قصاب کی تلاش میں چل پڑے۔ وہاں دیکھا تو ایک قصاب اپنی دکان پر گوشت بیچنے، فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ اپنا کاروبار ختم کر کے اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا کھینچ لیا۔ اس پیشا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قصاب کے گھر کے بارے میں مزید معلومات جاننے کے لیے بطور مہمان گھر چلنے کی اجازت چاہی۔

گھر پہنچ کر قصاب نے گوشت کو پکایا پھر روٹی پکا کر اس کے ٹکڑے شوربے میں نرم کیے اور دوسرے کپڑے میں چلا گیا۔ جہاں نہایت کمزور بڑھیا پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ قصاب نے بمشکل اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ایک ایک لقمہ اس کے منہ میں دیتا رہا۔ جب اس نے کھانا تمام کیا تو بڑھیا کا منہ صاف کیا۔ بڑھیا نے قصاب کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر قصاب مسکرایا اور بڑھیا کو لیٹا کر واپس باہر آ گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا ”بڑھیا نے کیا کہا؟“ تو قصاب نے کہا۔ ”یہ میری ماں ہے اور روزیہ دُعا دیتی ہے کہ جنت میں تمہیں یعنی مجھے حضرت موسیٰ کا ساتھ نصیب ہو۔“

نوال افضل گھمن - گجرات

خلیل جبران نے کہا،

ہم اپنی زندگی کے دکھ اپنے خود ساختہ خیالات اور رجحانات سے خریدتے ہیں اور باقی کے دکھ ان سب کا ردِ عمل ہوتے ہیں۔

حنان سلیم اعوان - آخون باندی ہری پور

حروفِ زہرا،

جج مومن کی جان اور اس کا مال، اس کے ایمان کی وجہ سے قیمتی ہو گیا اور ایمان سے محروم، کافر کی جان

اور اس کا مال مٹی کا ڈھیر۔ جج لوگوں کی عدم توجہ، تنہائی، بے کسی، رذی کی ٹوکری، کبارِ خانہ، پھر جوہنے کی آگ، لاکھ کا ڈھیر، یہ سارے عذاب محبوب سے تعلق منقطع ہونے کی سزا ہیں۔

جج بدگمان انسان اپنے اعمال نامے کو دوسروں کے اعمال نامے سمجھ کر پڑھتا ہے۔

جج سانپ کا زہر سانپ کے لیے زندگی ہے۔ غیروں کے لیے موت ہے۔ پانی، پانی کے جانوروں کے لیے زندگی اور خاکیوں کے لیے موت۔

جج عبرت اور آگاہی نہ تو صرف کتاب سے حاصل ہوتی ہے اور نہ گفت گو سے، بلکہ یہ توشا کا عطیہ ہے جسے چاہے عطا کرے۔

جج گناہوں کی بدبو کی وجہ سے ہماری دعا میں مردہ ہو جاتی ہیں۔

ایقہ انا - چکوال

حجاب،

حجاب محض عورت کا پردے میں چھپ جانا اور سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کی ایڑی تک اپنے آپ کو دھانپ لینا ہی نہیں۔ نایہ کہ عورت کو گھر کے کسی کونے میں بند کر دیا جائے۔ جہاں سے اسے نکلنے کی اجازت نہ ہو بلکہ حجاب یہ ہے کہ عورت باعزت طریقے سے اپنا تبرُّد چھپائے

اور اپنی زینت کو دوسرے سے چھپائے۔ اور معاترے کی فلاح میں اپنا کردار باوقار طریقے سے ادا کرے۔ عطیہ افضل - جہلم

قرآن کریم کی پیش گوئی،

ایک سمندر جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن کے قریب ہے۔ اس کا ذکر چودہ سو سال پہلے قرآن میں ہو چکا ہے۔ جبکہ اس کی دریافت بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی۔ اس کی خصوصیات یہ ہیں کہ ایک طرف میٹھا پانی اور دوسری طرف کڑوا پانی ہے اور یہ آپس میں مکس نہیں ہوتا۔

قرآن کے اس سائنسی بیان کی تصدیق امریکی یونیورسٹی آف کولورڈو کے بحری سائنس دان ڈاکٹر ولیم جے نے بھی کی ہے۔

”اس نے دو سمندر ملا دیے جو باہم ملتے ہیں۔“ ان دونوں کے درمیان ایک آرٹ ہے۔ رکاوٹ ہے۔ اور وہ اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔

نوال افضل گھمن - گجرات

انمول موتی،

بہتر نیت کتنی بھی اچھی ہو، دنیا تمہیں تمہارے دکھاوے سے جانتی ہے، اور دکھاوا کتنا بھی اچھا ہو، اللہ تمہیں تمہاری نیت سے جانتا ہے۔

بہتر دو چیزیں زندگی کی وضاحت کرتی ہیں۔

1- آپ کا صبر، جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

2- آپ کا رویہ، جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔

بہتر جب دُعا اور کوشش سے بات نہ بنے تو فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو، اللہ اپنے بندوں کے بارے میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

رضوانہ شکیل داؤد - لودھراں

حضرت علیؑ نے فرمایا،

جو شخص لالچ کرتا ہے، اس کی روزی میں تواضع

شاعری کے بولچہ

ارم حنیف

یہ اب جو آگ کا دریا میرے وجود میں ہے
یہی تو پہلے پہل تھا شرر اداسی کا

محسن نقوی کی تو کیا ہی بات ہے۔ محسن نقوی
کی شاعری سے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر انسان کے دل
کی آواز ہو۔ محسن نقوی کی یہ غزل آپ کے نام۔
اے اُس کو فرصت ہی نہیں وقت نکالے محسن
ایسے ہوتے ہیں بھلا چاہنے والے محسن

یاد کے دشت میں بھرتا ہوں ننگے پاؤں
دیکھ تو آگے کبھی پاؤں میں چھلے محسن

کھو گئی صبح کی امید اور اب لگتا ہے
ہم نہیں ہوں گے کہ جب ہوں گے اگلے محسن

حاکم وقت کہاں، میں کہاں، عدل کہاں
کیوں نہ خلقت کی زباں پر لگائیں تلے محسن

وہ جواک شخص متاعِ دل و جاں تھا نہ رہا
اب بھلا کون میرے درد سنبھالے محسن

میر نیازی عمر حاضر کے شاعر۔ میرے علاوہ اور
بہت سے باذوق صاحبِ دل کی پسند ہے۔ لہذا
ان کی ایک نظم۔

میری دعا میں پچیدہ بہت ہیں
شام کا وقت ہے
دعاؤں کی منظوری کا وقت ہے
میں کن دعاؤں کو یاد کروں
میری دعا میں پیچیدہ بہت ہیں

شاعری کے بارے میں کیا کہوں۔ میری نظر میں
شاعری احساسات کی ترجمانی کا آسان ذریعہ ہے شاعری
زندگی کی تلخ و شیریں حکایات کا بیان بھی ہے۔ اب
چلتے ہیں سب سے پہلے علامہ اقبال کی طرف۔ شاعری
کی بات ہو اور سب سے پہلے علامہ اقبال کا ذکر نہ ہو
یہ نا انصافی ہوگی۔ علامہ اقبال کی غزل کے کچھ اشعار۔
سے نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
تیرا سفینہ ہے تکر بے کراں کے لیے

ذرا سی بات تھی اندیشہ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیب داستان کے لیے

غم اور خوشی زندگی کا حصہ ہے لیکن پھر بھی جب
کوئی اپنا دود ہو تو اداسی ہی ہو جاتی ہے۔ اداسی
میں ایک خوبصورت سی احمد فراز کی غزل آپ سب
کے لیے۔

تھکا گیا ہے سلسل سفر اداسی کا
اور اب تھی ہے میرے شانے پہ سرا اداسی کا

وہ کون کیمیا گر تھا کہ جو بکھیر گیا
تیرے گلاب سے چہرے پہ نر اداسی کا

میرے وجود کے خلوت کدے میں کوئی تو تھا
جو رکھ گیا ہے طاق پہ سرا اداسی کا

میں تجھ سے کیسے کہوں یاد مہربان میرے
کہ تو علاج نہیں ہے میری ہر اداسی کا

انیس فاطمہ۔ انیس فاطمہ
کئے دنوں میں محبت مزاج اس کا تھا
مگر کچھ اودھی انداز آج اس کا تھا
میں کیا بتاؤں کہ کیوں اس نے بے وفائی کی
مگر یہی کہ کچھ ایسا مزاج اس کا تھا

تسلیم اختر۔ تسلیم اختر
گیسوئے شام میں ایک ستارہ، ایک خیال
دل میں لیے پھرتے ہیں تمہارا ایک خیال
یوں بھی ہوا ہے دل کے مقابل دُنیا تھی
پھر بھی نہ ہارا پھر بھی نہ ہارا ایک خیال

نزال افضل کھن۔ نزال افضل کھن
کیسی محبت، کیسی چاہت ہم پر سب کچھ روشن تھا
یونہی ذرا سا شوق ہوا تھا، اُد ڈل بر باد کریں
طاہرہ ملک۔ طاہرہ ملک
اس زمانے میں دوستوں کا خلوص
جس نے دیکھا نصیب سے دیکھا
وہ تو بالکل وفا سے عاری تھے
ہم نے جن کو قریب سے دیکھا

آمنہ اجالا۔ آمنہ اجالا
شام سے آنکھ میں نمی سی ہے
آج پھر آپ کی کمی سی ہے
دفن کر دو ہمیں کہ سانس آئے
نبض کچھ دیر سے تھی سی ہے
ثمرین اکرام۔ ثمرین اکرام
میر بچہ خاص
میں زندگی کی جنگ میں ہارا ضرور ہوں
لیکن کسی محاذ پر پسپا نہیں ہوا



نائلہ، شاملہ۔ نائلہ، شاملہ
جب اُس کو جتنا ہی بار پھرے
تو کھلے زندگی بھر کا جوا کون
گزدنی رات نے جب سادھ لی ہے
نہ جانے آتے جاتے رُک گیا کون

رقیہ اسماعیل۔ رقیہ اسماعیل
ملے تو خیر، نہ ملنے پر رنجشیں کیسی
کہ اس سے اپنے مراسم تھے پرستے ایسے
رفاقوں سے مرا ہوں، مسافروں سے نہیں
سفر وہی تھے مگر ہم سفر نہ تھے ایسے

ذوباریہ خالد۔ ذوباریہ خالد
کسے خبر وہ محبت تھی یا رقابت تھی
بہت سے لوگ مجھے دیکھ کر ہمارے ہوئے
اب اک ہجوم شکستہ دلال ہے ساتھ اپنے
جنہیں کوئی نہ ملا ہم سفر ہمارے ہوئے

نزدہت ریاض۔ نزدہت ریاض
یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نباتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی

نمرہ، اقرأ۔ نمرہ، اقرأ
ہم جو پاگل تھے تو بے وجہ نہیں تھے پاگل
ایک دُنیا تھی مگر اس کی دوانی لوگو
حیلہ جو ویسے بھی ہوتے ہیں زمانے والے
اس پہ آئی نہ ہمیں بات چھپانی لوگو

آسیہ جاوید۔ آسیہ جاوید
اہل دل کی انجمن میں آ کبھی
ان کی دُنیا یاد جانی اودھے
نامہ بر کو کچھ بھی ہم پیغام دیں
داستان اس نے سنائی اودھے

ماریہ چودھری۔ ماریہ چودھری
بہت سے لوگ تھے گل مل کے سب باتیں کیں
وہ جس کو میں نے نہ دیکھا میری نظر میں رہا
کچھ اس طرح سے گزری ہے زندگی جیسے
تمام عمر کسی دوسرے کے گھر میں رہا

دستک دستک

شاہین رشید

نہیں سکتی۔
”کوئی سیلری وغیرہ طے نہیں کی؟ اور پھر کہاں کہاں کام کیا؟“

”ارے! ہمیں کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ ہم تو بس بولنے جاتے تھے اور بول بول کر اپنی مرضی کے گانے چلا کر گھر واپس آ جاتے تھے۔ خوشی بہت ہوتی تھی ظاہر ہے ہم چھوٹے تھے۔ بس پروگرام کر کے خوش ہو جاتے تھے۔“

تھے۔ چھ مہینے کے بعد اس چینل کو چھوڑ کر ایف ایم 94.6 کو جوائن کیا۔ یہ نیارڈیو اسٹیشن تھا۔ اس میں صرف چھ آوازیں تھیں اور ان میں ایک میں بھی کھی پورا ایک سال ان کے ساتھ کام کیا۔ پھر میں نے ایف ایم 105 جوائن کر لیا اور اب تک یہیں ہوں۔“

ریڈیو سے لی وی تک کا سفر کیسے ہوا؟
”ریڈیو سے لی وی تک سفر کرنے کا میرا کوئی راہہ نہیں تھا۔ یہاں سے بھی خود بخود ہی آفر آئی تھی۔ ہوا یہ کہ آج سے دو تین سال قبل لی وی کے پروڈیوسر آفتاب عظیم صاحب نے مجھے رمضان کے سارے پروگرامز کی آفر دی تھی وہ ریکارڈ پروگرام تھے چونکہ ان سے ہمارے فیملی تعلقات ہیں۔ تو میں انکار نہ کر سکی اور پورے رمضان کے پروگرام میں نے کر دیے۔ وہ رمضان سیریز انڈس ویژن سے بھی چلی اور میٹروون لی وی سے بھی۔ اب جب اس سال میٹروون اپنی سحری کی ٹرانسمیشن کر رہا تھا تو اس نے چونکہ میرے پہلے پروگرام نہ صرف دیکھے ہوئے تھے بلکہ چلائے چکی تھے تو انہوں نے لائسنسیشن کے لیے مجھ



تحریم منیبہ

”کیسی ہو تحریم؟ اور ریڈیو پر کام کیسا جا رہا ہے؟“
”میں ٹھیک ٹھاک۔ اللہ کا شکر ہے اور ریڈیو بھی ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔“

”ریڈیو کی فیلڈ میں اتفاق“ آپ میں یا شوق لایا ہے؟
”ریڈیو کی فیلڈ میں اتفاق سے آئی ہوں۔ کیونکہ سچی بات ہے کہ مجھے ریڈیو کی وی پیہ کام کرنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ نہ بڑے ہو کر نہ بچپن سے۔ یہ تو اللہ نے عزت دے دی ہے ورنہ میں نے کوشش بالکل نہیں کی تھی۔“

”اچانک جاب ملنے پر کیا تاثرات تھے؟“
”جاب ملنے پر تاثرات تو اچھے تھے ہی۔ مگر اس سے کہیں زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ مجھے بولنے کا موقع ملے گا۔ کیونکہ بولنے کی عادت مجھے بچپن سے ہے اور کہیں بھی بولنے کا موقع ملے تو میں بولنے بغیر رہ

میں نیازی کی نظم کے بعد اب اپنا تعارف بھی کروادوں۔ میرا نام ارم حنیف ہے۔ میں تحصیل و ضلع منڈی بہاؤ الدین کے ایک چھوٹے سے گاؤں ڈھوک کاسب میں رہتی ہوں۔ میرے خیال سے اتنا تعارف کافی ہے۔ بنم الثاقب کیا خوب کہتے ہیں۔

اس کو تو پچھڑنے کے ڈھنگ بھی نہیں آتے
مجھ سے دور رہ کر بھی قریبوں میں رہتا ہے

ایک ایسے انسان سے مجھ کو نہیں رسم جو
دوستی نہیں کرتا دوستوں میں رہتا ہے

دوسروں کی طرح میرے بھی پسندیدہ متفرق اشعار تو بہت سے ہیں مگر ابھی میں دہی فلم بند کیے دیتی ہوں جو میرے فکریں ہیں۔ امید ہے آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔

کتنی سدھر گئی ہے جدائی میں زندگی
ہاں وہ خفا ہے مجھ پر احسان کو کر گیا
(خالد شریف)

اس آخری نظر میں عجب درد تھا
جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا
(میں نیازی)

کوئی غم ہو کوئی دکھ ہو درد کوئی ہو عذیم
مسکرائی ہی پر جانا ہے زمانے کے لیے
(عذیم)

اس قدر قیمتی تو نہ تھا میرا چین و سکون عسی
لوٹ کر لے گئے وہ کسی انمول خزانے کی طرح
(محسن نقوی)

پلیز آپ لوگ یہ ضرور بتائیے گا کہ آپ
کو میرا عام سا شاعری کا انتخاب کیسا لگا،



دنیائے شاعر سے منتخب شاعری ادب
عمران ڈائجسٹ
Email: id@khawateendigest.com



انٹراٹولیہ کا پاسپان
اس روز کی کہانی ہے کہ یہاں ہنگو 18 سالہ لڑکا ہے جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

داسی
دو دو سالہ لڑکی ہے جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

جادوگر
ایک بچہ تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

عذاب
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

دیا اور طوفان
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

رقص اجل
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

قیامت سے قیامت تک
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

خوشی
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

نئی بھرتی
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

روزی قتل کیس
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

گناہ گار
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

ادھوری سازش
ایک لڑکا تھا جس کی والدہ 18 سال کی تھیں۔

جنوری 2013 کا تازہ شمارہ آج برآمد

سے رابطہ کیا۔ تو میں نے ان سے کہا کہ میں نے ریڈیو لائیو پروگرام بہت کیے ہیں اور ریکارڈڈ پروگرام نی وی سے بہت کیے ہیں، لیکن ابھی نی وی سے لائیو پروگرام نہیں کیے اور پھر وہی بات کہوں گی کہ مجھے نی وی پہ آنے کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔

”بھئی ایسا ہوا کہ تم کچھ بولنا چاہ رہی ہو اور بول نہیں پا رہی اور کہہ دیا کہ ہم ایک وقفہ لیتے ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ ایسا آج تک نہیں ہوا۔ پورے مہینے پروگرام بہت اچھے گئے اور سب نے بہت پسند بھی کیے۔ چونکہ بچپن سے باتوں ہوں اس لیے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔“

”وائس اور میں کیا کیا کیا؟“

”وائس اور میں پاکستان کے تقریباً تمام مشہور برانڈز کے کمرشل کر چکی ہوں۔ آج کل بھی میرے پانچ چھ کمرشلز آن ایر ہیں۔“

”اپنی نعت اور حمد کوئی کی سی ڈیز بنوائیں اور کوئی ایوارڈز وغیرہ ملے آپ کو؟“

”سی ڈیز اس لیے نہیں بنوائی، کیونکہ پچھلے کئی سالوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ لوگ بہت بھرم مارتے ہیں کہ ہماری اتنی سی ڈیز آچکی ہیں۔ اور میرے



نزدیک یہ کوئی معیار نہیں ہے۔ میں نے آج تک نہ کوئی سی ڈی بنوائی ہے اور نہ ہی کوئی ارادہ ہے۔ مجھے گورنمنٹ آف سندھ نے 2007ء میں بہترین نعت خواں کا ایوارڈ دیا تھا۔ میں اس وقت سترہ سال کی تھی اور کم عمر ترین نعت خواں تھی جس کو اتنا بڑا ایوارڈ ملا تھا۔“

نور حسن

شوہز کے کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنے کام سے پہچانے جاتے ہیں۔ نور حسن بہت اچھے آرٹسٹ ہیں مگر ان کی پہچان مشہور سیریل ”ہم سفر“ ہے۔ جی بی خضر ہیں۔

”جی بی نور حسن صاحب! کیسے ہیں؟“

”الحمد للہ! ٹھیک ہوں۔“

”اب لوگ آپ کو آپ کے نام سے پہچاننے لگے یا ابھی بھی خضر کے نام سے ہی بلائے جاتے ہیں؟“

”میں تو کوشش کرتا ہوں کہ لوگ مجھے میرے نام سے ہی بلا لیں، لیکن لوگوں کے ذہنوں پر ابھی تک خضر ہی سوار ہے۔ وہ ابھی تک میرے کردار سے باہر نہیں آئے ہیں۔“

”آج کل کوئی نیا ڈراما نظر نہیں آ رہا آپ کا۔ خیریت؟“

”ہاں جی بالکل خیریت ہے۔ جب میرے ڈرامے آن ایر آئیں گے تو پھر ایک ساتھ ہی آئیں گے کیونکہ کام تو کافی ہو رہا ہے اور ویسے آج کل مختلف چینلز سے ایک دو ڈراما سیریل آن ایر بھی ہیں۔“

”کام کے لیے کسی خاص چینل کو منتخب کرتے ہیں یا سب کے ساتھ کام کرتے ہیں؟“

”کسی خاص چینل کے لیے نہیں بلکہ ہر اچھے پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ کام کے لیے میرا انتخاب چینل نہیں بلکہ اچھا کردار ہوتا ہے۔“

”آپ نے نیگیٹو رول کیا ”ہم سفر“ میں پھر ایک

آدھ ڈرامے میں بھی کیا۔ کیا ہمیشہ نیگیٹو رول کو ترجیح دیں گے؟“

”ہمیشہ تو نہیں، لیکن اگر کوئی اچھا نیگیٹو رول ملا تو ضرور کروں گا۔ کیونکہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اگر میں نوجوان ہوں تو ہمیشہ ہیرو کے رول ہی کروں۔ میں ایک فنکار ہوں اور فنکار کو ہر طرح کے رول کرنے چاہئیں۔“

”مگر ہمارے یہاں تو یہ ٹریجڈی ہے کہ اگر کوئی نیگیٹو میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ ہمیشہ نیگیٹو ہی کو ترجیح دیتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں ہر طرح کے رول کر کے یہ ثابت کروں گا کہ میں ہر طرح کے رول کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ میں سال میں ایک پروجیکٹ ایسا کروں گا جس میں میرا نیگیٹو رول ہو گا۔“

”آپ لیویا کے شہر طرابلس میں پیدا ہوئے۔ پاکستان آنے کی وجہ؟“

”میں جب پانچ سال کا تھا تو پاکستان آیا اور ظاہر ہے کہ اس وقت میری عمر ایسی نہیں تھی کہ میں ضد کرنا کہ مجھے یہاں رہنا ہے۔ میری بنیادی تعلیم پاکستان میں ہوئی البتہ ایم ایس سی مارکیٹنگ میں نے یوگے سے کیا۔“

”اب دل چاہتا ہے کہ کہیں باہر شفٹ ہو جاؤں؟“

”نہیں بالکل بھی نہیں۔ مجھے پاکستان سے بہت محبت ہے اور میں اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پاکستان نے مجھے عزت دی اور شہرت بھی۔ میں کسی اور ملک میں ہوتا تو شاید اتنا کامیاب نہ ہوتا۔“

”گھر والوں نے شوہز میں آنے کی اجازت آسانی سے دی؟“

”بالکل! آسانی سے دی، کیونکہ اس معاملے میں میرے والدین کا موقف یہ ہے کہ بچے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ انہیں کسی فیلڈ میں جانے کے لیے فورس نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب میں اس فیلڈ میں آیا تو میرے گھر والوں نے میری حوصلہ افزائی ہی کی۔“

”آپ نے اس فیلڈ میں آنا چاہا اور آپ آگئے۔ آپ کی محنت کو دخل ہے یا آپ کی قسمت کو؟“

”میں تو سمجھتا ہوں کہ جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی ملتا ہے مجھے اس فیلڈ میں آنا تھا کامیاب ہونا تھا قدرت کی مہربانی سے میں کامیاب ہوتا چلا گیا۔“

”اپنے ڈراموں کو دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟“

”اپنے ڈراموں کو بہت تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں۔ پھر انہیں دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایک فنکار اسی طرح دیکھتا ہے۔“

”مشہور ہونا اچھا تو لگ رہا ہو گا؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ فیمس ہونا کیسے اچھا نہیں لگتا۔ جب لوگ مجھے پہچانتے ہیں میری تعریف کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“

”شہرت بھی ایک امتحان ہے انسان کا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ یہ بھی اللہ کی آزمائش ہوتی ہے کہ میرا بندہ میری مہربانیوں پہ کتنا شاکر ہوتا ہے یا دل میں کتنا غرور پیدا کرتا ہے۔“

”آپ ماڈلنگ بھی کرتے ہیں۔ آپ کو ایک فلم کی پیشکش ہوئی تھی۔ انکار کیوں کیا آپ نے؟“

”انکار اس لیے کیا کہ مجھے سزا پسند نہیں آیا تھا اور ماڈلنگ تو میں اداکاری سے پہلے ہی کر رہا ہوں۔“

”کھانے پینے کا شوق ہے؟“

”کھانے پینے کا بہت شوق ہے۔ زیادہ تر گھر کا کھانا کھاتا ہوں۔ اپنی ماں کے ہاتھوں کا کھانا زیادہ پسند ہے۔ رات کا کھانا اکثر دوستوں کے ساتھ باہر کھاتا ہوں۔“

بینش ناصر خان۔ ایف ایم 91

”بینش کیسی ہیں؟“

”جی! اللہ کا شکر ہے۔“

”آپ اتنی مصروف رہتی ہیں۔“



”اور میں حیران ہو گئی کہ اتنی جلدی تم اٹھ بھی جاتی ہو۔ خیر! لائیکائز میں کبھی مشکل کا سامنا ہوا؟“

”کائز تو ایسی ویسی آتی ہی رہتی ہیں، کیونکہ سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مگر ہمیں بھی ایسے لوگوں سے بات کرنی آتی ہے جو تھوڑے ”اور“ ہو جاتے ہیں۔ بڑی تمیز کے ساتھ اور بڑے احترام کے ساتھ ان سے بات کر کے سمجھاتے ہیں، کیونکہ ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ آج ہم جو کچھ بھی ہیں اپنے سامعین کی پسندیدگی کی وجہ سے ہی ہیں مگر میں کسی گولائین کر اس نہیں کرنے دیتی۔“

”ریڈیو کے لیے جو ٹریننگ آپ کی ہوئی۔ آپ اس کو نئے لوگوں میں منتقل کرتی ہیں؟ ریڈیو مشکل میڈیا ہے یا آسان ہے؟“

”میری جو ٹریننگ ہوئی ہے یقیناً میں اس کو دوسروں تک منتقل کرتی ہوں اور ریڈیو ایک مشکل اور چیلنجنگ میڈیا ہے کیونکہ ہمیں آواز کے ذریعے ہی سامعین کو متاثر اور مطمئن کرنا ہوتا ہے۔ ان کو انٹرٹین کرنا ہوتا ہے اور ہماری ٹریننگ اس انداز میں ہوتی ہے کہ چاہے ہمارا کیسا ہی موڈ کیوں نہ ہو ہم اپنے سامعین کو پتا نہیں لگنے دیتے کہ موڈ خراب ہے یا ہم پریشان ہیں یا کسی سے ناراضی ہے یا ہماری طبیعت خراب ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے دوسروں کا کیا قصور ہے کہ ہم ان کو اپنی باتوں سے بور کریں۔“

”کس ایجنسی کے لوگ آپ کا پروگرام زیادہ سنتے ہیں؟“

”میرے سننے والوں میں ہر عمر کے لوگ شامل ہیں۔ میرے شو کو نانی دادی سے لے کر کم عمر بچے نوجوان جوان سب ہی شوق سے سنتے ہیں اور بڑی محبت سے کال بھی کرتے ہیں۔ میں صرف نوجوانوں کے لیے شو نہیں کرتی۔ میرا شو تو ہر ایک کے لیے ہے۔ کیونکہ میں ہر ایک کی دلچسپی کا خیال رکھتی ہوں۔“

”آپ وائس اور بھی کرتی ہیں۔ ریڈیو پر بھی کافی

گزاریں؟“

”ہماری فیملی بہت چھوٹی سی ہے۔ بڑی بہن کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ گھر میں امی بھائی بھابھی اور بچے ہیں۔ بس انہی کے ساتھ وقت گزارنے میں مزا آتا ہے۔ امی کے ساتھ وقت گزارنے کو دل زیادہ چاہتا ہے۔ اگر میں رات دیر سے گھر آؤں گی تو پھر امی کے ساتھ وقت کیسے گزاروں گی۔ تو بڑا اچھا لگتا ہے جلدی گھر آنا۔ بہت سے دیگر کام بھی ہو جاتے ہیں اور صبح کے پروگرام کی تیاری بھی کر لیتی ہوں۔“

”جلدی سوتی ہیں اور جلدی اٹھتی ہیں؟“

”سوئی تو میں بارہ بجے کے بعد ہی ہوں۔ البتہ میری صبح ساڑھے چھ بجے پاسات بجے تک ہو جاتی ہے۔ میں چاہے رات کو کتنی ہی دیر سے کیوں نہ سوؤں صبح اپنی روٹین کے مطابق ہی اٹھ جاتی ہوں۔ کیونکہ ہمیں بچپن سے ہی صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے اس لیے میں نے آپ کو انٹرویو کے لیے دس بجے کا ٹائم دیا۔“

مقبول ہیں اور سوشل بھی ہیں۔ لوگ آواز سے پہچان لیتے ہیں؟“

”میری پہلی پہچان تو میرے ابا (سلیم ناصر مرحوم) کی وجہ سے ہے پھر جب میں کسی محفل میں جاؤں تو لوگ میرے بات کرنے کے انداز اور آواز سے پہچان لیتے ہیں اور ساتھ ہی کنفرم بھی کرتے ہیں کہ آپ ریڈیو پہ آئی ہیں آپ کا نام بیش ہے؟ اور جو نام سے ہمیں پہچانتے وہ ایف ایم کا حوالہ ضرور دیتے ہیں کہ آپ ایف ایم 91 سے پروگرام کرتی ہیں، تو کافی جانی پہچانی جاتی ہوں۔“

”کبھی ٹی وی پہ آنے کا موڈ ہوا؟“

”ٹی وی یہ میں کافی آتی ہوں۔ میرے انٹرویوز آتے

رہتے ہیں تو ٹی وی کے حوالے سے بھی لوگ جانتے ہیں۔ ٹی وی پہ آنے والی شکلوں کو تو لوگ جلدی پہچان لیتے ہیں۔ فیوچر میں میری خواہش ہے کہ میں ٹی وی کے لیے کوئی ٹاک شو ٹائپ کے پروگرام کروں۔“

”آپ کے والد کے بارے میں تو سنا ہوا ہے کہ بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوا کرتے تھے۔ آپ میں ان کی طبیعت کا اثر ہے؟“

”بالکل ہے۔ کیونکہ مجھے بھی غصہ نہیں آتا۔ خوش مزاج اور ہنس مکھ ہوں۔ کوئی غلط بات برداشت نہیں ہوتی۔ جھوٹ تو برداشت ہوتا ہی نہیں ہے اماں اور ابا کی طرح ایک اسٹرائٹ شخصیت کی مالک ہوں۔“



جنوری 2013 سال نو نمبر شائع ہو گیا

”بیاد ابن انشاء“

سال نو کے موقع پر معروف شخصیات اور ثقافتی شخصیات سے مصاحبات

اداکار ”سوهاگے علی ابرو“ سے ملاقات

سال نو پر کرن کا نیا سلسلہ ”میری بھی سہیلی“ اس بار

”دست کو زہ گد“ فوزیہ یاسین کے سلسلے دار ناول

”درہ دل“ نبیلہ عزیز کے سلسلے دار ناول کا آخری حصہ

”ساڈا جڑیا دا چنبا“ نفیسہ سعید کا مکمل ناول

میرا شریف طور کا مکمل ناول ”وہ ایک لمحہ محبت“

ریحانہ امجد بخاری، رفعت سلطان، حیات بخاری کے ناول

میمونہ صدق، بشری احمد، روبی لورائشا، فرحان اختر، فرح طاہر قریشی

اقراء شفیق، حنا ناز، سعیدہ غنیہ بخاری کے الماسے اور مستقل سلسلے

ان شمارے کے ساتھ کرن کتاب

سال نو کے موقع پر ہونے والی انٹرویو کے لیے شخصیت کے اسٹراٹگی

کرن کتاب

”دود کو بھیناس“

کرن کے شمارے کے ساتھ شائع ہونے والے

شعاع کے ساتھ

ادارہ

جبل باجوه 106 شمالی سرگودھا

1 "شعاع" سے تعارف پھپھو کی وجہ سے ہوا۔ وہ "شعاع" اپنے کلج کے زمانے سے پڑھ رہی ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ سے ان کے تین بچے ہیں۔ پہلے اسکول اور پھر کلج، کثیر لڑکیاں مختلف ڈائجسٹ لے کر آیا کرتی تھیں۔ جن میں زیادہ کے پاس "شعاع" یا "خواتین" ہوتا تھا۔ لیکن میں زیادہ تر "شعاع" کو ہی پڑھتی تھی۔ ایک دفعہ کلاس میں "شعاع" کی کہانی میں اس قدر منہمک ہوئی کہ مجھے میڈم ہڈر کے آنے کا احساس ہی نہ ہوا، میڈم نے ہاتھ سے "شعاع" چھینا اور ٹائٹل دیکھ کر کہنے لگیں کہ مجھے اس میں سے اچھی اچھی باتیں لکھ کر دینا، وہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میڈم بھی "شعاع" کی فین تھیں ورنہ کوئی اور ہو، میں تو رسالہ پھاڑ دیتیں یا پھر پریسل کے سامنے میری پیشی کروا دیتیں۔ پھر جو میرے ساتھ ہوتا خدا جانے خدا کا بندہ نہ جانے۔

ہمارے گھر میں بھی ان چیزوں کو پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی زیادہ سختی کرتی ہیں اور ابو اور بھائی کچھ نہیں کہتے۔

2 دن کا آغاز فجر کی نماز اور تلاوت کلام پاک سے ہوتا ہے۔ پھر بستر وغیرہ سمیٹتی ہوں اور یونیفارم استری کرنے کے بعد بیگ کو درست کرتی ہوں اور بکس جو میں نے پورے کمرے میں بکھری ہوتی ہیں، انہیں سمیٹ کر بیگ میں ٹھونسنے کے انداز میں ڈالتی ہوں پھر امی کی ناشتے کے لیے پکار شروع ہو جاتی ہے۔ ناشتہ کرنے کے بعد کلج جانے کی تیاری شروع کر دیتی ہوں۔ اگر دین لیٹ ہو جائے تو بھائی کو اٹھانے کا کام سرانجام دیتی

ہوں۔ اف خدایا بھائی کو صبح اٹھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

ابو بھی ڈیرے سے دودھ لے کر آجاتے ہیں۔ دودھ کو مانے کا کام سبیلہ (بڑی بہن) سرانجام دیتی ہے اور میں اپنی دیر میں بھائی جی کے جوتے ڈھونڈ رہی ہوتی ہوں۔ جو پتا نہیں انہوں نے کس کونے میں پھینک دیے ہوتے ہیں۔ انہوں جوتے ڈھونڈ کر دوں اور دین دروازے پر۔

ڈھائی بجے کلج سے واپسی ہوتی ہے۔ تین بجے تک ریسٹ یا کچ ان دونوں میں سے ایک کام کرتی ہوں۔ تین بجے سے لے کر ساڑھے چار بجے تک امی کو رات کے کھانے کے لیے اہتمام میں مدد کی۔ پھر عشاء تک کلج بکس کے سبق یاد کیے۔ پھر رات کا کھانا کھایا اور کھانا کھانے کے دوران بھائی اور سبیلہ کی نوک جھونک گوانجوائے کیا۔

رات آٹھ بجے سے نو بجے تک ٹی وی دیکھا۔ نیوز کم ہی سنتی ہوں۔ نو بجے سے ساڑھے دس بجے تک شعاع پڑھا اور سبیلہ کے ساتھ تبصرہ کیا۔ اس کے بعد سو جاتی ہوں۔ سبیلہ بھی ساڑھے دس بجے تک اپنا کلج کا کام ختم کر کے سو جاتی ہے۔ اتوار والے دن صرف دو ہی خاص کام کرتی ہوں، ایک جو باقی رسالہ ر گیا ہے۔ اسے ختم کرتی ہوں اور صبح صبح چھت پر جا کر طلوع آفتاب کا منظر دیکھنا مجھے بہت پسند ہے۔ 96۔ F.M سرگودھا سننا بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔ بانی سارے کام روٹین والے چلتے ہی رہتے ہیں۔

3 ایسی بہت سی تحریریں ہیں جنہیں بھولنا ناممکن ہے

مثلاً "زرد موسم آنی راحت جبین کی تحریر ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ اپنی راحت گاؤں کی منظر کشی جس انداز میں کر رہی ہیں وہ۔۔۔ زرد موسم کے بعد فرحت اشتیاق کی تحریر "دل سے نکلے ہیں جو لفظ" یہ ناول کتابی شکل میں میرے پاس موجود ہے۔ اس ناول میں مجھے عمر کا کردار بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ "زندگی اک روشنی" ماہ ملک کا "اک دیا جلانے رکھنا" پھلاں دے رنگ کالے اور نمونہ بخاری کی ہر شخص ہر تحریر مجھے پسند ہے اور مجھے لگتا ہے کہ جوادی اور شبلی ہمارے نکلے دار ہیں اور پسندیدہ رائٹرز کی لسٹ میں رضیہ جیل 'رفعت سراج' 'رخسانہ عدنان' 'نمو اور عہدہ' ہیں اور اسپیشلی مصباح گل جو ہمارے ہی شہر سرگودھا کی رہنے والی ہیں۔

ہر وہ کردار جو شوخ و شنگ، شرارتی، حاضر جواب، ہنسنے والا ہنسانے والا، زندہ دل اور کھانے پینے کا شوقین ہو، اس کردار میں آپ کو ہماری جھلک نظر آئے گی۔ اور خاص طور پر نمونہ بخاری کے جوادی اور شبلی۔ میں اور سبیلہ ہی ہیں۔ ہا ہا ہا۔

4 ذات کی خوبیاں اور خامیاں دوسرے ہی بتا سکتے ہیں اسی لیے لائبہ (دوست) سے سب سے پہلے رابطہ کیا۔ اس نے کہا تم خوب صورت ہو۔ (ہائے لائبہ کس خوش فہمی میں ڈال دیا) ہمدرد ہو، بے شمار ہنروں کی مالک ہو، کسی کو دکھ نہیں دیتیں اور سب سے بڑی بات کہ تم دوسروں کی خواہشات پوری کرتی ہو پھر صبا سے پوچھا تو اس نے کہا کہ تم ہر ٹاپک پر بول سکتی ہو۔ عاشی نے بتایا کہ تم میرے ساتھ والی بال اچھا کھیلتی ہو۔ خامیاں بتانا مشکل ہے پھر بھی چلتے چلتے کچھ خامیاں بتاتے چلیں۔

لائبہ کا کہنا ہے، غصہ بہت جلد آتا ہے اور کسی کو معاف نہیں کرتیں۔

سبیلہ اور بھائی سے پوچھا تو دونوں نے مشترکہ ایک ہی خامی بتائی کہ کسی کے حصہ کی چیز ہو تو تم کھا جاتی ہو۔ بس بس اب اتنی ہی کافی ہیں۔

تقریبی جملے تو بہت سنے ہیں لیکن لائبہ اور مس زیب (اردو کی نیچر) کے منہ سے تقریبی جملے سننا اچھا لگتا ہے۔

5 ساون کا اصل مزہ تو بچپن میں آتا تھا۔ گاؤں کی کچی سڑکوں پر بھاگنا، کانڈ کی کشتیاں بنانے کے پانی میں تیرانا، ایک دوسرے کو کچھڑ میں دھکے دینا، گھر آکر امی کے ہاتھ کے پکائے ہوئے موٹی کے براٹھے، آج کا ساون تو فکر میں ہی گزر رہا ہے۔ اوہ رپارٹس کا پہلا قطرہ زمین پر پڑا اور امی کی کنٹری شروع، موڑ ڈھک دو، چارپائیاں برآمدے میں ڈال دو اور صابن وغیرہ اندر رکھ دو۔ خراب ہو جائے گا۔ یہ سب تدبیریں کرنے کے بعد اپنے چھوٹے سے لان میں واک کرنا اور اپنے مٹھو کے ساتھ باتیں کرنا اور اسے تنگ کرنا۔ یہ ہے ہمارا ساون۔ ابھی تک تو کوئی دلچسپ اور اچھی بات یاد نہیں۔ ہو تو یاد ہوتا۔

6 پسندیدہ شعر: وہ قربتوں کے سفر بھی عجیب تھے ضیاء کہ ساتھ چلتے رہے اور کہا کچھ بھی نہیں پسندیدہ کتابوں میں شہادت نامہ، سفر در سفر، پار کا پہلا شعر، پطرس کے مضامین اور شاعری کی کتابوں میں برگ صحرا، عذاب دید، طلوع اشک اور ہمیں اقرار کرنا تھا اور دوسری بہت سی کتابیں۔

7 اقتباس راحت جبین کے ناول "زرد موسم" سے حاضر ہے۔

"تو ہوتا یوں ہے کہ تقدیر ہماری زندگی کی تصویر میں بڑے خوب صورت رنگ بھرتی ہے مگر ہم جیسے لوگ۔۔۔ اپنی بے لگام خواہشوں اور آوارہ خوابوں کی بدرنگی سے ساری تصویر مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ رنگ کچے ہیں۔ اصل اور پکار رنگ تو وہی ہے جو کتب تقدیر نے ہمارے لیے زندگی کی تصویر میں بھر دیا ہے۔"



کچھ عرصہ پہلے

سے خبروں میں بھی رہتی ہیں۔ اداکاری بھی خوب جم کے کرتی ہیں۔ تاہم اتنی ساری خوبیوں کے ساتھ موصوفہ خاصی بھلکڑا واقع ہوئی ہیں یا شاید ”کہہ مکرنیاں“ پسند ہوں انہیں۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، عتیقہ اوڈھو کی انصاف پسند ہونے کی دعوے دار ایک پارٹی کے رہنما سے شناسائی ہوئی جو گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بات شادی تک جا پہنچی۔ عتیقہ اوڈھو اور ان رہنما نے کچھ لوگوں کو مدعو کر کے شادی کر لی۔ ایک معروف اخبار کے میگزین میں اس تقریب کی آنکھوں دیکھی بات تصویر رپورٹ بھی شائع ہوئی کہ وہ خاتون صحافی اس تقریب میں بہ نفس نفیس موجود ہونے کی دعوے دار تھیں۔ اس رپورٹ میں عتیقہ اوڈھو سے مختصر بات چیت بھی شامل تھی۔ عتیقہ ان صاحب کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں۔ یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ مگر اس رپورٹ کے شائع ہونے کے چند ماہ بعد عتیقہ اوڈھو نے واویلہ بچا دیا کہ جی! یہ خبر تو جھوٹی ہے۔ یہ انہیں بدنام کرنے کی کوئی سازش ہے۔

مگر جناب! تازہ ترین خبر یہ ہے کہ عتیقہ اوڈھو بالآخر اپنی اس شادی کو منظر عام پر لے آئی ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے اپنے شوہر عمر علی خان کے ساتھ ایک نجی چینل میں شرکت کی اور اپنی شادی کا باضابطہ اعلان کیا۔

”کوئی بتلاؤ! کہ ہم تلامیں کیا۔“

ہیرو

کرکٹ اور فلمی دنیا کا ساتھ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ ان میں سے کسی ایک کا جنم



کہہ مکرنیاں

”کہہ مکرنیاں“ اردو ادب کی مقبول صنف ہے۔ اشعار میں ذوق معنی انداز میں کوئی بات کہی جاتی ہے اور پھر آخر میں واضح ہونے والے قریبی مفہوم سے مکر کے بعد کا مفہوم بیان کر دیا جاتا ہے۔ گویا کوئی بات کہہ کے اس سے مکر جاتا ہے۔ اسی لیے اس صنف کو ”کہہ مکرنی“ کا نام دیا گیا۔ امیر خسرو نے بے شمار باکمال کہہ مکرنیاں کہی ہیں۔ لیکن جناب! امیر خسرو کی اس صنف میں ہمارے اکثر سیاست دانوں نے اس قدر کمال حاصل کیا کہ وہ اپنی کسی ہوئی ہر بات سے اگلے ہی لمحے مکر نے لگے۔ پھر اس صنف کو ہماری بعض فلمی اداکاروں نے اپنایا۔ وہ شادیاں کر کے مکر نے لگیں۔ تاہم اب یہ وبا ہماری ٹی وی اداکاروں تک بھی پہنچ گئی ہے۔

معروف اداکارہ عتیقہ اوڈھو سے کون واقف نہیں۔ جتنی خوب صورت وہ خود ہیں، اتنی ہی خوب صورتی



(ظاہر ہے) اس کا جنم جو بعد میں وجود میں آیا کہ پہلے آنے والا تو وجود میں آکر دوسرے کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ کبھی فلمی ستاروں اور کرکٹرز میں قریبی دوستیاں پروان چڑھیں تو کبھی کرکٹ کے ستارے کرکٹ چھوڑ کر فلم نگری کے آسمان پر چمکے۔ ایسے ہی ستاروں میں ایک اور ستارے کا اضافہ ہوا ہے کہ معروف کرکٹ شاہد آفریدی خیر سے فلم اشار بننے کی تیاریوں میں ہیں۔ شاہد آفریدی ان خوش قسمت کرکٹرز میں سے ہیں جنہوں نے کرکٹ کی دنیا میں قدم رکھتے ہی شائقین کرکٹ کی توجہ کھینچ لی تھی۔ خاص طور پر ”شانفمنیوں“ کی۔ (یہ اصطلاح کسی لغت میں تلاش کرنے کی زحمت نہ کیجیے کہ یہ ہم نے ابھی ابھی ایجاد کی ہے۔) اور یہ ”شانفمنیاں“ شاہد آفریدی کے کھیل سے زیادہ ان کی پرکشش شخصیت کی مداح تھیں۔ شاہد آفریدی اپنے جارحانہ کھیل کے باعث جہاں نوجوان دلوں کی دھڑکن بنے تو وہیں جماندیدہ نظموں کی دوا کے مستحق بھی ٹھہرے۔ ان کی اسی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کئی لوگوں نے انہیں اداکاری کی پیش کش کی۔ شاہد آفریدی نے کچھ اشتہارات تو کر لیے۔ تاہم فلموں اور ڈراموں میں کام کرنے سے

معذرت کر لی۔ مگر جناب! لوگوں نے ہمت نہ ہاری اور شاہد آفریدی کے انکار کے پتھر پر اصرار کے قطرے ٹپکاتے رہے۔ ان قطروں نے اس پتھر میں سوراخ کر دیے۔ یوں اب شائقین کرکٹ کے بعد اب شائقین فلم بھی جلد ہی شاہد آفریدی کو ایکشن میں دیکھ سکیں گے۔

انہیں فلم میں لانے کا سرا معروف اداکار اور ”نو آموز فلم ساز“ ہمایوں سعید کے سر بندھا ہے۔ (تاہم فلم کے دولہا شاہد آفریدی ہی ہیں کہ ہمایوں سعید نے صرف انہیں لانے کا سرا ہی اپنے سر باندھا ہے اور فلم میں ہمایوں کی موجودگی کے باوجود بھی مرکزی کردار شاہد آفریدی کا ہی ہے۔) اس فلم کا نام ”میں ہوں شاہد آفریدی“ ہے اور یہ شاہد آفریدی کی زندگی پر ہی بنائی گئی ہے۔ (گویا اسے سمعی و بصری اور میوزیکل سوارح حیات“ کہا جاسکتا ہے۔ فلم تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور اس کی نمائش جلد ہی متوقع ہے۔ شاہد آفریدی کے ساتھ اس میں بے شمار فنکاروں نے کام کیا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ہمایوں سعید نے اس فلم میں ہمایوں سعید، شبنمہ پیرزادہ، ماہ نور بلوچ، ندیم جاوید شیخ، شہزاد شیخ، نعمان حبیب سمیت کئی معروف ناموں کو اکٹھا کیا ہے۔ (ذرا دیکھیے گا ہمایوں جی! کوئی نام کاسٹ ہونے سے کہیں رہ تو نہیں گیا؟)

واپسی

کہانی بنانا اور سنانا ایک فن ہے تو کہانی سننا اور دیکھنا ایک شوق۔ دنیا میں تقریباً ہر جگہ اور ہر دور کے بچوں کو کہانی سننے کا شوق رہا ہے۔ خاص طور پر جنوں بھوتوں اور پریوں کی مافوق الفطری کہانیاں سننے کا۔ ان ہی کہانیوں کے ذریعے پتا چلا کہ جنوں کو بھی عینک لگ جاتی ہے۔ لیکن جناب! ہر جن کو عینک نہیں لگی ہوتی اور نہ ہر عینک والا جن ہی ہوتا ہے کہ عینک والا جن تو بس ایک ہی تھا، نستور جن۔ جس نے نوے کی دہائی میں لاکھوں بچوں کے دلوں پر راج کیا تھا۔ نوے کی دہائی

اب ”پریاں“ ہوتی ہیں تو پھر اس وقت وہ ڈراما سنس کون کرے گا؟ ہمیں تو شبہ ہے شہزاد قیصر جی! کہ یہ ڈراما اب شروع ہو بھی پاتا ہے یا نہیں۔

ہمت

کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے مگر جناب! یہ مقولہ ترتیب دینے والے احباب غائب! اس میں ”عمر“ کا اضافہ کرنا بھول گئے یا انہوں نے عمر کو اس خیال سے اس میں شامل نہ کیا ہو کہ بعض لوگ ”عمر چور“ بھی تو ہوتے ہیں نا! مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری فلمی و غیر فلمی اداکاروں کا یہ ایک سدا بہار مسئلہ ہے۔ اکثر اداکار اپنی عمر چھپانا تو بہت چاہتے ہیں مگر جناب! عمر ہے کہ چھپائے نہیں چھپتی (میک اپ کی تھوں سے کی نہیں)۔ عمر چھپانے کے لیے میک اپ اور پھر کاسمیٹک سرجری کا سہارا لیتی ہیں۔ تاہم ایک وقت میں سارے سارے دغا دے جاتے۔ اس ضمن میں اداکارہ ریشم کو داد نہ دینا یقیناً یادتی ہوگی کہ انہوں نے جی کڑا کر کے ایک قدم اٹھایا۔ ریشم سے اپنی تین سو سالگرہ منادلی۔ یوں وہ ہماری فلمی صنعت کی پہلی ہیروئن ہو گئی ہیں جنہوں نے تیس کا ہندسہ عبور کیا ہے۔ ورنہ یہ ہندسہ ”برڈلز وڈ“ میں ایک ایسی رکاوٹ کی مانند ہے جہاں آکر ہماری ہیروئین چت ہو جاتی ہیں۔



کے وہ بچے تو اب بڑے ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے دلوں میں وہ ”عینک والا جن“ ابھی تک برا جہان ہے۔ اسی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بچوں کی یہ مقبول ترین سیریل ایک بار پھر شروع کی جا رہی ہے۔ ایک نئی چینل کے مارننگ شو میں ”عینک والا جن“ کی ٹیم کے افراد نے شرکت کی اور یہ خوش خبری سنائی کہ یہ سیریل جلد ہی شروع کی جا رہی ہے۔ اسی شو میں ان فنکاروں نے انکشاف کیا کہ ”عینک والا جن“ ہر خاص و عام طبقے کے بچوں میں یکساں مقبول تھا۔ تاہم خواہ اس کے بچے تو پھر خاص ہی تھے نا ”سو“ ”عینک والا جن“ کی نئی قسط ریلیز ہوتے ہی پہلے ان خواہ اس کے بچوں کے پاس خاص طور پر بھیجی جاتی تھیں۔ وہ اسے دیکھتے تھے پھر یہ ڈراما ان پر ہوتا تھا۔ (ہاں! تو وہ بچے سنسورڈ کے رکن ہوں گے ناں! ڈراما سنسر کرنے کی نیت سے پہلے دیکھتے ہوں گے۔)

ڈرامے کے فنکاروں شہزاد قیصر اور منالا ہوری وغیرہ نے یہ بھی شکوہ کیا کہ یہ سیریل تین سال چلی اور اپنی مقبولیت کے عروج پر کوئی وجہ بتائے بغیر بند کر دی گئی تھی۔ (لو جی! وجہ تو سامنے ہی ہے۔ ڈراما سنسر کرنے والے خواہ اس کے وہ بچے تین سال کے عرصے میں ”بڑے“ ہو گئے ہوں گے ناں! ویسے اب تو وہ بچہ اور بھی بڑے ہو چکے ہیں۔ اتنے کہ ان کی دلچسپی کچھ

اسے میں ریشم کا تین سو سالگرہ منانا یقیناً قابل تحسین امر ہے۔ گوریشم نے ابھی کال ہمت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے کہ دنیا بھر کی معلومات دینے کی معتبر ویب سائٹ ویکیپیڈیا میں ریشم کا سال پیدائش انیس سو بہتر درج ہے۔ اس حساب سے ان کی عمر چالیس سال بنتی ہے۔ (آج ریشم نے اتنی ہمت کی ہے۔ کل کو تھوڑی اور کر لیں گی)۔ ریشم کی دیکھا دیکھی اداکارہ میرا نے بھی ہمت پکڑی اور اپنے ستائیس سال کے ہونے کا اعلان کر ڈالا۔ ورنہ تو وہ گزشتہ ایک عشرے سے اپنی پچیسویں سالگرہ منانا ہی تھیں۔

(شکریہ ریشم جی!)



بیان کالمانہ

○ طاہر القادری نے وزیر اعلیٰ نواز شریف پر الزام لگایا کہ انہوں نے قاتلانہ حملہ کرایا۔ انہوں نے فوٹو گرافروں کو دیوار پر لٹو کے چھینٹے اور گولیوں کے نشان بھی دکھائے۔ یہ کیس ہائی کورٹ میں گیا اور ہائی کورٹ نے اس الزام کو بہتان قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے حوالے سے جو ریمارکس دیے۔ وہ اتنے نازیبا تھے کہ درج نہیں۔ کہہ جاسکتے اور خون کے چھینٹوں کے بارے میں لیبارٹری رپورٹ یہ سامنے آئی کہ یہ چھینٹے بکرے کے خون کے ہیں۔

(عطا الحق قاسمی۔ روزانہ دیوار سے)

○ ارد شیر کاؤس جی 1985ء میں بشری زیدی کی ہلاکت کو شہر میں پیش آنے والا سب سے سنگین سانحہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سانحے نے شرکو حادث کے سپرد کر دیا۔ چند برس پہلے ایک انٹرویو میں جب ان سے گراچی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بے دھڑک یہ جملہ کہا کہ ”شہر سڑ گیا ہے۔“

(زاہدہ حنا۔ نرم گرم)

○ پاکستانیوں کو دنیا کی چوتھی ذہین ترین قوم کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ ایمان اور یقین کی وہ طاقت اور شعور

ہے جو اس کے اندر اس کی پیدائش کے وقت کی آذان کی آواز سے اس کے دل میں ولایت کر دی جاتی ہے۔ (عبدالقادر حسن۔ غیر سیاسی باتیں)

○ حقائق یہ ہیں کہ ایک طرف میڈیا میں کچھ عناصر کے ذریعے لال مسجد میں آپریشن کے لیے ماحول پیدا کیا گیا۔ دوسری طرف کچھ نام نہاد مجاہدین کو داخل کر کے حالات بگاڑے گئے۔ جب آپریشن شروع ہوا تو یہ نام نہاد مجاہدین وہاں سے نکل گئے اور بے گناہ لوگوں کا خون بہا دیا گیا۔

(حامد میر۔ قلم کمان)

سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد سے ہو سکتا ہے قومی اسمبلی کی دو چار ہی سیٹوں کے نتیجے پر اثر پڑے مگر ہر ایک کی چیکنگ اور ساتھ ہی اگر گھروں کی بھی چیکنگ کر لی گئی اور اسلحہ وغیرہ پکڑا گیا تو کراچی کا امن بحال ہو سکتا ہے۔ کام تو پہاڑ جیسا ہے مگر مسئلہ بھی پہاڑ سے کم نہیں۔ کرنا تو ہو گا۔

(شاہین صہبائی۔ چلتے چلتے)

○ امریکا میں جگر کی خرابی کے واقعات کثرت سے منظر عام پر آئے۔ جگر کی خرابی کی اہم وجہ پیرا سیٹامول کا استعمال تھا۔ ایک دن میں نہیں گولیاں پیرا سیٹامول کے استعمال سے موت واقع ہو سکتی ہے۔ درد کم کرنے والی اس دوا کی مقرر کردہ تعداد آٹھ ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے اس دوا کی فروخت پر پابندی سے برطانیہ میں اس کے کیسوں میں نمایاں کمی آئی۔

(لندن۔ نیٹ نیوز)

○ جن خواتین میں وٹامن ای کی کمی ہوتی ہے۔ ان کے بچوں میں پانچ سال کی عمر تک سانس پھولنے یا دسے کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ حمل کے پہلے سولہ ہفتے اس سلسلے میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔



پانچ منٹ مزید پکائیں۔ سیاہ مرچ اور سویا ساس ڈال کر پیش کریں۔

فیش بالز

اجزا :
مچھلی کا قیمہ
ہری پیاز
ہری مرچ
کارن فلور
بیکنگ پاؤڈر
اورک پیسٹ
چینی
سرخ پیس مرچ
نمک
تیل
ترکیب :
تین پاؤ
دو عدد
چار عدد
چھ چائے کے چمچے
ایک کھانے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
دو چائے کے چمچے
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

چینی
سرکہ
نمک
تیل
ترکیب :
آدھا چائے کا چمچ
چار کھانے کے چمچے
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

چکن اور گاجر کو لمبائی میں (اسٹریپس) کاٹ لیں۔
تیل گرم کر کے سلائس میں کٹی پیاز ڈال کر سنہرا کریں
پھر گاجر اور لسن اورک پیسٹ ڈال کر تھوڑا سا
بھونیں۔ اب چکن اور کتری ہوئی اورک ڈال کر مکس
کریں اور چکن گل جانے تک پکائیں۔ پانی خشک ہو
جائے تو نمائو پیسٹ، چینی، نمک، سفید مرچ ڈال کر
بھونیں یہاں تک تیل اوپر آجائے۔ سرکہ ڈال کر پانچ
منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ چپاتیوں یا ابلے ہوئے
چاول کے ساتھ پیش کریں۔

چکن کریم سوپ

اجزا :
چکن
مکھن
میدہ
دودھ
پسی سیاہ مرچ
نمک
ترکیب :
اورک پیسٹ، نمک، چینی، سرخ مرچ اور دو
کھانے کے چمچے کارن فلور تھوڑے سے پانی میں ملا کر
پیسٹ بنالیں۔ ہری پیاز اور ہری مرچ باریک کاٹ کر
شامل کریں، پھر مچھلی کا قیمہ ملا کر بالز بنالیں۔ بقیہ کارن
فلور میں بیکنگ پاؤڈر اور تھوڑا سا گھی ملا کر آدھے
کپ پانی میں گھول کر پیسٹ بنالیں۔ فیش بالز کو اس
پیسٹ میں لپیٹ کر درمیانی آئچ پر گہرے تیل میں
تلیں اور کھجپ کے ساتھ پیش کریں۔

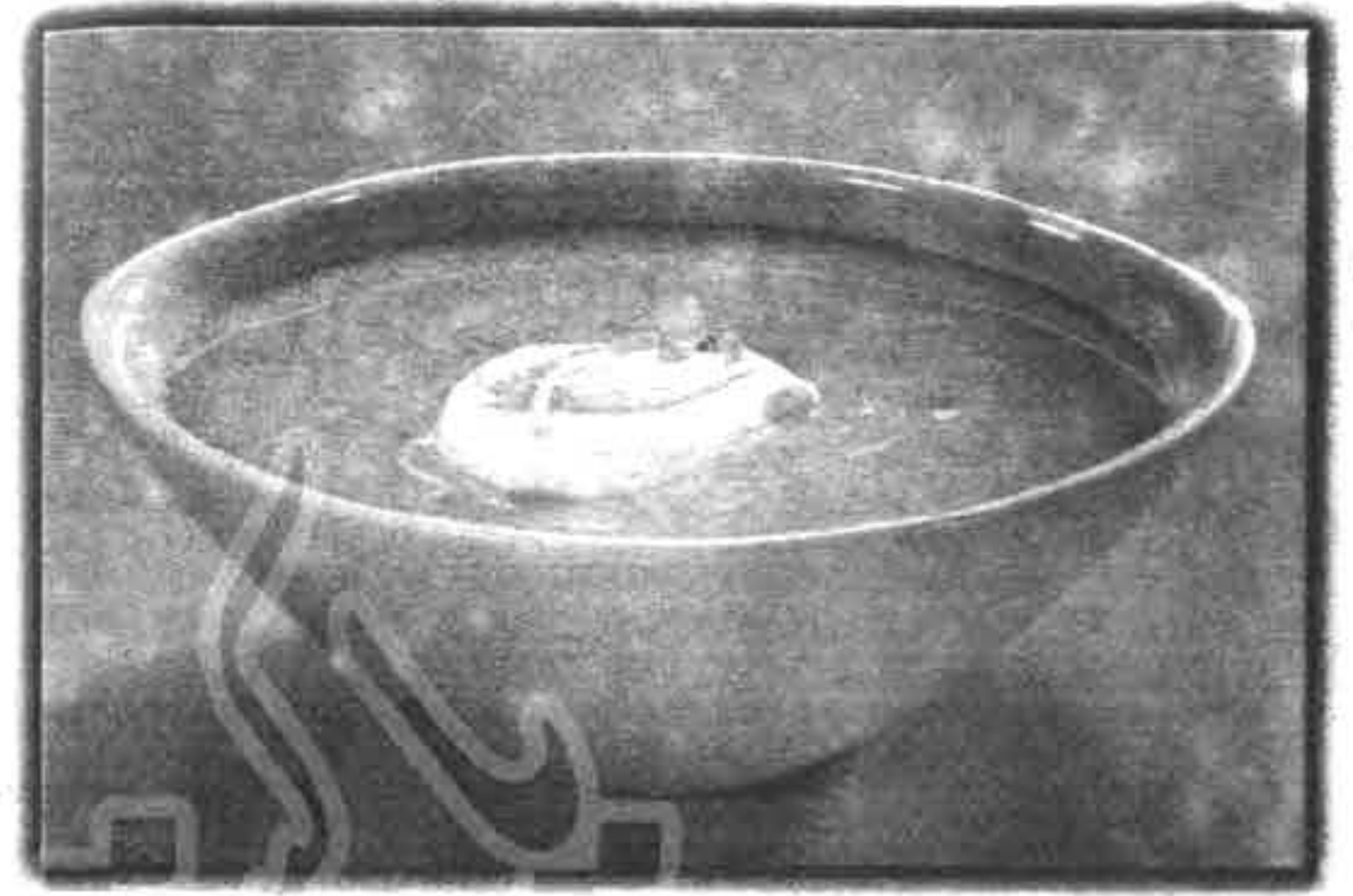
آدھا کلو
ایک چھٹانک
ایک چائے کا چمچ
آدھا پاؤ
آدھا چائے کا چمچ
حسب ضرورت

ترکیب :

آدھے مکھن میں میدے کو اچھی طرح مکس کر کے
ابلے ہوئے دودھ میں ڈال کر ایک جوش مزید دے
دیں۔ باقی مکھن کو گرم کر کے اس میں چکن فرائی
کریں۔ سنہرے ہو جائیں تو نمک اور تھوڑا سا پانی
ڈال کر جو لمے پرچھادیں۔ دو تین ابل آجائیں تو آئچ
ہلکی کر کے اتار لیں کہ پانی چار کپ رہ جائے۔ چکن
نکال کر ریشے کر لیں۔ بھاپ خارج کر کے میدے اور
مکھن والا آمیزہ، چکن کے ریشوں کے ساتھ ڈال کر

اجزا :
آٹا
میتھی کا ساگ
انار دانہ
سرخ مرچ
نمک
گھی

دو کپ
تین کپ
دو چائے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
تیل کے لیے



موم کے پکوان

خالہ جیلانی

لگے تو چینی ڈال دیں۔ چینی کا پانی خشک ہونے لگے تو
بالائی پھینٹ کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی پسا کھوپرا بھی ڈال
دیں۔ شیرہ گاڑھا ہو کر جذب ہو جائے اور سارا آمیزہ
نیجان ہو کر خوشبو دینے لگے تو کیوڑہ ڈال کر چند منٹ
کے لیے ڈھک دیں۔ پھر بادام پستے کی گریوں سے
سجاوٹ کر کے پیش کریں۔

چکن جنجر

اجزا :
چکن
لسن اورک پیسٹ
ثابت اورک
پیاز
گاجر
نمائو پیسٹ
سفید مرچ پاؤڈر
آدھا کلو
دو چائے کے چمچے
ایک ٹکڑا
ایک عدد
چار عدد
دو کھانے کے چمچے
ایک کھانے کا چمچ

گاجر کا حلوہ

اجزا :
گاجر
دودھ
بالائی
کھوپرا
الائیچی
چینی
کیوڑہ
بادام پستہ
پسا کھوپرا
ترکیب :
ایک کلو
دو کلو
ایک پاؤ
آدھی پیالی
دس عدد
ایک کلو
دو کھانے کے چمچے
حسب ضرورت
آدھی چھٹانک

گاجر چھیل کر کدو کش کر لیں۔ دودھ میں الائیچی
ڈال کر ایک جوش دے لیں۔ پھر گاجر ڈال کر ہلکی آئچ پر
مکھنے دس۔ چھی چلاتے رہیں۔ دودھ ذرا خشک ہونے

لیں اور ٹکڑے کر کے شامل کریں۔ اب چاول، جو خشک ہو چکے ہوں گے ڈال کے ہلکے ہاتھوں سے مکس کریں اور سویا ساس ڈال کر دم پر لگا دیں چائینر پلاؤ تیار ہے۔

مچھلی پلاؤ

ضروری اجزا :

مچھلی	آدھا کلو
(کانٹے نکال کر اسٹوپس کاٹ لیں)	
چاول	آدھا کلو
تیل	تین پیالی
لسن کے جوئے	15-12 عدد
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	2 عدد
زیرہ	چائے کا ایک چمچ
لونگ	6 عدد
ثابت و ضیا	چائے کے دو چمچ
ثابت سیاہ مرچ	10-12 عدد
نمک	حسب ذائقہ
ثابت گرم مسالا	کھانے کا ایک چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	چائے کا ڈیڑھ چمچ

سیل یا گراؤڈر میں لسن، زیرہ، لونگ، ثابت و ضیا، سیاہ مرچ، نمک اور سرخ مرچ پاؤڈر ڈال کر پیس لیں۔ مچھلی کے اسٹوپس کو دھو کر خشک کر لیں۔ تیار کیا ہوا مسالا مچھلی میں ڈال کر دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ چھوڑیں۔ فرائنک پین میں تیل گرم کریں اور اس میں مچھلی کے اسٹوپس ڈال کر سنہری مائل ہونے تک فرامی کریں۔ (زیادہ نہ پکائیں ورنہ مسالا جل جائے گا) ایک میں بقیہ تیل گرم کر کے اس میں ثابت گرم مسالا ڈال کر کڑکڑائیں۔ پھر اس میں پیاز ڈال کر سنہری مائل کر لیں۔ باسستی چاول، حسب ضرورت پانی اور نمک ڈال کر ایک کئی رہنے تک پکائیں اس کے بعد فرامی کئے ہوئے مچھلی کے اسٹوپس چاولوں کے اوپر ڈال کر اسے دم پر رکھ دیں۔ مزید ارچھلی پلاؤ تیار ہے سرونگ ڈش میں نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

ترکیب :
میٹھی صاف کر کے باریک کاٹ لیں اور نمک، مرچ اور انار دانے کے ساتھ آٹے میں ملا کر گوندھ لیں۔ پندرہ منٹ تک گیلے کپڑے سے ڈھک کر رکھیں پھر پیڑے بنا کر زیادہ گھی کے ساتھ تلیں اور لسن کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

چائینر پلاؤ

اجزا :

چکن	ایک کلو
چاول	آدھا کلو
انڈے	دو عدد
گاجر	دو عدد بڑی
ہری پیاز	چار عدد
بند گوشتی	آدھا پاؤ
اجینو موتو	آدھا چائے کا چمچ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچ
پسی سفید مرچ	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چاول صاف کر کے پندرہ منٹ کے لیے بھگو دیں، پھر دو کئی ابال لیں اور نتھار کر کسی باریک کپڑے پر پھیلا دیں۔ چکن کو ابال کر ہڈیاں الگ کر کے اس کے ریشے یا بہت چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ گاجر، گوشتی اور ہری پیاز کو بھاپ پر گلا لیں۔ الگ پیلی میں تیل گرم کر کے چکن اور سبزیاں ڈال کر ہلکے چمچے سے مکس کریں۔ نمک، اجینو موتو اور پسی سفید مرچ بھی ڈال کر مکس کریں۔

چائینر پلاؤ میں انڈا شامل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ چاہیں تو اسی مسالے میں انڈے توڑ کر مکس کر لیں ورنہ الگ پھینٹ کر ایک چمچے تیل میں مل

دنیا میں بت پرستی کا آغاز

آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان

دس قرن تھے، جو سب اسلام پر قائم تھے۔ قرن سے مراد نسل یا صدی ہے۔ دو سواغ، یغوث، یعوق اور نسر نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگ تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دل میں یہ بات ڈالی کہ جہاں وہ حضرات بیٹھا کرتے تھے وہاں بت بنا کر رکھ دو، اور ان کے وہی نام رکھ دو جو ان بزرگوں کے تھے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت تو بتوں کی پوجا نہیں ہوئی۔ جب وہ لوگ فوت ہو گئے اور علم مٹ گیا تب ان کی پوجا ہونے لگی۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے یہی بت بعد میں عرب میں پوجے گئے۔

محمد بن فیس رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے ”یہ حضرات آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان کے زمانہ کے اولیائے کرام تھے۔ ان کے کچھ پیروکار بھی تھے جو ان کے طریقے پر چلتے تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو ان کے عقیدت مند پیروکاروں نے کہا۔ ”اگر ہم ان کی تصویریں بنالیں تو ان کی یاد کی وجہ سے ہمیں عبادت کا شوق زیادہ ہو گا۔“

چنانچہ انہوں نے ان کی تصویریں بنائیں۔ جب یہ (تصویریں بنانے والے افران) فوت ہو گئے اور ان کی جگہ دوسرے لوگ آ گئے تو ابلیس نے ان کے دلوں میں دوسوہ ڈالا اور کہا۔

”تمہارے باپ و دادا ان اولیائے کرام کی عبادت کیا کرتے تھے اور ان ہی کی وجہ سے انہیں بارش ملتی تھی۔“ چنانچہ ان لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر

دی۔

ابوالمطہر سے روایت ہے کہ ابو جعفر محمد باقر نماز پڑھ رہے تھے کہ حاضرین نے یزید بن مہلب کا ذکر کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے فرمایا۔

”تم نے یزید بن مہلب کا ذکر کیا ہے، وہ اس علاقے میں قتل ہوئے ہیں جہاں سب سے پہلے غیر اللہ کی پوجا ہوئی تھی۔ انہوں نے وہ کبارے میں فرمایا۔

”وہ ایک نیک آدمی تھا جو قوم میں ہر دل عزیز تھا“ جب وہ فوت ہو گیا تو لوگ باطل میں اس کی قبر پر بیٹھ گئے

اور بہت زیادہ غمگین ہوئے۔ جب ابلیس نے ان کا غم دیکھا تو انسانی صورت میں ان کے پاس آکر کہنے لگا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ان صاحب کی وفات پر بہت دل گرفتہ ہو۔ تو کیا میں تمہیں اس جیسی ایک صورت نہ بنادوں جو اس کی جگہ رکھی جائے اور وہ اس کی یادگار بن جائے؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہاں! بنادو۔“

اس نے وہ کا ایک بت بنادیا۔ انہوں نے اسے چوپال میں رکھ لیا اور اسے یاد کرنے اور اس کی باتیں کرنے لگے۔ جب ابلیس نے دیکھا کہ لوگ وہ کو بہت یاد کرتے ہیں تو کہا۔

”کیا میں تم میں سے ہر شخص کے گھر میں اس طرح کا ایک مجسمہ نہ بنادوں جو اس کو دیکھ کر وہ اسے یاد کرے؟“ انہوں نے کہا۔ ”ہاں! بنادو۔“

اس نے ہر شخص کے گھر میں ایک بت بنادیا۔ وہ اس کو دیکھ کر اس (اللہ کے ولی) کو یاد کرتے تھے۔

جب ان کے بیٹے بڑے ہوئے تو انہوں نے اپنے بزرگوں کو ان (بتوں) کو اہمیت دیتے دیکھا (تو وہ بھی اسی طرح اہمیت دیتے رہے) حتیٰ کہ اگلی نسلوں کے لوگ

اس بات سے بے خبر ہو گئے کہ ان کے بزرگ انہیں کیوں یاد کرتے تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ ان کی عبادت شروع کر دی۔ چنانچہ سب سے پہلے جس مخلوق کی عبادت کی گئی وہ بزرگ کا بت تھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بت کو پوجنے والی ایک الگ جماعت تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب طویل زمانہ گزر گیا تو انہوں نے تصویروں کی جگہ مجسم بت بنالے تاکہ زیادہ دیر تک قائم رہ سکیں۔ (یعنی پہلے تصویریں بنائی گئی تھیں بعد میں تصویروں کے مٹ جانے کے خوف سے مجسمے بنائے گئے۔) بعد میں ان کی عبادت ہونے لگی۔ ان کے ہاں ان کی عبادت کے بہت سے طریقے تھے۔

حضرت ام سلمہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حبشہ میں جو گر جا دیکھا تھا اس کا ذکر رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ اس کا نام ”ماریہ“ تھا۔ انہوں نے اس کی خوب صورتی کا ذکر کیا اور اس میں جو تصویریں تھیں ان کا ذکر کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تھا تو اس کی قبر پر مسجد (عبادت گاہ) تعمیر کرتے تھے اور اس میں یہ تصویریں بناتے تھے۔ اللہ کے ہاں یہ لوگ مخلوقات میں بدترین ہیں۔“ (صحیح بخاری)

اصحاب الرس

اصحاب الرس کا ذکر قرآن مجید میں دو مقامات پر آیا ہے۔ قرآن کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ملیا میٹ کر دیا گیا تھا۔

عربی زبان میں ”الرس“ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کی منڈر پتھروں سے بنائی گئی ہو۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ایک خاص کنواں تھا جس پر قوم ثمود کا ایک قبیلہ رہتا تھا۔ وہی لوگ اصحاب الرس کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت ابو بکر محمد بن حسن نقاش رحمۃ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اصحاب الرس کا ایک کنواں تھا جس سے ان کے پینے کی اور آب پاشی کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ ان کا بادشاہ بہت انصاف پرور اور نیک سیرت تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو لوگوں کو بہت زیادہ غم ہوا۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ شیطان اس (مرحوم بادشاہ) کی صورت میں ان کے پاس آیا اور کہا۔

”میں مرا نہیں تھا، میں تو غائب ہو گیا تھا تاکہ دیکھوں تم کیا کرتے ہو۔“

وہ انتہائی خوش ہوئے۔ اس نے کہا۔

”میرے لیے پرہ لگا دو۔ میں کبھی نہیں مروں گا (لیکن تمہاری نظروں سے اوجھل رہوں گا)۔

بہت سے لوگوں نے شیطان کی بات کو سچ سمجھ لیا اور اس کے فریب میں آکر اس کی پوجا کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک نبی محبوب فرمایا، اس نے بتایا کہ

”پر دے کے پیچھے سے بات کرنے والا (بادشاہ نہیں، بلکہ) شیطان ہے۔ اس نبی نے انہیں اس کی عبادت سے منع کیا اور اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا۔

امام سبیلی رحمۃ اللہ کا بیان ہے کہ ان نبی پر نیند کی حالت میں وحی نازل ہوتی تھی اور ان کا نام حنظلہ بن صفوان علیہ السلام تھا۔ لوگوں نے آپ علیہ السلام پر حمد کیا اور آپ علیہ السلام کو شہید کر کے کنویں میں ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کنویں کا پانی خشک ہو گیا۔ درخت سوکھ گئے، پھل ختم ہو گئے، انہیں پیاس نے آ لیا، چنانچہ ان کے گھروں پر ان ہو گئے اور وہ ادھر ادھر بکھر گئے اور آخر کار سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

ہیکل سلیمانی اور تابوت سیکمنہ

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی تھی کہ مجھے ایسی حکومت ملے میرے بعد آنے والوں کو ایسی حکومت نصیب نہ ہو۔ آپ کی دعا قبول ہوئی اور آپ انسانوں، جنوں، حیوانوں اور ہوا پر حکومت کرنے

لگے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے باپ حضرت داؤد علیہ السلام کی خواہش کے مطابق فلسطین میں ایک عبادت خانہ تعمیر کیا اس عبادت خانہ کا نام ہیکل سلیمانی پڑا۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر 1012ء قبل مسیح میں ہوئی۔ تعمیر کا کام سات سال تک جاری رہا۔ بعض روایات کے مطابق دوا لاکھ مزدوروں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔

اسرائیلی روایات میں پایا جاتا ہے کہ تعمیر کے دوران جنوں نے بھی حصہ لیا۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس عبادت خانہ کی لمبائی 90 فٹ، چوڑائی 30 فٹ اور اونچائی 45 فٹ تھی۔ اس کے اندر ایک مخصوص جگہ بنائی گئی تھی۔ جہاں تابوت سیکمنہ رکھا گیا۔ یہ ایک صندوق کی شکل میں تھا۔ اس میں یہودیوں کے تبرکات رکھے گئے تھے۔ اس میں آل موسیٰ اور آل ہارون علیہ السلام کی نشانیاں تھیں۔ اس لیے ان کے

نزدیک یہ صندوق بہت متبرک مانا جاتا ہے۔ عصائے موسیٰ علیہ السلام بھی اسی صندوق میں تھا۔ ان میں پتھر کی وہ تختیاں بھی تھیں جو طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی تھیں۔

طاہوت جب بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا تو اس نے لڑکر یہ صندوق حاصل کیا تھا۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ فلسطین پر ہر زمانے میں حملے ہوتے رہے۔ کبھی بابل نے تباہی چائی (عراق کا قدیم نام بابل تھا) کبھی رومیوں نے حملہ کیا جس نے بھی حملہ کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کیے ہوئے عبادت خانے کو بھی نشانہ بنا دیا۔

ایک مرتبہ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کیا اور ہیکل سلیمانی کو تاخت و تاراج کیا اور اسرائیلیوں کا قتل عام کیا۔ بخت نصر فلسطین سے دس لاکھ یہودیوں کو عراق لے گیا اور وہاں غلام بنا دیا۔ بخت نصر کے عہد کے بعد پھر یہ قوم فلسطین میں آکر آباد ہو

گئی۔ رومی بھی اکثر فلسطین پر حملہ کرتے رہے۔ ہیکل سلیمانی کے جو بھی نشانات تھے حملوں کی زد میں آکر مٹتے رہے۔ آخر میں روم کے ایک بادشاہ نے اس نے ہیکل سلیمانی کو آگ لگا کر بالکل تباہ کر دیا۔ حتیٰ کہ اس کے وجود کی دھندلی سی نشانی بھی نیست و نابود ہو کر رہ گئی۔

یہودیوں کا دعوا ہے کہ ہیکل سلیمانی کی زمین پر مسجد اقصیٰ تعمیر کی گئی۔ اس لیے یہ یہودیوں کی ملکیت ہے۔ آج بھی یہ تنازعہ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے بیت المقدس کی سرزمین پر آج تک جنگ جاری ہے۔ اسرائیلی مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔



خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو انسائیکلو پیڈیا

کانیا انڈیشن قیمت - 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا خواتین

قیمت - 225/- روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - 800/- روپے کا مٹی آؤ دار سال فرمائیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

گھی یا مکھن (یعنی چکنائی) میں تقریباً 45 کیلوریز ہوتی ہیں اور اس کو ہضم کرنے میں کچھ صرف نہیں ہوتا۔

گوشت میں سب سے بہتر سفید گوشت یعنی مچھلی اور مرغی کا ہوتا ہے سفید گوشت کیلوریز کنٹرول کرنے میں بہت ہی مفید ہے۔

مختصراً یہ کہ کھانے میں گھی اور تیل کا کم سے کم استعمال پھلوں اور سبزیوں کا وافر استعمال اور آٹے میں بھوسی کی موجودگی وزن کم کرنے کا ذریعہ ہے۔ مندرجہ ذیل ہفتہ وار ڈائنٹ پلان پر عمل کر کے آپ

بہت حد تک موٹاپے سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔
پہلا دن : سارے دن میں کسی بھی قسم کا پھل کھائیں سوائے کیلے کے۔

دوسرا دن : سارے دن میں کسی بھی قسم کی سبزی کھائیں۔ سوائے آلو، مٹر اور مکئی کے۔

تیسرا دن : سارا دن پھل اور سبزی کھائیں۔
چوتھا دن : سارے دن میں آٹھ کیلے اور چار

گلاس دودھ (دہی اور لسی بھی استعمال کی جاسکتی ہے) پانچواں دن : سارے دن میں آدھا کلو مرغی، ایک کلو ٹماٹر (تین کھانوں میں تقسیم کر کے)

چھٹا دن : سارے دن میں آدھا کلو مچھلی اور کوئی بھی سبزی (تین کھانوں میں تقسیم کر کے)

ساتواں دن : سارے دن میں ڈیڑھ پاؤ ایلے ہوئے چاول اور کوئی بھی سبزی (تین کھانوں میں تقسیم کر کے)

نیز چائے کافی وغیرہ بغیر شکر کے استعمال کی جاسکتی ہے۔ گھی اور تیل قطعی استعمال نہ کریں۔ گوشت کو کونکوں پر سینک کر یا اہال کر کھائیں اور سبزیوں کا سوپ دن میں جب بھی بھوک لگے پی لیں۔ آپ دیکھیں گی کہ چند دنوں میں آپ کا وزن نمایاں طور پر کم ہونا شروع ہو جائے گا۔



موٹاپے کی بہت سی وجوہات و اقسام ہوتی ہیں ان میں اہم ترین یہ ہیں۔ (1) خاندانی بیماری کے باعث

(2) غدودوں کی وجہ سے
(3) کھانے کی زیادتی وغیرہ

ان تمام وجوہات میں آخری وجہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر موٹاپا کسی غدود کی وجہ سے ہے تو اس کا علاج ماہرین امراض غدود سے کروا کر اس سے چھٹکارا دیا جاسکتا ہے۔

وزن کم کرنے کے بہت سے طریقے ہیں مگر سب سے بہترین طریقہ ”کیلوریز کنٹرول“ کرنا ہے۔ اس سے معدے کو کم کھانے کی عادت ہو جاتی ہے کیلوریز کنٹرول کرنے کے لیے پہلے اسے سمجھنا اور جاننا ضروری ہے کہ یہ کس طرح مفید ہے۔

مثال کے طور پر ایک ایلے ہوئے اینڈے میں 70 فیصد کیلوریز ہوتی ہیں۔ اگر اس کو فرائی کیا جائے تو 650 ہو جاتی ہیں۔ آلیسٹ بنایا جائے تو 450 ہو جاتی ہیں۔

ایک سیب میں تقریباً 70 کیلوریز ہوتی ہیں۔ اس کو ہضم کرنے کے لیے تقریباً 25 یا 30 کیلوریز استعمال ہو جاتی ہیں اس کے مقابلے میں ایک چمچہ تیل

اس

اس

اس